

# دروازے

عہد ساز سرمایہ مارچلیش کاروں کی داستا میں  
خوش بیانوں کا بیاں، خیال پروروں کے فسانے

اس کتاب کو پڑھنے والے ہر شخص کو اس کے اندر موجود کئی کئی  
نورانی اور تاریکیوں کی دنیا کی کھلی ہوئی جگہ ملے گی  
خس ابرار اور خدیجہ (ایک اداکارہ)  
ایک پوری کی پوری کہانی ہے جس کا سبب ہے  
مرزا صاحب کے بیان سے  
گزار (میں نے لکھا)  
اسے خوب تر کر دے، وہ اپنے ساتھ  
سوائی خراج کے ساتھ یہاں پہنچا کر پھر ان کے آگے  
ان کا کہنا  
مرزا جانید ایک کتا کی طرح لگا رہے  
کہیں یہ کتا نہیں ہے بلکہ جاگتا ہے ہر گز نہیں  
عبداللہ حسین  
مرزا جانید کے یہ نام کہیں خاک نہیں ہوں گے  
کہ ان کے افسانہ خود گردش کرتا ہے  
مستشرقین تار

مرزا جانید



برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید



آپ ہمارے ساتھ شامل ہونے  
کے لیے ہم سے رابطہ کر سکتے  
ہیں ہمیں امید ہے آپ کو یہ  
گوشہ پسند آئے گی

منیجنگ ڈائریکٹر: 03056406067

انتظامیہ

03340120123/03168782185

03478848884:pj8m

# دروازے

(خاکے)

عرفان جاوید

Arslan Raza Book Bank  
and Library Suppliers  
Panjab University Old Campus New Model Town Lahore.  
0307-4198217 0323-4251011

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4394 Javed, Irfan

Darwaazay/ Irfan Javed.- Lahore :  
Sang-e-Meel Publications, 2017.

256pp.

1. Urdu Literature - Essays.

1. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ  
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی  
کوئی بھی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2017ء

انفال احمد نے

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2997-9

ISBN-13: 978-969-35-2997-5

**Sang-e-Meel Publications**

25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN

Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101

<http://www.sangemeel.com> e-mail: [smp@sangemeel.com](mailto:smp@sangemeel.com)

حامی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

ابو اور امی کے نام

خود را دانی

سپردم به تو مایه خویش را

تو دانی حساب کم و بیش را

## درتچے

احمد ندیم قاسمی	9	پارس
اے حمید	29	بارش، خوشبو اور سماوار
احمد فراز	45	شریر
مستنصر حسین تارڑ	57	کاہن
عبداللہ حسین	85	باگھ
احمد بشیر	109	کامریڈ
عطاء الحق قاسمی	129	کھلکھلاتا آدمی
نکیل عادل زادہ	147	بازی گر
تصدق سہیل	185	نازکا پرست
نصیر کوٹی	205	ٹٹا جوگیاں کا مضلی
جاوید چودھری	217	دوسرا آدمی
محمد عاصم بٹ	245	دھندلا آدمی

# پارس

احمد ندیم قاسمی





2000

پس نرسنگہ داس کی کونھی سے اُٹھنے والی موسیقی اور ایڑی وار رقص کرتے جوتوں کی ٹپ ٹپ دور کہیں تھاتھی کی تال میں گھل جاتی۔

10

نوجوان اثبات میں سر ہلا دیتا ہے۔ بزرگ ٹھنٹی بجاتا ہے، چہرہ اسی آتا ہے، اُسے چائے کا کھہر دیا جاتا ہے۔ بزرگ مسودہ میز کی دراز میں رکھ دیتا ہے اور گفتگو لہجے میں گفتگو کرنے لگتا ہے۔

بات جب چل نکلتی ہے تو نوجوان بتاتا ہے کہ کئی دہائی پہلے اُس کی والدہ کا خاندان جناب کے ہمسائے میں نسبت ردو پر رہتا تھا۔ بزرگ کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک آ جاتی ہے اور وہ کھڑکی سے باہر چھپاتی چیزوں اور بلبوں کو دیکھنے لگتا ہے اور کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا ہے۔ باہر چڑیوں کی چھبھاہٹ میں رقص کرتے قدموں کی چاپ گھلتی جاتی ہے۔

جب زنگھ داس نے وہ عمارت تعمیر کی تھی اور وہ رقص گاہ کے ایک کونے میں کھڑا آسودہ جوڑوں کو رقص کرتے دیکھتا تھا اور مسکراتا تھا تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اسی کونچے کے ایک کمرے میں، بہت بعد، برصغیر کا ایک نابھہ روزگار ادیب بیٹھے گا۔ زنگھ داس نے رقص کی چاپوں میں زبان اردو کے عظیم دماغوں اور ادبی اساتذہ کی آمد و رفت کی آوازیں نہ سنی ہوں گی۔ پھر یہ کیسے ممکن کہ اُس نے مجھ جیسے نوآموز نابھہ کار یونیورسٹی کے طالب علم کے سمجھتے قدموں کی چاپ سنی ہو۔ ممکن ہے کہ رات کے پچھلے پہر سب مہمانوں کو رخصت کر کے، بخار کے اُس عالم میں جب کبھی شاید کبھی، مارائی انکشاف بجلی کے مانند مان بکوند جاتا ہے، یہ سب اُس پر وارد ہوا ہو..... شاید۔

پہلی ملاقات میں لمبے نکلے ہوئے پرانے پتے کی گھر گھر روشنی دان سے آتی سنہری دھوپ کی ترجمانی کر رہی، کھڑکی کی جالی سے ٹکراتی کھینچی چڑیاں اور کمرے میں سانس لیتی قد امت کے فست اور اق سے مماثل مہک مجھے تذبذب میں مبتلا کرتی تھیں کہ میں بیسویں صدی کے اوائل میں سانس لیتا ہوں یا اواخر میں زندگی برت رہا ہوں۔ سامنے منظر، بیدی، کرشن چندر اور فیض کے ہم عصر احمد ندیم قاسمی صاحب بیٹھے اور اق زندگی کو لمحہ پلٹ رہے تھے اور میں ایک بھرپور دور کی ترجمانی کرتے استاد ادب کو عقیدت سے دیکھ رہا تھا۔

وہ پہلی ملاقات، اقلندہ ملاقاتوں کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ چند روز بعد میں اُن کے پاس دوبارہ گیا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے خبر دی کہ میرا انسانہ معمولی ترمیم کے بعد۔ ماعی "فنون" میں شائع کیا جا رہا ہے۔

آج جب ہندوستان کا مایہ ناز نظم ساز اور ادیب ٹھہرا کہتا ہے "میں بابا کی سال کرہ" "فنون" کا شاہد سامنے رکھ کر اور کینڈل جلا کر مناؤں گا۔" رات کے اس پہر قاسمی صاحب کے چلے جانے کے کئی برس بعد میں ہمت پاتا ہوں کہ اُن کی ذات پر عقیدت علیحدہ کر کے کچھ لکھوں تو پیچھے مجھے یادوں کے شبستان کے مقدس تالاب پر واقعات روشن دیوں کی طرح تیرتے نظر آتے ہیں۔ سو یہ احوال صرف ادیب احمد ندیم قاسمی کا نہیں بلکہ احمد شاہ مامی آدمی کا بھی ہے۔

محمد خالد اختر نے قاسمی صاحب پر لکھے خاکے میں ایک کالج ڈرامے کا احوال بیان کیا ہے جس میں ان دونوں نے حصہ لیا تھا۔ ڈراما بڑے کروفٹ شہر کے واحد سینما ہال میں منبج ہوا۔ اسے دیکھنے کے لیے بہاول پور کے سبھی افسران اور معززین مدعو کیے گئے تھے۔ اس ڈرامے میں نوجوان احمد ندیم قاسمی نے اپنا رول بخوبی ادا کیا، البتہ خالد اختر کے ہر لڑکھڑائے اس پر سارا ہل قبیلوں سے گونج اٹھا اور کئی ایک نے آواز سے بھی گئے۔ "واحد شخص جو مجھ پر نہ ہنس، نہ تم تھا۔ اس نے کبھی اس کا ذکر تک نہ کیا۔" یہ وضع قاسمی صاحب کی شخصیت کا خیر تک حصہ رہی۔ کوئی نظم، غزل یا افسانہ انھیں اشاعت کے لیے بھیجا جاتا اور وہ ان کے معیار پر پورا نہ اترتا تو وہ یہ نہ کہتے کہ یہ اُن کے معیار کے مطابق نہیں بلکہ وہ اکثر و بیش تر یہی کہتے کہ نظم یا افسانہ اُس شاعر یا افسانہ نگار کے معیار کا نہیں۔ اسی طرح اگر مضامین سے کوئی ملاقاتی آتا تو وہ اسے بھی اسی گرم جوشی سے اٹھ کر ملے جتنا بڑا اُنے شناسا ادیب کو۔

مجلس ترقی ادب کے دفتر میں بے شمار سویرے، دوپہریں اور شامیں اس طرح گزریں کہ وہ اپنے پرانے دوستوں اور معاصر ادیبوں کے قہقہے سناتے اور میں ایک شوہر کو انھیں منتہر ہوتا۔



جب کبھی اُن کے بچپن کا تذکرہ ہوتا تو وہ اسے شدت اور ناسمجھیا سے یاد نہ کرتے کیوں کہ ان کے وہ دن بہت مشکل اور تنگ دستی میں گزرے تھے۔ البتہ اُس دور کا مشاہدہ، قدرت اور ماں کی محبت کی یاد ایا م رفتہ کی کلفتوں پر غالب آجاتی اور ان کی آواز بھیگ بھیگ جاتی۔ ان کی سون سیکسرسے جذباتی وابستگی تحریروں اور گفتگو پر غالب رہی۔ لہلہاتے کھیت، اٹھتے بادل، دھلی پہاڑیاں، چکراتی بل کھاتی چم ڈھلیاں، بیکو کے پھول کی جڑ میں مٹھاس کا موتی، چٹختی چٹانوں کی دراڑوں سے پھونٹے جنگلی پھول، گھنی پھلاہیوں کے سائے میں دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو، نیلے پہاڑ کے دامن میں آئینے کی طرح چمکتی ہوئی جمیل پرسورج کی کرنوں کی سرک، بادل کی گرج کے ساتھ تانبے کی چادر وں کی طرح بجتے ہوئے پہاڑ، بکئی کے بھٹوں کے لائے لائے سنہرے بالوں میں بکئی کی مہک، رات کے سائے میں اونٹ کی گھنٹی یا شجر کے ٹاپ، مینہ کے چھیننے، موسلا دھار بارش کی عمودی دیواریں اور سیاہ بادلوں سے بجلی کے لشکارے اُن کی تحریروں میں ڈراتے ہیں۔

بچپن کے مشاہدہ قدرت نے ان کے تحت الشعور میں ایسا درود کیا کہ بعد کے مستقران کے اندر اس طرح جگہ نہ بنا سکے۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا کہ کیا کبھی لاہور نے جذباتی طور پر ان کے اندر جگہ بنائی تو انھوں نے نفی میں سر ہلادیا اور بتایا کہ انھیں لاہور سے کبھی وہ جذباتی وابستگی محسوس نہ ہوئی جو آبائی علاقے سے تھی۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ لاہور اتنا بدل گیا ہے کہ اگر کوئی اصحاب کھف کے مانند مدت کی نیند سے بیدار ہو کر ادھر لوٹے تو اسے قطعی طور پر پہچان نہ پائے۔

لڑکپن کی ایک یاد کا کئی مرتبہ انھوں نے ذکر کیا جب وہ 1937ء میں دو بزرگوں کے ہم راہ علامہ اقبال سے ملنے گئے تھے۔ ان بزرگوں میں سے ایک عبدالحجید سالک تھے۔ ان دنوں اقبال کافی بیمار تھے، ان کا گھٹایک نہیں تھا۔ آواز بھی باریک ہو چکی تھی۔ دونوں بزرگ اقبال سے گفتگو کرنے لگے اور نو جوان قاسمی انھیں عقیدت سے دیکھتے رہے۔ اقبال اس وقت حقے سے بھی شوق فرما رہے تھے۔ گفتگو کے دوران ایک بزرگ نے حقے کی جانب اشارہ کر کے لقمہ دیا علامہ آپ کا اس حقے کی خودی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اقبال اشارہ سمجھ گئے اور مسکراتے ہوئے حقے کا رخ اُن کی جانب کر دیا۔

ایک مرتبہ میں نے اُن سے پوچھا کہ ادب میں باقاعدہ آمد اور ابتدائی تربیت میں وہ کس کو سب سے اہم سمجھتے ہیں تو انھوں نے عبدالحجید سالک کا نام لیا اور بتایا کہ وہ ایک نر کے محکمے کی ملازمت سے حدود چہیزار تھے، جہاں ان کا منشیات کے معاملات سے واسطہ پڑتا تھا۔ انھوں نے سالک صاحب کو خط لکھا اور درخواست کی کہ کوئی متبادل اور مزاج سے ہم آہنگ سلسلہ روزگار کی جانب راہ نمائی کی جائے۔ سالک صاحب تب تک قاسمی صاحب کی تحریروں اور شاعری سے خاصے متعارف ہو چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بچوں کے رسالے 'پھول' کی ادارت کی پیش کش کی۔ قاسمی صاحب نے فوراً قبول کر لی۔ بعد ازاں قاسمی صاحب نے 'تہذیب نسواں' کی ادارت بھی کی جو ادب کے سنہرے دور میں ان کی آمد کا وسیلہ بھی بنی۔

یہ اسی دور کی بات ہے کہ بیدی، منٹو، کرشن چندر اور اردو ادب کی کہکشاں کے درخشندہ ستاروں سے ان کے ذاتی تعلق کا آغاز ہوا۔ ایک روز میں نے پوچھا کہ اتنے قد آور ادیبوں اور دیگر نمایاں لوگوں کے ساتھ تعلق میں اپنے دل کے سب سے نزدیک کس کو پاتے ہیں۔ اس پر وہ گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

"نادران گاڈیا" وہ بالآخر بولے اور بتایا کہ گاڈیا صاحب اینگلو انڈین تھے، معروف کتب خانے فیروز سنز میں ملازم تھے اور چند برس پہلے فوت ہوئے تھے۔ وہ بہت نفیس اور غلص آدمی تھے۔ قاسمی صاحب سے ان کی دوستی اور محبت کا ایسا عالم تھا کہ رمضان کے مہینے میں جب سارے ہوٹل بند ہوتے تو قاسمی صاحب اپنے گھر سے ان کے لیے کھانا بنا کر ٹفن میں لاتے۔ قاسمی صاحب یہ بات سنا رہے تھے تو میں ہنسم تصور میں ایک چمیرے بدن والے بزرگ کو لو پھونکتی اور سیک دھونکتی دوپہر میں دیران مال روڈ پر ٹفن لے جاتا دیکھ رہا تھا۔ وہ بزرگ کتابوں کے ایک بڑے شوروم کے باہر دم بھر کو کھڑا ہوتا ہے۔ باہر شیشے کی ایک دیوار پر سنہرے رنگ سے کندہ ہے "یہ ادارہ طہاعت و اشاعت ہے۔"

بھروسہ بزرگ شوروہم کے خطبے ماحول میں داخل ہو جاتا ہے جہاں ایک اور نرم نقوش اور شلیق مسکراہٹ والا دان گاڈیا مہمان کو دیکھ کر کھل اٹھتا ہے اور احمد ندیم قاسمی سے نقن لے لیتا ہے۔

دان گاڈیا کے گزر جانے کا قاسمی صاحب کو بہت صدمہ تھا۔ گاڈیا صاحب کے ذکر سے قاسمی صاحب کی آنکھوں میں چمک آگئی، انھوں نے اپنا ہوا نکالا اور مسکراتے ہوئے اس میں سے ایک تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ وہ گاڈیا صاحب کی تصویر تھی۔ وہ تصویر میرے لیے ایک انکشاف کا درجہ رکھتی تھی۔

”میں نادر گاڈیا کی تصویر ہر وقت اپنے بٹوے میں رکھتا ہوں۔ وہ مجھ سے کبھی بھی جدا نہیں ہوئے۔“ قاسمی کی ایک مہین تہہ قاسمی صاحب کی آنکھوں میں ابھر آئی۔

مجلس ترقی ادب کا دفتر یقیناً برصغیر میں ادب کا سب سے اہم اور متحرک مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ کلب روڈ پر واقع زرنگہ واس کی تعمیر کردہ یہ عمارت قاسمی صاحب کی زیر ادا رت لگنے والے سہ ماہی ”فنون“ کا بھی دفتر قرار پائی۔ دہائی بھر سے زیادہ کے تعلق میں میری قاسمی صاحب سے فون پر ہر دوسرے تیسرے روز بات ہو جاتی اور دس بارہ دن بعد میں ان کے دفتر میں حاضر ہو جاتا۔ کیا کیا دماغ تھے اور کیا کیا لوگ جو اس مرکز فنون و ثقافت میں آمد و رفت رکھتے۔ وہ دروازہ کھلا اور احمد فراز اندر داخل ہوئے، یہ محمد کاظم صاحب چلے آ رہے ہیں، گلزار صاحب کا ہندوستان سے فون ہے، ادھر فون رکھا ادھر برطانیہ سے ساتی فاروقی کا فون آ جاتا ہے، ابھی انکسار نسیم اٹھے ہیں تو امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی داخل ہوتے نظر آ رہے ہیں۔

ان سب کے درمیان احمد ندیم قاسمی اپنے مخصوص لہجے میں ہلکی ہلکی جھڑپیاں چھوڑ رہے ہیں۔ سب ان سے محبت بھی کرتے ہیں اور آداب کا تکلف بھی قائم ہے۔

انھیں ہمیشہ میں نے لباس میں خوش ذوق پایا۔ زیادہ تر نقیس استری شدہ شلواری قمیص کے اوپر واسکٹ میں دیکھا، کبھی تقریبات کے لیے پیچنگ سوٹ بھی زیب تن کر لیتے جو ان پر خوب چلتا۔

ان کے بیٹھے ہونے سے ماحول میں ایک سکون اور ٹھیراؤ ہوتا۔ میں نے ان کے منہ سے کبھی کوئی نازیبا بات یا اونچی آواز نہیں سنی۔ ان میں ایک صلاحیت تھی کہ ان کے حلقے کا ہر شخص یہ سمجھتا گویا وہ اسے سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ ان کی محفل میں جہاں ایک بے تکلفی ہوتی وہیں مراحب کا بھی خیال رکھا جاتا۔

ایک مرتبہ وہ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ کمرے میں احمد فراز، جمیل عالی، منصورہ احمد اور تسنیم منٹو بھی بیٹھے تھے۔ بہت دیر سے ایک خشک فلسفیانہ موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ ماحول خوش گوار کرنے کے لیے محترمہ تسنیم منٹو نے احمد فراز سے فرمائش کی کہ وہ اپنا تازہ کلام پڑھ کر سنائیں تو فراز قاسمی صاحب کی جانب اشارہ کر کے دھیمی آواز میں بولے کہ ایسے بزرگ اور استاد کے سامنے اپنا کلام پڑھنا بے ادبی کے زمرے میں آتا ہے۔ فراز حلقہ یاراں میں شوخ اور بے باک جاتے جاتے تھے لیکن قاسمی صاحب کے سامنے وہ بھی باادب ہو جاتے۔ اسی دوران ان تحائف کا ذکر چل نکلا جو ”فنون“ میں شائع ہونے کے بعض خواہش مند لے کر آ جاتے، بالخصوص جب ان کی تحریریں ناقابل اشاعت ہوتیں۔ یہاں فراز بول پڑے کہ ناقابل اشاعت مسودہ تو ضرور لوٹا دیا کریں لیکن تحفہ نہ لوٹایا کریں۔ اس پر قاسمی صاحب گویا ہوئے۔ ”ایک مرتبہ ایک سکھ کے گھر کوئی بم رکھ گیا۔ کسی نے سردار جی کو خبر دی تو انھوں نے سنی ان سنی کر دی۔ خبر دینے والے نے جھنجھلا کر کہا کہ وہ اس سنگین اطلاع پر توجہ کیوں نہیں دے رہے تو سردار جی بولے۔ یا رکھ کوئی کچھ رکھ کر ہی گیا ہے، لے کر تو نہیں گیا۔ اس پر خوب تہقیر پڑا۔“

اسی طرح ایک مرتبہ شاعر خالد احمد محفل میں ایک لطیفہ سنا رہے تھے۔ لطیفہ خاصا طویل تھا سو حاضرین اس میں دل چسپی کھونے لگے۔ بیچ میں عطاء الحق قاسمی صاحب نے لقمہ دیا۔ ”خالد! لطیفہ سنانے سے بہتر ہے کہ تم اسے لکھ کر کاپیاں سب میں تقسیم کر دو تاکہ سب پڑھ



لیں۔ ”یہاں احمد ندیم قاسمی صاحب نے مسکراتے ہوئے مداخلت کی۔ ”عطا لطیف کی طوالت دیکھتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ اس کا خاص نمبر شائع کرنا پڑے گا۔“

’خاص نمبر‘ کی بھی ایک تاریخ ہے۔ یہ 1963ء کی بات ہے۔ ایوب مارشل لا اپنے عروج پر تھا، وہیں اردو کے فعال اور اہم ترین ادیب غیر معمولی ادب تخلیق کر رہے تھے۔ ایسے میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے حبیب اشعر کے ساتھ ”فنون“ کا اجرا کیا۔ جلد ہی رسالہ مقبولیت کی معراج پر پہنچ گیا۔ اسے فقط خالص ادب تک محدود نہ رکھا گیا بلکہ فنون لطیفہ کی دیگر اصناف مصوری، موسیقی، تصوف، فلسفہ وغیرہ کو بھی جگہ دی گئی۔ بہت جلد ان اصناف کے اساتذہ اس پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو گئے۔ جہاں مصوری پر عبدالرحمن چغتائی کے مضامین شائع ہونے شروع ہوئے وہیں ابوالخیر مودودی ’خدا‘ کے موضوع پر نمائندہ تحریر کے ساتھ آن موجود ہوئے۔ افسانے میں راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے شہ پارے پہلے ہی شمارے میں موجود تھے۔ ایک جانب جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کی شاعری اس میں جگہ پانے لگی دوسری جانب کرشن چندر ’بڑا آدم‘ انتظار حسین ’آخری خندق‘ خالد اختر ’ننھا نا نھی‘ اور غلام عباس شاہ کار افسانوں کے ساتھ شریک محفل ہوئے۔ سڑکی دہائی تک یہ برصغیر میں علم و فن کا سب سے اہم جریدہ بن چکا تھا۔ اس قافلہ رنگ و بو کے سالِ قاسمی صاحب تھے جو اپنی شاعری اور افسانوں کے ساتھ اس نازنین ادب کے ماتھے کا جھومر تھے۔

”فنون“ نہ صرف نام وراویوں کی نمائندہ تحریروں کو جگہ دے رہا تھا بلکہ نوادارانِ ادب کی بھی پرورش کر رہا تھا۔ آج کے اجمل کمال ہوں جنھوں نے خالد طور کو فنون کے پرانے شماروں سے ڈھونڈ نکالا، نام وراصور تصدیق سہیل جو اپنی مصوری سے زیادہ فنون میں چھپنے والے افسانوں پر نازاں ہیں یا دیگر نمایاں تخلیق کار، فنون کے پرانے شماروں سے آج بھی جواہر نکلتے چلے آتے ہیں۔

قاسمی صاحب نے جہاں سفر نامے میں مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، محمد کاظم وغیرہ کو متعارف کروایا وہیں شاعری میں اختر حسین جعفری، پروین شاکر، احمد فراز، امجد اسلام امجد، خالد احمد، نجیب احمد، عباس تابش، اعجاز رضوی، شاہ نواز زیدی اور ایوب خاور کے علاوہ درجنوں دیگر کو سامنے لے کر آئے۔ افسانے میں تو یونس جاوید سے لے کر نیلوفر اقبال تک ایک دکتی کہکشاں ہے۔ فلسفے میں علی عباس جلال پوری سے لے کر محمد ارشد تک نمایاں نام ہیں۔

اردو میں عربی ادب کو صحیح معنوں میں محمد کاظم ایسے سال ”فنون“ کے توسط ہی سے سامنے لائے۔

قصہ مختصر، فنون کا دفتر ادیبوں کی آماج گاہ بن گیا جہاں قاسمی صاحب مسکراتے ہوئے، سب کو شفقت اور محبت میں شراہور رکھتے۔ وہاں جدید فکری نظریات اور فلسفوں پر بحثیں ہوتیں، نئے نکتے ڈھونڈ کر لائے جاتے، تازہ خیالات کو نمونہ بنائے اور پرانے خیالات رد کیے جاتے، یہ سارا کچھ ”فنون“ کے صفحات پر نمایاں ہو جاتا۔

”فنون“ سے پہلے ”نقوش“ خاص نمبر نکالنے کی شہرت رکھتا تھا، بھلے یہ نمبر موضوعاتی ہوں یا شخصیتی۔ ”فنون“ نے ’غزل نمبر‘ اقبال نمبر اور غالب نمبر وغیرہ جیسے شاندار نمبر نکال کر خوب داد دی۔

میں نے ذاتی طور پر قاسمی صاحب اور فنون کے درمیان تعلق میں چند چیزیں نمایاں طور پر محسوس کیں۔ ہمارے ہاں حقیقی معنوں میں ایڈیٹنگ کا تصور موجود نہیں۔ یہ ادبی رسالے ہوں یا اشاعتی ادارے۔ ہمارا ادیب اس معاملے میں غیر معمولی طور پر حساس ہے، وہ اپنی تحریر میں کاٹ چھانٹ عمومی طور پر پسند نہیں کرتا۔ جہاں تک ایڈیٹر کا تعلق ہے تو وہ بھی اس تردد میں نہیں پڑتا۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ دنیا میں ایڈیٹر اور ادیب کا مسلسل رابطہ اور صلاح مشورہ جاری رہتا ہے۔ نتیجتاً عمدہ معیار کا، بین الاقوامی سطح کا ادب وجود میں آتا ہے۔

قاسمی صاحب کو میں نے مسودات کی باقاعدہ سرخ قلم سے کاٹ چھانٹ کرتے اکثر دیکھا۔ وہ ترمیم شدہ مسودہ ادیب کو یہ کہتے ہوئے بھجواتے کہ غالباً وہ بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا۔

معیار پر انھیں کبھی سمجھوتا کرتے نہیں دیکھا۔ البتہ وہ کسی نئے لو جوان ادیب (جس میں انھیں صلاحیت نظر آتی) کی حوصلہ افزائی کی غرض سے نسبتاً ناپختہ تحریر بھی تراشیم کے ساتھ شائع کر دیتے۔ کئی مسودات میں نے انھیں لوٹاتے بھی دیکھا۔ میرے چند افسانے انھوں نے لوٹائے اور ایک افسانے کا عنوان ”شب گزیدہ“ سے بدل کر ”بھونچال“ کر دیا۔ انھیں میں نے اشعار کے الفاظ تبدیل کرتے اور افسانوں کے پورے اقتباسات حذف کرتے دیکھا۔

جب تک فنون پرلیس میں نہ چلا جاتا وہ اسے بناتے سنوارتے رہتے، جیسے یوٹی پارلر میں دلہن سنواری جاتی ہے۔ ایک بار میں اُن کے پاس بیٹھا تھا، ساتھ میں اُن کی منہ بولی بیٹی منصورہ بھی تھیں۔ بات رسالے میں چھپنے والے مضامین پر چل نکلی۔ منصورہ نے کہا کہ رسالہ تو بہت پہلے آ جانا چاہیے تھا مگر کچھ اُن کی یہ عادت کہ آخری لمحے تک نثر اور شاعری کی جمع تفریق میں مصروف رہ جے ہیں اور کچھ بیماری کی وجہ سے غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا بلکہ بار بار ہو چکا ہے۔

اس پر قاسمی صاحب نے بہت سادگی سے اپنی ڈائری کھولی اور دکھانے لگے کہ اس سے اگلے شمارے کے بھی سبھی افسانے مکمل ہیں۔ ڈائری میں ایک فہرست لکھ رکھی تھی۔ اس پر منصورہ مصنوعی غصے سے بولیں۔ ”جانے بھی دیجیے بابا، آپ ہر مرتبہ اسی طرح کہتے ہیں کہ مواد مکمل ہے مگر رسالہ ہے کہ مکمل ہونے ہی میں نہیں آتا۔“ اس پر میں نے پوچھا کہ کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انھوں نے جتنے صفحے افسانے یا شاعری کے لیے مختص کیے ہوں ان کی تعداد میں معیاری مواد کی کمی کے باعث رد و بدل کرنا پڑا ہو۔ انھوں نے بتایا کہ ایسا بار بار ہوا ہے۔

اس معاملے میں میں نے قاسمی صاحب میں ایک اور عادت دیکھی۔ وہ اپنے قلمی معاونین سے یا قاعدہ تحریری درخواست کرتے کہ انھیں تخلیقات بھجوائی جائیں۔ ایسے میں وہ سینئر اور جونیئر کی تخصیص نہ رکھتے۔ جاوید انور ابھی فیصل آباد میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے کہ انھوں نے اپنی ایک نظم ”فنون“ میں اشاعت کے لیے بھجوائی۔ اگلے شمارے میں ان کی نظم بہت اہتمام سے شائع ہوئی۔ اس پذیرائی نے جاوید انور کو خوش گوار حیرت سے دو چار کیا اور وہ سنجیدگی سے شاعری کی طرف مائل ہوئے اور عمدہ شاعر کے طور پر جانے گئے۔ اسی طرح افتخار بخاری سناتے ہیں کہ کس طرح ان پر تخلیقی جھوٹا طاری تھا کہ انھیں قاسمی صاحب کا مکتوب ملا جس میں تازہ کلام کی فرمائش کے ساتھ پیار بھری دھمکی بھی شامل تھی کہ اس کے بغیر ”فنون“ کا اگلا شمارہ نہ آئے گا۔ پس یہ دھمکی کارگر ہوئی اور یوں بخاری صاحب کا تخلیقی جھوٹو بنا۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا کہ اچھا اور معیاری لکھنے کے لیے وہ نئے لکھنے والوں کو کیا مشورہ دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ مسلسل مطالعہ بہت اہم ہے۔ ہر ادیب کو یہ عادت بنانی چاہیے کہ وہ کچھ وقت مطالعے کو ضرور دے۔ اس سے نہ صرف تازہ ترین ادبی تخلیقات اور رجحانات سے آگاہی رہتی ہے بلکہ سوچ اور تخلیق کا نیا مواد بھی سامنے آتا رہتا ہے۔

دوسرے انھوں نے زور دیا کہ روزانہ لکھنا بہت اہم ہے۔ مشق جاری رہنی چاہیے۔ اس سے تحریر میں روانی، پختگی اور نکھار آتا ہے۔ یہاں انھوں نے اپنی مثال دی کہ جب لمبے وقفے کے بعد قلم اٹھایا تو تحریر میں زکاوت اور زبان میں لکنت آگئی اور پہلی ہی روانی محسوس نہ ہوئی۔

تیسرا اہم نکتہ جس پر انھوں نے زور دیا، وہ مشاہدہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ بعض اوقات ایک لمحے کا مشاہدہ طویل ریاضت پر بھاری ہوتا ہے۔ جب کبھی میں قاسمی صاحب کے ہم راہ کہیں جاتا تو وہ اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ کرتے، وہ گل برگ کا رستوان ہو، مال روڈ پر واقع ہوٹل ہو، جم خانہ ہو یا کوئی دفتر۔ وہ نہ صرف مشاہدہ کرتے بلکہ معاملات کا معروضی تجزیہ کرتے۔

سوالات ہر وقت ان کے ذہن میں جنم لیتے رہے، جن کا جواب مل جاتا، افسانے میں ڈھل جاتے۔ وہ آخری عمر تک تجسس رہے۔ عالمی نظریات ہوں، ملکی حالات یا جدید ادب، اُن کی دل چسپی برقرار رہتی۔ ایسے میں بہت سے معاملات تشنہ بھی رہتے۔

شہرہ آفاق نفسیات دان سگمنڈ فرائڈ نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ”ایک پیچیدہ مسمی جسے میں اپنی تیس سالہ عرق ریزی اور تحقیق کے

’باوجود نورسنگھا نہیں سکا، یہ ہے“ عورت آخر چاہتی کیا ہے؟“

تجسس انھیں مشاہدے پر اُکسانا اور انکسار انھیں حصولِ علم پر۔

آخری عمر میں، جب وہ زندگی کی آٹھویں دہائی میں تھے، زیادہ دیر تک کہیں بیٹھ نہیں سکتے تھے چنانچہ اکتاہٹ یا تھکاوٹ کے باعث کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھنے کی فرمائش کرتے۔ ایک امرالبتہ قابلِ غور ہے کہ وہ اپنے دفتر میں قریباً نوے برس کی عمر تک روزانہ باقاعدگی سے نہ صرف آتے بلکہ شام چھ بجے تک تمام امور کی انجام دہی میں مصروف رہتے۔

ابھی موبائل فون نیا نیا آیا تھا اور اسے جدید ایجاد اور ماڈرن لوگوں کے استعمال کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ ایک کھانے پر انھوں نے مسکراتے ہوئے سادگی سے سامنے اشارہ کیا جہاں ایک برقع پوش خاتون موبائل پر بات کر رہی تھی اور بولے۔ ”دونوں کتنے مختلف ہیں، موبائل اور باپردہ خاتون۔“ ایسے میں کئی مرتبہ ان کے عقیدت مند اور چاہنے والے ان کے گرد قیادیر بنوانے کے لیے اکٹھے ہو جاتے۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے ان کے لکھنے کے انداز کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بیدی کے بارے میں بتایا کہ بیدی ایک تحریر کو دسیوں بار تراسیم کر کے حتمی شکل دیا کرتے تھے، اپنے بارے میں قاسمی صاحب نے بتایا کہ وہ عموماً ایک مرتبہ نظر ثانی کرتے ہیں اور اپنی تحریر کو حتمی شکل دے دیتے ہیں۔

اسی طرح ”فنون“ میں اُن کے نامکس ناول کے ابواب قسط وار شائع ہوئے۔ میں نے اس کے نامکمل رہ جانے کی وجہ پوچھی تو بتانے لگے کہ انھوں نے باقاعدہ کسی پلان کے تحت ناول کو شروع نہیں کیا تھا بلکہ کہانی خود ہی آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ ایک مقام پر اُن کرکڑک گئی اور باوجود کوشش کے آگے نہ بڑھ سکی۔ اُن کا کہنا تھا۔ ”کہانی اُن کی اُنکی تمام کرچلتی ہے اسی لیے اس کی چال قدرتی ہوتی ہے۔“

اُن کے کھانے کے معاملات بہت سادہ تھے۔ دوپہر میں گھر سے آیا کھانا لگ جاتا۔ پینیں سالن و فتری میز ہی پر سج جاتے۔ عموماً وہ لیس دار خوراک جیسے بھنڈی یا اردی شوق سے نہ کھاتے، البتہ ٹنڈے، لوکی وغیرہ رغبت سے کھاتے۔ پھلوں میں آم خاص پسند تھا بلکہ کہا کرتے تھے کہ آم کے بعد پانی بھی نہیں پینا چاہیے کیوں کہ اس سے آم کا ذائقہ بھی جاتا رہتا ہے۔

کھانے کے بعد وہیں دفتر میں صوفے پر لیٹ جاتے۔ ایسے میں ان کا منحنی جشہ سمٹ جاتا اور وہ چھوٹے بچے کی طرح پیٹ سے گھٹنے جوڑ کر سو جاتے۔ ان کی قریباً نوے برس کی طویل عمر اور اچھی صحت میں غالباً دوپہر کے مختصر آرام کا بھی ہاتھ تھا۔ قیلولے کی عادت میں نے نکلیل، دل زادہ صاحب اور عبداللہ حسین صاحب میں بھی دیکھی۔ قاسمی صاحب کہتے تھے کہ قیلولہ انھیں بقیہ دن کے لیے جسمانی طور پر چاق و بوند اور ذہن کو تروتازہ کر دیتا ہے۔ قیلولہ گرم اور مرطوب علاقوں میں آج بھی عام ہے۔ برطانوی راج میں دفاتر کے ساتھ قیلولے کے لیے ’رینائرنگ روم‘ بنائے جاتے تھے۔ شہرہ آفاق برطانوی راہ نما چرچل میں قیلولے کی عادت کچھ ایسی راسخ ہو چکی تھی کہ وہ جنگِ عظیم کے دوران بھی قیلولہ کرتا جسے وہ ”Power Nap“ کا نام دیتا تھا اور تروتازہ ہو کر پھر سے جنگی حکمتِ عملی اور امورِ مملکت میں تن دہی سے مصروف ہو جاتا۔

قاسمی صاحب سے دنیا جہاں کے موضوعات پر بات چیت ہوتی رہتی۔ وہ اکثر ملکی حالات میں خرابی پر رنجیدہ ہو جاتے۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا کہ معاشرتی و اخلاقی تنزل کا آغاز کب ہوا تو بتانے لگے کہ اس کا آغاز تقسیم کے فوری بعد ہی ہو گیا تھا جب ہندوؤں کی چھوڑی زمینوں اور جائیداد کی بندر بانٹ ہو رہی تھی۔ تب غیر منصفانہ آلاتِ منلوں نے خرابی کا آغاز کیا جو روز بہ روز بڑھتی ہی رہی۔

غیر منصفانہ سلوک کا وہ خود بھی شکار بنے جب ایک بیوروکریٹ نے انھیں مجلس کی نظامت سے ہٹا دیا۔ وہ اس دفتر سے اٹھ آئے

جہاں مئی وہابیوں سے ادب کی آب یاری کر رہے تھے اور صفایا والا چوک کے قریب ایک ٹھک گلی میں واقع 'نون' کے دفتر میں جا بیٹھے۔ وہاں میں نے انھیں بے حد افسردہ اور معطل دیکھا۔ گو میں نے اُن کی دل جوئی کی اپنی ہی کوشش کر دی تھی مگر ان کی فطری قہقہے کی اور بٹا شہت تک نہ لٹی جب تک اُن کے چند پرستاروں کی مداخلت سے انھیں واپس بحال نہ کر دیا گیا۔

ایک مرتبہ ایک اجنبی شخص اُن کے دفتر میں آیا اور اپنا تعارف کروایا کہ وہ یہاں والی سے لایہود کسی کام سے آیا ہے، کام جن صاحب کے پاس ہے، اُن کی کوئی سفارش اُس کے پاس نہیں۔ متعلقہ صاحب کا نام سنتے ہی قاسمی صاحب بے اختیار بول اٹھے: ارے وہ تو میرے چاہنے والے ہیں، ابھی فون کر دیتا ہوں، قبل اس کے کہ میں اُن سے درخواست کرتا کہ اُس شخص کے بارے میں پوری طرح جانچ کر لیں، وہ نون کا چوڑا اٹھا کر نمبر ملا چکے تھے۔

اپنے ہم عصر ادیبوں کے حوالے سے اُن کی یادداشت کی ذخیل میں بے شمار واقعات تھے۔ منٹو کو بہت محبت سے یاد کرتے تھے اور ان کے مزاج کی نفاست اور شرافت کی بہت تعریف کرتے۔ ”منٹو صبح اٹھ کر اچلے لباس میں میز کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ سامنے عہدہ کا غذا اور تراشی ہوئی پنسلیں ہوتی تھیں۔ وہ تیزی سے افسانہ مکمل کرتے اور رسالے کے مدیر کے پاس لے جاتے تاکہ بیسوں کا انتظام ہو سکے۔ انھیں افسانے کی تکنیک پر اس حد تک عبور تھا اور ضد و اداس حدیث کچھ ایسی تھی کہ وہ ان حالات میں بھی اعلیٰ ترین شاہکار تخلیق کر لیتے تھے۔ ہاں بعد میں معیار پر انھیں خاصا سمجھوتا کرنا پڑا لیکن وہ آخر منٹو تھے۔ ہٹ دھرم منٹو جو کہاں کسی کی سنتے تھے۔“

منٹو کے افسانوں کے متنازع موضوعات پر بات ہوتی تو قاسمی صاحب بتاتے کہ منٹو بنیادی طور پر شرعیہ شخص تھے، اپنی بیوی منیہ کے مکمل وفادار تھے۔ ان میں ایک خاص صلاحیت یہ تھی کہ ددنی بہت جلد بنا لیتے تھے۔ ان کے افسانوں کے پیش تر کردار حقیقی زندگی سے اٹھائے گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اُن کے حلقہ احباب میں شامل ہوئے اور منٹو نے ان سے افسانے کا عطر کشید کر کے اسے الفاظ کی شکل دے دی۔ ایسے میں چند لوگ بعد ازاں ان سے ناراض بھی ہوئے۔

شراب کی نکت تو ایک بیماری تھی جو منٹو کو لگ گئی تھی اگر نہ اُن کے اندر ایک حساس اور زخمی دل دھڑکتا تھا۔ ایک مرتبہ منٹو کا واقعہ سامنے لگے کہ بہت پریشانی میں منٹو صاحب اُن کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بٹی گھٹ پیار ہے، بیس روپے کی ضرورت ہے۔ اتفاق سے قاسمی صاحب کے پاس فوری طور پر اتنے پیسے نہ تھے، انھوں نے منٹو کو پیش کش کی کہ وہ پیسے کسی سے ادھار پکڑ لاتے ہیں۔ منٹو نے یہ پیش کش یہ کہ کر مسترد کر دی کہ اگر اُن کے پاس پیسے ہوتے تو ٹھیک تھا مگر اس طرح کسی سے پیسے ادھار مانگ کر لانا مناسب نہیں۔ قاسمی صاحب نے کافی اصرار کیا مگر منٹو نہ مانے اور وہاں سے چلے گئے۔ ابھی وہ گئے ہی تھے کہ شباب کیرانوی صاحب اُن پہنچے۔ وہ ان دنوں ڈائریکٹر نامی ایک رسالہ نکال رہے تھے، جس کے لیے انھوں نے قاسمی صاحب سے افسانے کی فرمائش کی۔ قاسمی صاحب کو رسالے کے معیار اور مزاج سے اختلاف تھا، انھوں نے معذرت کر لی مگر شباب کیرانوی مصر رہے تا اُن کہ انھوں نے تیس روپے قاسمی صاحب کی میز پر رکھے اور وہاں سے چلے گئے۔ ابھی وہ گئے ہی تھے کہ منٹو واپس آ گئے اور کہنے لگے۔ ”شباب کیرانوی آیا تھا، کچھ رقم ضرور دے کر گیا ہوگا۔“ قاسمی صاحب نے فوراً انہیں روپے منٹو کے سامنے رکھ دیے۔ منٹو نے بیس روپے اٹھائے اور کہنے لگے۔ ”احمد ندیم قاسمی (وہ قاسمی صاحب کو پورے نام سے پکارا کرتے تھے) بس مجھے تینے پیسوں ہی کی ضرورت ہے۔ باقی ضرورت سے زیادہ ہیں۔“ قاسمی صاحب کے اصرار کے باوجود منٹو مزید رقم لیے بغیر چلے گئے۔ اتفاق سے اُسی شام قاسمی صاحب کو ایک محفل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ محفل اس وقت جوین پر تھی اور منٹو وہاں روٹی محفل بنے بیڑے سے محفل فرما رہے تھے۔ قاسمی صاحب کو سامنے دیکھ کر منٹو جیسا پر اعتماد شخص بوکھلا گیا، عداوت چہرے پر ہویدا ہو گئی۔ خیر قاسمی صاحب نے منٹو سے اس ضمن میں کوئی تذکرہ کیا، ورنہ ہی منٹو نے کوئی وضاحت پیش کی البتہ ایک حساس یا ضمیر دوست کے چہرے پر ابھر آنے والی عداوت قاسمی صاحب کو یاد رہی۔



ایک دفعہ سنانے لگے کہ وہ پشاور میں ملازمت کرتے تھے کہ منٹو انھیں ملنے کے لیے آئے۔ اب وہاں قاسمی صاحب جیسے آدمی کے پاس منٹو کے لیے کوئی انتظام نہ تھا۔ قاسمی صاحب کے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے دوست کی بھرپور مہمان داری نہ کر پائیں چنانچہ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر منٹو کے لیے انتظام کر لائے۔ منٹو صاحب خوش ہو گئے۔ بعد ازاں جب کبھی منٹو کی ان سے ملاقات ہوتی وہ قاسمی صاحب کی مہمان نوازی کا خاص ذکر کرتے اور مردانہ کہہ دیتے کہ وہ جیسے آتے ہی اس کی ادائیگی کر دیں گے۔ منٹو کی مکرر ملاقات ویسے ہی تنگ دستی میں ہوتی تھی سو ان کے لیے ادائیگی کا کام انجام دینا ذرا مشکل تھا۔ البتہ اپنے دوست کی مہمان نوازی کا متواتر تذکرہ منٹو کی وضع و صورت کی علامت تھا۔

ایک روز بتانے لگے، ایک ایسا وقت آیا تھا کہ ادبی تحریروں میں غیر ضروری بے باکی باقاعدہ ڈرائی تھی۔ ”یہ میں ہی تھا جس نے منٹو کی کہانی ”بو“ ادب لطیف میں شائع کی تھی۔ بعد ازاں مجھے اس سلسلے میں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کا بیانیہ افسانے کے موضوع اور فن کے لیے ضروری تھا اس لیے میں اپنے موقف پر جم کر کھڑا رہا مگر میں فقط لکھاتی اور سستی شہرت کی خاطر بے باکی سے کبھی سمجھوتا نہیں کر سکا۔“

جب میں نے منٹو کی وفات کے بعد بچیوں کی کفالت کا پوچھا تو بتانے لگے کہ منٹو کے بچے حامد جلال (عائشہ جلال کے والد) نے بعد میں بچیوں کا بہت خیال کیا اور انھیں کسی کی نگاہ میں نہ ہونے دیا۔

قاسمی صاحب نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اپنی مختصر سی 43 سالہ زندگی کے آخری حصے میں منٹو کے اعصاب پر دو چیزیں سوار تھیں۔ پہلی، اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کا غم جس نے ان کے اعصاب بٹھا دیے تھے اور دوسری غالب کی شاعری سے ایسا مجنونا نہ لگاؤ کہ پیروں غالب پڑھتے اور اس کی شاعری میں گم رہتے۔

اپنی آخری ملاقات کا سناتے کہ منٹو کو کثرت سے نوشی سے منع کیا تو وہ زہر خند لہجے میں بولے۔ ”احمد ندیم قاسمی! میں نے تمہیں اپنے ضمیر کی مسجد کی امامت کا حق نہیں دیا۔“

اس کے چند روز بعد وہ نادیر روزگار چل بسا۔

منٹو کے حسن سلوک کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ وہ خود تو شراب کی علت میں مبتلا تھے مگر کبھی انھیں پینے پر مجبور نہیں کیا۔ اس پر میں نے سوال کیا کہ شاعری اور شراب کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا رہا ہے، ایسے میں کبھی کم زور لکھات بھی آئے ہوں گے۔ اس پر انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ البتہ سنانے لگے۔

”ایک مرتبہ ہمارا وفد ہندوستان کے دورے پر تھا۔ اس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے بہت سے شاعر اور ادیب شامل تھے۔ ایک رات ہم نے ایک پر نضا مقام پر قیام کیا جہاں جمیل کنارے محفل منعقد ہوئی۔ بہت سے لوگ پینے پلانے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اپنے لیے سنگتوں کا رس منگوا لیا۔ اتنے میں فیض صاحب نے مجھ سے شراب پینے پر اصرار کیا مگر میں نے شامی سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ ٹپکتے ہوئے آئے اور میرے گلاس میں شراب انڈیل دی۔ میں نے سارا گلاس جمیل میں انڈیل دیا۔ فیض صاحب وقتی طور پر ناراض سے ہو گئے۔

اسی طرح ایک روز صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے بھی کافی اصرار کیا بلکہ یہاں تک کہا کہ انھوں نے میرے لیے اعلیٰ دلائی ہوئی سنبھال رکھی ہے۔ انھوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ اس کی خبر کانوں کان کسی کو نہ ہوگی۔ میں نے بڑے احترام سے معذرت کی تو جزبہ ہوئے اور کہنے لگے کہ شراب میں کوئی ایسی بڑی بات نہیں جو اسے اتنا برا بنا دیا گیا ہے، ایک دفعہ آزما کر تو دیکھیں۔ میں نے گزارش کی کہ میں نے شراب پی کر بڑے معزز آدمیوں کو جو حرکتیں کرتے دیکھا ہے، اگر میں خود بھی کوئی ایسی حرکت کر بیٹھا تو ساری زندگی نامور ہوں گا۔ اس پر صوفی صاحب

اپنی ہو کر چھپ گئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ چند روز بعد مجھے ملے تو بے اختیار بولے۔ ”آپ کے حصے کی شراب ذرا اٹھادیں ماری پی گئے۔“ اس میں نے فکرا دیا کہ ایک آزمائش سے میری جان چھوٹی۔“

ایک دفعہ فراز صاحب بیٹھے تھے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر شراب پیا مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ”قاسمی صاحب کو ایک مرتبہ گردوں میں پھری ہوئی تو میں نے مشورہ دیا کہ پانچ بجے ہو گئیں بیڑ کی پالیس، پیشاب میں نکل جائے گی۔“ یہ سن کر کسی سودے میں قاسمی صاحب نے چونک کر لاجل و لا چہمی۔ فراز صاحب کا قبضہ بلند ہوا۔

ایک سہ پہر میں اُن کے دفتر میں پاس بیٹھا تھا کہ انگلستان سے ساقی فاروقی کا فون آگیا۔ بہت ہم دردی سے اُن کی باتیں سننے رہے۔ فون بند ہوا تو تاسف اور محبت سے کہنے لگے۔ ”بے چارے ساقی صاحب بہت دل گرفتہ تھے۔ کہتے تھے کہ آخری سانس ہیں، جلدی سے میرے اوپر چند سطریں تھپیٹ ڈالے۔“ یہ کہہ کر انفسوس میں سر ہلاتے رہے۔ کسی نے قلم دیا کہ بے چارے ساقی کو تو شراب خانہ خراب لے بیٹھی۔ اس پر جلدی سے بولے۔ ”نہیں نہیں، اب تو کہتے ہیں کہ چھوڑ دی ہے۔“ پھر گویا کچھ یاد کر کے زیر لب مسکرا دیے اور بولے ”ساقی صاحب کی خواہش ہوتی ہے کہ رسالے میں انھیں سب سے پہلے شائع کیا جائے جب کہ میں ہمیشہ فراز کو شائع کرتا ہوں۔ اس پر ساقی ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں برطانیہ میں ان سے ملا تو پوچھ بیٹھے کہ میں کس کے ساتھ آیا ہوں۔ میں نے فراز کا نام لے دیا۔ بس پھر کیا تھا، گویا بھڑوں کے چھتے کو ہاتھ لگا دیا۔ وہ برا بھلا کہا کہ خدا کی پناہ۔ اتنے میں فراز کمرے میں داخل ہوئے۔ اُن کو دیکھ کر گویا ساقی صاحب کی دنیا ہی بدل گئی۔ آگے بڑھ کر اتنی گرم جوشی سے فراز کے گلے لگ گئے گویا مدتوں کے پھڑپھڑے محبوب ترین دوست ہوں۔“ یہاں پہنچ کر قاسمی صاحب کے بد بار چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ آگئی اور بولے۔ ”بھلا یہ شراب بھی آدمی سے کیا کچھ کراتی ہے۔“

فیض صاحب پر لکھے ان کے ایک خاکے کا کافی چرچا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس خاکے میں قاسمی صاحب کو فیض صاحب کی بڑی خامیوں سے صرف نظر کرنا چاہیے تھا۔ جب اس بارے میں اُن سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ فیض ان کے ہم عصر، در دوست تھے۔ جہاں دوستوں میں اشتراک رائے ہوتا ہے، وہیں نظریاتی اور ذاتی اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ یوں بھی ان سے ایک پرستار کی جانب سے لکھی گئی تحریکی توقع رکھنا بے جا ہے۔ یہ ایک ہم عصر کی تحریر تھی۔ اس کے بعد انھوں نے منصورہ احمد کی موجودگی میں فیض صاحب کے کلام کی بے پناہ تعریف کی اور نہ صرف ان کے کلام میں سے مثنیٰ کے طور پر چند اشعار سخن میں گنگنائے بلکہ خاکے کے دو تین واقعات کا ضمیمہ حوالہ دیا جو ان کی باہمی بے تکلفی کے مظہر تھے۔

ایک قصہ مشہور ماہر موسیقی رفیق غزنوی صاحب کا ہے۔ غزنوی صاحب کراچی میں مقیم تھے۔ وہ قاسمی صاحب اور فیض صاحب کو اپنے دل لے گئے اور سامنے بیٹھ رکھ دی۔ جب فیض صاحب نے مطلع کیا کہ قاسمی صاحب اہتمام کرتے ہیں تو غزنوی صاحب نے حیرت سے پوچھا کہ کیا وہ بیڑ ایسی غیر نشہ آور چیز بھی نہیں پیتے۔ وہ تو گئے کے دس سی بے اثر شے ہے۔ اس پر قاسمی صاحب نے کہا کہ ان کے اور غزنوی صاحب کے عزیز دوست معاویہ حسن منٹو نے بیڑ کے حوالے سے غزنوی صاحب کے متعلق کچھ اور ہی کہا ہے۔

رفیق غزنوی صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”کیا بکواس کی تھی اس کشمیری نے؟“

قاسمی صاحب نے انکشاف کیا کہ منٹو کہتے تھے، رفیق غزنوی کا سامنہبوط جتنے کا آدمی بیڑ کی دو بوتلیں پی کر لڑھک جاتا ہے اور اس سے ایک خاص لفظ ٹھیک سے نہیں بولا جاتا۔

غزنوی یہ سن کر ہنس پڑے اور کہا کہ منٹو بہت فضول بک بک کرتا ہے اور پوچھا کہ ویسے اُس نے کون سا لفظ بتایا تھا۔ اب تک وہ دو بوتلیں پی چکے تھے، سو فیض صاحب نے قاسمی صاحب کے کان میں کہا کہ جناب نے دو بوتلیں نوش فرمائی ہیں اس

لیے وہ لفظ بتا دیتے ہیں۔ غزنوی بھی منتظر تھے۔ چنانچہ قاسمی صاحب بولے۔ ”لمبکتو“

رفیق غزنوی مسکرائے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے۔ ”مکلمو“

اس پر قاسمی اور فیض صاحب کھٹکھٹا کر ہنس پڑے اور اصرار کیا۔ ”غزنوی صاحب بولے لمبکتو“

غزنوی صاحب اعتماد سے بولے۔ ”مکلمو..... مکلمو“ میں کہہ تو رہا تھا کہ منٹو شرارتی تھا، مگر اس کرتا تھا۔ مکلمو“

اسی طرح ایک مرتبہ فیض صاحب اپنی گاڑی میں قاسمی صاحب کے ہم راہ معروف مصور عبدالرحمان چغتائی کے ہاں جا رہے تھے۔ نسبت روڈ سے گزرے تو انھیں سڑک کنارے ”قاسمی پریس“ کا بڑا سا بورڈ دکھائی دیا۔ یہ نہ جانے کس کا بورڈ تھا۔ فیض صاحب بورڈ کی جانب اشارہ کر کے مسکرائے اور بولے۔ ”آپ چپکے چپکے اتنا بڑا کاروبار چلا رہے ہیں؟“ اس پر دونوں ہنس پڑے۔ آگے میڈیہنٹال کے قریب ایک بورڈ دکھائی دیا جسے دیکھ کر قاسمی صاحب نے فیض صاحب سے کہا۔ ”فیض صاحب کاروبار تو آپ نے بھی خوب پھیلا رکھا ہے۔ وہ بورڈ دیکھیے۔“ بورڈ پر ”فیض میئر کنگ سیلون“ کے الفاظ درج تھے۔ فیض صاحب کا ہنسنے ہنسنے بڑا حال ہو گیا۔

فیض صاحب اپنی معصومانہ ڈرائیونگ کی وجہ سے بدنام تھے۔ ایک مرتبہ پاکستان ٹائمز کے دفتر کی جانب جا رہے تھے، ساتھ میں قاسمی صاحب بھی تھے۔ فیض صاحب نے ایک مقام پر گاڑی کا گیر بدلا، ٹھیک اسی وقت قریب سے گزرنے والے ٹرک نے بھی گیر بدلا جس میں سے ٹھکر کی خوف ناک آواز آئی۔ فیض صاحب نے یہ سمجھا کہ آواز ان کی گاڑی سے آئی ہے، بولے۔ ”لو بھئی قصہ ختم ہو گیا، گیر ٹوٹ گیا ہے۔“

قاسمی صاحب نے انھیں بتایا کہ آواز ٹرک کے گیر کی تھی تو فیض صاحب کھسکا کر ہنس پڑے۔

قاسمی صاحب نے میرے سامنے کئی مرتبہ فیض صاحب کے اشعار سنائے اور ان کی تعریف کی۔

بلاشبہ میرے سامنے قاسمی صاحب نے ہمیشہ فیض صاحب کی تعریف کی لیکن ایک ان دیکھا تھا کہ بہر حال دونوں بزرگوں کے بیچ محسوس ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ منیر نیازی نے قاسمی صاحب کے بارے میں ایک سخت بیان دے دیا۔ ”احمد ندیم قاسمی اچھا شاعر کہنا نہیں جانتا، بھلا اچھا افسانہ کیا لکھے گا۔“ میری قاسمی صاحب سے اس موضوع پر بات ہوئی تو بولے۔ ”اگر کوئی مجھ سے اس بارے میں پوچھے تو میں صرف اتنا کہوں گا۔ بے چارہ منیر نیازی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ منیر نیازی میرے اتنا خلاف کیوں ہو گیا ہے۔ حالانکہ ایک وقت تھا کہ اس نے اپنی ایک کتاب کا دیباچہ تک مجھ سے لکھوایا تھا۔ بات یہاں تک رہتی تو سمجھا جاسکتا تھا کہ شاید سیاق و سباق سے ہٹ کر ہے، مگر اس نے تو احمد فراز کو بھی تنگ بند شاعر قرار دیا ہے۔“

کچھ دیر توقف کر کے بولے۔ ”ایک مرتبہ منیر نیازی نے کراچی میں ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ کراچی میں کوئی بھی اچھا شاعر نہیں جس پر کافی ہنگامہ ہوا۔ بعد میں مجھ سے بھی یہ سوال کیا گیا تو نہ صرف میں نے اس بات کی تردید کی بلکہ بہت سے شاعروں کے نام بھی لیے جو فی الواقع اچھے شاعر ہیں۔ منیر نیازی کی باتیں وہ خود ہی سمجھ سکتا ہے۔“

آخری عمر میں قاسمی صاحب پر ان کی منہ بولی بیٹی اور باصلاحیت شاعرہ منصورہ احمد کی تیز طبیعت اور صاف گوئی کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ منصورہ کی کسی بات سے متاثر ہو کر وہ اپنی رائے قائم کر لیتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے ایک تذکرہ میری پسندیدہ فلموں میں سے ایک ایرانی فلم ”The Hidden Half“ یعنی ”پنہاں نصف“ کا۔ یہ بین الاقوامی پذیرائی حاصل کرنے والا شاہ کار انسانی نفسیات اور زندگی کی مختلف جہتوں پر لطیف انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ یہ ایک جج اور اس کی بیوی کی کہانی ہے۔ جج ایک دور افتادہ ہستی میں ایک خاتون کو سزا

سنانے جا رہا ہے۔ وہاں اُس کا جانا فقط رکھی ہے کہ سزا کا فیصلہ مروجہ قانون کے مطابق ہو چکا ہے۔ جب بیج طویل سفر کے بعد اُس شہر پہنچتا ہے اور سرے میں جا کر آرام کی غرض سے اپنا سامان کھولتا ہے تو اس میں سے ایک خط نکلتا ہے۔ یہ خط اُس کی بیوی نے سامان میں رکھا ہے۔ یہاں کہانی ایک چونکا دینے والا موڑ لیتی ہے۔ خط میں بیوی نے اپنے اوائل جوانی کی کہانی بیان کی ہے۔ وہ اس وقت اٹھارہ برس کی تھی اور شہر ان یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ تعلیم کے دوران وہ سیاست میں دل چسپی لینے لگتی ہے اور ایک انقلابی کینڈسٹ گروپ میں شامل ہو جاتی ہے جہاں اُس کی ملاقات ایک رسالے کے مدیر اور دانش ور سے ہو جاتی ہے۔ دانش ور کی پروکار شخصیت سے متاثر ہو کر وہ اُس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ دانش ور بھی طالبہ کے معصومانہ اور بے غرض جذبے سے متاثر ہوتا ہے اور وہ دونوں قریب آ جاتے ہیں۔ اس دوران اسلامی انقلاب آ چکا ہے اور اس نوعیت کی انقلابی کارروائیاں قائل گرفت ہیں۔ دانش ور اور طالبہ کے درمیان محبت پر وان چڑھ رہی ہوتی ہے کہ بیج میں دانش ور کی بیوی آ جاتی ہے جو طالبہ سے معاندانہ رویہ اختیار کر کے اُسے نہ صرف یہ بتاتی ہے کہ دانش ور شادی شدہ ہے بلکہ ایک بیٹے کا باپ بھی ہے۔ یہ انکشاف طالبہ کے لیے دھچکے کا باعث بنتا ہے اور وہ تعلق قطع کر لیتی ہے۔ اس کے بعد طالبہ کی شادی بیج سے ہو جاتی ہے اور ان کے ہاں خوش گوار ازدواجی زندگی کے دوران ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ بیوی مکتوب میں اپنے شوہر کو لکھتی ہے کہ میاں بیوی کے سے قریبی رشتے میں بھی وہ ایک زندگی ہم راہ گزار کر ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے، جیسا کہ بیج اپنی بیوی کی زندگی کے انتہائی اہم مخنی گوشے اور دوسرے رخ سے نا آشنا تھا، اس طرح یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اُس ملزمہ سے انصاف کر پائے جب کہ وہ ملزمہ کے موقف سے آگاہ نہیں۔ یہ پڑھ کر بیج سوچ میں گم ہو جاتا ہے۔ فلم کے آخری سین میں ملزمہ کو بیج کے سامنے لایا جاتا ہے۔ ملزمہ سزا کے لیے تیار ہے۔ لیکن بیج خلاف روایت ملزمہ کو سامنے بیٹھنے کا حکم دے کر کہتا ہے کہ وہ اس معاملے کا دوسرا رخ دیکھنا چاہتا ہے یعنی ملزمہ کا موقف سننا چاہتا ہے۔ ملزمہ کو حوصلہ ملتا ہے اور وہ بولنا شروع کرتی ہے اور فلم اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

یہ فلم زندگی کے دوسرے رخ اور پوشیدہ پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

منصورہ نے اسی کی دہائی کے اوائل میں مجلس میں ملازمت اختیار کی اور جلد ہی قاسمی صاحب کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی جس کی وجہ سے اُس کی طبیعت میں کچھ اترا ہٹ اور تلخی آ گئی۔ اگر یہ حد اعتدال میں رہتی تو مناسب تھا لیکن اس کے باعث قاسمی صاحب کے احباب کو کچھ شکایات بھی پیدا ہوئیں۔ اس رویے کی وجہ سے اختر حسین عسکری جیسا باکمال شاعر اور صبح دار شخص ایک مرتبہ دفتر میں پھٹ پڑا تو پروین شاکر چشم برآب باہر نکلیں اور عطاء الحق قاسمی تو منصورہ سے مستقل ناراض ہو گئے۔ فن کار تو حساس ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب کی شخصیت کے قرب نے اُسے دیگر ادبا کے ساتھ رعایت لینے پر آمادہ کر دیا اور مزاج میں کڑوے ہاداموں کی سی تلخی شامل ہو گئی۔ ایسے میں یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ وہ حد اعتدال عبور کر جاتی۔

اس معاملے کا ایک اور رخ بھی تھا، دوسرا رخ۔

میرے سامنے قاسمی صاحب نے چند ایک مرتبہ کہا۔ ”آج اگر میں زندہ ہوں تو بیٹی منصورہ کی وجہ سے۔“ یہ سن کر منصورہ آب دیدہ ہو جاتی۔ اور میں قاسمی صاحب کی آنکھوں میں ہم دردی کے ایسے دیے روشن ہوتے دیکھتا جو صرف ایک شفیق باپ کی آنکھوں میں روشنی دے سکتے ہیں۔

منصورہ قاسمی صاحب کے ہم راہ صبح دفتر آتی، اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے روٹی نرم کرتی، سیب کی قاشیں کاٹ کر رکھتی اور ان کے آرام کا خیال کرتی۔ منصورہ کا کہنا تھا کہ اُس نے قاسمی صاحب سے دودھائی سے بڑھ کر تعلق میں لوگوں کو انھیں کامیابی کے لیے استعمال کرنے اور پھر ان کی غیبت کرتے سنا ہے۔ اُس کا کہنا تھا کہ لوگ آتے ہیں اور اس بڑھاپے میں قاسمی صاحب کے لیے ہم دردی کے دو بول بولی کر چلے جاتے ہیں۔ ”ساتھ کوئی نہیں بھاتا جب کہ میں بابا کی دل و جان سے خدمت کرتی ہوں۔“ اس کے علاوہ منصورہ کا کہنا تھا کہ اُس



نے ایسے بزرگوں کو اپنے ساتھ فلرٹ کی کوشش کرنے آزمایا ہے کہ اس کا بالعموم ادیبوں اور بالخصوص مردوں پر اعتبار اٹھ گیا ہے۔ قاسمی صاحب کی خواہش تھی کہ منصورہ کسی مناسب شخص سے بندھن میں بندہ جائے۔ اس کا اظہار انھوں نے مجھ سے بھی کیا۔ چند رشتے آئے بھی مگر جوڑنا مناسب تھے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنا ایک افسانہ قاسمی صاحب کو رائے کے لیے پیش کیا۔ موضوع خاصا بے باک تھا اور الفاظ کی حد تک تیز تھے۔ آج جب میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو اپنی حماقت پر شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ خیر اگلی ملاقات میں میں نے اس پر قاسمی صاحب ان کی رائے کی درخواست کی تو انھوں نے مقفل دروازہ چابی سے کھولی اور نیچے کاغذات کے بندل سے نکال کر افسانہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خوف تھا کہ کہیں منصورہ کی اس پر نظر نہ پڑ جائے۔“

اس قصے کا ایک تیسرا پہلو بھی تھا۔ منصورہ کی قاسمی صاحب سے محبت نے اس میں جذبہ ملکیت پیدا کر دیا جس سے قاسمی صاحب کی حقیقی اولاد متاثر ہوئی اور اس کے اور منصورہ کے بیچ برفانی دیوار کچھ ایسی کھڑی ہوئی کہ بات قاسمی صاحب کے وصال کے بعد ”فنون“ کے حق ملکیت تک چلی گئی۔

طویل العمری کے آخری سرے پر قریب آنے والا شخص بعض اوقات بزرگ کے فیصلوں اور تعلقات پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے اور ایسا ہی منصورہ کا قاسمی صاحب پر اثر ہوا۔ یہ جاں کاہ حقیقت بھی قابل توجہ ہے کہ قاسمی صاحب کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد منصورہ جو تنہا رہ گئی تھی، جوانی میں خالق حقیقی سے جا ملی۔ اس دوران میری جب بھی اس سے ملاقات ہوئی، میں نے دل جوئی کی اپنی سی کوشش کی لیکن اس پر اداسی مستقل سایہ لگن رہی، وہ روز بہ روز بیمار ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ایک روز موت کے اندھے کنویں میں اتر گئی۔

قاسمی صاحب کی شخصیت کے چند دل چسپ اور متاثر کن پہلوؤں کے تذکروں کے بغیر ان کا تذکرہ تشنہ رہے گا۔ شاعر اور دانش ور افتخار بخاری صاحب نے ایک مرتبہ مجھے بتایا۔ ”جب میں نے نظم ”چودھویں صدی کی آخری نظم“ قاسمی صاحب کو اشاعت کے لیے بھیجی تو وہ فوراً چھپ گئی۔ اس بات نے مجھے بہت متاثر کیا کہ بغیر کسی تعارف اور نام کے میری تخلیق کو قاسمی صاحب نے ”فنون“ میں نمایاں جگہ دی چنانچہ جب میں لاہور گیا تو قاسمی صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔“

”دفتر میں داخل ہوتے وقت میں قاسمی صاحب کے ادبی مقام کی عظمت اور دانش ورانہ شوکت کے رعب تلے دبایا ہوا تھا، یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سامنے ایک بہت شفیق اور مسکراتا، منکسر شخص بیٹھا تھا جو میرے تعارف کر دینے پر نہ صرف مجھے پہچان گیا بلکہ بہت تپاک سے ملا اور بولا۔ ”آپ کی تخلیق کی پختگی دیکھ کر میں آپ کو بڑی عمر کا شخص سمجھ بیٹھا تھا، آپ تو ابھی بالکل جوان اور تروتازہ ہیں۔“

ان کی اس حوصلہ افزائی نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ یہ میرے تخلیقی سفر کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔

اسی طرح آصف فرخی صاحب نے ایک مرتبہ تذکرہ کیا کہ جب انھوں نے اپنا ایک افسانہ قاسمی صاحب کو بھیجا تو فوراً چھپ گیا۔ جب آصف صاحب کی قاسمی صاحب سے ملاقات ہوئی تو قاسمی صاحب نے نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی کی بلکہ دہرایا۔ ”میں تو آپ کو خاصی بڑی عمر کا آدمی سمجھ بیٹھا تھا۔“

نو جوانوں کی حوصلہ افزائی کا قاسمی صاحب کا یہ اپنا انداز تھا۔ انھوں نے بہت سے ایسے لوگوں کی کتابوں کے غلطی بھی لکھے جو چند معترضین کی نظر میں اس کے اہل نہ تھے۔ قاسمی صاحب اس پر اظہار رائے کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے۔ ”مجھے جس میں ذرہ برابر بھی خوبی نظر آتی ہے میں اس کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتا ہوں۔ عین ممکن ہے ان میں کوئی باصلاحیت ہو جو میری زبان، ادب اور میرے وطن کے لیے بار آور ثابت ہو۔“

ایک روز میرے مربی اور صف اول کے ادیبوں کے معروف پبلشرنگ میل کے مالک الحال احمد مسکراتے ہوئے مجھے سے کہنے لگے۔ ”عرفان بھائی، میں نام و را اور بڑے ادیبوں کے حوالے سے ایک نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان میں سے بیشتر کے لیے انجیادات سے متقدم اور کچھ نہیں ہوتا، یہ خواہش مند ہوتے ہیں کہ نوواردان ادب ان کی کامرہ لکھی کریں۔“ میں نے اختلاف کرتے ہوئے چند ایک نام لیے جن میں سرپرست قاسمی صاحب کا نام تھا۔ اُن کا نام سن کر افضال صاحب نے توتف کیا اور بولے۔ ”قاسمی صاحب کا تو تذکرہ ہی کیا، ایسے بڑے لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ادیبوں کی ٹیلیس سنواریں اور اپنے لگائے پودے دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔“

دو تین بار میں نے قاسمی صاحب کے سامنے کچھ ایک ایسی جساتیں کیں جن پر کوئی اور شاید سٹخ پا ہو جاتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے نہ جانے کس وقتی رد کے تحت شاعری پر بات کرتے ہوئے اُن سے کہہ دیا۔

”میں شاعری کی رموز میں بالکل کورا ہوں لیکن اقبال کے ہاں جو شوکت، راشد کے ہاں خیال، فیض کے ہاں غنائیت، فراز کے ہاں رومانوی گداز، ناصر کے ہاں اُرداسی نظر آتی ہے وہی کوئی نمایاں پہچان آپ کی شاعری کی نہیں، اس میں تخلیق مہارت تو ہے مگر غنائیت اور روح کو چھو جانے اور سرشار کرنے والی شعریت نہیں۔“

یہ سن کر قاسمی صاحب خاموش ہو گئے۔ منصورہ قریب سے بولیں۔ ”بابا کے ہاں گہری گہرائی اور خیال کی جوندہ ہے وہ ان کے ہم عصروں میں نایاب ہے۔“

قاسمی صاحب نے منصورہ کو ٹوکا۔ ”بیٹی، عرفان صاحب کو رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے۔“

اسی طرح ایک مرتبہ میں نے ایک انسانہ بھیجا جس کا عنوان ”ابورشن“ تھا۔ جب اُن سے ملنے گیا تو افسانہ کمپوز ہوا رکھا تھا اور اُس کا عنوان ”ابارشن“ درج تھا۔ درج شدہ عنوان دیکھ کر میں نے گزارش کی کہ یہ انگریزی کی ترکیب ہے اور اس میں ”الف“ کی جگہ ”و“ کا آنا زیادہ درست ہوگا۔ اتنا سننا تھا کہ قریب میں بیٹھے ایک ادیب نے تجنی سے مجھے ٹوک دیا۔ ”کیا اب آپ ہمیں سکھائیں گے۔“

یہ سن کر قاسمی صاحب نے مسودہ اٹھایا اور سرخ قلم سے ”ابارشن“ کاٹ کر دوبارہ ”ابورشن“ لکھ دیا اور بولے۔ ”یہ انگریزی اچھی طرح جانتے ہیں، اس لیے درست فرما رہے ہوں گے۔“

کسی نے لکھا کہ اُس نے ٹی وی پر ایک پاپ گلوکار کو اپنا سیز ٹھونک ٹھونک کر کہتے سنا۔ ”ہاں میں عظیم ہوں۔“ تو اُسے اُستاد بڑے سلامت علی خان یاد آ گئے۔ استاد فن کی معراج پر تھے کہ کوئی ان کی تعریف کرتا تو انکسار سے سٹ کر شرما جاتے اور فرماتے۔ ”میری کیا اوقات ہے۔“

جب معاشرے کو تباہ قامت ہو جائیں تو بونے قد آور ہو جاتے ہیں اور زندہ معاشرے تو کھڑے ہی قد آور لیکن عظیم اور منکسر لوگوں کے کندھوں پر ہوتے ہیں۔

دے کی بیماری کے باعث چند ایک مرتبہ اسپتال میں داخل ہونا پڑا لیکن قاسمی صاحب کے مزاج کی شکستگی میں کوئی فرق نہ پڑا۔ کبھی کسی اہم موقع نکتے پر بحث کے دوران سنجیدہ ہو جاتے لیکن عموماً اُن کی کوشش ہوتی کہ محفل کا ماحول مختلف رکھیں۔ ایسے میں شہ مزاج کی پھوار برستی رہتی۔

ایک مرتبہ کہنے لگے۔ ”ایک صاحب بہت دور سے ملنے آئے، میں اُن کے جذبے سے بہت متاثر ہوا اور اُن کی خوب مدارات کی۔ کچھ دیر بعد مہمان نے گھڑی دیکھی اور بولے۔ ”میں شورش سے ملنے آیا تھا، وہ تھے نہیں، سوچا کہ اُن کے بھانے آپ سے بھی ملتا چلوں۔ اب تک وہ آگئے ہوں گے۔ سو اجازت چاہتا ہوں۔“ یہ سننا تھا کہ میری خوش فہمی ہوا ہو گئی۔“

بیماری کی وجہ سے نفاہت ہو جاتی، تقریبات میں شرکت سے گریز کرنے لگے۔ ایک مرتبہ فون آیا۔ دوسری جانب سے کوئی تقریب میں شرکت کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ یک دم قاسمی صاحب کی آواز میں کم زوری ڈرائی اور کھانسنے ہوئے عاجزی سے معذرت کی اور بتایا کہ کس طرح ان کی صحت ٹھیک نہیں۔ کچھ دیر ادھر سے سنتے رہے اور پھر بولے۔ ”بس دعا کیجیے۔“ جب فون بند کیا تو چہرے پر بے بسی لٹائی اور کھٹکتی آواز میں شرارت سے مسکراتے ہوئے بولے۔ ”دیکھا کس طرح بنایا ہے۔“

آخر میں کچھ اونچا سننے لگے تھے آگے سماعت کا سہارا لیتے۔ ایک روز کہنے لگے۔ ”اس اونچا سننے نے مجھے بہت شرمندہ کیا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک صاحب میاں والی سے آئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ ”ہو رہا ہے، کیہ حال اے اس پر میں نے انھیں آہستہ بولنے کا اشارہ کیا اور مسکرا کر پوچھا، جناب کیا قیامت آگئی ہے؟ میرے اونچا سننے کی بدنامی کہاں تک جا پہنچی ہے۔“

ایک شام مجلس ترقی ادب میں محترمہ نایلم احمد بشیر اور پروین عاطف سے ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ احمد بشیر صاحب بیمار ہیں۔ پروین عاطف صاحبہ بہت دکھ سے بتانے لگیں کہ حالت بہت بگڑ چکی ہے، کافی لوگ ملنے آرہے ہیں۔ پھر اضافہ کیا کہ کیہ وزم سے اس شدت سے لگاؤ ہے کہ کمرے میں اب تک مارکس وغیرہ کی تصاویر بھی ہوئی ہیں۔ البتہ ان کا بیٹا امریکا جا کر کافی صاحب ثروت ہو چکا ہے اور اپنے بچوں کو بتاتا رہتا ہے کہ مارکس اور لینن وغیرہ بد معاش اور قاتل تھے۔ باپ اور بیٹے میں عجیب تضاد ہے۔ ایک پکا کیونسٹ اور دوسرا کپیتلسٹ۔ پروین صاحبہ نے بات مکمل کی تو قاسمی صاحب نے زیر غور مسودے سے سر اٹھایا اور بولے۔ ”احمد بشیر صاحب کیسے ہیں؟“ یہ سن کر سب مسکرا پڑے۔ گویا انھوں نے اب تک کی کوئی بات نہ سنی تھی۔ حاضرین محفل میں سے کسی نے بتایا کہ خللی سماعت کے شکار مخاطب سے جب تک اس کی جانب چہرہ کر کے اور نام لے کر بات نہ کی جائے تو مخاطب متوجہ نہیں ہوتا۔

فون پر بہت مختصر اور مطلب کی بات کرتے۔ بعض اوقات مخاطب کو غلط فہمی ہوتی کہ شاید اس سے ناراض ہو کر فون رکھ دیا ہے لیکن شناسا اس عادت سے واقف تھے۔

ایک مرتبہ دراز کی عمر کی بات چل رہی تھی تو معصومیت سے بولے۔ ”میری عمر اتنی ہو گئی ہے کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ اب تک زندہ ہوں۔“

میری آنکھیں بھر آئیں۔

ملکی حالات اور عدم برداشت کے بڑھتے رجحان پر دکھی ہو جاتے۔ جیو اور جینے دو کے اصول پر یقین رکھتے۔ ایک دو پہر رمضان میں روزے کے دوران ان کے دفتر میں داخل ہوا تو چند ادیب بیٹھے چائے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک صاحب بولے۔ ”بھئی ہمارے مسلک میں چائے اور سگریٹ سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ہم سب الحمد للہ روزے سے ہیں۔“ یہ سن کر قاسمی صاحب مسکرا دیے اور بات کا سرا و ہیں سے پکڑ لیا جہاں سے چھوڑا تھا۔

ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے کہ جانے کیا ماجرا ہوا ہے کہ تقسیم کے بعد سے لوگوں میں نظریاتی، مسلکی اور سیاسی برداشت ٹھنسی ہی جا رہی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا قیام پاکستان سے قبل باہمی تعلقات میں مذہبی رجحان حائل ہوتا تھا تو نفی میں سر ہلا دیا اور بولے۔ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اکاؤنٹ انفرادی واقعات سے ہٹ کر کبھی کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ کون ہندو، سکھ یا مسلمان ہے۔ پھر کرشن چندر اور بیدی سے اپنے تعلق کی مثال دی جس میں کبھی کسی کو خیال بھی نہ آیا تھا کہ کون کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق میں سب افسانہ پڑھتے، اس پر بحث ہوتی، اختلاف رائے بھی ہوتا لیکن بعد ازاں سب اکٹھے ہوتے اور کسی کے دل میں ذرہ برابر کدورت نہ ہوتی۔“

قاسمی صاحب ایک چھوٹی سی گاڑی میں دفتر آتے، لباس نفیس اور صاف ستھرا لیکن سادہ عموماً شلوار قمیص اور واسکٹ پر مشتمل ہوتا،

لاہور کی ایک متوسط آبادی کے چھوٹے سے گھر میں رہتے، روزگار کا انحصار شرمناک حد تک محدود و تنگوار ہوتا ہوا، کالم اور ناول کی آمدنی سلسلے میں وہاں کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی۔ خودداری کا یہ عالم کہ کبھی تکتہ و مسائل کا شکوہ نہ کرتے دیکھا گیا۔ سرمایہ انحصار لین کار، ہائے ادب کو علم کی مزدوری میں صبح سے شام کرنا پڑتے۔

ساتھ کی دہائی سے آخر عمر تک بے پناہ ٹیلنٹ کو بنانے، سنوارنے، راہ نمائی کرنے اور متعارف کروانے میں قاسمی صاحب کا کردار مثالی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر یقیناً اُن سے بڑے، بلکہ بہت بڑے نام اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک معاملہ جس میں انھیں انفرادیت حاصل رہی وہ نئے تخلیقی کاروں کی دریافت، حوصلہ افزائی، تربیت اور تعارف میں اپنی تمام تر مخلصانہ توجہ اور محنت کو بردے کار لاتے ہوئے نمایاں کرنے میں بلا مبالغہ بین الاقوامی سطح پر کوئی اُن کے قریب بھی نظر نہیں آتا۔ بیش تر اہم تخلیقی کاروں کے سوانح نظر دوڑائیے، کبھی دوحہ، لاشریک، کاوور کرتے اپنی ذات کے استھان پر سجدہ ریز نظر آتے ہیں، جب کہ ناول احمد ندیم آختر عریک کچی مٹی کے بارے بنا کر انھیں پکاتا اور چومتا رہا۔ وہ یقیناً دیو مالائی پارس کے پتھر کے مانند تھ، وہی افسانوی پتھر جو جس دھات سے بھی چھو جائے اُسے سونے میں ڈھال دے۔

تخلیقی کاروں کی راہ نمائی کے سوا تخلیقی فعالیت کا یہ عالم کہ شاعری، افسانہ، خاکہ، کالم نگاری، مضامین اور تنقید پر مشتمل درجنوں (پچاس سے اوپر) کتابیں تصنیف کیں۔

اُن کی تحریروں میں مون سون کی بارشوں کی ریم جھم، تازہ کٹے چارے کی کچی مہک، ارہٹ سے نکالے کنویں کے میٹھے ٹنڈے، شاد پانی کی تازگی، اُپلوں پہ پکتے پکوان کی اشتہا انگیز خوشبو اور تالاب میں اُترتی بھینسوں کی چھپاک تھلکتی ہے۔ ان میں جنگوں میں جتنی ندی کی سی روانی اور بانسری کی موسیقی کا سجادو ہے، خیال آرائی ہے، قادر الکلامی ہے، رنگ سازی ہے۔ یہ تحریریں آگ اُگلتے سورج کی طرح چندھیا دینے والی نہیں بلکہ پورن ماسی کے چاند کی طرح نرم اور ٹھنڈک بخشنے والی ہیں۔ بالکل احمد ندیم قاسمی کی طرح۔

کچے ذہن کچی مٹی کی طرح ہوتے ہیں جن پر اوائل عمر کے نقوش گوتم بدھ کے قدموں کے نشانوں کی طرح پکے اور دیر پا ہوتے ہیں، شاید اسی لیے، بچپن میں پڑھی درسی کتابوں میں درج حکایات اور کہانیاں ساری زندگی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بعد ازاں بیش تر لوگ اُن ادیبوں کا عکس انھی تحریروں کے چاندی آئینوں میں دیکھتے ہیں۔

میں نے قاسمی صاحب کو اُن کی دیہی طرزِ حیات پر مشتمل افسانوں میں بعد میں دریافت کیا۔ ”رئیس خانہ“ بعد میں دیکھی، پہلی تحریر ”گھر سے گھر تک“ پڑھی جو متوسط شہری گھرانے کی عکاسی کرتی ہے۔ اُن کی تحریروں کی سلاست، روانی، گفتگویی، شائستگی اور سادگی مجھے بہت ہرکش لگی۔

اُن کے سترہ افسانوی، آٹھ شعری، تین تحقیقی و تنقیدی مجموعوں کے علاوہ درجنوں کتابیں بچوں کے ادب، اخباری کالموں، تراجم، مضامین، ڈراموں، خاکوں اور یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔

یوں 1916ء میں انگلہ میں جنم لینے، وادی سون سیکس میں ابتدائی زندگی گزارنے، معمولی سرکاری ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز اور بعد اکتا کر اُس سے قطع تعلق کرنے والے دیہاتی لڑکے کو ”بابائے ادب“ بنا تھا، یہ صحیفہ ”ادب“ میں لکھ دیا گیا تھا۔

تین تاریخیں ہیں اور ان تاریخوں کا زنگھ داس سے کوئی تعلق نہیں۔

سُن ہے دو ہزار چھ عیسوی اور تاریخ جولائی کی چھ۔

میرا ہور کافی دنوں کے بعد جانا ہوا تھا۔ پہلے ہر آٹھ دس دن بعد قاسمی صاحب سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ کراچی جانے کے بعد



لیے وقفے آنے لگے تھے۔ اُس روز معروفیات کو کچھ یوں ترتیب دیا کہ آغاز قاسمی صاحب سے ملاقات سے رکھا تھا۔ سو جب اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو حسب معمول وہ کوئی مسودہ پڑھنے میں مشغول تھے۔ وقت کمرے میں تقیم چکا تھا۔ کرا دیا ہی تھا اور کھڑکی سے آتی سورج کی کرنیں اور پردوں کی چمکار کی برم جھم دیتی تھی۔ البتہ قاسمی صاحب مزید کم زور نظر آئے۔ مجھے دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ کی روشنی طلوع ہوگئی اور گرم جوشی سے اُٹھنے کو تھے کہ میں نے اُن کا ہاتھ اپنے دلوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”کیسے ہیں“ انھوں نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

لہجے میں خشکی درآئی۔ ”آپ تو لاتا ہوا ہو گئے۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ خیریت سے ہوں۔ فون کرنے کو تھا۔“ ہر چند روز بعد خیریت دریافت کرنے کے لیے ان کا فون آجایا کرتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا کہ میرے قیام کے شہر میں کوئی حادثہ ہوا تو خیریت دریافت کرنے کے لیے سب سے پہلے، میرے اہل خانہ سے بھی قبل ان کا فون آ جاتا۔ میں سیال کوٹ میں تھا کہ ایک دھماکا ہو گیا، اہل خانہ کے علاوہ سب سے پہلا فون اُن کا آیا۔ اسی طرح 2005ء کے زلزلے کے بعد اسلام آباد میں میری خیریت دریافت کرنے والے ابتدائی پرسان حال میں وہ شامل تھے۔ اس زلزلے سے وہ بہت رنجیدہ رہے۔ وہ اپنے رفقا، ”فنون“ کے معاونین اور دوستوں کے لیے ایسے ہی فکر مند رہے۔

میرے لہجے میں ندامت آگئی۔ ”سر کراچی چلا گیا ہوں اس لیے کوتاہی ہو جاتی ہے۔“

”کم از کم فون ہی کر لیا کریں، اس پر چند سیکنڈ کا فاصلہ ہے۔“

میں نے معذرت کی تھی۔

انھوں نے آصف فرخی صاحب کی خیریت دریافت کی اور مجھے ”سبل“ رسالہ تمہادیا تھا۔

”عہدہ رسالہ نکالا ہے فرخی صاحب نے۔“ انھوں نے کہا تھا۔

میں رسالے کی ورق گردانی کرتا رہا تھا۔

اُس دن کا ہر لمحہ میرے یادداشت پر کیسے نمایاں ہے، روز حشر کے نامہ اعمال کی طرح۔

ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو اُن سے بولے تھے۔

”میری شاعری اور نثر کے تمام مسودوں کے بارے میں میں نے فلاں صاحب کو کہہ دیا ہے، آپ وہ مسودے لیجے آئیے گا۔“

میں نے بات سچ سے اچک لی تھی۔

”سر، کیا آپ کا ان تمام مسودوں پر دوبارہ کام کرنے کا ارادہ ہے؟“

”کچھ کام کرنا ہے اُن پر۔ اس کے علاوہ تاثرات اور خاکوں پر مشتمل ایک کتاب پر بھی کام کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد مکمل ہو جائے گا۔“ سنجیدگی نے اُن کے چہرے پر بڑبڑم جال بننا شروع کر دیا تھا۔

میں نے کسی تازہ عہدہ تصنیف کا دریافت کیا تو انھوں نے مسودہ ملتی کے افسانے اور اسد محمد خاں کے افسانوں کی کتاب ”تیسرے

پہر کی کہانیاں“ مجھے عطا کیں اور کچھ کہنے کو تھے کہ ایک صاحب، غالباً شاعر سعد اللہ شاہ کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ قاسمی صاحب نے تپاک

سے اُن کی خیریت دریافت کی تھی۔ چند رسمی جملوں کے بعد انھوں نے اپنی ایک تازہ غزل قاسمی صاحب کو پیش کی۔ قاسمی صاحب نے اسے بغور

پڑھا، ایک آدھ لفظ بدلا، چند الفاظ کے بارے میں استفسار کیا اور مسودہ قریب میں پڑے بریف کیس میں رکھ لیا تھا۔

اب تک دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ کھانا میز پر چن دیا گیا۔ قاقی صاحب میز کی اس جانب آگئے۔ اُن کے سامنے دو سادہ کباب پیٹ میں بجا دیے گئے۔ میں اجازت لے کر اٹھنے کو تھا کہ قاقی صاحب بھی اٹھے، میں نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ تھام لیے، اور باہر چلا آیا تھا۔

باہر مال دوڑ پڑ زندگی زور و شور سے دوہاں تھی۔

پیاز بختمی جروالی کی آٹھ اور سن دی۔

میں نے بھلس کے دفتر فون کیا تا کہ عاریتاً مکی کتاب میں لونا دوں۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ قاقی صاحب بیمار ہو گئے ہیں، اسپتال داخل کر دیا گیا ہے۔

میں روزمرہ کی طرح گھر سے نکلا، بھلس کے دفتر گیا، کتابیں ادا نہیں، اسپتال کا معلوم کیا، بتایا گیا شام تک لوٹ آئیں گے۔ سال با سال کے غلط میں وہ چند ایک مرحلہ پہلے بھی اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ اسپتال کا فون آلودہ ماحول مجھے دہشت زدہ کر رہا ہے۔ نہ ہانے اُس روز میں کیوں کر قاقی صاحب کی عمارت کرنے اسپتال چلا گیا تھا۔

وہ ابجائی نگہداشت دار امیں داخل تھے۔ میں اُن کے ہسٹریک ہا پہنچا۔ قریب میں اُن کے بر خور دار نعمان قاقی کھڑے تھے اور صدف ایم آر شاہ بیٹھے بہت مضمت سے قاقی صاحب کی ناگہم دہار ہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایم آر شاہ نے قاقی صاحب کی جانب اشارہ کیا تو صفائی نہیں لگا رہے تھے۔ "نعمان، وہ مانی آپ۔" میں نے سر ہلا دیا تھا۔ اسی ناگہم قاقی صاحب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انہوں نے ایم آر شاہ کو اشارے سے ناگہم دہارنے سے منع کیا، نعمان قاقی سے میری ہاب اشارہ کر کے چوکتے پڑے تھے۔

میں ان کے ہاتھوں کے نزدیک ہوتا ہوا، ٹھیک لچے میں پڑے تھے۔ "آپ کے بڑا دکھ میرے ہم سامنے میں رہتے تھے۔ ہم ماہوں کا ایک دوسرے پر حق ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ منظر لے گئے۔

مجھے ہاتھ، میں نے پتہ نہ ہو، بہت مال پہلے، بی بی علی عاتق میں کیا تھا۔

میں نے پیر و دوسری ہاب نہ لگا تھا، اسونہ بی بی بھگنوں سے بہہ لگے تھے۔ میں نے تڑا دار تہذیب سے کہا۔ "سر، میں آپ ہولی سے ٹھیک ہو جاؤں۔"

انہوں نے اُنات میں سر ہلا دیا، روت بہتی رہا، ہمیں مودنی تھیں۔ میں دیکھتے ہوئے باہر نکل آیا تھا۔

چوکنی کا بختمی تھی، کوئی کون سامنے ہاتھیں۔

دکھتے ہیں کہ جو نہیں بڑے کے صبیح کی دس جو بیسی کا دار گزار چٹا ہوا تھا۔

میں کراہی لوٹ آیا تھا، حصول کے کام میں مصروف تھا کہ جیل آ جا کہ قاقی صاحب کو فون کر کے خبریت در بالٹ کر لوں وہ اراضی نہ ہو جائیں۔

سوفن در برف۔ "مکی قاقی صاحب سے بات کرانی۔"

ایک لمحہ مردانہ آواز فون پر تھی۔ "وہاں صبح فوت ہو گئے ہیں۔ جتا، ہائی بی ہے۔"

چند لمحے کتابوں میں جڑے ہوئے ہیں، جن کی ہم سب جگانی کرتے رہتے ہیں۔

"آزمینوں کے لچے سے سر کی محسوس ہوئی۔" یہ جلد سے شمار مرتبہ چھ قافلاتیں دن فر پڑی ہو گیا۔

قاقی صاحب کہتے تھے کہ جب بٹنے کے لیے خوب دھمکتے ہیں۔

نیم روز گھر کرنی، مکی کیا تو کسی کی موت کی خبر تھی۔ بھینجا کرنی وہی بندہ کرو اور لیٹ گیا۔

اب تک دو پہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ گھانا میز پر بن دیا گیا۔ قاسمی صاحب بڑکی اس جانب آ گئے۔ اُن کے سامنے دو سادہ کباب پلیٹ میں سجادیے گئے۔ میں اجازت لے کر اٹھنے کو تھا کہ قاسمی صاحب بھی اٹھے، میں نے آگے بڑھ کر اُن کے اُتو قحام لیے اور باہر چلا آیا تھا۔

باہر مال روڈ پر زندگی زور و شور سے رواں دواں تھی۔  
یہ تاریخ تھی جولائی کی آٹھ اور سن وہی۔

میں نے مجلس کے دفتر فون کیا تاکہ عاریتاً مئی کتابیں لوٹا دوں۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ قاسمی صاحب بیمار ہو گئے ہیں، اسپتال داخل کر دیا گیا ہے۔

میں روزمرہ کی طرح گھر سے نکلا، مجلس کے دفتر گیا، کتابیں لوٹائیں، اسپتال کا معلوم کیا، بتایا گیا شام تک لوٹ آئیں گے۔  
سال ہاساں کے تعلق میں وہ چند ایک مرتبہ پہلے ہی اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ اسپتال کا خوں آلود ماحول مجھے دہشت زدہ کر دیتا ہے۔ نہ جانے اُس روز میں کیوں کر قاسمی صاحب کی عیادت کرنے اسپتال چلا گیا تھا۔

وہ انتہائی نگہداشت دار آدمی داخل تھے۔ میں اُن کے بستر تک جا پہنچا۔ قریب میں اُن کے برخوردار نعمان قاسمی کھڑے تھے اور معصوم ایم آر شاہد بیٹھے بہت عقیدت سے قاسمی صاحب کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایم آر شاہد نے قاسمی صاحب کی جانب اشارہ کیا تھا اور فقط تین لفظ بولے تھے۔ ”میرا روحانی باپ۔“ میں نے سر ہلادیا تھا۔ اسی اثنا میں قاسمی صاحب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انھوں نے ایم آر شاہد کو اشارے سے ٹانگیں دبانے سے منع کیا اور نعمان قاسمی سے میری جانب اشارہ کر کے کچھ بڑبڑائے تھے۔

میں اُن کے ہونٹوں کے نزدیک ہو گیا، وہ نحیف لہجے میں بولے تھے۔ ”آپ کے بزرگ میرے ہم سائے میں رہتے تھے۔ ہم سبوں کا ایک دوسرے پر حق ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرائے تھے۔

مجھے یاد تھا، میں نے یہ تذکرہ بہت سال پہلے، اپنی پہلی ملاقات میں کیا تھا۔

میں نے چہرہ دوسری جانب کر لیا تھا۔ آلسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ میں نے تڑو اور تذبذب سے کہا۔ ”سر، بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“

انھوں نے اثبات میں سر ہلایا، کروٹ بدلی ورا آنکھیں موند لی تھیں۔ میں دبے قدموں باہر نکل آیا تھا۔  
یہ کون سی تاریخ تھی اور کون سا سن یاد نہیں۔

لوگ بتاتے ہیں کہ جو لیس سینر کے مہینے کی دس اور عیسیٰ کا دو ہزار چھٹا برس تھا۔

میں کراچی لوٹ آیا تھا، معمول کے کام میں مصروف تھا کہ خیال آیا کہ قاسمی صاحب کوفن کر کے خیریت دریافت کر لوں وہ ناراض نہ ہو جائیں۔

سو فون ملا یا تھا۔ ”جی قاسمی صاحب سے بات کراؤ۔“

ایک گنہگار مردانہ آواز فون پر تھی۔ ”وہ آج صبح فوت ہو گئے ہیں۔ جنازہ پانچ بجے ہے۔“

چند جملے کتابوں میں پڑھتے ہیں، جن کی ہم سب جگالی کرتے رہتے ہیں۔

”زمین پیروں کے نیچے سے سرکتی محسوس ہوئی۔“ یہ جملہ بے شمار مرتبہ پڑھا تھا، اُس دن تجربہ بھی ہو گیا۔

قاسمی صاحب کہتے تھے کہ ادیب بننے کے لیے تجربے اچھے ہوتے ہیں۔

اُس روز گھر آ کرٹی وی آن کیا تو کسی کی موت کی خبر آ رہی تھی۔ بھنجا کرٹی وی بند کر دیا اور لیٹ گیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے، کیوں ہو جاتا ہے۔

سنا ہے کہ اُس روز اُردو کے ادبی حلقوں میں کھرام برپا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس روز ایک آدمی اٹھ گیا تھا۔ خواب تھا یا حقیقت تھا، آدمیت کا افتخار یا مشقتِ غبار کچھ معلوم نہیں۔ کہ معلوم اور نامعلوم کے بیچ ایک لطیف حد ہوتی ہے، پس اُس روز ایک آدمی سلطنتِ خداوند کے عالمِ اجسام سے خاموشی سے اٹھا اور چلا گیا۔ وہ ایک آدمی.....

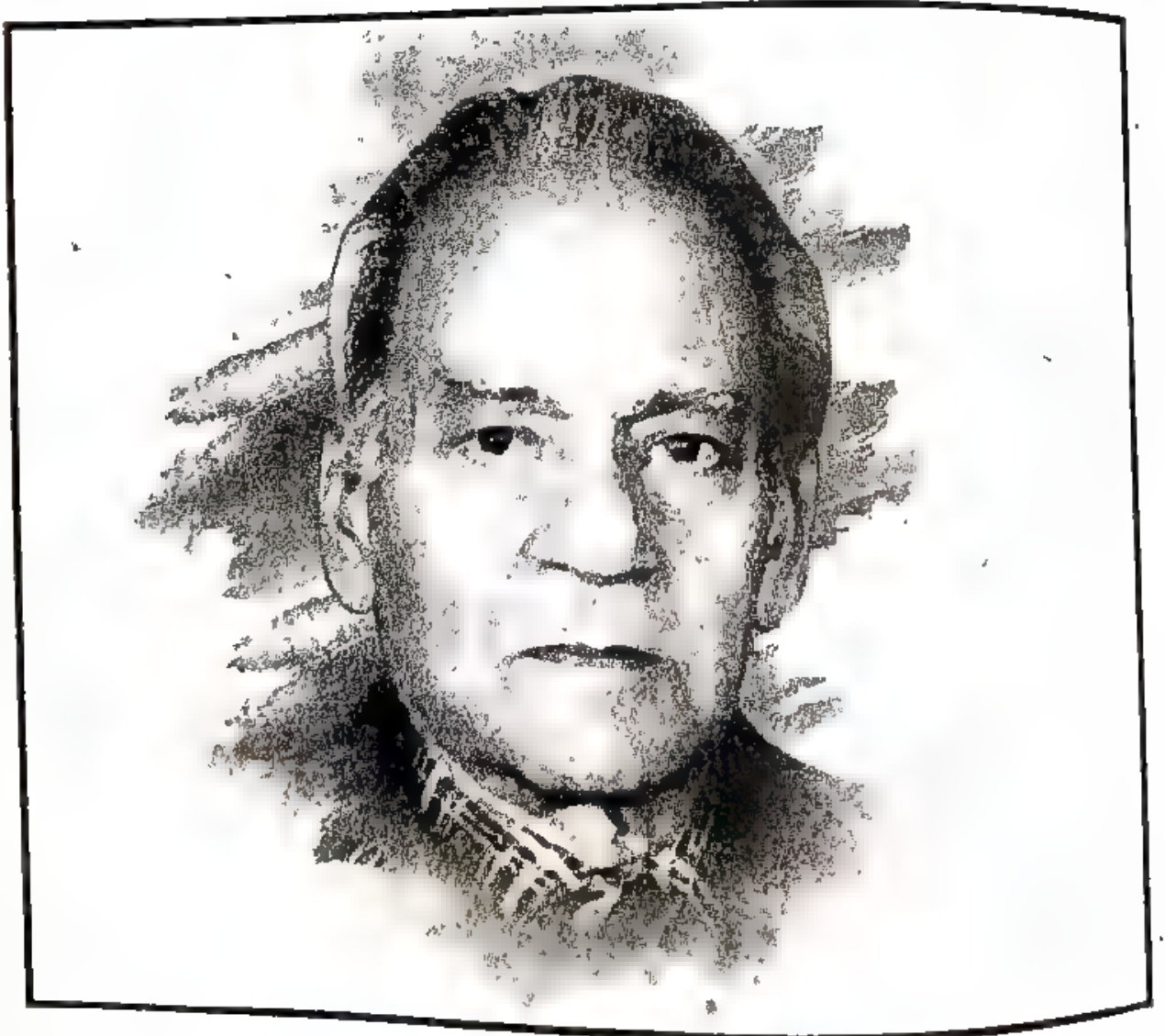
اُس روز کے بعد جانے کتنی مرتبہ مرتبہ زنگہ داس کی کوچی کے سامنے سے گزرا ہوں لیکن اندر نہیں گیا، مبادا قاسمی صاحب ہمارے ہو جائیں کہ اتنے دنوں سے اُن سے بات کیوں نہیں کی۔ ویسے بھی ان دنوں وہ کچھ حساس ہو چکے ہیں۔

---



# بارش، خوشبو اور سماوار

اے حمید (خاکہ)



میں چھوٹا سا چھتا تو صبح سویرے کی تازہ نیم سرد ہوا میں دروازے میں بیٹھے دادا جی کی گود میں چڑھا آتا تھا۔ تازہ غسل کے بعد ان سے دلائی صاحب، فیلکم پاؤں اور اولڈ سپاٹس آؤٹریٹوں کی مہک آتا کرتی تھی۔ وہ مجھے اپنی گود میں بٹھا کر، سامنے سڑک سے گزرتی اکاؤنٹ ریٹائٹ، واکس ویگن، مورس گاڑیوں، آسانی رنگ کے دیبا سکورڈوں، کھنٹی کی جل ترنگ میں خراماں سا کنگوں کی میکا کی موسیقی میں گھلتی ملتی چھاؤنی کے قدیم برگد کے چھتنا و درختوں میں ٹوکتے پرندوں، نیم کے درختوں سے گرتے نیم کے پیلے کپے پھل کی تھک تھک درختوں سے جامن کے گرنے کی ہلکی ٹپ ٹپ اور انگور کی بیلوں میں چھپی چھوٹی رنگین چڑیوں کی چپکار میں گھلتی ملتی کہانیاں سنایا کرتے۔ ان کی سنائی کہانیاں، امبر سر کوئی جادوئی شہر لگتا تھا جہاں امرت کے چشمے بہتے، سونے میں اعلیٰ سورج سنہری شعائیں بکھیرتا، ٹھنڈے ٹھارے پانی کے کنویں اپنی گہرائیوں میں برف آب، آب حیات کا خزانہ رکھتے۔ وہاں کے کھنٹی باغ کی کیاریوں میں خوش رنگ پھول جھومتے اور ہنرے سے لدے درخت روشوں پر جھک آتے۔ ان کی یادوں کا سلسلہ تب تو شایب گوالا سا نکل کی کھنٹی بجاتا دودھ بھری گڑیاں لیے کھنٹی میں داخل ہوتا۔

دادا جی کے گزر جانے کے بہت سال بعد جب میں نے اسے حمید سے سوال کیا کہ کیا امبر سر اتنا ہی جادوئی شہر تھا جس میں ہر سو موسیٰ، گلاب، رات کی رانی کے پھولوں کی خوشبو ہوا کے ہم راہ ہلکورے لیتی اور چھوٹی چاندی آئینہ ندیاں باغات میں بکھری ہوتیں تو وہ مسکرائے اور کسی اور دنیا میں گم ہو گئے تھے۔

”میرا امرت سراسر اس سے بھی کہیں زیادہ حسین تھا۔ اس میں چالیس ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے کنویں تھے، سرسبز و شاداب اور پرسکون کھنٹی باغ تھا، بیچ میں نہر بہتی تھی۔ میں روز وہاں نہایا کرتا اور روز نیا انسان ہو جانے کا احساس دل و دماغ کو سیراب کیا کرتا۔ وہاں کا پانی ایسا تھا کہ وہ جب دوا دیتے تو ہدایت کرتے تھے کہ اسے امرت سر کے پڑنا شیر پانی کے ساتھ لیا جائے۔“

اے حمید صاحب نے کھوئے ہوئے لہجے میں یہ بات مجھ سے پہلی ملاقات میں کہی تھی۔ بعد کی ملاقاتوں میں تقسیم کے بعد کالا ہور، لٹکا، برما، بنگال، مجبیتیں، تمکین، بلج لڑکیاں، بودھ، نیم، شیشم، ناریل کے درخت، ہندو مت، سکھ مذہب، دھرم اسلام، سادھو سنت، ست رنگے دوست، بیٹیاں اور جانے کون کون سے موضوعات تھے جن پر ہماری بات نہ ہوئی ہو۔ ان میں بہت سی وہ باتیں بھی کھلیں جو ان کی تحریروں میں موجود نہ تھیں۔

وہ خوش پوشاک، خوش خوراک، سرخ و سفید، نازک مزاج رومانوی اے حمید جو تصویروں میں نظر آتا تھا، اُسے ڈھونڈنا جب میں سمن آباد کی ایک پرسکون سڑک کے چھوٹے سے مکان تک جا پہنچا تو وہاں میری ملاقات ایک نحیف، کم زور، کھجڑی بالوں والے شخص سے ہوئی۔

وہ رابیل لنڈن کر آ کر، عمدہ دلائی کپڑے کا نفیس لباس، خوشبودار تھبا کو اور بھاپ اڑاتی رومانوی سیلون کی چائے جس کا تذکرہ ان کی تحریروں سے یوں نکلتا تھا جیسے چھوٹی مکھی کے چمچے سے بہشت کا شہر، نندارد تھا۔ سفید پوشی تھی یا شاید عسرت تھی، سادگی تھی، متانت تھی، خودداری تھی تا سبیل جیانا تھا اور بلا کی یادداشت تھی۔

اے حمید کا پورا نام عبد الحمید تھا۔ انھوں نے اُس دور کے فیشن کے مطابق اسے مختصر کر لیا، زیڈ اے بخاری، زیڈ اے سلہری، ایم ڈی تاثیر کی طرح۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں امرت سر میں پیدا ہونے والے اے حمید کو انیس برس کی عمر میں ہجرت کر کے لاہور آنا پڑا لیکن ان کا امرت سر سے رشتہ اتنا شدید تھا جتنا پیش تر مرچکے لاہوری ہندو سکھوں کا لاہور سے۔ شہروں کے مذہب نہیں ہوا کرتے، نومولودوں کی طرح، جنھیں ہم بعد ازاں اپنے پسندیدہ مذاہب اُڑھا دیتے ہیں۔ 1928ء میں امرت سر میں جنم لینے والے اور منزل منزل نامی انسانے سے ادبی زندگی کا آغاز کرنے والے اے حمید نے بلاشبہ سیکڑوں افسانے، ناول، سفر نامے، کالم، یادداشتیں اور ڈرامے لکھے۔ ان کی کتب کی تعداد

دوسو سے بڑھ کر تھی۔ البتہ اُن کی شہرت کا باعث ”اردو شعری داستان“، ”اردو نثر کی داستان“، ”مرزا غالب لاہور میں“، ”داستان گواہانِ حق احمد“، ”سلی کی سونا لیزا“، ”جنگل اُداس ہے“، ”جنگل روتے ہیں“ کے علاوہ بے شمار افسانوی مجموعے اور ناول بنے۔ ان کے ہاں دیو، ملا، حقیقت اور تاریخ تحریر کے بنیادی تار و پود ہوتے جو قہر و روان کی کھڑی پٹن پارے کی شکل میں بنے جاتے۔ جہاں یہ یکسانی اُن کی انفرادیت و شناخت بنی وہیں اُن کی ایک رنگی تحریریں شروع سے عروسی کے باعث وہ ارفع مقام نہ پاسکیں جو اُن کے سے قادر الکلام و پرخیال و ہر کار فن کار کا مقدر بن سکتا تھا۔ ان کو تو جوان طبقے میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا مگر سنجیدہ علمی حلقوں میں مقبولیت تو بہت ملی، وہ مقام نہ مل پایا جو وہ شروع اور عمر و معیار قائم کر کے حاصل کر سکتے تھے۔ قلم کے ملازم تھے جہاں چہ روزانہ ایک تنی چادر بچتے۔ لکیر روزگار سے اتنی فرصت نہ تھی کہ ایک سوئی سے کٹی برس صرف کر کے نازک و نفیس کشمیری پشیمین بچے جو سونے کی انگوٹھی سے گزر جاتی۔

وہ دور جہاں انگیز تل پٹ کا تھا، وہیں تخلیقی فعالیت کے عروج کا زمانہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی، منٹو، اختر شیرانی، احمد راہی، ابن انشا، ناصر کاظمی، اشفاق احمد، ضمیر نیازی، انجم رومانی، قیوم نظر، مصور شا کر علی، انور جہاں شہزاد، گلزار استادا امانت علی خان اور جانے کون کون سے ستارے اس کھکشاں کا حصہ تھے۔

۱ اُن کے ناول اور افسانے بالخصوص نوجوان طبقے میں فہرست کی عکاسی، روان اور گنگنہ طرزِ تحریر کی وجہ سے مقبولیت کے عروج تک پہنچے۔ امرت سر، لاہور، سیلون، رنگون اور ہندوستان کے طویل و عرض کی یادداشتیں، مشہور ادیبوں کے خاکے، عام زندگی کے کرداروں کی عکاسی میں انھیں پید طوئی حاصل رہا۔ بچوں کے ادب کی جانب آئے تو بسیرا لوسی کے باوجود جاسوسی اور ورائٹی کہانیاں ادبی رنگ میں لکھیں۔ ”عزیز ناگ مار یہ پڑھ کر تو ایک پوری نسل جوان ہوئی۔ اس سلسلے کے ایک سو سے زیادہ ناول لکھے۔ البتہ رومانی تخلیق میں چند بنیادی افلاطون کر گئے جیسے چنگیز خان اور دہلی بال کا دور سکندر اعظم سے پہلے آگیا۔ ان افلاطون کا اعتراف کیا مگر توجہ یہ پیش کی کہ یہ کوئی تاریخی و تحقیقی دستاویز نہیں بلکہ تخیل کی اور طلسماتی دنیا کی تخلیق ہے جو زمان و مکان کی قید سے ماوراء ہے۔ وہ ہر تابو شے سے محبت میں جھلا ہو کر ایک سو گوار و نوئی تعلق قائم کر لیتے۔“ میں نے عظیم مصور رینا نر کی دوسو برس پرانی پینٹنگ میں پیرس کی ایک لڑکی دیکھی۔ وہ لڑکی ایک باغ میں تھی۔ اب وہ لڑکی مرجئی ہے مگر اس پینٹنگ کی وجہ سے زندہ ہے۔ میں اس لڑکی سے محبت میں گرفتار ہوں۔“ کالموں کی شائستہ در رواں اور دل چسپ تحریر نے قارئین کے دل موہ لیے۔ ٹی وی ڈرامے لکھے۔ بچوں کے لیے ڈراما، ٹینک والا جن نے تو کھڑکی توڑ کر لیا۔ گویا تصور تخیل کی دنیا میں رہنا اور اسے قلم سے کاغذ پر منتقل کرنا اُن کا عشق اور روزگار ٹھہرا۔ جہاں عشق اور روزگار ایک ہو جائیں وہں کام کام نہیں رہتا لطافت و لذت کا یادگار تجربہ بن جاتا ہے۔

جہاں منٹو نے انھیں پیار سے ایک بھو اسی کا خطاب دیا جو کعبے سے بھی عشق کرتا ہے، وہیں انتظار حسین نے انھیں بیسویں صدی کے تین بڑے رومانوی ادیبوں میں ناصر کاظمی اور ضمیر نیازی کے ساتھ شمار کیا۔ کشور ناہید نے ان کے رومانی مزاج کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ”جب ماں باغ کی صفائی کرتا تو وہ خشک پتے واپس بکھیر دیتے کہ ان کے بغیر باغ سونا لگتا۔“ ہا تو قدسیہ نے اُن کے دھیمے مزاج کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اُن کی موجودگی میں مخاطب میں اپنی ذات کی مضبوطی اور طاقت کا احساس فزوں تر ہو جاتا۔ ابن انشا نے تو ان کی محبت میں لکھا۔ ”اب کے لاہور آتا تو طوں گا“ اور جی کڑا کر کے تمہارے منہ چوموں گا اور شہر گھوموں گے۔“ احمد راہی کا خیال تھا کہ جب بھی انھوں نے قلم بنائی تو اے حمید اس کا ہیرو ہوگا۔ خالد حسن ایسے اپنے مزاج کے شخص نے تو ان کے شاہ پارے انگریزی میں ترجمہ کر کے انھیں عالمی قارئین سے متعارف کروایا۔

اے حمید سے میرے تعلق اور ان کی جانب رجحان کی وجوہ کچھ اور تھیں۔ عفتوانِ شباب تک میرا کوئی دوست نہ تھا۔ بھرے بڑے خاندان میں رہنے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ خاندان کا پہلا بچہ ہونے کے باعث میں اپنے وادائی ورنہ ناجی کے بے انتہا قریب تھا، زیادہ وقت اُن

کے ساتھ گزرتا یا پھر کتابوں کے ساتھ۔ میرا خاندان بھی امرت سر سے ہجرت کر کے لاہور چھاؤنی آباد ہوا چنانچہ امرت سر کا کوئی بھی حوالہ اُن کے دل کے تار جھیر نہ دیتا تھا۔ ”نوائے وقت“ اُس وقت سب سے مقبول روزنامہ تھا جس میں امرت سر سے متعلق تحریریں چھپا کرتیں۔ امرت سر کی یادیں تازہ کرنے میں اے حمید سر فہرست تھے۔ مجھے اُن کی تحریریں اُن میں موجود پاکیزہ یادوں اور زبان کی درستی کے لیے پڑھانی جاتیں۔ میں یہ تحریریں کو پڑھ کر جو ”بارش خوشبو اور سادار“ کے عنوان سے چھپتی تھیں، ایک رنگین دھندلکے میں کھو جاتا۔ اُن کی تحریریں کیا تھیں، صندل کے جنگلوں سے ہلکی بارش کے بعد سرسئی دھند میں اٹھنے والی روح پرور مہک، کشمیری ہاتھوں کے چھوٹے پہاڑی مکانوں میں اُبلتی سادار کی نمکین خوشبو، امرت سر کی باقر خوانیوں کی خوشگلی، لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر چلتی دکنور یا میں بچے سفید رنگ کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز، بنگال کے بندراہن کی جھیلوں میں گھٹنے گھٹنے ڈوبے درختوں سے لٹکتے شیش ناگوں کی پھنکار، راتوں کو دریاؤں سے لوٹتے چھیروں کے چپوؤں کی چھپاک ہوتی تھی، رنگ برنگی بے شمار جزئیات کی خن آرائیاں۔

میں امرت سر نہیں گیا مگر امرت سر کے سحر میں گرفتار ہوں۔ میں مسلمان ہوں، آواگون پر شاید یقین نہیں رکھتا مگر رکھتا بھی ہوں کہ مجھے لگتا ہے، میں نے پچاس اور ساٹھ کی دہائی کے لاہور میں زندگی، بھرپور زندگی گزاری ہے۔ میں نے وہ سنہالی لڑکی نہیں دیکھی جس نے ریلوے اسٹیشن پر سڑک ٹرین کی کھڑکی میں بیٹھے خوب رواے حمید کو شیدائیت بھری نظروں سے دیکھا تھا اور ہجوم میں گم ہو گئی تھی مگر میں آج بھی اُس لڑکی کی محبت میں مبتلا ہوں۔ میں اُس سر اپلاحت بری لڑکی سے تو عشق کرتا ہوں جو ایک بم حملے میں ماری گئی تھی (مجھے آج بھی یقین نہیں کہ خوب صورت بھولی بھالی لڑکیاں مر بھی سکتی ہیں) یہ بھی سچ ہے کہ پچھلے دنوں ایک رات کے پچھلے پہرا میں سیانی کی آواز میں رکارڈنگ سن کر مجھے وہ ریڈیو سیلون، جاگی ہائی، شمشاد بیگم اور کنڈن لال سہگل یاد آ گئے جنہیں میں نے اے حمید کے کانوں سے سنا تھا۔ میری یادداشت میں چابی والے قد آدم گھڑیال کے گھٹنے کی آواز، لٹکا کے ساحلوں پر تاریل کے جنگلوں میں ڈبکے ہوئے بنگلے۔ اُن بنگلوں کے باغوں میں خود رو گھاس میں اُگے جنگلی پھولوں پر منڈلاتی تلیوں کے نازک پروں کی مہین پھڑ پھڑا ہٹ بھنورے کی پھر پھر گرد گداری ہے۔ میں نے بہت کچھ نہیں دیکھا لیکن ہلکی پھوار کے بعد سیاہ بادلوں کے پھٹنے سے وجود میں آتے شگاف میں سے ترچھی سنہری شعاؤں کا سمندر کی لہروں پر ناچ، بری لڑکیوں کے رنگین فرائٹ جھاروں والے لباس میں رقص کے دوران ہست و بود سے ماورا ہو جانا، قرقرم کے پہاڑوں کی بلندیوں سے برف کی سلیس لاتے پہاڑی لوگوں کی قطاریں میں نے کہیں دیکھ رکھی ہیں۔ شاید میں نے یہ سب نہیں دیکھا مگر دیکھا ہے، بہت قریب سے دیکھا ہے اور اب یہ سب کچھ، بہت کچھ میری روح کا حصہ ہے۔

میری یادداشت میں ایک ذائقہ بھی ہے۔ بڑی ہرنی آنکھوں، صراحی گردن اور شفاف جلد والی شرمیلی لڑکی کی اُنکلی سے گلاب کا پھول توڑتے ہوئے کا ناچ چھ جانا پھر اُنکلی پر ابھرتی لہو کی بوند کو اپنے منہ میں جذب کر لینے کا ذائقہ۔ جنون کچھ ایسا طاری ہوا اور کچھ ایسا سودا سر میں آیا کہ اے حمید کے ریل گاڑی کے طویل سفر، کھڑکی میں سے نظر آتے سرزمین ہند کے سونا اُگلنے کھیتوں میں کام کرتے دھقان، لٹکا کی چائے چنتی سلونی لڑکیاں، گھنے اندھیرے جنگلوں میں سے اُٹتی وحشی ہنزے کی تیز مہک، یک دم بنتے بادلوں سے گرتے پانی کے چھینٹوں کی بوچھاڑ، سرنگ سے گزرتی ریل کے پیروں کی کٹ کٹ کی گونج، شیشے کے بجتے گلاسوں میں بکتی دودھیلی چائے، ریل کی جانب لپکتے سرخ لباسوں میں لمبوس بازوؤں پر بندھے سفید نمبروں والے لٹکی، سرکشی ٹرین کے ساتھ بھاگتے دوست، تیز رو گاڑی کی کھڑکی سے پھسلتا اور لہراتا جانا رنگین دھنکا میرے حواس پر مدتوں سے سوار ہیں۔ شاید اسی لیے میں نے ریل کے بے ضرورت کئی سفر کیے۔ ایک صبح لاہور کی ٹرین میں سوار ہوا اور کھڑکی کے ساتھ باہر جھانکتا، کتاب پڑھتا پشاور پہنچا۔ رات عزیز کے ہاں قیام کیا اور اگلی صبح لوٹ آیا۔ ستمبر کا مہینہ تھا اور ڈبے میں ہجوم پنڈی کے بعد چھٹ گیا، سوار آلود موسم میں وہ سفر کچھ ایسا بھایا کہ پوٹھوہار کی سرخ پہاڑیوں سے لے کر دریا کے قدیم ریل پل کے وہ مناظر، تنہا ڈبہ اور سرد ہوا جو بدن کارواں رواں گد گداتی تھی، اُن لمحات کی دین ہے جو آج بھی مجھ میں ظالم برپا کرتے ہیں۔



اے حمید کا چھوٹا سا مکان سمن آباد لاہور کی ایک بڑی سکون، یک درہ درختوں سے گئی سڑک پر تھا۔

سنا تھا، گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔ میری اُن سے ٹیلی فون پر چند ایک مرتبہ بات ہو چکی تھی۔ میرے خاندان کے امرت سرت وہاں میرے پردا کے نام پر کوچہ دین محمد کا سنا تو اُن کے ب و لچے میں گرم جوشی ڈرا آئی۔ طاقت، تفرین اور سادگی اُن کے انداز زندگی سے وہاں تھے۔ مکان کے اندر بائیں جانب چھوٹے برآمدے سے ملحق اُن کے کمرے کا جالی دار پرنگ والا دروازہ تھا۔ وہ کمرہ اُن کا کتاب خانہ سونے کا کمرہ اور خال خال ملاقاتیوں سے ملنے کی جگہ تھی۔ کمرے میں ایک جانب معمولی میز کرسی پر بیٹھ کر وہ لکھتے پڑھتے تھے، میز پر کتابوں کا انبار بھی دھرا ہوتا تھا، سامنے رکھے پلنگ پر سادہ اور صاف ستھری چادر بھی ہوئی تھی، وہ تھک جاتے تو پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور گھنٹوں پر ہتھالی سمجھ کر لکھتے رہتے، وہیں سو بھی جاتے۔ کمرے کی قابل ذکر اشیاء میں ایک اور میز بھی تھی جس پر کھانے پینے کا سامان دھرا دیا جاتا۔ میز پر کپڑے کا میز پوش پڑا رہتا جس کے کبھی کھکنے سے بوسیدہ میز کی کھرچی ہوئی سطح تنگی ہو جاتی۔ کمرے سے ملحق لاؤنج یا پرانی زبان میں گول کمرہ تھا جس کے اُدھر بارہی خانہ تھا۔ کمرے کے ساتھ غسل خانہ تھا، وہاں سے کبھی کبھار پانی کے ٹپکنے کی آواز متواتر آتی رہتی۔

انہیں ایک سامع کی ضرورت تھی اور مجھے گھنٹوں اُن کی باتیں سننے کا اشتیاق، سودہ لحات میری زندگی کے فرحت بخش لحات ہیں۔ جب کبھی جی اُچاٹ ہو جاتا ہے، روح بوجھل اور تھکن ہڈیوں تک اتر آتی ہے تو اُن کی وہ دھیمی دھیمی روح پرور باتیں پڑ مرده اور دل گیر رجز کو لاریاں سناتی اور نرم تھکیاں دیتی ہیں۔

اے حمید کے دادا کے امیر سری تھے۔ اپنی جمع پونجی لگا کر ایک خوب صورت مکان تعمیر کیا اور اُسے خوب سچایا۔ ساری عمر اس مکان میں گزار دی۔ اسے دیکھ کر خوش ہوتے رہتے۔ ایک مرتبہ شہر میں شور اُٹھا کہ لرزلہ آ رہا ہے۔ لوگ خوف زدہ ہو کر گھروں سے نکل کر میدانوں میں جمع ہونے لگے، بازار دیران ہو گئے، مدرسوں میں چھٹی کا اعلان کر دیا گیا۔ دادا کے اہل خانہ بھی سامان اسباب اُٹھ کر ہاہر کو لے لے لیکن دادا نے جانے سے انکار کر دیا اور ایک ہی بات دہراتے رہے۔ ”یہ میرا گھر ہے اور قبر بھی۔ یہ گھر گرے گا تو میرے ہی اوپر گرے گا، میں اسے کسی صورت چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ یہ علیحدہ بات ہے کہ بلا ٹل گئی۔

گویہ خبط و راحت میں تھا۔

والد پہلوان تھے۔ پہلوانوں کی خوب عزت کی جاتی تھی۔ اُن کی خواہش تھی کہ بیٹا بھی پہلوان بنے۔ چٹاں چہاں کی صحت جانے کے لیے باقاعدہ ڈنڈ نکھواتے، ورزش کرواتے اور کھیتوں، میدانوں اور نواحی جنگلات میں صبح سویرے سیر کے لیے لے جاتے، ان سیروں نے طبیعت میں فطرت سے لگاؤ اور رومان پیدا کر دیا۔ پنجاب کی گھنی ہریالی اور جنگلی پھول، تازہ ہو میں پرندوں کی چکار و درانی پر نازی و دائرہ چپلا اُرنی گولا اور پھر منہر او مکتا و کتا چندھیانا سورج بن جاتا۔ والد اس دوران درختوں، پودوں اور پھولوں کے بارے میں بتاتے جاتے، بیٹا شوق اور حیرت سے دیکھتا جاتا۔

بیٹے کو تازہ دودھ پینے کا شوق باپ سے راحت میں ملا۔ وہ بھینس کا تازہ کچنیم گرم دودھ دہا رہیں دھاروں کی شکل میں پی لیتا۔ البتہ ایک شوق اور تھا، دودھ تھا مٹا لے گا۔ رات کو اپنے پسندیدہ معشوقین کے نادل لے کر کمپنی باغ چلا جاتا۔ لوگ چلے سو جایا کرتے تھے، سر شام ہی ہر سونانا ہو جایا کرتا۔ ایسے میں کمپنی باغ کی روشیں سرکاری سٹریٹ لیمپوں کی روشنی سے منور ہو جاتیں۔ اب رات میں وہاں پٹنگے لائٹوں کا طواف کرتے یا پھر جھینگروں کی آوازیں سناتے میں سیندھ لگاتیں۔ ایسے میں نوجوان اے حمید کسی سٹریٹ لیمپ کے نیچے بیٹھ جاتا اور ایک وقت کتابیں پڑھنے میں گزار دیتا۔

اے حمید کی بہنوں کے بعد پہلے بیٹے تھے، کچھ نازک مزاج اور نفاس طبع بھی تھے۔ ماں بہنوں کے لاڈ لے، اس جسمانی مشقت، ایسے غیر شاعرانہ مشاغل پر کیوں کر آمادہ ہوتے۔ باپ کی سختی اس حد تک بڑھ جاتی کہ نسبت مار پیٹ تک آ جاتی۔ اے حمید کے مزاج میں

بغاوت تو شاید پیدا نہ ہو سکی، البتہ فرار ضرور آتا۔

قریباً پورا ہندوستان چھان مارا۔ رنگوں سے سیلوں تک زمین و متن، ہندوستان کا چٹا چٹا دیکھ ڈالا۔ اسی آوارگی اور سیاحت نے جہاں رنگ رنگ کے لوگ، گورکھے، جینی، بنگالی، پنجابی، گودن وغیرہ سے ملوایا، وہیں ہر طرح کے ماحول، جانور، پرند، پھلوں، پھولوں، اور درختوں سے بھی روشناس کروایا اور مزاج میں گداز، لطافت اور برداشت کو یوں ابھارا جیسے تنور کی آنچ میں میدے کا بیڑا پھول کر ابھرتا ہے۔

گرمیوں میں ایک دوپہر میں اُن سے ملنے گیا تو آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا کے جھوکوں میں درختوں کی شاخیں، جھوم رہی تھیں۔ اُس روز خوش گوار موڈ میں تھے۔ ہم باہر کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور وہ منتظر نظروں سے بادلوں کو دیکھنے لگے۔ ہر سو ہلکا سرسئی اندھیرا ابھرا ہوا تھا۔ بادلوں میں بجلی کی بے آواز کوندلشکارا مار جاتی تھی۔ ایسا موسم تھا جو روح کو ترات دیتا ہے۔ نہ جانے کس لہر میں تھے کہ خود کلامی کے سے انداز میں بولنے لگے۔

”مذہب کتنی رومانٹک چیز ہے۔ میں بھی بہت رومانٹک ہوں۔ پیغمبروں کو دیکھو، پہاڑوں پر چڑھے، ٹھنڈے غاروں میں قیام کیا روشنی پانے کے لیے، اور گیان و حیاں کیا۔ اس میں اسرار کی ایک لطیف دُھند ہے، مٹھاس اور نرمی ہے۔ گوتم بدھ جنگل جنگل چمپیا کرتا ہے اور ایک درخت، بودھ گیا کے درخت تلے نروان پاتا ہے۔ مذہبی آدمی سخت مزاج تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو انسان کو دھیمیا اور رومانٹک کرتا ہے۔ قدرت کی گود میں بیٹھ کر چمپیا کرنے سے آپ کے اندر ایک درد اور رواداری پیدا ہوتی ہے۔ گوتم کو جب گیان ہوا تو اُس نے کل جہاں پر رحم کی نظر ڈالی۔ وہ جان گیا کہ سب مجبور دولا چار ہیں، کچھ حالات کے اور کچھ اپنی فطرت کے۔ سبھی محبت، شفقت اور رحم کے مستحق ہیں۔“

اس کے بعد پیغمبروں، ولیوں، جوگیوں کے قصے سنائے۔ اشعار اُن کی زبان پر یوں اُتر رہے تھے جیسے سیاہ گلابوں پر شبنم اُترتی ہے۔ ٹکسی داس کے اشعار سنائے، چند یاد رہ گئے۔

ٹکسی دیا دھرم کا مول ہے  
پاپ کا مول ابھیمان  
ٹکسی دیا نہ چھوڑیے  
جب تک تن میں پران

ٹکسی یاں سنار میں بھانت بھانت کے لوگ

سب سے مل مل رہے مدی ناؤ بنوگ

پھر کہنے لگے کہ وہ کسی مذہب کو غلط نہیں سمجھتے بلکہ ہر مذہب کی حقانیت کے قائل ہیں۔ ہندو دھرم کے نظریے آواگون کو تو بہت بڑی

حقیقت مانتے ہیں۔

”تمام مذاہب ایک ہی آفاقی سچائی کی جانب جاتے ہیں۔ ارجن کرشن کو کہتا ہے۔ تو نے اتنے روپ دکھائے تو یہ ہزاروں فرقتے

کیسے ہیں؟“

کرشن کہتا ہے۔ مجھ سے ملنے جو کوئی جس راستے سے آتا ہے میں اُس سے اُسی راستے میں ملتا ہوں۔“

ہر انسان دوسرے سے مختلف ہے اسی طرح مذاہب انسان کو زیادہ انتخاب کی آزادی اور مواقع دیتے ہیں۔ یہ انسان کی انفرادیت

مجروح نہیں ہونے دیتے۔ یوں خلقت کی رنگارنگی دنیا کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔“

جوگی، سنت، جٹا دھاری سادھوؤں کے بارے میں بتانے لگے کہ ایسے جوگی ہوتے تھے جو اپنے بدن کو راکھ سے لپ لپتے

تھے، چندا سے کم خور ہوتے کہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن جاتے، کچھ ناخنوں اور بالوں کو اتنا بڑھا لیتے کہ سونپھوڑھی جھروا صاحب لیتی اور ہدف نظر بن جاتا۔ ان کے ہال اسٹے بڑھ جاتے کہ انھیں رسیدوں کی فصل دے کر درختوں کے تنوں میں غلوں پر کند کے اندر چمکتے جوتان کے گرد لپٹ جاتے اور یہ بندروں کے مانند ان سے جھولنے لگتے۔ چند ایسے بھی تھے جو غلوں پر اس حد تک قدرت حاصل کر لیتے کہ خود کو زمین میں دفن لیتے اور گھنٹیوں بند زعمہ باہر نکل آتے۔ ایسے سادھو انھوں نے اپنی آنکھوں سے یا تو لاہور میں دوسرے کے تہوار پر دیکھے یا پھر آوارہ گردیوں کے دوران۔

مرت سر کے دنوں میں بلا ارادہ جہاں گردی کو نکل جاتے۔ سودا جب سماتا تو سیلاب بلا ہر سوز گرجاتا۔ ایک مرتبہ گون میں بڑی آپ کے ہاں چلے گئے جن کے شوہر کیپٹن ممتاز کی وہاں تعیناتی تھی۔ نصف برس وہاں قیام کیا اور اس سرزمین کے عشق میں کچھ ایسے جہاں ہوئے کہ آخر حیات تک اصل حیات رہا۔ رومان تو لاہور آنے کے بعد ٹھنڈی سڑک کی شاہ دین بلڈنگ، پاک ٹی ہاؤس، لارنس باغ کے درختوں اور ان پر رین، ہیرا کرنے والے پرندوں، شکر دوپہروں کی سنسان سڑکوں اور شاداب پنجابی درختوں سے بھی کیا۔

”عشق بہت کیسے لیکن کسی لڑکی کو خراب نہیں کیا۔“ ایک روز ان کی بیگم یہی نہ نے چائے بھجوائی تو اس کی چسکیاں لیتے ہوئے کہنے لگے۔ ”میں اُن خوش نصیبوں میں سے ہوں کہ جس سے عشق کیا، اُسے با بھی لیا۔ میرا سب سے شدید عشق ریحانہ سے تھا اور آج بھی ہے۔“ ایک عجب داستان بھی سنائی۔

اے حمید نے افسانے لکھنے شروع کیے تھے۔ ان کے افسانے ”اوب لطف“ میں چھپتے اور ساتھ میں تصویر ہوتی۔ کنیر ڈکال کی ایک لڑکی نے انھیں خط لکھا جس میں ان کی تحریر کی از حد تعریف تھی۔ اے حمید کے افسانوی ذہن نے ایک منصوبہ بنایا اور یہ کنیر ڈکال جانچنے۔ وہاں انھوں نے بہانہ بنایا کہ یہ باصلاحیت لڑکیوں کے انٹرویو کے لیے ایک رسالے کے نمائندے کے طور پر آئے ہیں۔ اسی لڑکی کا حوالہ دیا کہ اُس کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ انتظامیہ کو شک ہوا تو کسی لیکن بہر طور ان کی مطلوبہ لڑکی سے ملاقات کر وادی گئی۔

بعد ازاں یہ کنیر ڈکال کے ایک فنکشن میں اُس لڑکی کے بھائی بن کر جا پہنچے ورا سے لے کر لارنس باغ چلے آئے۔ وہاں رات میں ایک پولیس والے نے پکڑ لیا تو بہانہ بنایا کہ یہ اُس کے چچا ہیں جو اُسے کالج فنکشن کے بعد گھر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ یہ بعد کی ملاقاتوں کا نقطہ آغاز تھا۔ معاملات اس حد تک بڑھ گئے کہ بات شدی تک جا پہنچی۔ اُس دور میں پسند کی شادیاں بہت معیوب سمجھی جاتی تھیں اور ایسے لڑکے لڑکیوں کو عموماً آوارہ سمجھا جاتا تھا۔ رشتے میں پیچیدگی ڈرا آئی۔ لڑکی کے باپ کا چچا پاخانہ تھا اور وہ خاصے خوش حال لوگ تھے جب کہ لڑکے کی آمدنی کا دار و مدار اُس کی تحریروں پر تھا جو بہ مشکل جیب خرچ کے برابر تھی۔ بات بگڑتی سنورتی، سنورتی بگڑتی رہی۔ در بہت بڑھ گئی۔ بالآخر لڑکی والوں نے لڑکے کی سرکشی پر ہر ڈال دی یہ معاملہ مستقل رفاقت پر منتج ہوا۔ اس معاملے میں احمد ندیم قاسمی، اے حمید کی جانب سے لڑکی والوں کو قائل کرنے بھی گئے۔

یہ اے حمید کی پہلی شادی تھی اور آخری بھی۔ لڑکی کا نام ریحانہ تھا۔ لڑکی کو سسرال والوں نے آخری وقت تک قبول نہ کیا، بہت بعد تک اے حمید کو دیگر لڑکیاں رشتے اور دوسری شادی کے لیے دکھاتے رہے۔

”عورت مرد کی ملاقات کبھی مشکل نہیں رہی۔ یہ سب قصے کہانیاں ہیں کہ پہلے لڑکے لڑکیوں کی ملاقاتیں ناممکن تھیں۔ ملاقات تو جھوڑو، مجھے سیلون کی وہ لڑکی آج بھی یاد ہے جسے میں نے ٹرین کی کھڑکی سے پلیٹ فارم پر جاتے دیکھا۔ ہم دونوں کی نظریں ملی تھیں، وہ ٹھٹھکی، اور آگے بڑھ گئی تھی۔ میں دم سادھے اُسے دیکھتا رہا تھا۔ یکا یک وہ رُکی اور اس نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اُس کی نظروں میں بیک وقت اہنایت اور موت تھی، یاس بھی تھا۔ اسنے میں میری ٹرین چل پڑی تھی۔ وہ مجھے دیکھتی رہی تھی یہاں تک کہ ایک بہم ساپ بن گئی تھی۔ وہ ساپ آج



بھی میرے ساتھ موجود ہے۔“

اسے حمید نے شادی کے بعد بھی محبتیں کیں لیکن وہ خود کہتے تھے۔

”ریحانہ کو معلوم ہے کہ میں نے اسے چھوڑ کر کہاں جانا ہے۔ جب کچھ دور چلا، اُلٹے قدموں سے اُسی کے پاس چلا آؤں گا۔“

حیرت انگیز معاملہ تو یہ تھا کہ ریحانہ کی قریبی ترین سہیلی ’ش‘ گورے چنے جیسے نقوش والے کشمیری اسے حمید سے اس حد تک متاثر ہوئی کہ عشق کی منزل پہ جا پہنچی۔ اس اسیری میں اُس نے عمر بھر شادی نہ کی۔ ریحانہ کے لیے یہ کوئی راز مہاں نہیں تھا لیکن ریحانہ نے بھی ایسی وسیع اقلی کا مظاہرہ کیا کہ اُس سے دوستی ختم نہ کی۔ وہ ان کے ہاں باقاعدگی سے آتی رہی۔

ریحانہ سے اُن کی وابستگی اتنی دھیمی اور گہری تھی کہ نصف صدی سے کچھ زیادہ کے تعلق میں ایک روٹین تھا۔ دونوں میاں بیوی شام کی چائے اکٹھے پیتے۔ چائے کا وقت ہو جاتا تو گھڑی دیکھنے لگتے اور میں سمجھ جاتا، اُن سے اجازت طلب کرتا اور وہ مسکراتے ہوئے کہتے۔ ”ریحانہ کے ساتھ چائے کا وقت ہو گیا ہے۔“

میں قریباً غروب ہوتا نارنگی سورج دیکھتا باہر چلا آتا۔

محبت کس روپ اور صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے، اس کا اظہار ایک امریکی لڑکی نے ایک کتاب ”روح کی غذا“ کے محبت سے متعلق ایک باب میں کیا ہے۔

ایک مرتبہ وہ لڑکی اپنے نئے یو اے فرینڈ کے ساتھ ایک عمدہ ریسٹوران میں ڈیٹ پر کھانا کھانے گئی۔ جوانی کی دیوانگی تھی، جذبات اُبل اُبل پڑتے تھے۔ ریسٹوران کے بعد فلم پر جانے کا ارادہ تھا۔ پس منظر میں لائیو آرکسٹرانج رہا تھا اور باورچی پیرے چاندی کی چمک دار طشتریوں پر، دیکھتے کرشل کے ڈانوس کے نیچے سبک رفتاری اور بے وقار قدموں سے مہنوں کی مدارات میں مشغول تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے لڑکی نے لڑکے سے اپنے بے پناہ دلی جذبات کا اظہار کیا جن میں اپنے پر، نے تعلقات اور یو اے فرینڈ کی بے رحمی کا تذکرہ بھی تھا۔ لڑکے نے مستعدی سے اُس کی باتیں سنیں اور پر مزاح گفتگو سے کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑی دیر میں وہاں اُن دونوں کے اُبلتے قہقہے اور ہنسی کی پھوار کی مترنم آواز بکھر رہی تھی۔ اچانک لڑکی کی نظر قریب کی میز پر پڑی جہاں ایک سفید برف بالوں والا بوڑھا اور نفست سے بنے بالوں پونے منہ والی پردقار بڑھیا خاموشی سے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ وہ بہت سلیقے سے اپنی پلیٹ سے فٹ، چکن یا سلاڈ کا ٹکڑا کاٹنے سے اٹھاتے اور منہ میں ڈال کر بے آواز کھانے لگتے۔ لڑکی نے لڑکے کو اشارہ کیا اور وہ بھی اُس بوڑھے جوڑے کو دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد لڑکی نے لڑکے کو کہا۔ ”اس بوڑھے کو دیکھ رہے ہو۔ مجھے تو انہیں دیکھ کر ہی الجھن ہوتی ہے۔ ان میں ایک لائق ہے، جیسے دونوں کا آپس میں کوئی جذباتی تعلق ہی نہیں۔ کتنا ٹھنڈا اور غیررومانوی جوڑا ہے۔ اس پر لڑکے نے اُس جوڑے پر ایک ہتھی کسی اور دونوں ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے لڑکے سے پوچھا۔ ”جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے تو کیا ہم بھی اتنے ٹھنڈے، بے محبت اور بور ہو جائیں گے؟“ لڑکے نے گرم جوشی سے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ”ہرگز نہیں۔“ بعد ازاں موضوع بدل گیا۔ کھانے کے بعد جب وہ مل ادا کر کے باہر کی جانب چلے تو اُس بوڑھے جوڑے کے قریب سے گزرے۔ ناگاہ لڑکی کی نظر نیچے کی جانب گئی تو اُس نے دیکھا، دونوں میاں بیوی خاموشی سے ایک ہاتھ سے کھانا کھا رہے تھے اور دونوں نے ایک دوسرے کا دوسرا ہاتھ میز کے نیچے تھاما ہوا تھا۔ گویا وہ اس تمام عرصے میں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے رہے تھے۔ لڑکی بیان کرتی ہے کہ خاموش محبت کا یہ منظر دیکھ کر اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ محبت، جس میں خاموشی گفتگو اور بے زبانی ہے زبان، کا یہ منظر اس کے لیے بہت جاں فزا اور نشاط انگیز تھا۔

شادی کے بعد اسے حمید کے لابیائی پن میں کمی آ گئی۔ وہ ایک ذمے دار شوہر بن گئے۔ ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ اُن کی تحریریں تھیں۔ جب وہ لکھنے میں مصروف ہوتے تو اُن کی چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کا ریحانہ بیگم بھرپور خیال رکھتیں، بھلے وہ بازار سے سگریٹ لانے

ہوں یا دیگر گھر پر بیداری۔ اے حمید کے مزاج میں ایک رومانی اہالی پن زیریں سطح پر ضرور رہا۔ جب ان کا گھر سن آہا، میں قیہ ہو رہا تھا تو سر پادیر بھی ریمانہ بیگم ہی لائیں۔ اپنے خاندان کے رہنما کے ساتھ سر در دینے کی وجہ سے ان کا گھر وہ اپنے خاندان سے بے کلامی ہو گیا۔

اے حمید پرانے لاہور کو یوں یاد کرتے گویا وہ اب کسی اور گھر پر آباد ہوں۔ وہ امرت سر میں رہے اور ادیب بننا چاہتے تھے تو بھی لاہور آتے رہتے۔ یہاں ان کا ٹھکانا نارنگی کا ممتاز ہوٹل یا پھر منز نامی ریسٹوران ہوتا۔ ادیب زیادہ انہی ہوٹلوں میں بیٹھتے۔ ایک روز بتانے لگے کہ وہ لاہور کو اس کے سرچکے لوگوں کے علاوہ ختم ہو چکے ماحول اور تہواروں بلبادوں، موسموں کی نگاہوں کی شکل میں یاد کے شیش محل میں آباد رکھتے ہیں۔ پرانے دوستوں اقبال کوثر، احمد راہی، ناصر کاظمی اور ان کے ساتھ آندھی طوفان میں مٹی کے چھبے تلے ستون کی اوٹ میں پناہ لینے لگی اندھیری راتوں میں سرکوں پر آوارگی اور تپتی دوپہروں میں پرانی عمارتوں میں رسالوں کے دفاتروں سے ملحق آرام کردوں کی ٹھنڈک میں منسو کے ساتھ مودبانہ گپ شپ کی یادیں زندہ کرتے رہتے۔

ان کے شب و روز میں تبدیلی تب آئی جب وہ اٹلی کی رہائی میں امریکا سے لوٹے۔ ضیاء الحق کا دور تھا۔ سب بدل چکا تھا۔ پرانے دوست بچھڑ چکے اور ٹھکانے خرابوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جی کچھ اٹھ سا گیا۔ اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئے۔ کبھی بہت مجبوری ہوتی تو رکشے میں شہر کی جانب چلے جاتے مگر ایسے میں مٹی گرد اور حواس مختل کرتا شور نہیں بے دم کر دیتا۔ یہ واقعی وہ لاہور نہ تھا جس میں انھوں نے زندگی بسر کی تھی، زندگی سے پریم کیا تھا، اس کے بوسے لیے تھے اور اس کی زلفیں سنواری تھیں۔ یہ وہ ہستی نہ تھی جسے وہ چھوڑ کر امریکا گئے تھے۔ یہ تو اور کوئی اجنبی دنیا تھی۔

کچھ خاص پس انداز نہ کیا تھا۔ جو چیز دلی کو بھائی، خریدواں۔ پس انداز کی رقم بھی اس طرح غائب ہو گئی جیسے چھلنی سے ریت۔ ایک روز میں نے اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ لارنس باغ چلیں۔

مجھے ان کی درختوں اور لارنس باغ سے محبت کا علم تھا۔ وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔ ”مجھے درختوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں، یہ خود چل کر میرے پاس آ جاتے ہیں۔ درخت جانتے ہیں کہ انھیں کون پیر کرتا ہے سو یہ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس علاقے میں سب سے زیادہ درخت میرے گھر والی سڑک پر ہیں۔ یہ میں نے نہیں لگائے، خود ہی چلے آئے ہیں۔ سب سے پہلے سامنے سنبل کا درخت تھا، پھر اس کے بچے ہوئے، اب تو وہ پروادا ہے۔ اس کا پورا خاندان میری سڑک پر گھر کے سامنے آباد ہے۔ ان کی Polination میرے سامنے ہوئی ہے۔“ اس کے بعد ایک حیران کن واقعہ سنایا۔

لاہور کا ریڈیو اسٹیشن قیام پاکستان کے بعد ایک اہم ثقافتی مرکز بن گیا تھا۔ چون کہ اس دور میں ٹی وی تھا نہیں، فلم نے بہت ترقی کی تھی، تمام اہم ادیب شاعر یہیں اکٹھے ہوتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ فرمائش پر وہیں بیٹھے بیٹھے شہ کارڈر یا تحریر کر دیا جاتا۔ سارا دن ریڈیو اسٹیشن کی راہ داریوں میں جید علماء، معروف دانش ور و ادب کے زریں دور کے ادیب متحرک نظر آتے۔ برآمدوں میں اس ماہی کے باوجود ایک سکون ٹھیرا نظر آتا اور محسوس ہوتا۔ ایک تخلیقی تقدس کی پاس تھی۔

سر دیوں کے دن تھے۔ ریڈیو کی کینٹین لان میں تھی۔ سر دیوں کی دوپہروں میں دھوپ کی تمازت لان کے مختلف گوشوں میں بکھر جاتی تو ریڈیو کے لوگ کینٹین کے سامنے خوش گویوں کے لیے یہاں بیٹھ جاتے۔ ایسے میں شہر سے دیگر ادیب شاعر موسیقار بھی آ جاتے اور گویا محفل کا سماں ہو جاتا۔ لوگ ہانگ دھوپ تاپتے اور مالنے کنو، مونگ بھی اور دیگر میوہ جات سے لطف اندوز ہوتے۔ گر، گرم چائے سے کھٹکتے پیالوں میں مختلف میزوں پر بیٹھے لوگوں میں گردش کرتی رہتی۔

لان کے اطراف میں درخت پودے اور بلیں دیواروں پر جھکے رہتے یا انھیں سجائے رکھتے۔ دیوار کے ساتھ نہیں، در چلی کا ایک

(ہماری شادی محبت کی، مگر بھی محبت سے تغیر کیا تو روشنی بھی وہی چلے گی جس سے محبت ہوگی)

مزاج سے اختلاف ناراض کر دیتا کبھی کسی خاص کھانے کی خواہش ہوتی اور کھانا کچھ اور تیار کر دیا جاتا یا بے مزہ ہوتا تو خاموش رہتے مگر بے چینی صاف ظاہر ہو جاتی۔ کبھی بولتے ضرورت تھی اور خاصی ناراضی سے۔ بارش کا موسم ہوتا، اچھی موسیقی ہوتی یا ویسے ہی طبیعت سرشار ہوتی اور کوئی بجلی کے بل کا تذکرہ کر دیتا۔ ایسے میں باہر بارش کم برستی اور اندر وہ زیادہ برستے۔ برستے بھی ریحانہ پر جو چپ رہ کے طوفان بلا کے گزر جانے کا انتظار کرتیں۔

مزاج میں جہاں برہمی آ جاتی، وہیں مزاج بھی ڈرتا تھا۔

ایک مرتبہ گھر کے باہر پودوں کو پانی دے رہے تھے کہ تبلیغی جماعت کے چند لوگ آ گئے۔ انہوں نے ان سے بات کرنا چاہی تو اے حمید نے اپنے آپ کو ملازم ظاہر کیا۔ کہنے لگے کہ گھر والے باہر گئے ہوئے ہیں۔ تبلیغی جماعت والے اگلی منزل کی جانب چلے گئے اور یہ پودوں کو انجائی بنجیدگی سے پانی دیتے رہے۔

نئے الفاظ اور تراکیب تراشنا مشغلہ تھا۔ ان کے لکھے ٹی وی سیریل ”عینک والا جن“ کی بیل بتوڑی ناساں چوڑی ہو یا دیگر کردار۔ ایک جمعے کی دوپہر انہیں کہیں جانا تھا۔ نماز کا وقت تھا سو بچنے میں دیر ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر میزبان سے معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”جمعے کا شوٹو تھا، بہت رش تھا، سو دیر ہو گئی۔“

ان کی زیادہ دوستی ابن انشا، احمد راہی، حمید اختر اور ناصر کاظمی سے رہی۔ احمد راہی اور حمید اختر کا ذکر بے تکلفی سے کرتے جب کہ ناصر کاظمی محبت سے۔

کئی واقعات وہ اپنے کالموں اور کتابوں میں لکھ چکے تھے مگر ان کی زبانی سن کر گویا وہ سب کردار اور ماحول آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتے۔

ناصر کاظمی کی سب سے زیادہ دوستی پاک ٹی ہاؤس کے سامنے ایک درخت سے تھی جس سے وہ کھڑکی کے اس طرف بیٹھے باتیں بھی کیا کرتے۔

ایک روز بتانے لگے کہ ناصر کاظمی رات کے راہی تھے۔ رات گئے پاک ٹی ہاؤس بند ہو جاتا تو یہ دونوں شہر گردی پر نکل جاتے۔ ایسے میں ناصر پہ ایک سحر طاری ہو جاتا۔ ایک رات بارہ بجے کے قریب وہ میکلوڈ روڈ کی جانب سے آرہے تھے کہ جی پی او کی عمارت کے گنبد کے پیچھے پورا چاند ایک گول دسکتے چاندی کے تھال کی طرح سفید روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ناصر کاظمی پر جادو سا ہو گیا اور انہوں نے اپنا مشہور شعر وہیں کہا۔

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں

جس کو دیکھا اُسی کو پھوم لیا

بتانے لگے ناصر کاظمی خوابوں کی دنیا میں رہتے تھے چٹاں چٹا پی ذات اور زندگی کے متعلق جو بھی تصور کر لیتے، اسے خود ہی حقیقت مان لیتے۔ بعض اوقات زبیب داستان کچھ زیادہ بڑھ جاتی۔

”ایک روز ناصر بہت خوش تھا۔ میں نے خوشی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔ ”اے حمید میرے کرشن مگر کے گھر کی گلی میں انگور کی بیلیں ہیں جن پر انگور کے ریلے گھمے ٹٹکتے رہتے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے جب میرے بچے انگور کی اُن بیلوں کے نیچے سے گزرتے ہیں۔“ یہ علیحدہ بات ہے کہ اُس کی گلی میں انگوروں کی کوئی بیل نہ تھی۔“

”اسی طرح ایک روز میں باغ میں بیٹھا تھا۔ باغ میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ میری طرف بڑھا تو دھوپ کود کچھ کرڑک گیا



اور اس کے کنارے کنارے میں چلا آیا۔ میرے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ میلے کپڑوں میں لبوس تھا۔ میرے ساتھ آکر گم سم بیٹھ گیا۔ جب اُسے اس طرح چپ بیٹھے کافی دیر ہوگئی تو میں نے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ اُداسی سے کہنے لگا: یار میں روزانہ صبح ہاتھ میں اتنا کھاتا ہوں۔ آج صبح مجھے اتنا نہیں ملا اس لیے طبیعت بے چین ہے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب لاہور میں اتنا سم نہیں ملتے تھے۔

ناصر کاظمی بہت معصوم آدمی تھا اور جب کبھی بھڑ مارنے پر آتا تو ایسی بات کہہ جاتا جس پر اُس کا اپنا یقین کرنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ ایک روز کہنے لگا: ”یہ جو کرشن نگر میں میرا گھر ہے، انبالے میں اس سے بڑا تو میرا کبوتر خانہ تھا۔ اس کے بعد ناصر کا ایک واقعہ سنایا۔ جب ناصر امرت سر چھوڑ کر پاکستان کی جانب ہجرت کر رہا تھا تو اُس نے اپنے تمام کبوتروں کو آزاد کر دیا۔ گھر چھوڑتے وقت جب اُس نے مکان پر آخری نظر ڈالی تو کبوتر واپس لوٹ رہے تھے۔ وہ یقیناً گھر کو لوٹ آئے ہوں گے۔ انسوس وہ پرندے تو گھر لوٹ آئے۔ بے چارہ ناصر پھر کبھی گھر واپس نہ آیا۔“

اس دل گداز قصے کے بعد مسکرا کر کہنے لگے کہ ناصر کے ہاں کبوتر خانہ تو تھا مگر اس وسعت کا یقیناً نہ تھا جس کا ناصر نے نہ صرف دعویٰ کیا بلکہ شاید اپنے اس گمان پر یقین بھی کر لیا۔

”اُس دور میں اُدھار سم تھا۔ ایک روز ناصر کو پاک ٹی ہاؤس آنے میں دیر ہوگئی۔ میں نے تاخیر کی وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا کہ سامنے سے آنے کے بجائے وہ ٹیلا گنبد سے پچھلے حصے سے گھوم کر آیا ہے۔ ٹیلا پر واقع پان والے سے اُدھار چل رہا تھا جو کافی بڑھ گیا تھا۔ ناصر کہنے لگا کہ کچھل شب وہاں سے گزرا تو پان والے کی آنکھوں میں خون دیکھا تھا۔ وہ پان والا ایک بھلا مانس شخص تھا جو شاعروں ادیبوں کے ہاتھوں ویسے ہی نیم جان تھا۔ ناصر کاظمی کا مشاہدہ فقط تصوراتی تھا۔“

شہر گردی کا ایک اور واقعہ ہنستے ہوئے سنایا۔ ”میں اور ابن انشا لاہور کی سڑکوں پر مڑگشت کرتے ہوئے تصور کر لیتے جیسے ہم قدیم بغداد کے بازاروں اور محلوں میں چہل قدمی کر رہے ہیں۔ اندرون لاہور کی کسی نیم تاریک گلی سے گزرتے ہوئے انشا ٹک جاتا اور کہتا: یا شیخ! خلیفہ ہارون الرشید انھی گلیوں میں لوگوں کا حال معلوم کرنے کے لیے ہمیں بدلی کر پھر اکرتا تھا۔ اندرون لاہور میں کئی گلیاں یک دم بند ہو جاتی ہیں جنہیں غرق عام میں بند گلی کہا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ میں اور انشا اسی طرح مڑگشت کرتے ایک بند گلی کے اخیر میں پہنچ گئے جو کسی گھر کے صحن پر ختم ہوتی تھی۔ وہاں ایک عورت روٹیاں پکا رہی تھی جب کہ اُس کے ساتھ ایک شخص آرام کرسی پر نیم دراز کھڑے پینے میں مشغول تھا۔ ہمیں وہاں دیکھ کر اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا: ”کیوں میاں یہاں کیا کر رہے ہو۔“ انشا لا جواب ہو گیا تو میں بے اختیار بول اٹھا: ”ہم منور صاحب سے ملنے آئے ہیں“ کیا وہ یہاں رہتے ہیں؟ اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا: ”میں منور ہوں اور یہاں رہتا ہوں“ میں نے فوراً کہا: ”دراصل ہم مرزا منور قریشی سے ملنے آئے ہیں۔“ اُس نے بلاتال کہا: ”میں ہی مرزا منور قریشی ہوں۔“ اس کے بعد جو ہوا، وہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔“

”مولانا چراغ حسن حسرت بلند پایہ ادیب تھے، بذلہ سخ بھی خوب تھے۔ ایک مرتبہ میں اور دیگر نو جوان ادیب مولانا کے ہم راہ لاہور کے کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ ہم نے کچھ دیر پہلے چائے کا آرڈر دیا ہوا تھا۔ گفتگو جاری تھی کہ مولانا بے چین ہو کر کہنے لگے: چائے آنے میں خاصی تاخیر ہوگئی، جب ایک دوست نے ایک ویٹر کی جانب اشارہ کر کے پوچھا: ”مولانا کیا یہی سفید داڑھی والے ویٹر کو آپ نے آرڈر دیا تھا؟“

مولانا بے ساختہ بولے: ”ہاں یقیناً! لیکن جب میں نے آرڈر دیا تھا تب اس کی داڑھی سیاہ تھی۔“

سعادت حسن منٹو سے عزت اور مرجعیت کا رشتہ قائم رہا۔ افسانوں کی پہلی کتاب شائع ہو رہی تھی تو منٹو سے اس پر کچھ لکھنے کی

درخواست کی۔ منو نے بے اختیار کہا۔ "اے حمید بکواسی ہے جو کبھی کو دیکھ کر اس کے بھی عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" یہ بات اے حمید کو اتنی پسند آئی کہ اپنی کتاب کی پیشانی پر لکھ ڈالی۔

"منو کو میں نے کبھی خوش گفتاری کرتے نہیں دیکھا۔ میرا اُس کا کافی ساتھ رہا لیکن وہ میرے سامنے کبھی ہیرا منڈی نہیں گیا۔ وہ اپنے چند مخصوص الفاظ بولتا تھا لیکن ٹھیکہ گالی میں نے اُس کے منہ سے کبھی نہیں سنی۔ وہ عورت کی نفسیات کا حیران کن مشاہدہ رکھتا تھا اور نفسیاتی تجزیہ کرتا تھا۔ عورت اُس کی نظر میں مظلوم تھی۔ عورت کے لیے اس معاشرے میں اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لینا ضروری تھا۔ یہ ضرورت عورت کو ہر جائی کر دیتی تھی۔ وہ نئے رشتے کے بعد پرانے تعلق کو مکمل بھول جاتی۔ منو اعتدال سے شراب پیتا تھا۔ جب اُس کا بیٹا مرا تو میں نے اُسے بے انتہا دکھی دیکھا۔ غم غلط کرنے کے لیے وہ باقاعدہ شراب پینے لگا یہاں تک کہ شراب اُس کو پانی گئی۔"

ایک روز میں اُن سے ملنے گیا تو وہ اُداس دکھ رہے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو مجھے لہجے میں بولے "انشا اور ناصر بہت یاد آرہے ہیں۔ پچھلی تین دہائیوں میں خالی لوگ آئے ہیں۔ وہی دور اچھا اور قیمتی تھا۔ کیا کیا درویش اور فقیر تھے جو دانش ور بھی تھے اور جنہیں لوگ عزت بھی دیتے تھے۔ آج تو دولت ہی عزت کا معیار بن گئی ہے۔ پہلے لڑکیاں ننگے پیٹ کے ساتھ ساڑھیاں پہنے عام چلتی پھرتی تھیں۔ کسی کی نظر میں گندگی اور ہوس نہ ہوتی تھی۔ اب تو لوگ پورے لباس میں چلتی پچھیں کو نظروں سے نگا کر دیتے ہیں۔ اس معاشرے کی سب سے بڑی نا انصافی یہ ہے کہ یہاں عورت کو اس کا حق نہیں دیا جاتا۔ اگر کوئی شخص فوت ہو جاتا تو شاہینگی کا اور مشرقی اخلاقیات کا تقاضا سمجھ کر نہ صرف اس کی خطائیں معاف کر دی جاتیں بلکہ اس کا تذکرہ بھی محبوب سمجھا جاتا۔ کہا جاتا 'مرنے والے کو بڑا امت کہو کہ خدا اُس کا حساب کرتا ہے۔ اُس نے اس کی کھڑکیاں کھول دی ہیں۔"

سانس بھر کر بتانے لگے کہ آج بھی اُن پر جوانی کے اُس زمانے کا نشہ ہے، ایک ٹونہ بے خودی ہے جس کی وجہ سے 'میں تھکتا نہیں'۔ ادب کے حوالے سے اعجاز بٹالوی کی ایک نصیحت کو سند کا درجہ دیتے تھے کہ تیس برس کی عمر تک ہر کتاب پڑھو، لیکن پھر مزاج ہنالو اور مخصوص کتابیں پڑھو۔

اس کے علاوہ بین الاقوامی ادب میں جینوف سب سے زیادہ پسند تھا۔ اردو ادیبوں میں احمد علی، حجاب امتیاز علی اور سید رفیع حسین۔ سید رفیع حسین کی کتاب 'آئینہ حیرت' کا خاص ذکر کرتے۔ ان ادیبوں کی تحریریں اُن کے منفرد مزاج کی عکاسی کرتی تھیں۔ احمد علی مخصوص ادبی روایت سے جڑی تحریریں، حجاب امتیاز علی اسرار اور رومان میں ڈوبی دُھندلی لیکن دبیز قالینوں، بھاری ریٹھی پردوں، اخروٹ اور آمبوزی مسمریوں، گول کروں میں آتش دانوں کے سامنے جمائی لیتی سیامی بلیوں ایسی کہانیاں اور سید رفیع حسین جانوروں اور فطرت کے حیران کن حقیقی مشاہدے پر مشتمل افسانے لکھتے تھے۔ یہ سب اے حمید کے دل کے قریب تھا۔

دل کے قریب تو موسیقی بھی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ اچھے تخلیق کار کو موسیقی دل کا گداز اور خیال کی رفعت عطا کرتی ہے۔ ریڈیو سیلون پر ایک زمانے میں پرانے ہندوستانی گانے بہت شوق اور حسرت سے سنتے اور ماورائی دنیا میں چلے جاتے۔ اس کا حوالہ جا بے جا اُن کی تحریروں میں ملتا ہے۔ ایک روز کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے دھیمی موسیقی سن رہے تھے۔ کمرے میں صرف ایک لپ روشن تھا۔

مجھ سے کہنے لگے "موسیقی کے بغیر ادیب نامکمل رہتا ہے۔ ہندو بالکل درست کہتے ہیں 'سُر ایشور ہے'۔ یورپ میں پیاٹوگھر کا لازمی حصہ رہا ہے۔ مگر جاگروں میں بھی موسیقی ہوتی ہے اور مندروں میں بھی گھنٹیوں کی جل ترنگ۔ موسیقی ایک لہر ہے جو آدمی کو اٹھاتی ہے اور بلندی پر بادلوں کے نیچے لے جاتی ہے جہاں ایک طلسمی دنیا آباد ہوتی ہے۔ مجھے خاص طور پر کلاسیکی موسیقی بہت پسند ہے۔ بیگم اختر اور استاد

پرست علی خان صبح معنوں میں گلوکاری کی معراج پڑھتے۔ طفیل نیازی اور پرویز مہدی بھی ایسے گلوکار رہے۔ ایک دور میں مجھے فلموں کا بھی بہت شوق تھا اور میں سینما میں جا کر پہلا شوق دیکھتا اور کئی روز تک ان فلموں کے پھوکے منتر کے بحر میں رہتا۔ خاص کر اُن کے گانے اور رنگین مناظر میرے اندر گدگدی سی کرتے رہتے۔“

اُن کے گزر جانے کے بعد ایک مرتبہ میں اُن کے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا انھیں یاد کر رہا تھا تو بتایا گیا کہ ’کامی والا‘ فلم میں منڈے کا گانا

اے میرے پیارے وطن

اے میرے بگڑے وطن

تجھ پہ دل قربان

سن کر امرت سرگودیا دکر کے اُن کی آنکھوں میں حقیقی آنسو آجاتے تھے۔

میں نے پوچھا کیا وجہ تھی کہ امرت سر سے ہجرت کے بعد وہ دوبارہ اپنے وطن مالوہ کو نہ گئے تو ایک حیران کن انکشاف ہوا۔ تقسیم کی قتل و غارت گری نے اُن کی روح اس حد تک زخمی کر دی تھی کہ اُن کے دل میں ہندوستان سے ایک دوری پیدا ہو گئی۔ انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے انسانیت کے وحشی پہلو کو اس بے شرمی سے برہنہ ہوتے دیکھ لیا تھا کہ اُن کا لطیف مزاج اور گداز دل اس کی تاب آخروم تک نہ لاسکا اور ان سے قطرہ قطرہ ہوش پکٹا رہا۔

نازک مزاجی کی وجہ سے گھر میں ایک خاموشی ٹھہری رہتی۔ اُن کے کمرے میں جہاں وہ لکھتے، پڑھتے، آرام کرتے اور سوتے تھے کسی کو جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ دروازہ بند ہونے کی ادنیٰ آواز، گھر میں چھوٹے بچوں کا شور اور سڑک سے گزرتے رکشے کی مٹھٹ مٹھٹ سن کر چہرے پر ایسے تاثرات آجاتے جیسے کسی نے زور سے چنگی بھری ہو۔ وہ ایک دن میں بارہ گھنٹے بلا تکان لکھتے۔ اُن تھک محنت سے انھوں نے ہزاروں صفحات لکھے جس کی وجہ سے انھیں معیار پر بھی سمجھوتا کرنا پڑ جاتا۔ ارتکاز کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ اپنے نواسے کو نواسیوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ ان کے کھیل کود سے انھیں ذہنی کوفت ہوتی۔ موڈ بحال ہونے میں خاصا وقت لگتا۔

وقت تو تب بھی بہت لگا تھا جب میں اٹلاشا کے ’ہارنر اینڈ لونبرگ‘ نامی کتب خانے میں کتابیں دیکھتا تھا اور ہر رات میں آسمان سے بارش کے سوگوار قطرے سڑکیں اور عمارتیں گیلایا کرتے تھے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ میرے وطن پاک دہند کی بارشوں، موسموں، پھولوں، پھولوں اور لوگوں میں کیا خاص انفرادی مہک ہے جو امریکا میں ندارد ہے۔ مگر اُس وقت میں یہ نہیں سوچ رہا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے مجھے خبر ملی تھی کہ اے حمید 83 برس کی عمر میں گردوں کے عارضے کے باعث گزر گئے۔ ابھی آخری ملاقات میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انھوں نے بہت کچھ لکھنا ہے۔

میرا ذہن کچھ بھی نہیں سوچتا تھا، پس فی کی ایک چادر تھی جو وجود کے اندر روح کے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔

اٹلاشا کی وہ تاریک رات، وہ سوگوار بارش اور وہ نیم ویران کتب خانہ میں کیسے بھول سکتا ہوں جہاں پناہ لینے کو میں بے وجہ اپنے

ہونٹ سے چلا آیا تھا۔

اے حمید نے ایک مرتبہ انتظار حسین سے کہا تھا ”مجھے نیند بہت اچھی لگتی ہے۔ مجھے سونا اس لیے اچھا لگتا ہے کیوں کہ اس طرح مجھے

خواب آتے ہیں اور میں خوابوں میں رنگوں، کولہو اور امرت سر کا سفر کرتا ہوں۔ آہ میں کس طرح امرت سر بھول سکتا ہوں۔ وہاں میں خوب صورت لڑکیوں کو دیکھتا ہوں، بارش کی سوندھی خوشبو مجھے مہکاتی ہے اور میں گیلے درختوں کے نیچے روشوں پر بکھرے پتوں کے قالینوں پر چلتا

ہوں۔ صرف تب، آہ صرف تب!“

اے حمید آواگون پر یقین رکھتے تھے۔ جب میں گرمیوں کی بارش کی پھوار میں بھیک جاتا ہوں سردیوں میں کسی پہاڑی قبوہ خانے میں انگیٹھی پر پکتی چائے کی نشہ آور مہک سوگھتا ہوں کھلے آسمان تلے کے ایل سہگل کے گانے سنتا ہوں، کسی ریسٹوران میں وجیہ اور خوش پوشاک شخص کو کونے کی میز پر کسی خاتون سے رومانوی اور نفیس انداز میں گفتگو کرتے دیکھتا ہوں، کسی باپ کو ننھی سی بیٹی کو کمر سے لپٹائے سکوتر پر جاتے دیکھتا ہوں یا بے وجہ کی کسک دل کو آنچ دیے لگتی ہے تو اے حمید کا خیال آ جاتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ شاید انھوں نے دنیا کے کسی اور خطے میں خوب صورت معصوم کھلکھلاتے بچے کی شکل میں جہنم لے لیا ہو یا شاید وہ ابھی انتظار میں ہوں، جیسے دُور دراز کے قصبے کے ویران ریلوے اسٹیشن کے سال خوردہ مہمان خانے میں دودھیا بھاپ اڑاتے انجن والی ریل کار کا انتظار کرتے تھے، تاکہ بہشت کے باغات میں دوبارہ جہنم لیں اور اب کی بار کسی گھنیرے درخت یا مہکتے پھول کی شکل میں جہنم لیں۔



شیر

احمد فراز



فرآز صاحب نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "میری شہرت اچھے شاعر کی ہے لیکن میرا اصل کمال شاعری نہیں کچھ اور ہے۔"  
 "وہ کیا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تخصص اور پلاٹوں میں بہترین سرمایہ کاری اسی لیے میں شاعروں میں سب سے امیر شاعر ہوں۔"  
 گرمیوں کی ایک دوپہر سہ ماہی "معاصر" کے دفتر میں دیسی گھی میں بھنے گوشت اور کلچے کھانے کے بعد سگریٹ سلگاتے اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے احمد فرآز نے یہ بات سرسری انداز میں کہی تو قہقہے بلند ہوئے اور موضوع بدل گیا۔  
 احمد فرآز سے میری زیادہ ملاقاتیں تو نہ رہیں۔ جو رہیں، اُن میں سے بیش تر اتنی بھرپور تھیں کہ اُن کا نقش میرے دل و دماغ پر یوں مرتب ہے جیسے آج بھی ساتھ کے کمرے سے اُن کے زندہ قہقہے اور بھاری آنکھیں آواز سنائی دے رہی ہوں۔

فرآز صاحب سے میری پہلی ملاقات مجلس ترقی ادب کے دفتر میں ہوئی تھی۔ وکٹورین طرز کی یہ عمارت لاہور میں جی ادا کے سرسبز علاقے کے پرسکون گوشے میں واقع ہے جسے ایک وسیع خورد و پھولوں اور جھاڑیوں بھرا میدان مال روڈ سے جدا کرتا اور اس کے ارد گرد اونچے گھنے قدیم درخت پرندوں کی چچہاٹ سے اپنے وجود کا احساس دلاتے رہے ہیں۔ یہ عمارت احمد ندیم قاسمی صاحب کے معروف ادبی سہ ماہی "نئون" کے دفتر کا بھی درجہ حاصل کر چکی تھی۔ میں وہاں زمانہ طالب علمی سے قریباً ہر ہفتے جایا کرتا تھا۔ ایک روز حسب معمول قاسمی صاحب سے ملاقات کے لیے گیا تو پرانے چوبی دروازے کی درزوں سے بہہ کر باہر آتے بھرپور قہقہوں اور مکمل جملوں نے میرے قدم روک دیے۔ میں نے جھپکتے ہوئے قدم بڑھائے اور دروازہ کھولا تو سامنے احمد ندیم قاسمی صاحب چند لوگوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر قاسمی صاحب کی آنکھوں میں شناسائی اور محبت کی چمک اُٹھ آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُن سے مصافحہ کیا اور قریب ہی بیٹھنے کو تھا کہ ایک صاحب سے نظریں دوچار ہوئیں۔ وہ گفتگو یا لے بالوں اور شرارتی مسکراہٹ والے صاحب احمد فرآز تھے۔ اُس وقت کمرے میں غالباً جلیل عالی، تنسیم منٹو اور منصورہ احمد بھی موجود تھے۔ کسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ جب میں نے توجہ سے سنا تو فرآز صاحب کہہ رہے تھے۔

"ایک تو یہ ایر پورٹ حکام ہر بار میری شراب پکڑ لیتے ہیں۔"

اس پر منصورہ نے لقمہ دیا۔ "آپ انھیں نہ بتایا کریں کہ آپ بوتلیں لے کر آ رہے ہیں۔"

فرآز صاحب نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور مسکراتے ہوئے بولے۔ "یہی تو مسئلہ ہے۔ جہاز کے مسافروں میں میری شکل دیکھتے ہی حکام کہتے ہیں اور کوئی ہونہ ہو یہ کم بخت فرآز شراب کی بوتلیں ضرور ساتھ لارہا ہوگا۔ چٹاں چوہ میری طرف یوں لپکتے ہیں جیسے شکاری شکار کی طرف اور ہر مرتبہ مجھ سے بوتلیں برآمد ہو جاتی ہیں۔"

فرآز صاحب نے بات مکمل کی تو قہقہے گونج اُٹھے۔ انھوں نے قاسمی صاحب کو شرارت سے دیکھا اور بولے۔ "عرصہ پہلے قاسمی صاحب کے گردے میں پتھری ہو گئی۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ یہ پانچ سات لیٹر بیئر لیں، پتھری خود بہ خود نکل جائے گی۔"

قاسمی صاحب جو شراب سے مکمل پرہیز کرتے تھے، بے اختیار بول اُٹھے "لاحول ولا قوۃ۔"

اُن کی بے ساختگی پر بھی مسکرا اُٹھے۔

اُس محفل میں کافی دیر لطائف اور چٹپٹے چلتے رہے، جملے گئے جاتے رہے اور ماحول میں گفتگو کی مہک آدور پھوار برپا رہی، یہاں تک کہ قاسمی صاحب تھک کر قیلو لے کے لیے لیٹ گئے اور سب نے رخصت چاہی۔

اُس تعارفی ملاقات کے بعد فرآز صاحب سے مجلس ترقی ادب، ادبی رسائل کے وقار کے علاوہ لاہور، جم خانہ اور دیگر مقامات پر کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ابتدائی چند رسی اور بعد کی بیش تر بے تکلفانہ ملاقاتیں۔

فرآز کو دیکھ کر یوں لگتا جیسے ایک لڑکے کو پختہ چہرہ دے دیا گیا ہو۔ اُن کی جملہ بازیوں نے چند احباب کو وقتی طور پر جڑ کیا ہو لیکن اُن

کے اندر کا عاجز اور معاملہ فہم انسان وقتی جذبات پر قابو پا کر ایک سنجیدہ اور عاجز رخ کو سامنے لے ہی آتا۔ وہ ایک متین اور باادب آدمی ہوتا۔ جولائی میں فراز صاحب اور چند دوسرے شعرا اور ادیبوں کے ساتھ مجلس کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس روز احمد ندیم قاسمی صاحب ایک خاص موڈ میں اپنے شعر سنارہے تھے۔ وہ سناچکے تو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور قاسمی صاحب فون پر معروف ہو گئے۔ ایک خاتون شاعرہ نے ہولے سے فراز صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنا تازہ کلام سنائیں۔ فراز نے احمد ندیم قاسمی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اپنے سینئر شاعر اور استاد کے سامنے شعر سناتا ہے ادبی سمجھتے ہیں۔

ایک دفعہ لاہور جم خانے میں ایک محفل منعقد کی گئی، فراز بھی مدعو تھے۔ گرمیوں کا موسم، چھٹی کا دن اور بعد دوپہر کا وقت، شہر سستا رہا تھا، سڑکوں پر ٹریفک بھی نہ تھی۔ ایک سکون اور قدرے کاہلی کا سا حال تھا اور محفل میں ایک خاص شائق تھی۔ اسے سی کی ویسی گزراہٹ میں دوپہر کے مرغن کھانے، ٹھنڈے انور رٹول آموں سے شغف کے بعد فراز صاحب نے جیب سے سگریٹ نکالا، اُس کا فلٹر پانی میں ڈبو کر ترکیا اور سلگانے کے لیے ماچس یا لائٹر تلاش کرنے لگے۔ میں قریب بیٹھا تھا۔ پہلی مرتبہ فراز صاحب کو سگریٹ ترکرتے دیکھا تھا تو پوچھ بیٹھا۔

”یہ آپ نے سگریٹ کو گیلا کیوں کیا؟“ یہ سن کر احمد ندیم قاسمی صاحب مسکرا دیے۔ میں نے دونوں کو حیرت اور الجھی نظروں سے دیکھا تو فراز صاحب نے کہا۔

”قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ میں سگریٹ کو استنجا کر داتا ہوں۔“

یہ اُسی محفل کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے فراز صاحب سے اُن کی ایک مشہور نظم سنانے پر اصرار کیا۔ فراز صاحب نے قاسمی صاحب کو دیکھا اور پوچھا۔ ”اجازت ہے؟“ قاسمی صاحب نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہل دیا اور کمرے میں فراز کی بھاری آہنوسی آواز سحر طاری کرنے لگی۔

صاحب طرز شاعر، دانش ور اور میرے ہم دم دیرینہ افتخار بخاری صاحب نے مجھے چند واقعات سنائے۔

راول پنڈی کا قصہ ہے۔ حلقہٴ اربابِ ذوق میں ایک کتاب کی تعارفی تقریب تھی۔ شاعر یاسین قدرت صاحب تھے اور کتاب کا نام غالباً نیلی آنکھ کا ارٹنگ تھا۔ شرکائے محفل اور سامعین میں فراز صاحب بھی شامل تھے۔ مختلف ادیبوں نے کتاب پر اظہارِ خیال کیا۔ صاحب کتاب کے کلام سنانے کی باری آئی تو فراز نے یاسین قدرت صاحب کے اشعار پر داد دینی شروع کی اور داد دیتے ہوئے کہنے لگے ”سبحان تیری قدرت۔“ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا، یہاں تک کہ ایک مقام پر فراز نے شاعر کو با آواز بلند مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی کتاب کا نام سورۃ یٰسین ہونا چاہیے۔“ یہ سن کر شاعر جواباً مسکرا رہے تھے، جھنجھل گئے اور یہ کہتے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھ گئے ”میں اتنے عالی مرتبت شاعر کے سامنے کلام سنانے کی جسارت کر رہا ہوں جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اب میں احمد فراز صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اپنا کلام سنائیں۔“ اتنا سننا تھا کہ فراز صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے نہ صرف کھڑے ہو کر بلکہ بعد ازاں شاعر کے پاس جا کر تمام تر متانت سے معذرت کی۔

”ایسی جملے بازیوں کا مقصد کسی کو بے مزہ کرنا نہ ہوتا تھا بلکہ ان سے لطف لینا ہوتا تھا۔ وہ بس ایسے ہی تھے۔ خالص، کھرے، افتخار بخاری صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے اضافہ کیا۔

”وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے اور کئی نوجوان شعرا کو بھرپور داد دے کر اُن کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک شاعر نے میں فراز کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔ میں نے ایک شعر پڑھا۔

جھانکتا ہوں جب کبھی خود میں لرز جاتا ہوں میں  
اپنے اندر کھینچتی ہے میری گہرائی مجھے

اُس پر انھوں نے مجھے بہت داد دی۔ مشاعرے کے بعد کہنے لگے کہ تمہارے اس شعر سے مجھے فلسفی بیٹے کا جملہ یاد آ گیا ہے۔

when you look deep into an abyss, the abyss also looks into you.

(جب تم خلا میں جھانک کر گہری نظر سے دیکھتے ہو تو خلا بھی تمہیں ایک گہری نظر سے دیکھتا ہے)

بخاری صاحب نے ایک اور واقعہ سنایا۔

”واہ کینٹ میں ایک مشاعرے میں راول پنڈی کے قریب اسی اہم شعر ادا ہوئے۔ فرآز صاحب نے اپنی ایک مشہور نظم کا شعر پڑھا۔

کہاں کی آنکھیں کہ اب تو چہرے پہ آبلے ہیں

اور آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے

مشاعرے کے اختتام پر چائے کی میز پر میں نے فرآز صاحب سے پوچھا۔ ”کیا خواب دیکھنے کے لیے آنکھیں ضروری ہوتی ہیں؟“ وہ

سوچ میں پڑ گئے اور کہنے لگے۔ ”یہ بات تو میں نے کبھی سوچی ہی نہیں۔“ اس کے بعد قہقہہ لگا کر کہنے لگے۔ ”دیے اس شعر پر داد بہت ملتی ہے۔“

مگر چہ آبلے تو فرآز کے چہرے پر بھی آ گئے تھے لیکن اُس شاعر اُمید نے خواب دیکھنے نہ چھوڑے تھے۔ ایک سہ پہر جب ابھی

پرندے گھونسلوں کو لٹا کر شروع نہ ہوئے تھے اور سورج کی نرم روشنی آسمان کے گنبد نیلوفر پر عکس ڈالتی تھی کہ میں، فرآز اور احمد ندیم قاسمی صاحب

’مجلس‘ کے قدیم و کنورین دفتر کے ٹھنڈے نیم اندھیرے میں باتیں کرتے تھے۔ لمبے آہنی راڈ سے لٹکتے پرانے پتکے کی ہلکی گھر گھر رماحول میں

قدامت کا احساس گھول رہی تھی۔ میں نے فرآز صاحب کے ایام اسیری اور جلاوطنی کا تذکرہ کر دیا۔ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو گئے اور اپنا دل

میرے سامنے کھول دیا۔ احمد ندیم قاسمی اُن کے راز داں اور ہم دردی کا چھلکتا بیانا نہ تھے۔

”فیاء الحق نے بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹ کر ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں جمہور کی آواز تھا اور عوام میں سے تھا سو اُن کی آواز بول

رہا تھا۔ مزاحمتی شاعری لکھ رہا تھا اور پڑھ رہا تھا۔ فیاء الحق کو میری آزادی گفتار اور نمائندگی جمہور نہ بھائی۔ ایک دن مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میری آنکھوں

پر پٹی باندھ دی گئی اور مجھے فوجی جیپ میں بٹھو دیا گیا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ مجھے شہر ہی میں کہیں لے جا رہے ہیں۔ جیپ کافی دیر چلتی رہی تو

مجھے احساس ہوا کہ ہم شہر سے باہر جا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد جیپ ناہموار سے پرچنے لگی۔ اُس کی رفتار آہستہ ہو گئی اور بلندی پر چڑھنے لگی۔ چڑھتے

چڑھتے وہ ڈھلان پر اترنے لگی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم کسی پہاڑی مقام پر سفر کر رہے ہیں۔ خاصی دیر سفر کرنے کے بعد جیپ ایک مقام پر

رُک گئی۔ مجھے اتارا گیا، ہاتھ کی بندشیں کھولی گئیں اور آنکھوں سے پٹی اتاری گئی۔ مجھے شک تھا کہ وہ انک کا قلعہ ہے۔ جب میری آنکھیں ماحول

سے مانوس ہوئیں تو معلوم ہوا کہ وہ قلعہ انک نہیں تھا۔ وہ تو بلندی پر واقع ہے اور اُس سے نیچے بل کھاتی سڑک نظر آتی ہے۔ اس مقام پر سڑک سطح

زمین سے برابر گزرتی تھی۔ بعد میں ایک فوجی نے بتایا کہ وہ انسپکٹ تھا۔ وہاں پر ایک میجر مجھے ’وصول‘ کرنے پر مامور تھا۔ جیپ سے اترنے کے

بعد وہ خاصی دیر مجھے دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ بالآخر اُس نے سوالیہ انداز میں پوچھا ’احمد فرآز؟‘ اُس پر میں نے اُسے جواب دیا کہ

اُسے بہتر معلوم ہونا چاہیے۔ میجر نے کہا کہ اُسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ میں آ رہا ہوں بلکہ کہا گیا تھا کہ ایک ملک دشمن ایجنٹ کو لایا جا رہا ہے۔“

”پھر کیا ہوا؟“ میجر نے سوال میں تشویش تھی۔

”قید سے رہائی کے بعد میں جلاوطنی میں درجہ درجہ ہوتا رہا۔ میں نے چھ برس انگلینڈ اور دوسرے ملکوں میں گزارے۔ کوئی باقاعدہ

ملازمت تو تھی نہیں چنانچہ خاصی مشکل رہتی۔“

”انگلینڈ میں کوئی غم خوار ملا؟“

”لندن میں زہرا نگاہ نے میرا بہت خیال رکھا۔ وہ میرے حالات سے واقف تھی سو مجھے زبردستی اپنے گھر لے جاتی، خوب خاطر

مددات کرتی، اچھے کھانے کھلاتی اور مجھے حوصلہ دیتی۔ بہت اچھی عورت ہے۔“ فرآز نے اپنا نیت اور منونیت سے کہا۔



اس شب خون، قید اور جلاوطنی نے فراز میں حد درجہ کڑواہٹ بھردی تھی۔ وہ جمہور کی آواز سے ہٹ کر ذاتی صدوں کی وجہ سے غضب ناک ہو جاتے۔

قدرت کے بھی عجیب سلسلے ہیں کہ اُسی فراز کے بیٹے سعدی نے فوج میں کمیشن لیا۔

وقت نے فراز کے زخم خاصی حد تک مندمل تو کر دیے، مکمل بھرے نہیں۔ یہ اس حد تک مندمل ہو گئے کہ پرویز مشرف کے دور اقتدار میں فراز نے باقاعدہ سرکاری عہدہ قبول کیا۔ ایک مرتبہ اس بارے میں لاہور میں ایک اتفاقی ملاقات کے دوران بات ہوئی تو انھوں نے مشرف کی اُن پالیسیوں کی تعریف کی جو معاشرے میں اعتدال لانے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ایک فوجی حکومت میں ملازمت کے حوالے سے قیام الفاظ میں ایک دوست نے پوچھا تو اُن کا کہنا تھا۔ ”اچھا کام کسی بھی دور میں کرنے کی کوشش کرنا ایک قابلِ قدر بات ہے۔ اگر کبھی کام کے لوگ ایک مخصوص دور میں خاموش اور کنارہ کش ہو جائیں گے تو میدانِ ابنِ الوقتوں اور ناکارہ لوگوں کے لیے خالی ہو جائے گا۔“ اُن کا یہ کہنا بھی تھا کہ لازم نہیں کہ ایک سرکاری ملازم حکومت و وقت کی پالیسیوں سے مکمل طور پر متفق ہو۔ اس معاملے میں فیض صاحب کی مثال دی جنھوں نے برطانوی فوج میں ملازمت کی تھی۔ پابلو تیردوا جیسے شہرہ آفاق مزاحمتی شاعر نے بھی ایک آمرانہ حکومت کے دور میں ملازمت اختیار کی تھی۔ گو فراز صاحب کے دلائل منطقی تھے لیکن اُن کا لہجہ مضبوط نہ تھا۔ وہ شاید خود اپنے دلائل سے مطمئن نہ تھے۔

بعد ازاں فراز نے مشرف حکومت سے نہ صرف اپنے رستے الگ کر لیے بلکہ عدلیہ کی آزادی کی تحریک میں حکومت کے خلاف متحرک کردار ادا کیا۔ اسی تحریک کے دوران ایک واقعہ ہوا۔ اس کے راوی فراز کے قریبی دوست نوید زیدی ہیں۔

فراز صاحب ایک احتجاجی کیمپ میں شرکت کے لیے اپنے چند دوستوں کے ہم راہ جا رہے تھے۔ سامنے سے جنرل حیدر گل اپنے اہل خانہ کے ہم راہ آتے دکھائی دیے۔ اُن جنرل کا افغان جہاد میں کلیدی کردار رہا تھا۔ فراز کو دیکھ کر وہ ان کی جانب معانقے کے لیے بڑھے اور بولے کہ گو ان کے نظریات اور مزاج مختلف ہیں مگر مقاصد مشترک ہیں۔ فراز ایک جانب ہو کر اُن کی بغل سے چھوتے ہوئے یہ کہہ کر نکل گئے ”چھوڑیں گلے کیا ملنا۔ آپ نے آمرانہ حکومتیں اور اتحاد تخلیق کیے اور ان کا ساتھ دیا۔“

فراز صاحب بھٹو صاحب کے نزدیک رہے اور بے نظیر بھٹو کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نگرانِ وزیرِ اعظم بنے تو ان سے یہ کہتے ہوئے ناراض ہو گئے ”جتوئی نے بے نظیر بھٹو کی جگہ لی ہے۔“

فراز سرد و گرم چشیدہ اور وقت کے جوارِ بھانے کے باخس رہے تھے سو نو لوہارِ دانِ سیاست کو زیادہ اچھی طرح نہ جانتے تھے۔ ایک روز میرٹھ ہوٹل اسلام آباد کی لابی میں چند دوستوں کے ہم راہ جا رہے تھے کہ رحمان ملک صاحب سے سامنا ہو گیا۔ فراز صاحب انھیں پہچانے نہیں اور رسمی سلام دعا کے بعد جانے لگے تو رحمان ملک صاحب نے ان سے آئندہ دنوں میں ملاقات کی درخواست کی۔ انھوں نے ملک صاحب کا موبائل فون نمبر محفوظ کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے موبائل کے چند نمبر دبائے اور رخصت ہو گئے۔ بعد میں دوستوں نے انھیں بتایا کہ وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے ایک اہم عہدے دار مشیرِ داخلہ رحمان ملک تھے۔

چند روز بعد دونوں کی پھر ملاقات ہوئی تو رحمان ملک صاحب نے دوبارہ ملاقات کی درخواست کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے پچھلی مرتبہ میرا نمبر صحیح طرح محفوظ نہیں کیا تھا، اب کر لیجیے۔“ فراز صاحب نے اُن کا نمبر محفوظ کر لیا اور رحمان ملک صاحب کی ذہانت اور یادداشت کے قائل ہوتے ہوئے کہا۔ ”تیز اور ذہین آدمی ہے۔“

ایک مرتبہ عطاء الحق قاسمی صاحب نے مجھے وارث روڈ پر ”معاصر“ کے دفتر میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ میں وہاں پہنچا تو فراز صاحب کو پہلے سے موجود پا کر خوش گوار حیرت سے دوچار ہوا۔

اُن چند گفتگوں کے دوران فراز صاحب اپنے مزاج کے جوہر پر تھے۔ انھوں نے بے شمار واقعات سنائے، کئی حقائق کا انکشاف

کیا اور سیاست پر رائے کا اظہار کیا۔

گفتگو کے دوران انھوں نے کچھ ڈھونڈتے ہوئے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو ایک چھوٹی سی ڈائری باہر گر پڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر ڈائری انھیں پکڑائی تو مسکراتے ہوئے بولے ”یہ میری سب سے قیمتی چیز ہے۔ جب کبھی سفر میں یا کہیں بیٹھے کوئی شعر ذہن میں آتا ہے تو اس میں کچھ لیتا ہوں۔“ میں نے پوچھا کہ ان کے کئی اشعار میں ایک صاحب مطالعہ شاعر نظر آتا ہے تو انھوں نے بتایا کہ وہ رات گئے تک کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ میں نے ایک انٹرویو کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ گنتی کے چند دن کے سوا انھوں نے روزانہ پلہ ہے، سو یہ مطالعہ کیسا؟

فراز نے سنجیدگی سے بتایا کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ مد ہوشی کی حد تک پیتے ہوں، بس دو پیگ پیتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں اور پھر مطالعہ کرتے ہیں۔

”یعنی کوئی ٹیلا اور پلائے تو آپ حساب نہیں رکھتے۔“ میں نے شگفتہ چوٹ کی تو بولے۔

”میر بانوں کا دل نہیں توڑتا۔“

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ایک یونانی کہاوت ہے۔ ”کوئی گیت لمبی عمر نہیں پاسکتا اور زیادہ دیر سرت نہیں بخش سکتا اگر اُسے کوئی ایسا شاعر لکھے جو پینے میں فقط پانی پیتا ہو۔“ اس کہاوت کا سہرا اردو کے کئی نام و ر شعر اباندھے نظر آتے ہیں۔ غالب، جوش، عدم، شیرانی، جگر، فیض، راشد، فراز، منیر اور جون کے علاوہ کئی دیگر شعرا۔

فراز صاحب نے یہ بھی بتایا کہ انھیں اردو پر دسترس، فارسی کی سمجھ کے علاوہ عربی کی اس حد تک سوجھ بوجھ ہے کہ وہ قرآن پاک کی آیات بہ خوبی، بغیر کسی لغت یا ترجمے کے، سمجھ لیتے ہیں۔

شاعری میں زبان پر قدرت اور اس کی تفہیم جزو لازم ہے۔ کوئی شاعر اچھا شاعر نہیں بن سکتا تا وقتیکہ وہ زبان پر اس حد تک عبور نہیں حاصل کر لیتا کہ نئی تراکیب ایجاد کر سکے۔ آڈن نے اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”ایک شاعر تمام اوصاف دیگر سے پہلے، زبان سے بخونانہ عشق میں جھلا ہوتا ہے۔“

الفاظ کے صوتی آہنگ اور تاثیر پر قدرت ایک شاعر کو اس حد تک پڑا اثر کر دیتے ہیں کہ بہ قول ٹی۔ ایس۔ ایلینٹ ”حقیقی شاعری سمجھ آنے سے قبل ہی اثر کر جاتی ہے۔“

اس ملاقات میں میں نے ایک ٹیکہ تبصرہ کیا کہ ان کی ایامِ ادائل کی شاعری، تازہ شاعری سے زیادہ مقبول ہے تو بولے۔

”اجمے گلوکار ہی نہ رہے۔ میری تازہ شاعری پہلے کی شاعری سے بہتر ہی ہے۔ انھیں مقبول بنانے والے استاد موسیقار اور گلوکار

کہاں سے لائیں۔“

احمد فراز جنوری 1931 میں کوہاٹ میں اپنے وقت کے مستند ادیب سید محمد شاہ برق کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کا نام سید احمد شاہ رکھا گیا اور ان کے چھوٹے بھائی کا سید مسعود کوثر رکھا گیا۔ وہ کل چار بہن بھائی تھے۔ برق صاحب کیا جانتے ہوں گے کہ دیگر کے علاوہ ان کا ایک بیٹا شاعری میں دائمی نام پیدا کرے گا اور دوسرا اسی صوبہ سرحد کی گورنری پر متمکن ہوگا۔ فارسی اس خاندان کی گنجش میں تھی۔ ایڈورڈ کالج سے فراز نے اردو اور فارسی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ فراز نے ادبی ذوق جینیاتی وراثت میں پایا۔ فراز صاحب نے مجھے اپنی شاعری کی ابتدا کے حوالے سے ایک دل چسپ بات بتائی۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ان کے والد اپنے دونوں بیٹوں کے لیے عید کے کپڑے لے کر آئے۔ فراز کو اپنے کپڑے پسند نہ آئے البتہ اپنے بڑے بھائی کے کپڑے خاصے پسند آئے۔ انھوں نے پہلا شعر اُس موقع پر کہا جس میں اپنے کم تر کپڑوں کے حوالے سے طنز تھا۔

اُن کے والد نے شعر سنا تو ہنس دیے اور انھیں سننے پکڑے لادے۔

جو والدہ فرات صاحب نے مجھے سنایا، کچھ یوں تھا کہ اپنے طبعی رجحان کے باعث وہ اسکول میں بیت بازی کے مقابلوں میں باقاعدگی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ وہ مقابلے میں خاصے کامیاب رہتے لیکن اپنی ایک ہم جماعت لڑکی سے آخر میں مقابلہ ہار جاتے۔ بے شمار اشعار کو یاد رکھنے اور ہر حرف سے شروع ہونے والے اشعار فی الفور پڑھ دینے کی وقت سے تنگ آ کر فرات نے فی البدیہہ اشعار تخلیق کر کے کہنے شروع کیے۔ بعد میں اس فن میں مشق کی وجہ سے اتنے طاق ہوئے کہ اشعار کہنا اُن کے لیے مسئلہ نہ رہا۔

ابتدا میں فرات نے اپنا شعری نام ”شرر برقی“ رکھ جسے بعد ازاں احمد فرات میں بدل دیا۔ وہ منٹ کھٹ طالب علم جو اشعار بیت بازی کے لیے گھڑا شروع ہوا تھا، بہت جلد تعلیمی اداروں میں شہرت حاصل کرنا علاقائی مدار سے نکلا اور پہلے شعری مجموعے ”تہا تہا“ کے منظر عام پر آنے سے پچاس کی دہائی میں قومی آفت پر دکنے لگا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ”تہا تہا“ کا عنوان ایک امتر ہوت تہائی کی علامت ہے جو کسی کسی تخلیق کار کے ساتھ عمر بھر سفر کرتی ہے۔ مغربی شعرا میں سے ایک بیٹس Yeats نے سچ شاعر کے حوالے سے کہا تھا۔ ”ایک سچا شاعر دُور میں ہوتا ہے اور بھلے دوستوں میں ہو یا نہ ہو، وہ ہر دم ایسا ہی تہا ہوتا ہے جیسا ستر مرگ پر۔“ اردو زبان میں سرحد کے کسی شاعر نے ایسی عمدہ شاعری نہ کی تھی۔ اردو شاعری پر اب تک اردو اور پنجابی شعرا کی اجارہ داری تھی جسے ایک پختون بچے نے ٹھوکر سے توڑ ڈالا۔ اُس کے ابتدائی سخن سے ایک روایتی شاعری واما وھیما دھیما رو، ان لہرا تاں کل کھا تاں موبہا تاں تھا۔

سر سبز پہاڑوں، میدانوں اور دیوانوں میں سنے کو ہاٹ کا پچہ قدرت کی گود میں کھیل کر جوان ہوا۔ چلی کے صاحب طرز بڑے شاعر پابلو نیرودا نے کہا تھا ”میں اس ہستی میں پیدا ہوا ہوں میری شاعری نے پہاڑوں اور دریاؤں کے درمیان جنم لیا، بارشوں نے اسے آواز بخشی اور جنگلی ٹکڑی کی طرح اس نے جنگل کے بیچ پروان چڑھا۔“ ایسے کھلے وسیع نیلوں کے بیچ خوش نصیب آدمی قدرت کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتے، آسانی محبت پر ٹنگے دکتے بچتے ستاروں، سیاروں کو چھونے کی جستجو کرتے وسعت نظری کا جو ہر پالیتا ہے اور نامعلوم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ ”صحرا خانہ بندوش، سمندر طاح اور انہما شاعر کو بلاتے ہیں۔“

گزرتے وقت کے ساتھ اُس کی سیاسی بصیرت میں اضافہ ہوا اور وہ محنت کش کے ٹوٹے جڑتے سلسلہ کسب سے جذباتی سطح پر روشناس ہوا تو اُس کا رجحان بانئیں بازو کی جانب ہوا اور اُس کی شاعری میں مزاحمت کا سرخ رنگ نمایاں ہونے لگا۔ عجیب معاملہ یہ تھا کہ ایسے میں وہ سنجیدگی کا پیرا ہن اوڑھنے کے بجائے شوخی کا پنکا پہنے ہوئے تھا۔ وہ ساری عمر اپنے لڑکپن سے نہیں نکلا۔ نوجوانی کے یہی جذبہ اُس کی شاعری کو عمر بھر جنون، جذبہ اور توانائی بخشتے رہے۔ اس کی ایک نفسیاتی توجیہ ہو سکتی ہے لیکن وہ بعد میں۔

اس شعر غنائے اردو سمجھنے والے کروڑوں لوگوں کے دلوں میں ایسی جگہ بنائی کہ تقسیم کے بعد کے شاعروں میں فیض اور منیر نیازی کے ساتھ آج کھڑا ہوا۔ چودہ کے قریب شعری مجموعے تصنیف کیے اور آدم جی سے لے کر ستارہ امتیاز تک ہر قابل ذکر ادبی اور ادبی اہوار حاصل کیا۔

فرات کا اردو روایتی کلاسیکی شاعری کا مطالعہ قابل رشک تھا۔ اس کے علاوہ دینی علوم میں فرات نے خاص مطالعہ کر رکھا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ بین الاقوامی ادب اور تحریک سے نہ صرف آگاہ تھا بلکہ اُن پر نظر رکھتا تھا۔ ذاتی سطح پر معصرا نہ چشمک برطرف، ادبی نقد و قامت وہ خوب جانتا تھا۔ اسی لیے ایک نشست میں مجھ سے مختلف شاعروں کے بارے میں رائے کا بے دھڑک اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے ”اردو میں فیض بلاشبہ ایک بڑے شاعر تھے۔ احمد ندیم قاسمی اچھے شاعر تھے۔ منیر نیازی کی محدود شعری لفظیات کے باوجود اسے قابل ذکر شاعر مانا جاسکتا ہے۔ ان سب کا امام غالب تھا۔ میں اُسے بچپن سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ وہ غالب جو مجھے دسویں جماعت میں نظر آتا تھا، ایم اے میں کچھ اور تھا اور آج غالب مجھے ایک نئے رنگ میں نظر آتا ہے۔ وہ میری عمر کے ہر درجے کے ساتھ رنگ بدلتا رہا ہے۔ لا جواب شاعر تھا۔ اُسے مادرا کی راہ نمائی حاصل تھی۔“





مگر ہر ایک بار تجھ کو چھو کر  
 یہ ریت رنگِ حنائی ہے  
 یہ دھم گھل دار بن گئے ہیں  
 یہ آو سوزاں گھٹائی ہے  
 یہ درد موجِ صبا ہوا ہے  
 یہ آگِ دل کی صدا بنی ہے  
 ہر شعر کے اختتام پر داد و تحسین اور آواز کا نغمہ دل بلند ہوتا ہے اور نغماؤں میں بکھر جاتا ہے۔

اور اب یہ ساری ستارِ ہستی  
 یہ پھول یہ دھم سب ترے ہیں  
 یہ دکھ کے نوح یہ شکر کے نغمے  
 جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں  
 جو تیری قربت تری جدائی  
 میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

ہر نازِ مینِ دل آرا، دردِ شیرِ حسن آرا کا گمان ہے کہ ان اشعار کی مخاطب وہ ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ یہ اشعار اُس کا دل جس طرح گدگداتے ہیں کسی اور کی روح کو ایسے نہیں چھوتے ہوں گے۔ شاعر انھیں نظرِ بھر کے دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ اُس کے دل میں کیسے ہر لڑکی کے لیے ایک سا جذبہ موجِ زن ہے۔ وہ کی دل نگار جسوں پر اپنی نگاہ ڈالتا ہے۔  
 فرآز پر ایک لڑکی عاشق ہوئی تھی۔ وہ حسین تھی، نہ جذباتی۔ وہ گانگی میں نام رکھتی تھی، یہ شاعری میں۔ وہ سیدھی دیکھی تھی۔ سو بات بڑھ کر شادی تک جا پہنچی۔ فرآز تذبذب کا شکار تھے سو اپنے نرِ بی فیض اور فیض کے پاس مشورے کے لیے جا پہنچے۔ انھوں نے حیدر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ سو معاملہ جہاں تھا وہیں ختم کیا۔ بہت بعد، فیض صاحب کے گزر جانے کے بھی بہت بعد، فرآز اُس مشورے پر از حد شکر گزار رہے۔  
 فرآز صاحب من چلے ضرور تھے مگر غیر ذمے دار نہیں۔ ایک لڑکی اُن کی شاسا تھی۔ لہٰذا فرآز اور اُس لڑکی میں ایک قلبی تعلق قائم ہو چکا تھا۔

ایک دن دونوں سیر کے لیے ایک پہاڑی مقام کو چلے۔ دن بھر وہاں کی سرسبز بلندیوں اور وادیوں میں گھومتے کھیلنے رہے۔ شام کو شہر ہو کر واپس ہو رہے تھے کہ ان کی گاڑی کو حادثہ ہو گیا۔ وہ لڑکی آبِ دیدہ ہو گئی۔ فرآز دردِ مند دل رکھتے تھے، اُسے تسلی دی کہ اس حادثے کے بہ موجِ اُس کو پریشانی نہ ہوگی۔ یہ سمجھا کر اُسے شادی کی پیشکش کر دی۔ چنانچہ دونوں بیاہے گئے اور عمر بھر ساتھ رہے۔ یہ فرآز کی دوسری شادی تھی۔ اس سے پہلے فرآز صاحب کی پہلی شادی ملاقاتی رواج کے مطابق اپنی برادری میں ہوئی جو چھٹی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ پہلی شادی سے فرآز صاحب کے بیٹے ہوئے۔ وہ ہمیشہ اپنی پہلی بیوی کا بہت عزت سے ذکر کرتے اور کہتے۔  
 "وہ ایک عظیم عورت ہے۔"

اس تذکرے میں عزت کے مین بینِ پشیمانی کا رنگ بھی جھلک آتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔  
 لڑکی بالیاں انھیں اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے جھبکی تھیں تو خواتین خود کبھی جلی آتی تھیں۔ یہ قول اُن کے بارہ کہو کی سرخ پہاڑی پر رہنے والی ایک خاتون، جو ایک معروف سیاست دان کے حوالے سے بھی قریبی ملتوں میں جانی جاتی تھی، فرآز کے قرب کی خواہاں ہوئی۔ یہ

تعلق زیادہ مرے نہ چلا۔ فراز صاحب کے تجزیے کے مطابق وہ خاتون معروف اور مستحکم مردوں کی قربت کی خواہش مند رہتی تھی۔ اس کا مزاج بھی تھکسانہ تھا۔ فراز بھی دہنگ آدمی تھے۔ ان کا رعب ایسا تھا کہ بڑی نامی گرامی ورنی شخصیات ان کے مقابل نہ ٹھیرتی تھیں۔ جب تعلق ایسی ٹیج پر پہنچ گیا جہاں فراز جدائی کے بہانے ڈھونڈنے لگے تو خاتون کی ضد نے فراز کو رستہ دینے سے انکار کر دیا۔ فراز کی زندگی میں وہ واحد خاتون تھی جس نے انھیں خاصا پریشان رکھا۔

ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ انھیں اپنے ایک قریبی دوست کو فون کر کے کہنا پڑا ”یار اس میں بائیس سال کی میڈیکل کی لڑکی کو سمجھاؤ۔ میں ستر برس کا آدمی ہوں۔ یہ مانتی ہی نہیں، کہتی ہے کہ محبت کے سفر کا آغاز مجھ ہی سے کرنا ہے۔“ فراز کی محبتوں میں ازدواجی متعلقات کی جانب سے مداخلت نہ تھی۔ ایسے دہنگ آدمی تھے کہ شاعرانہ اور سیاسی معاملات کے علاوہ گھریلو معاملات میں ان کا کہا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ کسی کو ان کے معاملات حیات میں مداخلت کی جرأت نہ ہوتی۔ اپنی آزاد روش اور زندگی کے اس حد تک قائل تھے کہ رات کو مطالعے کے بعد تہا سوتے۔ غالباً ازدواجی بندشوں سے وحشی طور پر آزاد ہونے کی وجہ سے ان میں لڑکپن باقی تھا۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو اور بھی تھا۔ ان کے والد پٹھے کے لحاظ سے اکاؤنٹنٹ تھے۔ وہ ایک سخت مزاج اور ڈسپلن پر قرار رکھنے والے والد تھے۔ چنانچہ لڑکپن میں ادب کی جانب رجحان ہونے کی وجہ سے فراز کو دوستوں کی ادبی محافل میں بیٹھنے کا کچھ ایسا پکا پڑا کہ کبھی گھر لوٹتے ہوئے تاخیر ہو جاتی۔ ان کے والد بیٹے کے انتظار میں ہوتے۔ چنانچہ دروازہ کھولتے ہوئے وہ برخواردار کی نہ صرف با آواز بلند سرزنش کرتے بلکہ غصے میں دست و بازو پر اختیار کھو بیٹھے۔ والد کی سخت گیری کا ان کی نفسیات پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ انفرادی شخص آزادی کے نہ صرف اس حد تک قائل ہو گئے کہ اپنی ذات کے ہو گئے بلکہ گمان ہے کہ اس کا رد عمل ان کی شخصیت، شاعری اور نظریات میں بھی نفوذ کر گیا۔ کچھ ایسی صفات مزاجی آگئی کہ پل میں تولد پل میں ماشہ۔ سخت سے سخت بات کو فحش کر ڈال دیا اور خفیف سی تنقید پر زور دینے کا یہ عالم ہوا کہ اس شخص کو عمر بھر معاف نہ کیا۔ مزاج میں سخاوت آئی تو احباب کے سہرے لکھ ڈالے اور طبیعت متعصب ہوئی تو تلخ نوائی میں دشنام کی آگ بھڑک اٹھی۔

حامدین نے کیا کیا الزامات نہ لگائے لیکن خود مست شاعر کبھی کبھار کچھار سے نکل کر دہاڑ تو دیتا تھا دل کا روگ نہ لگاتا تھا۔ لوگ بھارت نواز ہونے کا الزام لگاتے ہوئے بھول گئے کہ شاعر شیر دل بھارت اور دیگر ممالک جا کر ہندوستان پر خوب دہاڑا تھا۔

دیگر ممالک تو فراز صاحب کا جانا عمر بھر لگا رہا۔ مشاعروں کی دعوتیں امریکا سے لے کر یوگنڈا تک، دنیا کے طول و عرض سے آتیں۔ جس دور میں امریکی ڈالر ایک مستحکم کرنسی تھی اور اسلام آباد میں زمین سستی، فراز صاحب بیرون ملک مشاعروں کی آمدنی سے کاروباری سوچہ بوجھ کے ساتھ سرمایہ کاری کرتے۔ پلاٹوں کے معاملات پر ان کی مقدمہ بازی چلتی رہتی۔ عموماً فیصلے ان کے حق میں آ جاتے جن پر بعض بذلہ سنج کہتے۔ ”زندہ فراز کے اندر ایک مومن چھپا بیٹھا ہے جس پر خدا اتنا مہربان ہے کہ اُسے خوش کرنے کا سامان دنیا ہی میں مہیا کیے دیتا ہے۔“

عمومی طور پر شعر ادنیاداری کے معاملات میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ البتہ فراز میں دونوں جہان یک جا ہوتے تھے، جہان فنی اور جہان روزگار۔ کفایت شعاری ان کے مزاج کا مستقل حصہ تھی اور سادگی طرز زندگی کا۔ عجب واقعہ تھا کہ جن حصوں میں سرمایہ کاری کرتے وہ منافع میں چلے جاتے اور جو پلاٹ خرید لیتے، وہ دنوں میں ڈگنی چوگنی مالیت کا ہو جاتا۔ یہ صرف قسمت کے معاملات نہ تھے، کاروباری ذہانت کے مظہر تھے۔ یہ باتیں ان کی ذات سے بڑھ کر دیگر دائرہ ہائے کار میں چلی جاتی تھیں۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن میں ملازمت اختیار کی، وہ خسارے میں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُسے منافع بخش ادارہ بنا دیا۔ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر متمکن رہے۔ ان عہدوں پر کبھی ایک روپے کی بددیانتی نہ تو خود کی اور نہ ہی حتی الوسع کسی اور کو کرنے دی۔ ان کی ذات کا یہ پہلو کم ہی زیر غور آیا ہے۔ بک فاؤنڈیشن میں لوگوں کو کتب خریدنے کی ترغیب دیتے۔ کتابیں تحفہ شاذ و نادر ہی دیتے۔ اسی طرح ادارے کی جانب سے خرید و فروخت اور دیگر مالی معاملات میں بددیانتی ایک زمانے میں تسلیم شدہ حقیقت مانی جاتی تھی۔ اس کا قطعی طور پر نہ تو حصہ بنے اور نہ ہی یہ روایت بڑھائی۔ اسی خوبی نے ان کی شخصیت کو مضبوطی دی۔ ورنہ

بدبختی کے مرتکب افراد کم زور اعصاب کے مالک اور بزدل ہوتے ہیں۔

خودداری کا یہ عالم تھا کہ مولانا کوثر نیازی کی وزارت میں اُن کے ماتحت کام کرتے ہوئے اُن کے شعری مجموعے کا دوبارہ مجھے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ انھیں مجموعے کے شاعرانہ معیار پر تحفظات تھے۔ احمد فراز اگر ناقد تھے تو بلا اختیار ہر پست دہلا کے۔

وضع داری لحاظ کا یہ عالم تھا کہ لندن جلاوطنی کے ایام میں اپنے بھائی کے ہاں قیام رہا۔ وہاں سارا دن باہر رہتے مبادا بھائی پر نوچہ نہیں۔ رات کو سونے کے لیے گھر جاتے۔ آخری دم تک 1983 کی لائبرکس رکھی ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ نئی گاڑی لینے کا سوچا۔ عین وقت پر ذہن بدل گیا۔ گھر کی آرائش بھی بہت سادہ تھی۔ سگریٹ منگوانے اور بقیہ رقم میں ملازم بچے ہوئے سکے لے آتا تو احتیاط سے انھیں واپس لے لیتے مبادا ملازم فضول خرچی کی جانب مائل ہو جائے۔ فضول خرچی کو ناگاہی درگزر جرم جانتے تھے۔ ساری عمر اس طبع سے وامن بچائے رکھا۔

وفات کے بعد اُن کے اہل خانہ نے گھر کی آرائش جدید تر اور بڑا سائش زدگی کرنے کی خاطر مناسب سلسلہ کیا۔ فراز صاحب کے لیے سب سے بڑی آزمائش عالم بالا سے نیچے جھانک کر یہ دیکھنا ہوگا کہ جس گھر میں اُن کی پرانی گاڑی کھڑی ہوتی تھی وہاں محمد قتیبی چپ کھڑی ہے۔

فراز کی شخصیت کا ایک ایسا رخ بھی تھا جسے انھوں نے عام لوگوں سے چھپا کر رکھا۔ اس کے شاہد اُن کے ذاتی بیٹکار اور میرے فراز صاحب کے بہ موجب بننے والے دوست نوید زیدی صاحب ہیں۔

نوید زیدی صاحب فراز صاحب کے مالی معاملات دیکھتے اور ان معاملات میں اُن کے مشیر اور راز دار تھے۔

ایک شام کافی پیتے ہوئے ہم حسب معمول فراز صاحب کو یاد کر رہے تھے تو بتانے لگے۔ ”فراز من موچی آدمی تھے۔ کبھی لوگوں کو ہاڑ دیتے جیسے وہ سوشلسٹ اور اہل تشکیک میں سے ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے فراز سے پوچھا کہ پٹھان ہوتے ہوئے تم اتنی اچھی اردو شاعری کہہ کر لیتے ہو تو انھوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور بولے۔ ”یہ اُس کا کرم ہے۔“ شاعری کے علاوہ شخصیت اور کردار کے لحاظ سے فیض کو بہت ماننے اور کہتے ”بہت solid آدمی تھے۔“ زیدی صاحب کے لہجے میں اُدا سی تھی۔

”فراز نے مجھے کئی باتیں بتانے سے منع کیا تھا۔ آخری مرتبہ مجھ سے ملے تو مشاعرے میں شرکت کرنے امریکا کو کنینڈا جا رہے تھے۔ واپسی پر مکمل منصوبوں پر سوچ بچار کا پروگرام بنایا اور چلے گئے۔ وہیں بیمار ہوئے۔ گزروں کا مسئلہ تو تھا ہی، پھسل کر گرنے سے ایسی چوٹ آئی جو کئی قباحتیں ساتھ لے آئی۔ ہسپتال داخل کرایا گیا۔ چند روز بعد وطن واپسی کی ضد کرنے لگے۔ ”مجھے واپس لے چو۔“ جب واپس آ رہے تھے تو ڈیمل جیسر پر تھے۔ وہ دہنگ نرا ایک بیمار کم زور مریض کی صورت واپس ہوا۔ کوہا میں تھا سو اور گرد سے بے نیاز تھا۔ واپسی پر فوٹو گرافروں کو اُن کی تصاویر بنانے سے منع کر دیا گیا۔ ہم بنگ اور شرارتی فراز کا ناثر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ وہ فراز جو اردو شاعری کا دل کش جسم بھی تھا اور اس کی مضطرب روح بھی۔“

”اسی لیے فراز کے اُن لمحات کی تصاویر ریکارڈ پر نہیں۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ زیدی صاحب بولے۔

”اُن کا بہت کچھ ریکارڈ پر نہیں۔ فراز کی عمومی شہرت ایک کفایت شعرا آدمی کی تھی۔ دہلی میں اُن کے ایک قریبی دوست تھے جن نے ہاں وہ ہمیشہ قیام کرتے۔ دوست کے بیٹے سے وہ اپنی اولاد جیسی محبت کرتے تھے۔ اُس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے کی خواہش کا ہمارا کیا۔ دوست نے فراز سے مشورہ مانگا اور اپنی کوتاہ سامانی کا تذکرہ کیا۔ فراز نے اُسی وقت پچیس لاکھ روپے کا چیک کاٹا اور دست خط رکے دوست کو یہ کہتے ہوئے دے دیا کہ بچے کے لیے اُس کی حسب خواہش تعلیم بہت ضروری ہے۔ اخراجات فراز صاحب اٹھائیں گے۔“

”واقعی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ علیحدہ بات ہے کہ بعد میں دوست نے چیک واپس منادیا۔“ زیدی صاحب نے وضاحت کی۔

”فراز کے بھائی مسعود کوثر صوبہ سرحد کے گورنر رہے۔ فراز نے کبھی اپنے بھائی کے حوالے سے مالی منفعت کی کوئی بات نہ کی۔“

”ایک مرتبہ سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک نے فراز کے ساتھ آداری ہوٹل لاہور میں ایک پر تکلف تقریب کا اہتمام کیا۔ جب تقریب کی

کمپیئرنگ کی بات آئی تو انھوں نے ایک دوست کا نام تجویز کیا۔ اس تجویز کے پس پردہ اُس دوست کو مالی فائدہ دینے کا خیال تھا چوں کہ اُسے اُن دنوں چند معاملات میں معاشی وسائل کی ضرورت تھی۔ فراز اُس تقریب میں اپنے جو بن پر تھے۔ انھوں نے چٹکے، واقعات، خیالات اور اشعار کی رنگارنگ پھوار سے ماحول کو ہولی رنگ کر دیا۔ یہ اُسی تقریب کا واقعہ ہے کہ دانش ور، سیاست دان اور قانون دان اعترافِ احسن اٹھ کر آئے اور ان کے قدموں کو محبت اور احترام سے چھو لیا۔“

فراز کی روزمرہ زندگی کی ایک چھوٹی سی عادت اُن کی ذات کے شبستان میں ننھے جگنو کی طرح دکتی ہے۔

اُن کے ہاں ایک میاں بیوی کا جوڑا ملازم تھا۔ جوڑے کا ٹکڑا سا اکلوتا بیٹا سماعت و گویائی سے محروم تھا۔ جب کبھی فراز گھر آتے تو وہ ننھا سا گونگا بہرہ بچہ بھاگتا ہوا اُن کی جانب لپکتا اور فراز جیب سے کبھی ٹانی تو کبھی کوئی میٹھی شے اُسے شفقت سے تھما دیتے۔ وہ بچے کے لیے ہر مرتبہ اہتمام سے کوئی شے لے کر گھر جاتے اور اُسے معصومانہ مسرت کا اظہار کرتے دیکھ کر کھل اُٹھتے۔

اُس شام زیدی صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے گویا ایک راز بتانے کا فیصلہ کر لیا، وہ افسردہ لہجے میں بولے۔

”فراز ہوتے تو ناراض ہوتے۔ ایسے معاملات دوسروں کے لیے مثال بنتے ہیں اس لیے بتا رہا ہوں۔ ایک غریب صحافی زاہد\* ان کے ارادت مندوں میں سے تھا۔ ایک برسات میں ایسی موسلا دھار بارشیں ہوئیں کہ زاہد کے گھر کی چھت اور ایک دیوار گر گئی۔ وہ پریشانی میں پھر رہا تھا کہ فراز صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ جب فراز صاحب نے اُس کی پریشانی کا احوال سنا تو اُسے آٹھ لاکھ روپے کی بلا شرط امداد دے دی اور مجھے منع کر دیا کہ کسی سے تذکرہ نہ کروں تاکہ غریب صحافی کی خودداری پر حرف نہ آئے۔ بھلے وقتوں میں آٹھ لاکھ روپے بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔“

زیدی صاحب نے بات جاری رکھی۔

”میرے پاس فراز صاحب کے اکاؤنٹس کا حساب رہتا تھا۔ وہ کئی بیواؤں اور ضرورت مندوں کی باقاعدہ امداد کرتے تھے۔ اُن کے ماہانہ وظیفے بندھے ہوئے تھے جو فراز صاحب کے اکاؤنٹ سے باقاعدہ طور پر منہا ہوتے رہتے تھے۔ میں ان کا مکمل حساب رکھتا تھا۔“

فراز کا بیٹا یہ سب کچھ بتا رہا تھا تو مجھے فراز کی ایک بات یاد آگئی جو انھوں نے، اگست 2008 میں اپنی وفات سے بہت پہلے،

مجھے کہی تھی۔

”سچا آدمی ہی بہادر آدمی ہوتا ہے۔“

میری یادداشت کے پاتال سے اُن کے قہقہوں کی گونج سنائی دی۔

”میں ایک کام یاب سرمایہ کار ہوں۔“

وہ شاید واقعی ایک کام یاب سرمایہ کار تھے۔ شاعری، مستحقین کی امداد اور سچائی میں سرمایہ کاری کرنے والے انوکھے اور دلیر آدمی۔

سپاٹ لائٹ شاعری کی آواز کی تیز ہوتی لے کے ساتھ تیز ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک مقام پر آ کر شاعر آخری شعر پڑھتا ہے اور حاضرین کی طرف دھندلی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ سامعین پر گویا سکتہ طاری ہے۔ شاعر کھڑا ہوتا ہے، مڑتا ہے، دھیرے دھیرے مخصوص چال چلتا ہوا پردے کے پیچھے گم ہو جاتا ہے۔ سامنے صرف پردہ رہ جاتا ہے یا اُس پر سپاٹ لائٹ کا گول دائرہ۔ سامعین ہوش میں آ جاتے ہیں اور کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ تالیوں کی گونج بڑھتے بڑھتے ہر جانب پھیل جاتی ہے۔ سامنے اسٹیج پر کرسی خالی ہے۔ شاعر پردے کی دوسری جانب ایک نئی محفل سجانے کی تیاری کر رہا ہے۔



کمپیٹرنگ کی بات آئی تو انہوں نے ایک دوست کا نام تجویز کیا۔ اس تجویز کے پس پردہ اس دوست کو مالی فائدہ دینے کا خیال تھا جس کا اسے اُن دنوں چند معاملات میں معاشی وسائل کی ضرورت تھی۔ فراز اس تقریب میں اپنے جوہن پر تھے۔ انہوں نے چکے، واقعات، خیالات اور اشعار کی رنگا رنگ پھوار سے ماحول کو ہولی رنگ کر دیا۔ یہ اسی تقریب کا واقعہ ہے کہ دانش ور، سیاست دان اور قانون دان اختر احسن اٹھ کرائے اور ان کے قدموں کو محبت اور احترام سے چھولیا۔

فراز کی روزمرہ زندگی کی ایک چھوٹی سی عادت اُن کی ذات کے شبستان میں ننھے جگنو کی طرح دکتی ہے۔ اُن کے ہاں ایک میاں بیوی کا جوڑا ملازم تھا۔ جوڑے کا مٹا سا اکلوتا بیٹا ساعت و گویائی سے محروم تھا۔ جب کبھی فراز گھماتے تو وہ ننھا سا گونگا بھرہ بچہ بھاگتا ہوا اُن کی جانب لپکتا اور فراز جیب سے کبھی ٹانی تو کبھی کوئی میٹھی شے اُسے شفقت سے تھما دیتے۔ وہ بچے کے لیے ہر مرتبہ اہتمام سے کوئی شے لے کر گھر جاتے اور اُسے مصنوعانہ مسرت کا اظہار کرتے دیکھ کر کھل اُٹھتے۔

اُس شام زیدی صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے گویا ایک راز بتانے کا فیصلہ کر لیا، وہ افسردہ لہجے میں بولے۔

”فراز ہوتے تو ناراض ہوتے۔ ایسے معاملات دوسروں کے لیے مثال بنتے ہیں اس لیے بتا رہا ہوں۔ ایک غریب صحافی زاہد\* ان کے اراکات مندوں میں سے تھا۔ ایک برسات میں ایسی موسلا دھار بارشیں ہوئیں کہ زاہد کے گھر کی چھت اور ایک دیوار گر گئی۔ وہ پریشانی میں بھر رہا تھا کہ فراز صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ جب فراز صاحب نے اُس کی پریشانی کا احوال سنا تو اُسے آٹھ لاکھ روپے کی بلا شرط امداد دے دی اور مجھے منع کر دیا کہ کسی سے تذکرہ نہ کروں تاکہ غریب صحافی کی خودداری پر حرف نہ آئے۔ پچھلے دنوں میں آٹھ لاکھ روپے بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔“

زیدی صاحب نے بات جاری رکھی۔

”میرے پاس فراز صاحب کے اکاؤنٹس کا حساب رہتا تھا۔ وہ کئی بیواؤں اور ضرورت مندوں کی باقاعدہ امداد کرتے تھے۔ اُن کے ماہانہ وظیفے بندھے ہوئے تھے جو فراز صاحب کے اکاؤنٹ سے باقاعدہ طور پر منہا ہوتے رہتے تھے۔ میں ان کا مکمل حساب رکھتا تھا۔“

فراز کا بیٹا یہ سب کچھ بتا رہا تھا تو مجھے فراز کی ایک بات یاد آگئی جو انہوں نے، اگست 2008 میں اپنی وفات سے بہت پہلے، مجھے کہی تھی۔

”سچا آدمی ہی بہادر آدمی ہوتا ہے۔“

میری یادداشت کے پاتال سے اُن کے قہقہوں کی گونج سنائی دی۔

”میں ایک کام یا ب سرمایہ کار ہوں۔“

وہ شاید واقعی ایک کام یا ب سرمایہ کار تھے۔ شاعری، مستحقین کی امداد اور سچائی میں سرمایہ کاری کرنے والے انوکھے اور دلیر آدمی۔ سپاٹ لائٹ شاعر کی آواز کی تیز ہوتی نے کے ساتھ تیز ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک مقام پر آ کر شاعر آخری شعر پڑھتا ہے اور حاضرین کی طرف دھندلی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ سامعین پر گویا سکتہ طاری ہے۔ شاعر کھڑا ہوتا ہے، مڑتا ہے، دھیرے دھیرے مخصوص چال چلتا ہوا پردے کے پیچھے گم ہو جاتا ہے۔ سامنے صرف پردہ رہ جاتا ہے یا اُس پر سپاٹ لائٹ کا گول دائرہ۔ سامعین ہوش میں آ جاتے ہیں اور کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ تالیوں کی گونج بڑھتے بڑھتے ہر جانب پھیل جاتی ہے۔ سامنے اسٹیج پر کرسی خالی ہے۔ شاعر پردے کی دوسری جانب ایک نئی محفل سجانے کی تیاری کر رہا ہے۔

# کاہن

مستنصر حسین تارڑ



آسمان کی نیلی مٹل سے شام کا سرمنی غبار دس رہا تھا۔ نیچے شہر سیا لکھٹ کے گرد و نواح میں پھیلے سرسبز کھیتوں سے دھندلا ٹھہر رہی تھی۔ کھیتوں کے بیچ میں اناج کے پتھوں کی طرح بکھرے اگاؤ کا گھروں میں روشن ہوتی جلیاں مونتے کی جھاڑی میں ٹٹلتے جگنوؤں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ انھی کے بیچ ایک شان دار اور وسیع و عریض کارخانے کا سرسبز لان شہر پر اگ کی طرز کے لیمپ پوسٹوں کے بیچ میں لیٹا جگمگا رہا تھا۔ لان کے گرد قدیم اور جدید یورپین طرز کی دل کش عمارات کہیں گردن اٹھائے اور کہیں سرسبز بوڑے کھڑی تھیں۔ اس فیکٹری کو بیرونی دنیا سے تعلق رکھنے والے اہل ذوق صحیح طور پر آرٹ کا نمونہ کہتے تھے۔

آج یہاں دعوت تھی۔ سفید دستانے اور دروایاں پہنے ویٹر ہاتھوں میں سلور ٹرے تھامے میزوں کے بیچ میں مستعدی سے حرکت میں تھے۔ چند مہمان آچکے تھے۔ ایک کونے میں ایک جرسن خاتون ایک امریکی تاجر سے محو گفتگو تھی۔ دوسری جانب چند یورپین حضرات ایک پاکستانی صاحب کی کسی بات پر مسکرا رہے تھے۔

ایک کونے میں فیکٹری کا جواں سال مالک انتظامات کو آخری شکل دے کر تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مطمئن ہو کر اس نے ایک گہری سانس بھری اور مسکرانے لگا۔ اس کا شمار شہر کے صف اول کے کاروباری افراد میں ہوتا تھا۔ وہ فرانس اور جرمنی کو فیشن گارمنٹس کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہونے کی ثرائی کئی برس سے جیتتا آیا تھا۔ مسکراتے ہوئے وہ میری جانب مڑا اور مخاطب ہوا۔

”تمہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ آج ایک راز کی بات بتاؤں؟“

میری آنکھوں میں سوال پڑھتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

”میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ ایک شخص کی وجہ سے ہے۔ مستنصر حسین تارڑ“

میری حیرت کو بھانپتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور گہری ہونٹیں اور وہ ایک مہمان کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

”باقی کھانے کے بعد بتاؤں گا۔“

کچھ ہی دیر میں لان ایک متحول شخص کے پیٹ کی طرح، مہمانوں سے بھر گیا۔

دعوت کے دوران میں مختلف ملکوں کے مہمانوں سے خوش گپیاں اور اپنے پاکستانی دوستوں سے کاروباری حالات پر گفتگو کرتا رہا

مگر میرا ذہن میزبان کی بات میں انکار ہا۔

دعوت خوب جمی۔

رات گئے جب سب مہمان رخصت ہو گئے اور ویٹر میز پوشوں کو تہہ کرنے اور کرسیوں کو اٹھانے لگے تو وہاں صرف میں اور میزبان

رہ گئے۔ اپنے ایک بازو پر اس کی نمی کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے اس نے مجھے قریبی صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور

سگارس لگایا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا

”پھر کیسی رہی؟“

”بہت شاندار۔“ میں نے جواب دیا

اس نے مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا ”تو“ اور بات جاری رکھی ”مجھے معلوم ہے کہ میری وہی بات تمہیں بے چین

کر رہی ہے۔“

مجھے تجسس پا کر اس نے سگار کا دھواں شب کی تاریکی میں چھوڑا اور اسے تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔ سنجیدگی اس کے چہرے پر نہ

پہنچ رہی تھی۔

”یہ اس دور کی بات ہے جب میں ابھی کالج میں داخل ہوا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ مجھے اپنا خاندانی معاملہ ہاتھ پاؤں سے ایک دور کالج کی لائبریری میں میرے ہاتھ تارڑ کی ایک کتاب لگی ”پیارا کا پہلا شہر“۔ کہ میں پڑھنے کا تو مجھے کوئی خاص شوق نہ تھا۔ وہ کتاب بھی ایک کورس کی کتاب ڈھونڈتے ہوئے میرے ہاتھ آ گئی۔ میں نے جب اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھنا چلا گیا۔ وہ کتاب مجھے خوابوں کی ایک سحر انگیز دنیا میں لے گئی۔ جہاں تارڑ کی جگہ میں تھا اور سامنے پاسکل تھی۔ اس میں کلیساؤں کی گھنٹیاں بھی تھیں اور اسٹیر کے بھونپوں کی آواز بھی۔ پس میں ایک گلابی دھندلکے میں کھوکھو کر رہ گیا۔ ابھی بمشکل اس نے باہر آنے کی کوشش میں تھا کہ تارڑ کی ایک اور کتاب ”گلے تیری تلاش میں“ نے مجھے زلیخا کی طرح بھشت سے پکڑ کر واپس اس رنگین غبر میں کھینچ لیا۔ مجھے پرگو یا سحر پھونک دیا گیا۔ میں نے عہد کیا کہ میں کوئی ایسا کاروبار کروں گا جس میں میرے سحر، جنسی دیسوں کی زمینوں کو چوم سکیں اور میں زندگی کے ان دیکھے جزیروں پر پڑاؤ کروں۔“

یہاں پہنچ کر اس نے مزید کچھ دھواں اگلا اور یولا

”عہد کرنا تو آسان کام ہے۔ اسے مہانا بہت مشکل کام ہے۔ سب نے نادان کہا۔ اس دور میں یہاں برآمد کاروبار عام نہ تھا۔ میں نے وقت مانگا اور یورپ چند سیکمیل لے کر چل دیا۔ قریب قریب پھرا۔ کئی بار نثر حال ہو کر واپسی کا سوچا۔ سیاحت کی لذت اور شے ہے اور معاش کی فکر قطعی مختلف۔ ایسا بھی ہوتا کہ درو زوں پر دستک دیتے دیتے اور چل چل کر بیروں میں آ بے پڑ جاتے۔ بج بے موسم میں بارش کا پانی جوتوں میں آ کر پیروں کی جلد کو خشک کر دیتا۔ مگر تارڑ کے پھونکے سحر نے جنون کو زندہ رکھا۔ کئی ماہ کی شہر گردی کے بعد واپس ہو کر واپس ہو گیا۔ واپسی کے سفر میں ایک جرمن سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی ایسا ہی کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ملے ہوا کہ میں اسے چند ادرنمو نے بھیجوں گا۔ بس وہ دن اور آج کا دن کہ میں نے پیچھے مڑ نہیں دیکھا۔“

یہاں پہنچ کر اس نے مجھے دیکھا اور پوچھا

”کبھی تارڑ سے ملے ہو؟“

میں نے جواب دیا ”ملا رہا ہوں۔“

اس کی آواز میں جذبات بھرا آئے اور وہ بول

”یار تارڑ کو میرا ایک پیغام دے سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے فوری پیشکش کی۔

اس نے توقف کیا اور پھر بولا

”اسے میری طرف سے کہنا ”شکریہ“۔“

زندگی کا پہلا الٹی سمت گھومتا ہے اور زندگی کئی برس پیچھے چلی جاتی ہے۔

کراچی کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہے۔ اپنے بچپن کا ابتدائی کچھ دورانیہ برطانیہ میں گزارنے کے بعد میں ایک طویل وقفے کے بعد

بیرون ملک جا رہا ہوں۔

استنبول میری منزل ہے۔

انٹرپورٹ کے نئے ٹرمینل کا بین الاقوامی معیار اور جگہ جگہ دل کو موہتی ہے۔ میں اپنا دینی سامان راونج کی ایک سیٹ پر رکھ کر

اور ساتھ میں بیٹھ کر سامنے لگے جہازوں کی آمد و رفت والے بورڈ کو دیکھنے لگتا ہوں۔ ابھی میں بورڈ دیکھنے میں محو ہوں کہ ایک آواز میری توجہ کے آگے مجھے بال ڈال دیتی ہے۔

”سرکار۔ کدھر جا رہے ہیں؟“



میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ قمری بیس سوٹ پہنے ایک لوجوان میری جانب دیکھ رہا ہے۔ وہ میری قریبی نشست پر بوجھان ہے۔ میں اس کے کوٹ کے کنارے لگے پھول کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی منزل کا نام بتا دیتا ہوں۔ وہ غالباً کسی وسطی ایشیائی ریاست کی جانب ماحول ہے۔

ہم دونوں کی پردازوں میں کافی وقت ہے سو بات چیت شروع ہو جاتی ہے۔

اس کا تعلق لاہور سے ہے اور وہ اندرون شہر کا کھلا ڈالا لاہور یا ہے۔

لاہوریوں میں ایک خوبی یا خامی یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ دیر تک کوئی بات یا راز اپنے پیٹ میں رکھ نہیں سکتے۔ سو وہ بھی جلد ہی بے تکلف ہو جاتا ہے۔ جب گفتگو ابتدائی تکلفات سے بے تکلفی کی حدود میں داخل ہوتی ہے تو وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہے، کوٹ کی سامنے کی جیب سے سرخ رومال نکالتا ہے، ہاتھ پونچھتا ہے اور رومال کا گولہ بنا کر اسے پتلون کی جیب میں ٹھونکتے ہوئے میرے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی میں پوچھتا ہے۔

”ٹکڑی کا ریزہ آپ کا بھرا کتنے میں لگا تھا؟“

میں غور سے اسے دیکھتا ہوں اور ریزہ فیس کا بتا دیتا ہوں۔

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے

”نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ایجنٹ کو آپ نے کتنے پیسے دیے تھے؟ بھلا یورپ میں داخل ہونا کوئی آسان بات ہے۔“

اب حیران ہونے کی باری میری ہے۔ مجھے اپنے حلق سے آواز برآمد ہوتی سنائی دیتی ہے۔

”بس ویزہ فیس ہی دی تھی اور میرا ترکی کے رستے یورپ داخل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتا ہے اور کہتا ہے

”بھئی یوں ہی کہتے ہیں۔ چلیں جو آپ کی مرضی۔“

کچھ دیر ہم دونوں خاموشی کی چادر اوڑھتے رہتے ہیں۔ پھر وہ بات جاری کرتا ہے۔

”بھائی صاحب، ہم تو بیچ بولیں گے۔ ہم دراصل یورپ جا رہے ہیں۔“

”لیکن آپ کی پرواز تو یورپ کی نہیں؟“ میں پوچھتا ہوں

”ایجنٹ نے سب انتظام کر دیا ہے۔ وہاں سے یورپ ہی داخل ہونا ہے۔“ وہ بے ساختگی سے سچ بول دیتا ہے۔

آپ ایران اور ترکی کے راستے یورپ کیوں نہیں گئے؟ وہاں سے تو زیادہ آسان ہے۔“

جب میں یہ پوچھتا ہوں تو وہ سنجیدہ شکل بنا کر میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے

”دوسرے کوشش کی تھی۔ دونوں دفعہ پکڑے گئے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا۔ انہوں نے واپس کر دیا۔ ایرانی اچھے لوگ ہیں۔ ان کی پولیس بھی اچھی ہے۔ مارتی بھی نہیں اور گالیاں بھی فارسی میں

دیتا ہے۔ اب ہمیں فارسی تو آتی نہیں۔ اس لیے بے عزتی بھی محسوس نہیں ہوتی۔“ وہ میرے سوال کا جواب دیتا ہے اور بات جاری رکھتا ہے۔

”یہ سارے مسئلے تو ہماری پولیس کے ہیں۔“

اس کے بعد باتوں کا رخ دوسری جانب ہو جاتا ہے۔ ایک سوال مجھے دیر سے ٹھک کر رہا ہے۔

”آپ یورپ پیسے کمانے کے لیے جانا چاہتے ہیں؟“

”پیسے۔ دو تو ہم یہاں بھی کما سکتے ہیں۔“ وہ جواب دیتا ہے۔  
”پھر؟“

میرے اس سوال پر وہ مجھے غور سے دیکھتا ہے، لمبی آہ بھرتا ہے اور کہتا ہے  
”مولانا نے ایک ہی زندگی دی ہے اور اتنی کھلی زمین سامنے اس طرح بچہ دی ہے جیسے قالین، چاہے اس پر چلو اور چھو لو تو نہیں  
چھو۔ بس اس چھوٹی سی زندگی کو ہم ایک کنویں میں کیوں مگادیں۔ کیوں نہ دنیا کے نظارے کریں۔ ہم اپنی زندگی کو پوری طرح استعمال کرنا  
چاہتے ہیں۔“

”خاصی گہری باتیں کرتے ہیں“ میں مسکراتے ہوئے کہتا ہوں۔

”مستعمر تارڑ سے سیکھی ہیں۔“ وہ جواب دیتا ہے۔

وقت کا پیسہ کچھ اور پیچھے کی جانب گھومتا ہے۔

لاہور جل رہا ہے، کالی مانا تاج رہی ہے۔

لوگ ابھی راتوں کو اپنے گھروں کی چھتوں پر سوتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک بچہ بھی ہے۔ لاہور کا آسمان تمام رات کو روشن رہتا  
ہے اور اس آسمان پر شاہ عالمی میں جلنے والے ہندوؤں کے بھاری بھرکم بھی کھاتوں کے اور اناق اڑتے، پھڑ پھڑاتے، چھتوں پر آن اڑتے  
ہیں۔

صبح جب لوگ جاگتے ہیں تو ان اور اناق کی راکھ ان کے لباسوں اور جسموں پر پھہری ہوتی ہے۔

وہ لوگ ایک دوسرے کے راکھ آلود چہروں کو دیکھتے ہیں۔ شائد کچھ شرمندہ شرمندہ بھی ہیں، مگر شائد!

وہ بچہ بھی اپنے لباس اور جسم پر سے راکھ جھاڑتا اٹھتا ہے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھتا ہے۔ یہ راکھ اوپر سے تو جھڑ جاتی ہے مگر اس  
کے دماغ کے جاندار پانیوں کی تہہ میں یوں جمتی جاتی ہے کہ بہت بعد تک اسے ستاتی رہتی ہے۔

وہ بچہ نیکر پہنے لکشمی مینشن میں اپنے دوستوں یا رندوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاتا ہے۔

شاموں میں قریبی بازار میں خوب گھما گھی اور روٹی ہو جاتی ہے۔ جب رات اترتی ہے تو لوگ سونے کا انتظام شروع کر دیتے

ہیں۔

ایک رات لکشمی مینشن کی سیڑھیوں پر وہ سفید لباس میں ملبوس ایک شخص کو بیٹھے دیکھتا ہے۔ وہ شخص سعادت حسن منٹو ہے۔ یہ اس

شخص کو سہارا دیکر اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں اس کی بیوی صیفی اسے وصول کرتی ہے۔ منٹو اسے ”اچھا بچہ“ کا خطاب دیتا ہے۔ بچہ تو بھر

پچہ ہے۔ شرات اس کی رگ رگ میں پارے کی طرح متحرک رہتی ہے۔

ایک روز منٹو رات گئے گھر لوٹتا ہے تو یہ بچہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سامنے والے فلیٹ کی سیڑھیوں پر دھڑے خوشنما گئے منٹو

کے فلیٹ کی سیڑھیوں پر منتقل کر دیتا ہے۔ اگلی صبح اس فلیٹ کی مالکن خوب شرمچاتی ہے کہ ہرنہ ہو یہ سب کیا دھرا اس منٹو کا ہے جو رات کو کچھ غمور

گھر لوٹتا ہے۔ منٹو ابھی اپنی صفائیاں پیش کر رہا ہوتا ہے کہ ایک اور شرات اس کی خواب گاہ میں دبے پاؤں داخل ہو جاتی ہے۔

یہ بڑکا اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر پانی کی ایک پائپ کو منٹو کے کمرے میں ایک سوراخ سے داخل کر دیتا ہے۔ جب رات کو

منٹو غمور حالت میں گھر میں داخل ہوتا ہے اور بستر پر سو جاتا ہے تو یہ لڑکے پانی کی پائپ کو سرگاتے ہوئے منٹو کے پیچھے تلے دھکیل کر تھوڑا سا پانی

کھول دیتے ہیں۔ اگلی صبح صیفی منٹو سے جھگڑتی سنی جاتی ہے کہ یہ پانی رات کو منٹو نے نشتے میں خود کر دیا ہوگا۔ منٹو کو اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے

منٹو جاتا ہے ”صیفی مجھے سے قسم لے لو میں نے یہ نہیں کیا۔“

وقت چند کروٹیں اور بدلتا ہے۔

یہ لڑکا اب بلوغت کے زمینوں پر پاؤں رکھ چکا ہے اور ایک لڑکی سے اس کی معصومانہ 'گپ شپ' بھی چل رہی ہے۔  
جہاں یہ منٹو یہ سب بھانپ لیتا ہے اور لاہور کی ایک تہی دو پہر میں جب یہ لڑکا وہی کا کٹورہ تھامے بیڈن روڈ سے آرہا ہوتا ہے  
اسے روک کر بیٹری کھانے کی دعوت دیتا ہے۔

'بیٹری' اس دور میں ایک رومانوی لفظ سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف صاحب لوگوں کے کھانے کی شے ہے۔ یا پھر بیڈن روڈ پر واقع  
ہیرٹ پارسی کی نیم تاریک ٹھنڈی برطانوی راج کے دور کی بیکری کے شوکیسوں میں جواہرات کی طرح بچی نظر آتی ہے۔  
لڑکے کا جی لچکا جاتا ہے اور وہ منٹو کے ساتھ بیکری چلا جاتا ہے۔ وہاں بیٹری کھاتے ہوئے منٹو لڑکے سے اس لڑکی کے متعلق  
پوچھتا ہے۔ لڑکا گڑبڑا کر کسی بھی ایسی لڑکی کے وجود سے انکار کر دیتا ہے۔ منٹو لڑکی کے ہاتھ سے لکھا محبت نامہ اس کے سامنے لہرا دیتا ہے جس  
میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ اس لڑکے پر مرتی ہے۔ پھر بہت شفقت سے پوچھتا ہے۔

"یہ تمہارے اوپر مرتی ہے، نیچے مرتی ہے یا درمیان میں مرتی ہے؟"

لڑکے کی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہیں۔ وہ جانے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ خلاف توقع اسے اجازت مل جاتی ہے۔ منٹو اپنی  
موٹی موٹی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھتا رہتا ہے۔ اپنے چلتے پھرتے افسانے کو جاتے دیکھتا رہتا ہے۔  
اب تک لاہور کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ کالی ماما خاموش کھڑی ہے مگر آنکھیں تاج رہی ہے۔ وہ ریگل چوک کے پار سینڈ روڈ  
ہوٹل کی چھت پر تاج رہی ہے۔

منٹو اب بیمار رہتا ہے۔

اب بھی کبھی کبھار اسے اس لڑکے کے سہارے کی ضرورت پڑتی جاتی ہے۔

مگر اب وہ اسے اچھا بچہ نہیں بلکہ اچھا لڑکا کہتا ہے کیونکہ ایک تو وہ جانتا ہے اور دوسرے اس بچے نے بھی تکر کی جگہ چٹلون  
پہننا شروع کر دی ہے۔

ایک روز منٹو اس لڑکے کو بہت شفقت سے روکتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔

"میں نے وہ خط۔۔۔ وہی خط۔۔۔ اسی روز پھاڑ کر پھینک دیا تھا، فکر نہ کرنا"

دن شاہ عالمی کے بھی کھاتوں کے چلتے اڑتے اور ارق کی، ننداؤ بکھر جاتے ہیں۔

منٹو اب بیمار نہیں رہتا اور جانتا بھی نہیں۔

منٹو اب مر چکا ہے اور یہ جانے بغیر مر چکا ہے کہ اپنے وقت کا سب سے بڑا افسانہ نگار جس لڑکے کے کندھوں کا سہارا لے کر لکھی  
میشن کی سیڑھیاں چڑھ لیا کرتا تھا وہ آنے والے وقت کا اس ملک کا بڑا ناول نگار اور سفر نامہ نگار ٹھہرے گا جسے زبانِ خلق مستنصر حسین تارڑ کے  
نام سے پکارے گی۔

چند چیزیں ہیں جو انسان کو بار بار اپنی طرف مائل پیری کی طرح بدلاتی ہیں۔

انہی چیزوں میں بچپن کی یادیں بھی ہیں۔ وہ سکول بھی ہے جہاں چھٹی جماعت کا ایک طالب علم سر جھکائے ایک کتاب پڑھنے  
میں مشغول ہے۔ ابھی پرائیویٹ سکولوں کا لاہور میں اتنا رواج نہیں۔ یہ ایک پرائیویٹ سکول ہے جہاں برطانوی طرزِ تعلیم متعارف کروایا گیا  
ہے اور زیادہ طالب علم مکس بلڈ پاکستانی ہیں۔ وہ طالب علم کتاب پڑھنے میں مشغول ہے اور سامنے ایک استاد کیلس لگائے، آنکھیں موندے

سرمایہ سحر کے زیر اثر چارلس ڈکنز کے ناول "اسے ٹیل آف فوسیلیر" کا ابتدائی حصہ ہر ادیب ہے۔

"وہ بہترین وقت تھا، وہ بدترین وقت تھا، وہ دانائی کا دور تھا، وہ حماقت کا دور تھا،۔۔۔"

اس طالب علم کی یادداشت کے کسی نہاں خانے میں آج بھی وہ سونڈی آنکھوں والا استاد، کلرزی کے فرنیچر کی مخصوص جھبک، روشنی والی سے آتی سورج کی ترچھی شعائیں اور وہ الفاظ مجید ہیں۔

یہ سب میرے تحت الشعور میں کچھ ایسے سرائت کر گیا کہ وہ لمحہ کئی برسوں پر محیط ہو گیا۔ ایسے ہی تارڑ کے ناول راکھ کے ابتدائی جملے میرے اندر گھس بیٹھے ہیں۔

"چار چیزیں ہیں جو ہر دیکر میں مجھے بلاتی ہیں۔۔۔ ان میں ایک شکار ہے، قادر آ باد کے آس پاس۔۔۔ اور وادی سوات کا ایک سیٹی منظر ہے۔ اور کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی ہے۔۔۔ در چوک چٹکھ ہے۔"

بہی نہیں، ناولوں کے کئی اور ابتدائی جملے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی دکتی بہرائی تلوار کی طرح آنکھوں کی یادداشت میں اپنی کاٹ اور چمک کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور یقیناً ایسی یادداشت کا آنکھوں کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں کہ جب آنکھوں میں اندھیرا تر بھی آئے اور سانس چلا ہو، تو نظریں یہ یادداشت دماغ کو مکمل طور پر سونپ دیتی ہیں۔

ایسا ہی خداوندی ادب نالسنائی کے لازواں شاہکار دنیا کرانینا کا ابتدائی جملہ ہے۔

"مسرور خاندان ایک جیسے ہوتے ہیں، ہر ناخوش خاندان کی ناخوشی کا انداز جدا ہوتا ہے۔"

اور یقیناً نالسنائی ازدواجی مسرت سے محروم زندگی گزارنے کے باعث ناخوشی کا قابض ہا کمال تھا۔

یا پھر گرڈوڈسٹین کے ناول "ڈامینگ آف امیریکنز" کا ابتدائی مگاناات عمل کا آئینہ دار ہے:

"ایک مرتبہ غیظ و غضب کا شکار ایک شخص اپنے باپ کو اپنے باغ میں گھسیٹتا چلا جا رہا تھا۔ "زک جاؤ" بلا خر بوڑھا باپ چلا اٹھا

"زک جاؤ" میں نے بھی اپنے باپ کو صرف اس درخت تک ہی گھسیٹا تھا۔"

اسی طرح کوئی بھی ادیب کتنی ہی منقبض شخصیت کا حامل کیوں نہ ہو، اپنی تحریروں میں غریاں ہو جاتا ہے۔ تارڑ بھی غریاں ہو جاتا

ہے حالانکہ وہ منقبض طبیعت کا ہرگز مالک نہیں۔

وگ دو طرح کی فطرت و مزاج کے ہوتے ہیں۔ ایک گریہ فطرت اور دوسرے سگ مزاج۔ جی جگہوں اور مقامات سے وابستہ

رہتی ہے جبکہ سگ کی فطرت لوگوں سے وابستگی کی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کو قدیم اجڑی حویلیاں پرانے شہر اور محلے اپنی گرفت میں رکھتے

ہیں جبکہ دوسری طرح کے لوگ، گزر گئے لوگوں کے کے بیچ میں زندہ رہتے ہیں۔ یقیناً تارڑ کی ناژ و ماحول اور مقامات سے بندھی ہے۔ یہ قادر

آباد ہو، وادی سوات ہو، کامران کی بارہ دری یا چوک چٹکھ ہو۔ یا یہ کے۔ ٹوکا میں کیمپ اور اس کے گرد پھیلی سفیدی ہو، سوکھے ہوئے دریا

سرسوتی کے بنجر پاٹ کی سنسانی ہو، پہاڑوں کے چٹخے پتھروں کی دراڑوں کی اندھی گہرائی ہو یا چوستان کی پُربیت رات ہو، تارڑ ان میں بھگتی

روح کی طرح بے چین پھرتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب وہ نیند میں ہوتا ہے تو اس کی روح نامعلوم گزرگا ہوں پر رواں ہوتی ہے۔ مقامات کا

ٹاپلجیا اس کی ذات کے پاتال سے یوں ابھرتا ہے جیسے اندھے کنویں میں دی گئی صد اس کی دیواروں سے سرنگراتی گونجتی باہر کو ابل آتی

ہے۔ اگر وہ لکھتا نہ ہوتا تو شاید زندہ نہ ہوتا۔

وقت کا ایک نامعلوم لمحہ ہوتا ہے جب کینسر کسی کے بدن میں اپنے بیج بوتا ہے اور وہ شخص اپنے بدن کی کوکھ میں موت کو زندگی دیتے

ہوئے نہیں جانتا، ہرگز نہیں جانتا۔ وقت کا نہ جانے وہ کون سا نامعلوم لمحہ تھا جب تارڑ کے اندر تخلیق کے شعور نے تحت الشعور کے گدلے پانیوں

سے یوں سر نکالا جیسے پھلی سانس لینے کو سطح آب پر لچکھ بھر کے لیے ابھرتی ہے۔ شاید دیوانگی اور وحشت جب تنہائی میں اس پر حملہ آور ہوتی ہے تو



وہ اسے الفاظ کے خوش نما سانچوں میں ڈھال کر کھار س کرتا ہے۔ اس کے اندر کی دیوانگی اس بدن پر ظاہر نہیں ہوتی جو قدرت نے اس کی ذات کو اوڑھ لیا ہے۔ حقیقی وفور کبھی کبھی روی کا راستہ اختیار کر کے کالرج کو غشیات کا سہارا لینے پر مجبور کرتا ہے، ایڈگر لین پوکر شراب میں غرق کر دیتا ہے، چیٹرٹن کو خودکشی پر آمادہ کرتا ہے، لارڈ بائرن کو جنسی بیتابی کے باعث تقدس کی عصمت دری پر بے چین کرتا ہے، منٹو کو مشروب مرغوب میں غوطے دلاتا ہے، میراجی کو دوست کاری کا راستہ دکھاتا ہے، راشد کو چتا پر جلاتا ہے، صغیر ملال کو زندگی دھوئیں میں اڑا دیتے پر ہائل کرتا ہے اور صغیر کو اپنی ذات کا پجاری بنا دیتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تارڑ صراط مستقیم، جو پل صراط سے زیادہ دشوار ہے پر چلتا ہے، ڈانواں ڈول سکی، پر اب تو چلتا ہے۔ یا شاید نہیں چلتا۔ یہ وہی جانتا ہے۔

وہ ایسا ساحر ہے کہ جنہوں نے اس کی کتابوں میں دیس دیس کی سیاحت کی اور پھر وہ خود ان نگریوں کی سیاحت کو نکلے تو بھی اس کی تحریروں کی جادوئی عینک نہ اتار پائے۔ ایسے موقع پر جارج آرویل جیسے نکتہ واں کی بات یاد آتی ہے

”بچپن میں پڑھی گئی کتابیں انسان کے ذہن میں دنیا کا ایک ایسا تصوراتی خاکہ بناتی ہیں، مختلف ملکوں کی ایسی تخیلاتی دنیا آباد کرتی ہیں کہ انسان بعد کی زندگی کی ہماہمی میں ان میں عافیت کے لیے پناہ لیتا ہے اور اگر کبھی ان حقیقی زمینوں کی سیاحت کرے تو بھی ان کو اس تخیلاتی آنکھ ہی سے دیکھنے پر مجبور پاتا ہے۔“

ایک مرتبہ میں نے تارڑ صاحب سے پوچھا کہ وہ اپنی خودنوشت کیوں نہیں تحریر کرتے کہ یہ نہ صرف ان کے سفروں بلکہ ٹی۔وی کی رنگین زندگی، متنوع کرداروں، دلچسپ واقعات، فکری، تخلیقی کے سفر اور پردہ نشینوں کا احاطہ کرے گی۔

یہ سوال کرتے ہوئے میرے ذہن میں دیگر کے علاوہ ان کی حقیقی زندگی کی، سکی آواز میں رات گئے فون کرنے والی پردہ نشین بھی تھی جس کا ذکر قریب مرگ میں محبت میں آیا ہے۔

میرے استفسار پر انہوں نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بس اتنا کہا

”یار میری زندگی میری کتابوں میں بکھری پڑی ہے، وہاں سے چن لو۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے شہر پاروں کے بہت سے کردار انہوں نے اپنی حقیقی زندگی سے اٹھائے ہیں۔ بھلے وہ ڈاکیا اور جولاہا کی نتالیہ ہو یا پیار کا پہلا شہر کی پاسکل۔ راکھ کا مشاہدہ ہو یا کے۔ ٹوکہانی کا مطیع الرحمان۔ یا پھر اس کے ستر ناموں میں بکھرے مٹی کے مختلف باوے۔ سب نرالے، بہت سے اصلی، بونے بھگوان۔ نتالیہ یقیناً ایک حقیقی لڑکی ہے جس کے ہاتھ کے لکھے خطوط آج بھی لاہور کی ایک کوشی کی بیلوں میں ڈھکی، بین الاقوامی مصوروں کی شاہکار چٹنگوں سے سجی، نفیس صاف ستھری روشن روشن اسٹڈی میں محفوظ ہیں۔ مضبوط ہاتھوں میں محفوظ ہیں۔ یہ وہ لڑکی ہے جو اپنے ارد گرد پھیلی حسین چیزوں، سروسوں کے کھیت، بیکر بھلائی شیشم اور سرس کے درختوں اور ہوا کے جھونکوں میں بسی ان کی مہک، ان کی شاخوں پر کوئی فاختاؤں کی سوز و سکون بھری آوازیں، سبز کھیتوں اور نیلے میدانوں میں بل کھاتی پگڈنڈیوں، مویشی چراتے لوگوں، بے فکری اور آسودگی سے چرتی گائیوں، کنویں پر پانی بھرتی عورتوں، تسلی سروں پر رکھے گوبر چھتے بچوں اور فصل کاٹی عورتوں کو صبح کی دودھ سفیدی اور شام کو اس میں کولا کی سی گھلتی نیم سیاہی میں دیکھ کر آکٹاتی ہے اور رودین کے فراخ سینے میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔ آستانہ روی میں ہے بھی اور نہیں بھی۔

یہ بے چین لڑکی اپنے معصوم معمولات رودین لکھ بھیجتی ہے۔ سویرے سڑک سے اونٹوں کے قافلوں جو گندم اٹھائے ہوتے ہیں، کی گھنٹیوں کی جلتزنگ، کالی شاما چڑیوں کی سیٹیوں، منہی چڑیوں کے شور، مرغ کی بانگوں، فاختاؤں کی آوازیں، لوگوں کے جاگنے کے شور اور مویشیوں کے کھولنے باندھنے کی آوازیں سے جاگ اٹھنے سے شبنم آلود گھاس پر شلوار کے پانچپے اٹھا کر ننگے حیر پھرنے تک، اپنے ہاہا کی کریمیں چوری استعمال کرنے سے غم حسین میں رودینے تک ہر بات لکھ دیتی ہے۔ وہ ناول بھی لکھتی ہے جو شاید شائع نہیں ہوتا۔

رودین، دوستوں کی کے ناول کا رودین جوتھوں، مسکندوں کے گندوں، پیناروں، طرکی دکالوں، گلابوں کی پتھوں اور تاریک جھروں، مزاروں کی سبز چادروں والے شہر، ہور کا تارڑ ہے بہت بعد میں، جب اسے یقین ہے کہ فائدہ کی طرح معصوم نالیہ اب بانی وادی ہو چکی ہوگی، ان خطوط کو فن پارے کا روپ دے دیتا ہے۔ اپنے ہاتھ آئے مقدس سنگ مرمر کو تراش کر دیوی کا روپ دیتا ہے، ایسی ملکوتی حسن والی دیوی جسے پوجنے کو موسن کا جی بھی لپٹائے۔

یہ خطوط میں نے خود دیکھے اور تارڑ کی غم ہوتی آنکھوں کے سامنے اس کے کانپتے ہاتھوں میں دیکھے۔

آخر یہ عمر بھی اچھے خاصے آدمی کو گزر کر دیتی ہے۔

میں نے پوچھا ”کبھی یاد آتی ہے؟“

تارڑ نے باہر باغیچے میں دیکھا، جہاں ابھی اہل خانہ کے قدموں کے نشان تازہ تھے

پھر میری طرف دیکھ کر سرٹٹی میں ہلادیا۔ یہی تقاضائے دانائی بھی ہے۔

نہ جانے اس فراخ سینے میں، استنبول کے آرمینیائی مسیحوں کے مجسمہ مجسمہ قبرستان کی طرح، کتنی مورتیاں جگی ہیں۔ چلتا پھرتا مندر

ہے تارڑ۔

پاسکل۔ سورج کبھی اپنے آپ کو منوانے کے لیے جتن نہیں کرتا۔ پس ابھر آتا ہے۔

پاسکل۔ پیارا کار پہلا شہر کی پاسکل افسانوی کردار سہی مگر جس مٹی سے اسے ڈھالا گیا ہے وہ نسوانی مٹی یقیناً حقیقی زمین سے اٹھائی گئی

ہے۔

نسوانی نرم ہاتھوں والے تارڑ صاحب سے نوے کی دہائی کے اواخر میں ہونے والی، ان کی صاف ستھری تھری روشن اسٹڈی میں،

پہلی ملاقات فقط ایک تارڑ کی شکل میں میری یادداشت میں محفوظ ہے۔

وہ اتنے نرم پچکیلے ہاتھوں کے مالک ہیں کہ اگر جیب تراش ہوتے تو خاصے کامیاب ہوتے۔

اس ملاقات میں ایک تکلف تھا، میری طرف سے ایک جھجک تھی کہ یہ ملاقات ایک طفل کتب کی ایک دیوقامت ادیب سے تھی۔

بعد میں جب کوٹھائپنوں کی طرح تکلف کا کوٹھا ٹاپ کر میں بے تکلفی کے احاطے میں کودا تو بظاہر اس پر اسرار جہاں گرد کی شخصیت کی پرتیں کھلتی چلی گئیں۔ اس کے کرزما کی دھند میں چھپی شخصیت اس طرح نمایاں ہو گئی جیسے سینٹ پیٹرز برگ کی عمارتوں کے سنہری کلس سرد دو پہروں کو ٹکمرے کے چھٹ جانے اور سورج کے غریباں ہو جانے پر چمک کر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

بڑے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلی طرح کے لوگ یہی ملاقات میں بھرپور تاثر چھوڑتے ہیں۔ یہ تاثر وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ زائل ہو جاتا ہے اور دیوقامت کے مجسمے کے پیچھے چھپا عام انسان سامنے آ جاتا ہے۔ دوسری طرح کے لوگ پہلی ملاقات میں بہت

بھرپور تاثر تو نہیں چھوڑتے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ایک پائیدار گہرا اور وسیع نقش مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ تارڑ صاحب دوسری طرح

کے لوگوں میں آتے ہیں۔ اگر کوئی نکتہ جیس ان سے ملاقات میں یہ توقع کرے کہ وہ کئی سوئی گفتگو میں دانائی کے پیوند لگا کر اس کے ذوق سلیم کی

تشقی کریں گے تو وہ شاید مایوس ہو۔ وہ عام بول چال میں اجنبی پر گہرا تاثر نہیں چھوڑتے۔ مگر اپنے بے تکلف احباب کے لیے ان کی صحبت ایک

خوشگوار اور خیال آفریں تجربہ ہوتی ہے۔ وہ دھیسے لہجے کی گفتگو میں مختلف موضوعات پر واقعات، نفسیاتی توجیہات اور قطعی منفرد اور گہری سوچ کا

ایسا ترکا لگاتے ہیں کہ ان کا محض طب یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ وہ اس موضوع کا اس طرح کیوں تجزیہ نہ کر پایا۔ یا شاید وہ بھی ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن

اسے اس کا شعور نہ تھا۔ میلان کنڈیرا کے الفاظ میں

”ایک تخلیق کار کا مطمح نظر اپنے پیش روؤں سے بہتر کر دکھانا نہیں ہوتا بلکہ وہ دیکھنا اور کہنا ہوتا ہے جو وہ نہ دیکھ سکے اور نہ ہی کہہ سکے۔“

اس امر کو میلان کنڈیرا جیسے ذہین اور دروں میں نکتہ داس سے بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے۔

کتنے واقعات ہیں اور کتنی ہی باتیں۔

ایک روز ہماری گفتگو سرمایہ دارانہ نظام کی گود میں پلنے والے میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ طور پر عام انسانی ایسے کو کرشل ازم کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیچنے کے ناقابل فروگزاشت موضوع پر جاری تھی۔ تارڑ صاحب نے سگریٹ سلگایا، چند کش لیے، اس کے سلگتے سرے کو گلہبر سے کاٹا، بقیہ سگریٹ کو سگریٹ کیس میں رکھا اور کہنے لگے۔

”یار اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ جان ایف کینیڈی کا بھائی مر رہا تھا اور اس کے گرد رپورٹر اور کیرہ مین یوں گھیرا ڈالے کھڑے تھے جیسے تماشائی موت کے کنوئیں کے گرد کھڑے ہوتے ہیں۔ ادھر اسے موت گھسیٹنے اپنی کچھار میں لیے جا رہی تھی، ادھر کیرے کلک کر رہے تھے، فلیش چمک رہی تھی اور ریکارڈنگ جاری تھی۔ اس کی بیوی سب کچھ دیکھ رہی تھی اور بے بسی میں مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو وہ میڈیا پر برس پڑی کہ ایک طرف اس کا شوہر مر رہا ہے اور دوسری طرف اس کی جان بچانے کی بجائے فوٹو گرافر رپورٹر اس کی کورتج میں مصروف ہیں۔ یہ سن کر فلم بناتے ایک کیرہ مین نے سر اٹھایا اور اس کی بیوی سے فقط اتنا کہا ”خاتون! ہم اس وقت تاریخ ریکارڈ کر رہے ہیں۔“

ایک روز تارڑ صاحب نے مجھ سے پوچھا

”سب سے بے لوث رشتہ کون سا ہوتا ہے؟“

میں نے بلا تردد جواب دیا

”ماں باپ کا“

انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بولے

”ودادادی نانائانی کا۔ ماں باپ کو تو پھر اولاد سے کوئی غرض یا امید ہو سکتی ہے۔ ان رشتوں کو نہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ جب تک

چھوٹے نواسے پوتے جوان ہوں گے تب تک شائد وہ زندہ ہی نہ رہیں۔“

مجھے سوچ میں گم دیکھ کر بولے

”اسی لیے یہ رشتے ذمہ داری سے بھی مبرا ہوتے ہیں۔“

یہ اس حقیقت کا دوسرا دلچسپ رخ ہے۔

مجھے ذاتی طور پر دستو و سکی کی زندگی کا ایک واقعہ ہانت کرتا ہے

ایک مرتبہ اسے ساتھیوں سمیت حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا۔ اس نے بغاوت کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی تھی سو بے فکر تھا کہ چند ہی روز میں چھوٹ جائے گا۔ چند روز بعد حکومتی اہلکار اسے اس کے ساتھیوں کے ہمراہ جیل سے لے گئے۔ سب نے جیل سے آزادی پر سکھ کا سانس لیا۔ حکومتی اہلکار انہیں شہر کے مرکز میں لے گئے اور کھلی فضا میں چھوڑ کر اعلان کیا کہ انہیں سرحام گولی مار دی جائے گی۔

یہ حکم سن کر دو قیدیوں کے چہروں پر غلاف چڑھا دیئے گئے اور ان کا رخ ایک دیوار کی جانب کر دیا گیا۔ دستو و سکی کا نمبر بعد کا تھا۔

وہ خواب کی کیفیت میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔

بندوقیں تان دی گئیں اور شست باندھ لی گئی۔

ابھی گولیاں چلنے ہی کو تھیں کہ ان سب کی معافی کا اعلان آ گیا۔

پس اس ایک لمحے نے دستور کی سوجا بدل دی اور اس کے سامنے زندگی کی حقیقت اور تصورات کی منو بہ ہو کر دی۔  
 ”میں ایک مرتبہ سفر میں تھا۔ ہم لوگ بس میں تھے اور یورپ کی طرف سفر کر رہے تھے۔ نہ جانے بس کس طرح سڑک پر پہنچ گئی اور گہری کھائی میں گر گئی۔ وہ چند لمحے تھے جب میں نے موت کی آنکھوں میں دیکھا اور مجھ پر زندگی اور موت کے درمیان ہار یک ہی لکیر کا فرق واضح ہو گیا۔“

ایک ٹانے میں بس بھری میں جا کر دی اور الٹ گئی۔ چند مسافر جاں بحق ہوئے اور مجھ سمیت باقی سبھی زخمی۔  
 ”اس طرح میں بے شمار مرتبہ موت کے سیاہ حلق میں سر ڈال کر زندہ لوٹ آیا۔ میری زندگی میں متنوع واقعات ہوں جس سے روٹا ہوئے ہیں کہ میں کسی ایک واقعے یا تجربے کو سوج کے زائے بدل دینے والا قرار نہیں دے سکتا۔“



ایک شام جب آسمان پر روشنی اپنا عکس ڈالتی تھی اور فضا میں پرندوں کا شور معمول سے کچھ بڑھ کر تھا کہ تارڑ صاحب نے محبت کے حوالے سے قصوں کی پنڈاری کھولی۔

”تمہیں معلوم تو ہے کہ میں نے شمالی علاقہ جات اور پہاڑی علاقوں کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔“  
 کچھ توقف کے بعد بولے

”ایک مرتبہ میں سفر میں تھا۔ میں اتفاق سے جس جیب میں سوار تھا غالباً اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی یا پھر ہم کچھ دیر کے لیے سستانے کے لیے گلگت کے قریب ایک جگہ رُک گئے۔ وہاں ہیبت ناک پہاڑوں کے بیچ میں گونجتے سناتے میں کوئی آواز نکل ہوتی تھی تو سر کی ہوا کی آواز تھی۔ اُس زوال کے وقت دھوپ کی تمازت اپنے ساتھ روشنی کو بھی مدھم کرتی تھی اور دھوپ پہاڑوں کے قدموں سے ان کی چوٹیوں کی جانب سفر کر رہی تھی۔ ہم کسی ٹھیکہ پنچابی دیہاتی لڑکی کی چوٹی کی طرح تھیں، گندمی اور لمبی سیاہ سڑک پر یک لگائے سستارہ تھے کہ وہاں کے ایک مقامی شخص نے میرے سامنے ایک کچے دھول اڑاتے رستے کی طرف اشارہ کر کے ایک عجیب کہانی سنائی۔“  
 اب میں پوری طرح کہانی میں کھویا ہوا تھا۔

”یہ اُس دور کی بات ہے جب پاکستانی فوج شاہراہ ریشم کی تعمیر پر کام کر رہی تھی۔ کام جاں گسل تھا اور جذبہ جوان۔ اس سڑک کی تعمیر میں بے شمار جوانوں کا لبو شامل ہے۔ ایک ٹیم کی قیادت ایک کپتان کر رہا تھا۔ اوپر چلے تو جیسے سورج اور نیچے سگلتے سنگلاخ پہاڑ۔ ایک روز مشقت سے نڈھال اور پیاس سے بے حال ٹیم جب نیم جان ہو گئی اور پینے کا پانی ختم ہو گیا تو پانی کی تلاش میں کپتان چند ایک ساتھیوں کے ہمراہ زیر تعمیر سڑک سے کافی دور چلا گیا۔ وہاں پانی کا ایک ذخیرہ تھا جہاں گرد و نوح سے لوگ پانی بھرے آتے تھے۔ اس ذخیرے کو دیکھ کر کپتان اور ریکی ٹیم خوشی سے سرشار ہو گئے۔“

یہاں پہنچ کر تارڑ صاحب نے الفریڈ چکا کی طرح بامعنی توقف کیا اور بولے۔

”اُسی مقام پر محبت کی ایک لازوال داستان نے جنم لیا۔ یہ مکمل طور پر سچا واقعہ ہے۔ وہاں قریبی آبادی کی چند لڑکیاں پانی بھرے آئی ہوئی تھیں۔ کپتان اور اس کے ساتھی ان لڑکیوں کے جانے کے انتظار میں ایک جانب کھڑے ہو گئے۔ جب لڑکیاں لوٹے لگیں تو ایک لڑکی کی نظروں سے ناگاہ کپتان کی نظر میں چار ہوئیں۔ قدرت کی تمام تر عنایاں اس حسن بلاخیز میں مجسم تھیں۔ دیکھتے چہرے پر نظریہ ٹھہرتی تھی اور اس کی جھللاتی نیلی آنکھوں سے پھوٹی شعائیں سحر پھونکتی تھیں۔ ماڈل ٹاؤن لاہور، جو ابھی متول خاندانوں کی آماجگاہ تھا، کا پردہ کپتان اس کے دام میں ایسا اسیر ہوا کہ روزانہ وہاں آنے لگا۔ چند روز بعد اس نے بلا تعارف اس لڑکی سے شادی کا ارادہ باندھا اور اپنے انچارج کرمل



کو اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ جہاں مدیدہ کرل نے اسے اس فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی لا حاصل سہی کی اور بلا خراس کا ساتھ دینے کا مدیدہ دے دیا۔“

تارڑ صاحب مزے سے کہانی سنا رہے تھے۔

”اب یہاں ایک فلمی موڈ آتا ہے۔ لڑکی کا گاؤں زیر تعمیر مرکزی شاہراہ سے کافی ہٹ کے تھا۔ جب کپتان اور کرل رشتہ لینے لڑکی کے گھر پہنچے تو اس کے چچا نے ایک شرط رکھ دی۔ شرط یہ تھی کہ مرکزی شاہراہ کو گاؤں سے ملایا جائے تاکہ مریضوں، ضرورت مندوں اور مسافروں کو آمد و رفت میں آسانی رہے۔ اب شاہراہ کا بنیادی پلان تبدیل نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اس گاؤں کو ایک ذیلی سڑک کے ذریعے مرکزی شاہراہ سے ملا دیا جائے۔ کپتان کے ساتھیوں نے اسے اپنی بھرپور مدد کا یقین دلایا۔ شام کو جب عملہ اپنے سرکاری کام سے فارغ ہوا جاتا تو کپتان کے ساتھی اس ذیلی سڑک کی تعمیر میں جت جاتے۔ کپتان کبھی خود اپنے ہاتھوں سے مزدوری کرتا اور کبھی اپنی زیر نگرانی رستہ ہموار کرتا۔ یہاں تک کہ کئی ہفتوں کی ان تھک محنت کے بعد ذیلی سڑک قابل استعمال حالت میں معرض وجود میں آ گئی۔ اب وعدے کے مطابق کپتان کی اس لڑکی سے شادی کر دی گئی۔ شادی کے بعد کپتان نے اپنی بیوی کو لیا اور لاہور میں اپنے گھر کا رخ کیا۔ گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی شادی کی اطلاع اہل خانہ کو دی تو سب سناٹے میں آ گئے۔ اس کے والدین نے اس رشتے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب ان کا سامنا دلہن سے ہوا تو اس کے خیرہ کن حسن کی تاب نہ لا کر انہوں نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ پاکستان ٹائمز ایوب دور میں انگریزی کا سب سے اہم اور معیاری اخبار مانا جاتا تھا۔“

پاکستان ٹائمز کے بے موقع تذکرے پر میں تذبذب میں پڑ گیا۔ مجھے الجھن میں دیکھ کر تارڑ صاحب گویا ہوئے

”والدین کو آمادہ کر کے نیا تو بڑا شادی شدہ جوڑا بنی مون کے لیے مری کی جانب روانہ ہوا اور جی۔ ٹی روڈ پر ایک ٹرک سے حادثے میں مارا گیا۔ ان کی محبت، شادی اور المناک موت کی خبر پاکستان ٹائمز نے نمایاں سرخی کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع کی تھی۔“

بات مکمل ہونے پر میں نے تاسف سے گہری سانس لی تو تارڑ صاحب بولے

”بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔“

میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ گویا ہوئے

”ہم جہاں سستانے کو بیٹھے تھے اس کے سامنے والی سڑک ’عاشق سڑک‘ کے نام سے آج بھی مشہور ہے اور یہ وہ سڑک ہے جو کپتان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بنائی تھی۔“

تارڑ صاحب کے اندر سے قصوں کا چشمہ ابل رہا تھا۔

”دو کردار ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ دونوں اندرون شہر لاہور میں رہتے ہیں اور محبت میں جھلا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ایوب دور کا قصہ ہے۔ ابھی محبت کی شادی کو معاشرتی رسوائی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ سودی ظالم سماج والا قصہ دہرایا جاتا ہے۔ لڑکی کے ہاں بے انکار ہو جاتا ہے۔ لڑکی اور لڑکے میں ہر قسم کا رابطہ ختم کر دیا جاتا ہے اور ان کی کسی بھی طور ملاقات کو بعید از امکان بنا دیا جاتا ہے۔ لڑکی گھروالوں کو فیصلہ سادیتی ہے کہ یا تو وہ اسی لڑکے سے بیاہ کرے گی یا پھر کنواری رہے گی۔ گھروالے بھی ہٹ پر قائم رہتے ہیں۔ کئی برکلی بیت جاتے ہیں۔ لڑکی کے بھی چھوٹے بہن بھائی بیاہ کر اپنے گھروں کو بسا لیتے ہیں۔ اس دوران لڑکی کا باپ بھی موت کے اندھے کوئیں میں چھلنگ لگا دیتا ہے۔ چند سال اور گزر جاتے ہیں۔ اب گھر میں لڑکی اور اس کی بوڑھی بیارہاں رہ جاتے ہیں۔ بوڑھی ماں دن رات بیٹی کے غم میں جھلا رہے ہوتی ہیں۔ اس یہ فکر و یک کی طرح چاٹتی رہتی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بیٹی کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ وہ بیٹی کو شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بیٹی اسی رت کو دہرا دیتی ہے کہ وہ اسی لڑکے، جو اب ایک پختہ عمر مرد بن چکا ہوگا، سے شادی کرے گی۔ ماں اسے سمجھاتی ہے کہ وہ

لڑکا اب سب کچھوں کا باپ بن چکا ہوگا۔ لڑکی تین سے کہتی ہے کہ اس کی محبت ماں کے دودھ کی طرح کھری ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ آج بھی اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ بالآخر ماں آمادہ ہو جاتی ہے لیکن ایک شرط رکھتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ لڑکی کو فوری شادی کرنا ہوگی کیونکہ ماں کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اور وہ اپنی بیٹی کو مرنے سے پہلے دلہن بننے دیکھنا چاہتی ہے۔ لڑکی کسی طرح لڑکے سے رابطے کا ذریعہ تلاش کرتی ہے اور اسے لڑکے کا فون نمبر مل جاتا ہے۔

”تمہارا کیا اندازہ ہے“ تارڑ صاحب نے مجھ سے سوال کیا ”کہانی کیا رخ لے گی؟“

مجھے خاموش دیکھ کر ان کے اندر کا بے چین داستان کو کروٹیں بدلنے لگا

”اس صبح لڑکی نے دل تھام کر لڑکے کا نمبر ملا یا۔ دوسری جانب سے کسی مرد نے فون اٹھایا۔ وہ مرد وہی لڑکا تھا۔ دودھائیوں کے دفعے کے بعد یہ ان دنوں کا پہلا رابطہ تھا۔ لڑکی کو اپنی محبت پر اتنا یقین تھا کہ اس نے لڑکے سے اس کی شادی کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور بس یہ پوچھا کہ وہ اس کے ہاں بارات کب لاسکتا ہے۔ لڑکے نے جواب دیا ”آج شام۔“

”اُسی شام اُن دونوں کی شادی ہوگئی“ تارڑ صاحب نے قصہ سیٹا۔

امریکی نکتہ سنج مارک ٹوئن نے جب یہ کہا تھا تو کیا یہ بصیرت افروز نہ تھا ”سچائی کلکشن سے زیادہ عجیب شے ہے۔ آخر کلکشن کو قابل یقین ہونا ہوتا ہے۔“

ارنست ہمنگوے تخلیقی جمود کو توڑنے کے لیے قریب قریب خاک چھان کر ان میں سے کہانیوں کے بیج یوں چن لاتا تھا جیسے ابتدائی نوا بادیاتی دور میں یورپی باشندے سونے کے ذرات کی تلاش میں امریکہ کے دیرانوں پر ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہوتے تھے۔

بیسویں صدی کی کلکشن کا فلک بوس نابغہ سرست ماہم کہانیوں کی تلاش میں مشرقی ایشیا کے جزائر کا رخ کرتا تھا۔ بلکہ اس کے ایک افسانوی مجموعے کی کہانیاں مشرقی ایشیا کی ہی کہانیاں ہیں۔

پچیس کروڑ کی تعداد میں بکتے والی کتابوں کے مصنف جفری آرچر کی کہانیوں کی کتاب ”اینڈ ویئر بائی ہینگوے ٹیل“ کی سبھی کہانیاں اس کی سفری داستانیں ہیں۔ اور سبھی حقیقی!

تارڑ کہانیوں کی تلاش میں پہاڑوں کا رخ کرتا ہے اور وہاں سے ایسے ہوش رُبا اور دل پذیر واقعات گٹھڑی میں باندھ کر لاتا ہے جو زندگی کے متنوع رنگوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس کی زد و نو میں پر حیران ہوتے ہیں نہیں جانتے کہ اس کی زنبیل میں ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ اس کی زندگی میں آنے والی طرح دار نانیوں کی طرح حیران کن۔

بے چین پانیوں، ازل سے منجمد برفوں، کنوارے جنگلوں، وحشی ہوؤں و برہنہ پتھروں سے ایک کہانی اور پھوٹتی ہے۔ ترجیح میر سے وابستہ کہانی۔ اس کہانی سے آگے نامعلوم کا وہ پچھرا رستہ ہے جس پر چلنے والے سودائی، گیلیائی کہلائے۔

تارڑ کی آواز پھر گونجی، پردہ حیرت پھر چاک ہوا اور ادھر کا منظر جاگا

”پہاڑوں کے سامنے تین نقطے ابھرے اور پہاڑوں کی جانب بڑھنے لگے۔ جب وہ قریب آئے تو ان کی ہیئت واضح ہونے لگی۔ ان میں ایک بوڑھا شخص تھا ساتھ میں جوان لڑکا اور لڑکی تھے۔ لڑکی دھیرے دھیرے چلتی تھی۔ کچھ آگے بڑھ کر بوڑھا اور جوان چند لمحوں کے لیے رُک جاتے تاکہ لڑکی ان کو آ لے۔ پھر تینوں چلنے لگتے۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکی کی ہمت جواب دے گئی اور وہ سنگلاخ پہاڑوں کے بیچ ایک بڑے سے لائٹ پتھر پر بیٹھ کر سستانے لگی۔ اس کے دونوں ساتھی پریشانی میں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ بالآخر جوان آگے بڑھ گیا اور ادھر ادھر ٹوٹتی نظروں سے دیکھنے لگا۔ سی تلاش کے دوران اس کی نظر ایک خیمے پر جا پڑی۔ خیمے میں فوج کا ایک بوڑھا صوبیدار چوہے پر المونیم کی

سیاہ ہوتی پتیلی میں کچھ پکانے میں مصروف تھا۔ جوان نے صوبیدار سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ جوان اور اس کے ساتھی ہسپانوی تھے اور اسپین سے سفر کرتے ہوئے تریج میر پہاڑ کی چوٹی سر کرنے آئے تھے۔ پہاڑی سلسلے کے راستے میں لڑکی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور اسے بخار نے آ لیا تھا۔ اب نقاہت کے مارے لڑکی سے آگے بڑھانہ جارہا تھا۔ ہسپانوی جوان نے بوڑھے صوبیدار کو بتایا کہ چونکہ وہ لوگ کئی سالوں کی جمع پونجی کے ساتھ اس مہم پر نکلے تھے اس لیے واپس لوٹنا انہیں گوارا نہ تھا۔ اس نے صوبیدار سے استدعا کی کہ وہ لڑکی کو اپنے خیمے میں جگہ دے دے۔ واپسی پر وہ جوان جولڑکی کا منگیتر تھا اور بوڑھا جولڑکی کا باپ تھا، اس لڑکی کو لے لیں گے۔

کافی سوچ بچار کے بعد بوڑھے صوبیدار نے ہائی بھری۔ اب لڑکی کو خیمے میں چھوڑ کر اس کا باپ اور منگیتر تریج میر چوٹی کو سر کرنے چل دیئے۔ صوبیدار نے لڑکی کو چار پائی پر لٹایا اور خود نیچے زمین پر بچھوٹا بچھا کر اس پر لیٹ گیا۔ رات گئے لڑکی کی حالت غیر ہونے لگی اور اس پر سرسائی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے بوڑھے صوبیدار سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ بستر میں آ جائے۔

تارڑکی آواز میں داستان گوؤں سے مخصوص ایسا زبردیم تھا جو مخاطب کو تجسس رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

”صوبیدار جوان لڑکی کے ساتھ اس کے بستر میں آ گیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”یہاں بھی انسانی نفسیات کی مختلف جہتوں کی کئی گرہیں کھلتی ہیں۔“ تارڑ صاحب نے جواب دیا اور بات بڑھائی۔

”جب بوڑھا صوبیدار شفیق محبت سے اس لڑکی کے ساتھ آ لیتا تو لڑکی اس سے لپٹ گئی۔ لڑکی نے صوبیدار کو بتایا کہ اس طرح اس کا احساس تنہائی کم ہوا ہے اور اسے حوصلہ ملا ہے۔ لڑکی رات بھر وہ ہوشی اور نیم ہوشی کی کیفیات میں ہلکورے لیتی رہی۔ کبھی وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے لگتی اور بیشتر گفتگو وہ ہسپانوی میں کرتی رہی۔ اس نے اپنے گھر، شہر اور ماں کی باتیں بتائیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے منگیتر سے بہت پیار کرتی ہے اور جلد ہی وہ شادی کر لیں گے۔ آہستہ آہستہ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اور صبح تک وہ مر گئی۔“

اب ہمارے درمیان ایک پُر معانی خاموشی معلق ہو گئی۔

”جب صوبیدار کی سمجھ میں کچھ اور نہ آیا تو اس نے لڑکی کی لاش کو اس کے سلیپنگ بیگ میں ڈالا اور کاندھے پر ڈال اس کے منگیتر اور باپ کی تلاش میں چل دیا۔ تھوڑی ہی دُور اسے لڑکی کا باپ اور منگیتر سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ صوبیدار کو دیکھ کر وہ دُور سے خوشی میں نعرے لگانے لگے کہ وہ چوٹی کو سر کر آئے ہیں۔ جب وہ قریب آئے اور ان پر حقیقت آشکار ہوئی تو وہ فرط غم میں گرہ کرنے لگے۔ روتے پیٹتے جب وہ نڈھال ہو گئے تو انہوں نے مردہ لڑکی کو دفنانے کی جانب توجہ کی۔ نیچے تریج گاؤں میں ایک پہاڑی نالے کے ساتھ ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ وہ کوئی باقاعدہ قبرستان نہ تھا بلکہ ایک چٹیل میدان میں پہاڑی پتھروں کے بیچ میں قبریں کھود کر ان میں مردوں کو دفنا کر ان پر بھر بھری مٹی اور روڑے پتھر ڈال کر انہیں برابر کر دیا جاتا۔ تنویر کی جگہ مختلف نوعیت کے پتھر بطور نشانی کھڑے کر دیئے جاتے۔ عیبت ناک پہاڑوں کے بیچ ہولناک سنائے میں موجود یہ بُرہشت جگہ رات کو پہاڑی نالے کے پُر شور پانیوں میں عجیب یاسیت کی علامت بن جاتی۔ بس اسی جگہ لڑکی کو ایک تابوت میں دفنا کر وہ دونوں مرد گرہ یہ دُزاری کرتے وہاں سے لوٹ گئے۔ کچھ ہی عرصے میں تریج گاؤں کے قبرستان میں ایک یورپی لڑکی کی قبر باقی قبروں میں یوں رزل بل گئی کہ وہاں کے لوگ اس واقعے کو بھول گئے۔“

”واقعی بہت دلگیر قصہ تھا۔“ میں نے تارڑ صاحب کی بات میں اپنی بات ملائی۔

اس پر تارڑ صاحب کے اندر موجود مشاق قصہ گو نے انگڑائی لی اور انہوں نے کہا

”حیران کن بات تو اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔“

میری آنکھوں میں حیرت اور چہرے پر تجسس پڑتے ہوئے وہ گویا ہوئے

”اس واقعے کو کئی برس گزر گئے۔ وہاں کے مقامی لوگ اس حادثے کو بھول گئے۔ ایک روز ایک پورچین بڑھیا وہاں آئی اور اس صوبیدار کا پوچھنے لگی۔ وہ صوبیدار اب ریٹائر ہو کر وہیں قیام پذیر تھا۔ جب ان دونوں کی ملاقات ہوئی تو بڑھیا کی آنکھیں جھپک جھپک چلیں۔ اس نے صوبیدار کو بتایا کہ وہ اس ہسپانوی لڑکی کی ماں تھی اور اس کو لینے آئی تھی۔ اس نے صوبیدار کو بتایا کہ وہ لڑکی اسے بے رحم مزاجی اور جب اس کی موت کی خبر وہاں ماں تک پہنچی تو وہ بے حال ہو گئی۔ غریب عورت تھی۔ ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی اور کئی برس کی محنت کے بعد اتنی رقم پس انداز کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ پاکستان آنے کا اور بیٹی کا تابوت لے جانے کا انتظام کر سکے۔“

یہاں پہنچ کر تارڑ صاحب نے سوگ میں نہائی آواز میں بات ختم کی

”جب تریج گاؤں کے اس صوبیدار نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو اس کی آنکھیں یہ بتاتے ہوئے جھپک گئیں کہ ماں جب بیٹی کا تابوت ساتھ لیے جا رہی تھی تو اس نے تفکر بھرے مطمئن لہجے میں فقط اتنا کہا تھا کہ کم از کم اب اس کی بیٹی ماں کے قریب تو ہوگی۔“

عام انسانی زندگی میں توجیہ اور دلیل سے ماوراء واقعات سن کر اور دیکھ کر انسان تھمر میں جھلنا نہ ہو تو اپنے فہم کو مطمئن کرنے کا کیا سامان کرے۔

بڑا ادیب اپنے زمانے کے بارے میں لکھتا ہے۔ اسی لیے تاریخی ناول لکھنے والے یا دیومالائی طلسماتی قصے تخلیق کرنے والے بہر حال ادب کی صف دوم میں ہی جگہ پاتے ہیں۔ جارج برنارڈ شا جیسا ڈین ڈرامہ نگار اور حاضر جواب و بذلہ سنج تخلیق کار جب یہ کہتا ہے ”وہ شخص جو اپنے بارے میں اور اپنے دور کے بارے میں لکھتا ہے درحقیقت سب لوگوں کے بارے میں اور سب زمانوں کے بارے میں لکھتا ہے“ تو اس کی بڑ وزن بات کو آسانی سے جھٹلانا ممکن نہیں۔ تارڑ نے جو کچھ بھی لکھا اس میں ان کا دور اور اس دور سے متعلق کردار یوں صحیح بیٹھتے ہیں جیسے ایک جگہ ساپزل کے ٹکڑے۔ چند استعمیات ہیں لیکن ان کی ٹھوس وجوہات ہیں۔

اس نئے سفر ناموں کے کردار، ناولوں کے لوکیل اور تحریروں میں رقم زمانے سب اس کے اپنے ہیں۔ یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ پاکستان کی متفرق معاشرت کی بچی کاری جس طرح تارڑ نے اپنی تحریروں میں کی ہے کسی اور پاکستانی ادیب نے نہیں کی۔ اس کے سفر ناموں کے شمالی علاقہ جات اور پشتون علاقے، خراسان کا زمانے کا پنجاب، راکھ کالا ہور، کراچی اور لاہور کے گرد و نواح، ’ڈاکیا اور جولاہا، کا جنوبی پنجاب، ’بہاؤ‘ کا سرسوتی اور چولستان، سفر گردی کے احوال میں بلوچستان سے ایران کا راستہ ہو یا گندھارا تہذیب، کالموں میں سندھو سائیں کے کردار ہوں یا ’قربت مرگ‘ میں محبت کا پوٹھو ہار اور پنڈی اور مری کو جوڑتا لوکیل، سب تارڑ کے تیار کردہ قہن میں بہار دکھاتے ہیں۔

یقیناً تارڑ پاکستان ہے۔

مجھے تارڑ کی دو باتیں حیران کرتی ہیں۔ حیران تو اور بھی بہت سی باتیں کرتی ہیں مگر دو باتیں زیادہ حیران کرتی ہیں۔

ایک تخلیق کار جب تنہائی میں کوئی شکاہ کار تخلیق کرتا ہے تو اسے اپنی ذات کی سرنگ اترنا پڑتا ہے۔ ایسے میں ایک اتر ہوت اُدا سی، اس کا گھیراؤ کر لیتی ہے۔ فرانس کا فکا کے الفاظ میں ”لامحدود تنہائی، ذات کے اندھے پاتال میں اتر جانے“ کے مترادف تنہائی کے وہ لمحات جب اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے، اس کی سنجیدگی کے سلیش رنگ کو سیاہ کرتا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہزاروں خالی صفحات میں رنگ بھرنے والا تارڑ اپنے مزاج کی شوخی اور انداز کی برجستگی کو برقرار رکھے ہے۔ اتنی شدید تنہائی تو اپنے نچ پانیوں میں کئی وجودوں کو جھاسکتی ہے۔“

عام زندگی میں بہت نارمل اور بے تکلف تارڑ اپنے ماحول کی جزئیات پر ایسی گہری نظر رکھتا ہے جیسی چوٹی پر بیٹھا ایک عقاب وادی میں بہتے دریا کے کنارے بیٹھے شکار پر رکھتا ہے۔ اگر ماحولیاتی جزئیات تک بات محدود ہو تو بھی قابل فہم ہے مگر انسانی نفسیات کے گورکھ الجھاؤں میں بھٹکتے پراسرار عوامل کو احاطہ فہم میں لے آنا سی کا کمال ہے۔



گرمیوں کی ایک جھک دو پہر کو ہم ایک ریسٹوران کے ٹنک نیم تاریک گوشے میں بیٹھے ٹھنڈے مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دو پہر سہ پہر میں تبدیل ہو رہی تھی اور ریسٹوران میں لوگوں کا رش کافی گھٹ گیا تھا۔ کپ شپ کے دوران کہنے لگے کہ ہر حال میں شکر ادا کرنے کی تلقین کرنے والے بنیادی انسانی نفسیات سے ناواقف نہیں رہتے ہیں۔ اسی حوالے سے ایک واقعہ سنایا کہ کس طرح ایک عورت کا اکلوتا جوان بیٹا راہ اجل پر چلا گیا۔ جب پر سہ دینے والوں نے اسے کہا کہ وہ مبر و شکر کرے تو ماں نے غم گین نگاہوں سے ایسے رکی پر سہ داروں کی جانب دیکھا اور بولی ”مبر تو شاید کر لوں مگر شکر نہیں۔“

اسی طرح بات ان خواتین کی جانب چل نکلی جو رشتہء جسم و جان قائم رکھنے کے لیے جسم کا رستہ اختیار کرتی ہیں۔ میرا موقف تھا کہ یہ بہر حال ایک حقیقت ہے اور غربت اور دیگر معاشرتی عوامل کی وجہ سے اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر اس صورت حال کا سدباب نہیں ہو سکتا، پھر کیا بنیادی انسانی جبلت کے خلاف اس کا سدباب جو دیگر معاشرتی منفی عوامل کی نمود پر راحت کر سکتا ہے، کے پیش نظر اس کو تسلیم کر لینا قرین فہم نہیں۔ اس ملک میں جہاں جانوروں کے حقوق ہیں، کتابوں میں سہی، وہاں ایسی خواتین کو کسی نوعیت کا تحفظ دینا تو کیا ان کو تسلیم نہ کرنا کیا بالائے فہم نہیں۔ بات اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہوئی جب اس غیر انسانی سلوک کی جانب چلی گئی جس کا ان خواتین کو کبھی سامنا کرنا پڑتا ہے تو تارڑ صاحب نے حسب عادت بچے سگریٹ کو کیس میں واپس رکھا اور سمجھانے کے انداز میں گویا ہوئے۔

”دیکھو تمہاری بات نصابی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر جسم فروش عورت کو بڑے سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ عموماً ایسی عورتوں کو غیر انسانی سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو ایک باقاعدہ منظم گینگ کا حصہ ہوں کیونکہ انہیں اپنی پشت پر کافی سہارا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عام چلتی پھرتی سڑک پر کھڑی جسم فروش عورتیں زیادہ تشدد کا سامنا کرتی ہیں کیونکہ ان سے استفادہ کرنے والا انہیں بے سہارا جان کر اپنی تمام تشدد خواہشات ان سے پوری کرنا چاہتا ہے۔ ایسے میں ان کا عالم مردوں سے بھی پالا پڑ جاتا ہے۔“

انہوں نے زور دے کر کہا

”اگر اس موضوع کو کلکشن میں استعمال کیا جائے تو تشدد سہارنے والی عورتوں کی بہ نسبت جبر کرنے والے مرد زیادہ طاقتور موضوع بن سکتے ہیں۔ عام طور پر جنسی طور پر کمزور یا غیر فعال مرد اپنی مایوسی کا انتقام تشدد کی شکل میں لیتے ہیں۔ ان کا نفسیاتی تجزیہ زیادہ کارآمد موضوع ہو سکتا ہے۔“

جب میں نے ان سے پوچھا کہ ایک صدی پہلے پیدا ہونے والا منٹواس بنیادی انسانی جبلت پر اتنا لکھ گیا تو آج کا ادیب کیونکر اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے ٹھٹھک جاتا ہے تو انہوں نے معاشرتی عوامل کے ادیب پر طاقت و اثر کو اس کی بنیادی وجہ قرار دیا۔ جدید مغربی ادب میں خواتین ادیبوں نے حال ہی میں جنسی موضوعات پر جس تخلیقی فعالیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ حیران کن ہے اور توجہ طلب بھی۔ ان میں ہر انعام جیتنے والی خواتین سے لیکر پاپولر ادب تخلیق کرنے والی خواتین، سبھی اس موضوع کے دام کی اسیر نظر آتی ہیں۔ شاید یہ ان کی جانب سے اپنے وجود کے جنسی پہلو کو منوانے کی پُر زور سعی ہے۔ جہاں ایک جانب آرٹ کی فرانسیسی نقاد کیترن ملٹ نے اپنی کتاب ”دی سیکسول لائف آف کیترن ایم“ کے ادبی معیار سے انڈیپنڈنٹ اور دی اسکاٹسمین جیسے اخبارات کو متوجہ کیا۔ تو دوسری جانب ”ان بیڈو“ میں علی سمیٹھ جیسی مستند ادیبہ دیگر ادیبوں کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھا کر ادبی دنیا میں بالچل چاتی ہیں۔ ”مائی ہو ریڈل لائف“ کی تخلیق کار چیلی سینڈلر بھی کہاں کسی سے پیچھے رہنے والی ہیں۔ ہیلن سمپسن کا نورینر لیگز ان اے بیڈ پرسنڈے ناٹسز کا ایوارڈ جیتنا بھی زیادہ پرانی بات نہیں۔ پچھلی دودھائیوں میں خواتین ادیبوں کی جانب سے متواتر ایسی تحریریں سامنے آئی ہیں کہ شاید انسانی تہذیب نے پھر سے مادری نظام کی جانب چھوٹے چھوٹے قدموں سے واپسی کا سفر شروع کیا ہے۔

تارڑ صاحب کے ہاں بنیادی انسانی جنسی جبلت کو ناولوں میں یوں سویا گیا ہے کہ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں۔

اسی سہ پہر بتائے گئے کہ اپنی ابتدائی تحریریں میں کہیں وہ اپنے چند ازدواجی مسائل کا ذکر کر بیٹھے تو ان کی بیچوں نے انہیں خامسے آڑے ہاتھوں لیا۔ بس جب سے کھل کر لکھتے ہوئے قلم میں جھجک در آتی ہے۔

تارڑ شائد ایک شریف آدمی نہیں اور نارٹل تو بالکل نہیں اسی لیے ایک بہت بڑے ادیب ہیں۔

”شریف آدمی بڑا ادیب نہیں ہو سکتا۔“ ایک روز انہوں نے میرے سامنے قحی اعلان کیا۔

”عرفان، میں تو شروع سے کہتا آیا ہوں کہ ایک شریف آدمی بڑا ادیب نہیں ہو سکتا۔ ایک مرتبہ اس پر اشفاق احمد سے خاصا بحث ہو گئی۔ وہ میری بیوی سے کہنے لگے ”میں کو یہ کہتا ہے کہ شریف آدمی بڑا ادیب نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ مجھے بڑا ادیب نہیں مانتا۔“ میں نے جواب دیا کہ ”میں آپ کو بڑا ادیب تو مانتا ہوں مگر شریف آدمی نہیں۔ اگر اجازت دیں تو آپ کی تحریریں سے حوالے نکال لادوں۔“

تارڑ صاحب نے تہتہ لگایا اور بولے

”بس پھر کیا تھا۔ اشفاق صاحب بوکھلا گئے اور انہوں نے موضوع بدل دیا۔“

ایک شام، اپنی اسٹڈی روم کی بتیاں روشن کرتے ہوئے کہنے لگے

”میری بیوی بہت باہست عورت ہے۔ بھلا کوئی عام عورت میرے جیسے سیلابی مزاج، مشکل آدمی کے ساتھ گزارہ کر سکتی تھی۔ اب میں شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد یورپ کی چانچ نکل گیا۔ راستے میں حیرت پہنچ گیا۔ وہاں بی۔ ایل۔ او کے دفتر چلا گیا اور اسے جوائن کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے انٹرویو لے کر انکار کر دیا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے استفسار کیا

انہوں نے جواب دیا۔

”وہ شادی شدہ لوگوں کو بھرتی نہیں کرتے تھے۔ جہاں گردی کا سودا سر میں ایسا سمایا کہ منزل کا تعین کیے بغیر کئی کئی ماہ بھٹکتا رہتا۔ اس کا بھی اپنا لطف تھا۔ بیچ ہانگنگ کے دوران نامعلوم منزلوں کی جانب روانہ ہو جاتا۔ ایک روز یورپ میں یونین سڑک پر کھڑا تھا کہ ایک شخص نے بتایا کہ وہ تیسرے گار جا رہا ہے۔ میں ساتھ چل دیا۔“

کچھ توقف کر کے مسکرائے اور بولے

”جہاں گردی اب بھی کرتا ہوں مگر ذرا سمجھدار ہو گیا ہوں۔ منزل کا تعین ضرور کر لیتا ہوں۔ شمالی علاقہ جات اور پہاڑی سلسلوں کے چند حصے زیادہ سفر کیے ہیں اور سب میں منزل پہلے سے متعین تھی۔“

میری طرف غور سے دیکھا۔

”بھلا میدانوں سے آنے والے کسی شخص کا پہاڑوں سے ایسا عشق نارٹل تھوڑا ہی ہے۔ میں نارٹل کہاں ہوں۔ پہاڑوں سے مجھے اب بھی ہوا دے آتے ہیں۔ پہاڑ مجھے بلاتے ہیں۔ ان میں ایک مقناطیسی کشش ہے جو مجھے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ تب میں آس پاس سے بیگانہ ہو جاتا ہوں اور ان سے ہمکنار ہونے کی خواہش مجھے بے اختیار کر دیتی ہے۔ ابتدائی ازدواجی زندگی میں کافی مشکلات پیش آئیں۔ آخر کار میری بیوی کو حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑا۔ اس زمانے میں بیویاں حالات سے سمجھوتا کر ہی لیتی تھیں۔“

تارڑ صاحب کی ذات کے بارے میں ایک راز ہے جو شائد بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

وہ دلچسپ، خبیث اور غیر معمولی لوگوں کی یادیں اکٹھی کرتے ہیں اور ان کو اپنے ذہن کے کسی نہاں گوشے میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ شائد اسی لیے عام روشین کی زندگی گزارنے والے لوگوں میں جلد ہی دلچسپی کھودیتے ہیں۔ ایسے میں یہ بات میرے لیے باعث

تجسس ہے کہ میری ذات کی کس کبھی نے ان کی دلچسپی کا رخ میری جانب کر دیا کہ اتنے تپاک سے ملنے بھی ہیں اور ہا کا مدھی سے ملنے ہیں۔

ان کے دوستوں میں ایک دوست مطیع الرحمان بھی تھا جو دست شناسی کو بطور پیشہ اپنائے ہوئے تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنے سفر نامے ”نانکا پربت“ میں بھی کئی مرتبہ کیا ہے۔ وہ ہم دونوں کا مشترکہ دوست تھا اور بہت رنگین کردار۔ زندگی سے بھرپور مطیع الرحمان کی اچانک وفات پر میں نے تارڑ صاحب کو بہت سوگوار دیکھا۔ اس کی وفات کے بعد جب میں تارڑ صاحب سے ملنے گیا تو وہ بہت دیر تک مطیع الرحمان کا ذکر کرتے رہے اور اس سے وابستہ دلچسپ واقعات سناتے رہے، بلکہ انہوں نے اس پر کالم بھی لکھا۔ اس روز باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ کس طرح ایک رات اچانک تارڑ صاحب کے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجی۔ جب وہ باہر نکلے تو سامنے مطیع الرحمان تھا۔ وہ کچھ جلدی میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک پلندہ تھا۔ پلندہ تارڑ صاحب کو تھا کہ اس نے درخواست کی کہ وہ بھی اس مسودے کو ایک نظر دیکھ لیں۔ جب تارڑ صاحب نے اس کے بارے میں مزید استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ایک ناول کا مسودہ تھا جو مطیع الرحمان نے لکھا تھا اور جس پر اسے ادب کا نوبل انعام ملے گا۔ اس نے انتہائی یقین سے یہ بات کہی گویا کہ نوبل کمیٹی نے یہ فیصلہ کر لیا ہو اور بس میڈیا کو اطلاع دینی ہو۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ میں نے تارڑ صاحب کو بتایا کہ ان دنوں اس نے مجھے بھی بتایا تھا کہ وہ ایک ایسا ناول لکھ رہا ہے جسے نوبل انعام ملتا ہے۔ پھر میں نے تارڑ صاحب سے پوچھا۔

”کیسا تھا ناول؟“

”ناول تو پتا نہیں وہ تھا یا نہیں لیکن جو کچھ بھی تھا، دلچسپ اور مختلف تھا۔“ انہوں نے جواب دیا

اُسی نشست میں وہ بتانے لگے کہ کس طرح مطیع الرحمان ان سے رقعہ لے کر اپنے ایک دوست پر دیز کے ساتھ ہندوستان میں قراۃ العین حیدر سے ملے پہنچ گیا، پھر امرتا پریتم اور امرود سے ملا اور بالآخر بمبئی کے ایک مشہور ریزمین ڈان سے تعلق نکال کر اس کی محفلوں میں شریک ہونے لگا جہاں ایک محفل رقص میں ایک معروف رقص لڑکے سے محبت میں مبتلا ہو گیا۔

مطیع الرحمان کی رنگین ذات ایک مکمل خاکے کی متقاضی ہے۔ تارڑ صاحب کے نقلی گھر میں ایسی کئی تیلیوں کی مسایاں محفوظ ہیں۔ ان دنوں وہ اپنے مشاہدے کی وسعت کے لیے ان لوگوں کو زیادہ استعمال کرتے ہیں جو ان کے ساتھ جج کی سیر کرتے ہیں یا پھر سفروں پر نکلتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ناسٹیلجیا کا شکار ہوں اور مجھے اپنا بچپن، پرانے گھر بہت ہانٹ کرتے ہیں۔ ”مجھے بچپن نے کبھی اپنی طرف نہیں کھینچا۔“ انہوں نے کئی مرتبہ اس بات کا اظہار کیا ہے۔ ”میں کبھی بچپن سے اس طرح محظوظ نہیں ہوا جس طرح اور بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ گوکہ میں اپنے خاندان میں پہلا اور سب سے بڑا بچہ ہونے کے باعث سب سے لاڈلا بھی تھا۔ پھر میرے والد صاحب کا کاروبار بہت وسیع ہو گیا تھا۔ ان کا کاروبار ہندوستان کی حدود سے نکل کر سری لنکا وغیرہ تک پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے برطانیہ اپنے خرچے پر بھیجا تھا اور اس دور میں یہ اچھی خاصی مہنگی عیاشی کے درجے میں آتا تھا۔ آج میں جس گھر میں گلبرگ جیسی مہنگی جگہ پر رہتا ہوں، یہ پلاٹ بھی انہی کا خریدا ہوا ہے۔“

”پھر کیا وجہ ہے کہ بچپن جیسا معصوم اور بے فکر دور زندگی آپ کو اس طرح متاثر نہیں کرتا جیسے دیگر کئی ادیبوں اور لوگوں کو کرتا ہے؟“

”شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا لڑکپن اور جوانی، بچپن سے زیادہ خوبصورت تھے۔ ان سہری ایام کی اوٹ میں میرا سادہ سا بچپن چھپ کر رہ گیا یا، ویسے بھی بچپن حیرت کا دوسرا نام ہے جب آپ ہر شے کو حیرانی سے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوتے ہیں، کئی تجربات سے پہلی مرتبہ گزر رہے ہوتے ہیں۔ میری تو حیرت آج بھی باقی ہے۔ مجھے آج بھی کئی مناظر اور کئی تجربات بچے کی طرح ایکساٹ کرتے

ہیں۔ راکا پوشی پر پہلی نظر بے طرح ایکٹ کرتی ہے۔ سو شاید آج بھی میں بچپن سے کل نہیں پایا۔ ایک طرح سے اپنے بچپن میں زندگی گزار رہا ہوں۔“

یہ ان کا اپنی ذات کے حوالے سے نفسیاتی تجزیہ تھا۔ ان سے ہونے والی نشستوں میں وہ ایسے نفسیاتی نکتے لاتے رہے ہیں جو منظر اور درجہ ہوتے ہیں یہی ان کی تخلیقی فعالیت کی دلیل بھی ہے اور شائد ان کی بہت سی تحریروں کا خیر اسی سے اٹھتا ہے۔

”ایک عورت ایک ہی وقت میں دو مردوں سے بیک وقت یکساں شدت سے محبت کر سکتی ہے۔ مکمل غلوں میں دل کے ساتھ“ ایک روز انہوں نے اعلان کیا۔

”یہ ایک تاریخی مغالطہ ہے کہ انسان کو زندگی میں صرف ایک مرتبہ محبت ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی مغالطہ ہے کہ آپ ایک وقت میں ایک ہی انسان سے محبت کر سکتے ہیں۔“ انہوں نے میز پر ہاتھ مارا۔

”تم عورت کو مرد کی نظر سے نہ دیکھو۔ اس کے اندر اتر کر دیکھو۔ میں نے عورت سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ عورت زندگی کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ جب میں یورپ کے سفر پر گیا تو کم لوگ باہر جاتے تھے۔ جو جاتے تھے وہ واپسی پر اپنے تجربات تحریر نہیں کرتے تھے۔ جب پاکستان کو یا تو لوگ کم جانتے تھے یا جو جانتے تھے ان کے ذہن میں اس کا تاثر ایک ابھرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ملک کا تھا۔ ایک لڑکے اور لڑکی کا باہمی تعلق وہاں کے کلچر کا حصہ تھا۔ چنانچہ جب واپسی پر میں نے اپنے تجربات اور مشاہدات سفر نامے کی شکل میں لکھے تو بہت سے نکتہ چینوں نے ان میں مبالغہ ڈھونڈ نکالا۔ اس امر سے قطع نظر، میرے ابتدائی سفروں نے میرے ذہن میں عورت کا یہاں پر مروجہ تصور توڑ ڈالا۔ وہاں کی عورت چونکہ نسوانی آزادی کے رستے پر گامزن تھی اسی لیے زیادہ بولتی تھی۔ وہ ان موضوعات پر بھی آسانی سے اظہار خیال کر سکتی تھی جن پر بات کرتے ہوئے یہاں کے مردوں کی زبانیں بھی تالو سے چپک جاتی تھیں۔ وہ عورت عملی طور پر بھی کچھ کر گزرنے سے نہ ہچکچاتی تھی۔ اس ماحول نے میرے ذہن کو ایک ایسی وسعت دی جو یہاں رہتے ہوئے حاصل کرنا ممکن نہ تھی۔“

تارڑ صاحب گہری سوچ میں غوطہ زن ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد متذبذب لہجے میں کہنے لگے

”دیکھو، اگر یہ عورتیں میری زندگی میں نہ ہوتیں تو شاید میری تحریریں سپاٹ اور بیان بے رنگ ہوتا۔ عورت نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ میری تحریر کو رنگ، میرے ذہن کو وسعت، میرے جذبات میں گہرائی اور میری شخصیت میں اعتماد۔ ان سب میں عورت کا بہت اہم کردار ہے۔ میرے ناول ”بہاد“ کی پاروشنی کو بیک وقت دو مردوں سے محبت ہو جاتی ہے تو یہ عین قرین حقیقت ہے۔“ ”چٹھی“ میں نسوانی کردار اصلی ہے۔ بلکہ جب سلجوق پیدا ہوا تو اس نے اس کے لیے تحائف بھی بھیجے تھے۔ ”پیار کا پہلا شہر“ کی پاسکل واقعی اپنا سچا تھی گو اس میں، میں نے رنگ آمیزی کی ہے مگر اسے تم فقط فرنی پر لگے چاندی کے درقوں کی طرح سمجھو۔ ”قربت مرگ میں محبت“ کی تینوں خواتین حقیقی ہیں۔ میں نے عورت کو اتنے قریب سے اور اتنے مختلف روپوں میں دیکھا ہے کہ یہ تجربات حیرت کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ہم منافق لوگ ہیں۔ جھوٹ کے شفاف لہ دے کو اوڑھ کر سمجھتے ہیں کہ ہمارا نگاہ بدن لوگوں سے چھپ گیا ہے۔ میں ایک بہادر آدمی ہوں۔ میں نے یہ سب اپنی تخلیقی تسکین کے لیے لکھا ہے۔ مجھے لوگوں کا کوئی ڈر نہیں۔ میں نے بس میمونہ کو اعتماد میں لیا اور وہ بہت جلد سمجھ گئی کہ ادیبوں کی زندگیوں عام ڈگر پر نہیں چلتیں۔ اس نے سمجھوتا کر لیا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اُس کی وجہ سے ہوں اور اس کا شکر گزار ہوں۔“

”تارڑ صاحب آپ ابھی اپنے صنف مخالف کے حوالے سے مشاہدے اور تجربے کا ذکر کر رہے تھے۔“

”عرفان، میں بیس فیصد عورت ہوں۔“

جب تارڑ صاحب نے یہ جملہ کہا تو مجھے اپنے ایک دوست کی بات یاد آگئی کہ تارڑ کے ہاتھوں سے عورت لکھتی ہے اور عبداللہ حسین



کے ہاتھ مرد کے ہاتھ ہیں۔ تارڑی ریٹھی تحریر بھی سہائی، نہیں اور موزوں ہوتی ہے جبکہ عبداللہ حسین مرد کی طرح اکھڑا کھڑا جاتا ہے، کمر ہوا ہو جاتا ہے۔

”ایک ادیب کے لیے ضروری ہے کہ اس کا تجربہ اور مشاہدہ خانقاہ سے لیکر طوائف کے گوشے تک ہو۔ ہر بڑے تخلیق کار میں نسوانیت کا مختلف تناسب سے جو ہر ایک جزو لازم ہے۔ یہ صرف ادیبوں میں نہیں، موسیقاروں اور مصوروں میں بھی ہوتا ہے۔ میں نے جب ایک مخصوص وقت اور مقام پر ایک عورت کو دیکھا تو وہ مجھے واجبی شخصیت اور شکل کی مالک نظر آئی۔ جبکہ کسی دوسرے موقع پر اسی عورت نے مجھے اپنے حسن اور شخصیت سے بہت متاثر کیا۔ عورت کی بے شمار پرتیں ہوتی ہیں جو آہستہ آہستہ مختلف لوگوں پر مختلف طرح سے مختلف اوقات میں کھلتی ہیں۔ اب جب ”بہاؤ“ میں پاروشنی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے اور میں نے وہ سارا منظر بیان کیا تو لوگوں نے مجھ سے پوچھا یہ سب اتنا اصلی ہے، آپ نے کہاں سے لیا؟ میں نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ وہ سب لکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خود زندگی کے مراحل سے گزر رہا ہوں۔“

بین کر میری یادداشت کے کسی نہاں گوشے سے امریکی ادیب نارمن ملر کی بات ابھری کہ کسی مرد کا کوئی کتاب تخلیق کرنا بچگی کے مراحل سے گزرنے کے قریب ترین مماثل تجربہ ہو سکتا ہے۔

تارڑ صاحب آج خلاف معمول کچھ زیادہ ہی جذباتی نظر آ رہے تھے۔

”جب میں یورپ کے سفر سے واپس آیا تو وہاں کے ماحول کا عادی ہو چکا تھا۔ نو جوانی کا دور تھا۔ میں سفید لٹھا تھا۔ کوئی بھی رنگ جلد چڑھ جاتا تھا۔ ایک روز میری ایک عزیزہ اپنی بیٹی کے ہمراہ ہمارے گھر آئیں۔ کئی سالوں بعد بات ان سے ملاقات ہو رہی تھی۔ جب پچھلی مرتبہ ان کی بیٹی کو دیکھا تھا تو وہ دس بارہ برس کی تھی۔ اب سترہ اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی اور خاصی قبول صورت تھی۔ چنانچہ میں نے عام مغربی انداز میں اپنی والدہ اور ان عزیزہ کے سامنے لڑکی کی تعریف کر دی خالہ بیو اتنی بڑی اور خوب صورت ہو گئی ہے کہ اس سے تو ہا قاعدہ محبت کی جاسکتی ہے۔“ مجھے تو قح تھی کہ وہ خوش ہو جائیں گی۔“

”انہوں نے شرم سے مجھے دیکھا اور بولے

”وہاں تو اچھی خاص مصیبت بن گئی۔“

”شکر کریں لڑکی کے والد ہمراہ نہ تھے ورنہ بہت سی خواتین گھٹنگریا لے بالوں، درگندی رنگت والے خوش شکل لڑکے کی قربت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتیں۔“

ایک سوال میرے ذہن میں کلبار رہا تھا، چنانچہ میں نے تارڑ صاحب سے بے تکلفی سے وہ سوال کر دیا

”کرز ما انگریزی کا لفظ ہے، صنف مخالف کی شخصیت مقناطیسیت جس کی ایک قسم اور قریب ترین مترادف اردو ترکیب

ہو سکتی ہے۔ آپ نے رنگ رنگ کے لوگ دیکھے اور ہر طرح کی زمینوں کی سیاحت کی۔ کیا کبھی کسی ایسے انسان سے آپ کی ملاقات ہوئی؟“

انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔

”میں ٹی۔ ڈی پر مارننگ شو کرتا تھا۔ شو خاصا مقبول تھا۔ اکثر شو کے بعد اسٹوڈیو کے باہر چند ایک چاہنے والے مل جاتے۔ ایک

روز شو کے بعد مجھے بتایا گیا کہ دیننگ روم میں ایک خاتون مجھ سے مناجا ہتی ہیں۔ میں دیننگ روم میں چلا گیا۔ سامنے صوفے پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے مجھے سرائی کر دیکھا۔ وہ واجبی شکل کی لڑکی تھی۔ لیکن اس نے جس انداز سے مجھے دیکھا اس نگاہ نے مجھے جکڑ لیا۔ یہاں کی مناسب لفظ نہیں۔ ایک مقناطیسی بلاؤ تھا اس کی نظروں میں۔ میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کونستہ سے تعلق

رہتی ہے اور کوئی کی تلاش میں ہے۔ فی الحال اس کا مسئلہ ہائش کا تھا۔ میں نے اسے دالنے کے لیے کہہ دیا کہ اگر ممکن ہو تو میں کوٹھڑی میں آ جاؤں گا۔ اس پر اس نے میرے ساتھ میرے کمرے میں ٹھہرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے معذرت کر لی۔ جتنی دیر بات چیت ہوئی رہی وہ موافقہ پر نہیں رہی اور میں ہٹ بنا اس کے سامنے کھڑا رہا۔ میڈیا اور عام زندگی میں بے شمار خواتین سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ مگر میں ان لمحات کو اب تک نہیں بھولا جب اس لڑکی نے مجھ پر سحر پھونک دیا تھا۔ دیکھو یہ وحشی متناسطیت عورت ہی میں نہیں بلکہ مرد میں بھی ہوتی ہے۔ عموماً مرد کے لیے عورت میں اور عورت کے لیے مرد میں ہوتی ہے۔ چند مرد ایسے بھی دیکھے جو مجھے بظاہر عام سے مرد نظر آئے مگر مورتیں ان کی جانب بولیں کبھی چلی آئیں جیسے شکار اژدھے کی نظروں میں نظریں ڈال کر اس کی جانب بے قابو کھینچا آتا ہے۔

تارڑ صاحب ایک انتہیلیٹ کا سائنس دان رکھتے ہیں۔ جب باڈل ٹاؤن پارک میں واک کرتے ہیں تو کئی جوانوں سے زیادہ متحرک ہوتے ہیں۔ ایک روز ان کے ساتھ واک کرتے ہوئے میں نے تھک کر بیٹھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اب تک واک کے دوران ان کو کئی جاننے والے مل چکے تھے۔ کسی کو ہاتھ ہلا دیتے تو کوئی ان سے معاف کرنے چلا آتا۔ وسیع و عریض پارک کے کنارے ترقی ترقیاتی بازو کے ساتھ میں نصب بیچ پر بیٹھ کر ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ باتیں جرائم کی جانب چلی گئیں۔ ان دنوں لاہور میں اسٹریٹ کرائم کا بوجھ تھا ہوا راجان عام شہریوں کو کافی پریشان کر رہا تھا۔

میں نے تارڑ صاحب سے سرسری انداز میں پوچھا۔

”جرم یقیناً ایک اخلاقی برائی ہے۔ مگر کیا مجرم کے ذہن میں صحیح طرح سے جھانکنے اور اس کی نفیاتی گروہوں کو کھولنے کے لیے ایک بڑے ادیب کے اپنے اندر ایک چھوٹا موٹا مجرم ہونا ضروری نہیں۔ ادھنری، ویم بورو، آسکر وائلڈ سے لے کر جیک لنڈن تک بے شمار بڑے ادیب اخلاقی جرائم میں سزا یافتہ تھے اور ہیں۔“

تارڑ صاحب جو ابھی سانس درست کر رہے تھے، نے ہڈ زور انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور بولے

”بالکل! لیکن یہ ضروری نہیں کہ ادیب عملی طور پر مجرم ہو۔ اس کی خطہ مجرمانہ ذہنیت بھی بہت کافی ہے۔ جرائم کے سدباب کے مغربی اداروں میں مجرم ذہنیت کے ادراک کے لیے دوستوں کی کرائم اینڈ پنٹسٹ اور دیگر بیرونی لا مرکز جیلو آج بھی نصاب کا حصہ ہیں۔“

میں نے سوال کیا۔

”کیا آپ میں ہے؟“

انہوں نے بے تکلفی سے جواب دیا

”شاید، ہاں۔ یار میرے اندر بہت چھوٹا مجرم بیٹھا ہے۔ شاید اسی لیے میری تحریروں میں تمہیں کوئی نمایاں مجرم کردار نہیں ملیں

گئے۔“

اب چونکہ بات مکمل کر ہو رہی تھی اس لیے میں نے ایک اعتراض دائر دیا

”فی۔دی پر کام کرنا ایک تخلیقی کام ہے۔ آپ نے جب شادی آن مائن، جیسا پرگرام کیا تو کیا یہ آپ کے معیار سے نچلے درجے کا کام نہیں تھا؟“

”تخلیقی کام کے لیے جتنی یکسوئی ضروری ہوتی ہے اور اس میں معاشی آسودگی کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے، خاص طور پر ٹکشن تحریر کرنے جیسے صبر آزما کام میں۔ عملی زندگی کے شروع میں میں ایک ایسے دور رہا پر آن کھڑا تھا جہاں مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ آیا میں کاروبار کروں یا پھر لکھنے کا روزگار اپناؤں۔ میری بیوی بہت سمجھدار اور شاکر عورت ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ اگر میں کاروبار کروں گا تو مجھے کبھی بھی اصل ذہنی و روحانی خوشی نہیں ملے گی۔ کچھ کھودینے کا احساس ہمیشہ میرے اندر زندہ رہے گا۔ اگر میرا کاروبار کامیاب ہو بھی گیا تو میں

ایک ناخوش کار وہاری شخص کی حیثیت سے زندہ رہوں گا۔ تب میری بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں لکھنے کے کام کو یکسوئی سے اختیار کروں۔ اس نے مجھے اپنے بھرپور تعاون کا بھی یقین دلایا۔ یقین جانو اس نے آج تک کبھی مجھ سے پیسے کی کمی کی شکایت نہیں کی۔ کبھی زیور یا جاندار کی خواہش نہیں کی۔ میرے اندر ایک ذمہ دار شوہر اور محبت کرنے والا باپ ضرور زندہ رہا۔ چنانچہ میں نے میڈیا کا رستہ اختیار کیا۔ اگر میں یہ رستہ اختیار نہ کرتا تو معاشی بد حالی کا شکار ہو جاتا۔ میرا ضمیر مجھے کچھ کے لگا رہتا۔ میری کتابوں نے مجھے مالی خوشحالی نہیں دی بلکہ یہ ٹی۔ وی ہے جہاں سے مجھے قابل ذکر آمدنی ہوتی رہی۔ اس کے نتیجے میں، میں بہتر ادب تخلیق کر پایا۔ یعنی تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میرے اندر کے ادیب کو ٹی۔ وی نے طاقت دی اور فعال کیا۔“

”کیا کبھی ساتھی ادیبوں کی جانب سے اس حوالے سے تنقید کا سامنا رہا؟“

”ایک مرتبہ ممتاز مفتی نے مجھے سمجھایا کہ میڈیا میرے اندر کے ادیب کو کھاجائے گا۔ جب میں نے اپنی مجبوری بتائی تو بھی ان کا اصرار جاری رہا کہ میں ٹی۔ وی چھوڑ کر یکسوئی سے ادب تخلیق کروں۔ میں نے ٹی۔ وی نہ چھوڑا۔ اس پر وہ باقاعدہ ناراض ہو گئے۔ اب وہ کہیں ملتے تو منہ دوسری جانب کر لیتے۔ مفتی جی بڑے دلچسپ اور انوکھی شخصیت کے مالک تھے۔ اکثر ڈرامہ کرتے تھے۔ جھوٹ موٹ میں ناراض ہو جاتے۔ اس مکالمے کے بعد بہت عرصہ ناراضگی کا ڈرامہ کرتے رہے۔ کہیں ملتے تو سلام نہ لیتے۔ پھر ایک روز ان کا غلط ملا، انہوں نے میرا ناول ”بھاؤ“ پڑھا تھا۔ ان کے خط نے مجھے آبدیدہ کر دیا۔“

”کیا لکھا تھا خط میں؟“

”انہوں نے لکھا تھا میں نے تم سے جھوٹ اور غلط کہا تھا کہ میڈیا تمہاری تخلیقی صلاحیتوں کو کھاجائے گا۔ میں اس غلط بیانی پر تم سے معافی مانگتا ہوں۔“

”مفتی جی کے بارے میں اور ان کی تقریباً سب ہی تحریریں پڑھی ہیں۔ احمد بشیر بھی ان کا بہت ذکر کیا کرتے تھے۔ کاش میں کبھی ان سے مل پاتا۔“ میں نے حسرت سے اپنی تشنہ خواہش کا اظہار کیا۔

”یہ مفتی جی جیسے لوگ نئے زمانے کے نکسال سے نکلنا بند ہو گئے ہیں۔ اپنی طرز کے واحد آدمی تھے۔ عشق رسول ﷺ ہم دونوں میں دیگر کے سوا ایک اور قد مشترک تھی۔ میرے اندر اپنے رسول ﷺ سے اتنا عشق بھرا ہوا ہے جو ناقابل اظہار ہے۔ ان کو روحانیت سے بھی لگاؤ تھا جبکہ میں اس جانب کبھی اپنی طبیعت کو زیادہ مائل نہیں کر سکا۔ ایک مرتبہ مجھے کہنے لگے یہ تو سیدھا لکھتا تھا۔ اب ادھر ادھر ہو جاتا ہے۔ یہ تو نے کہاں سے سیکھا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ پہلے اتنی خود اعتمادی نہیں تھی۔ اب کچھ بڑھ گئی ہے۔ اس لیے نئے تجربے کر لیتا ہوں۔ یہ سن کر بولے ”یہ تو نے کہیں پروفیسر احمد رفیق اختر سے تو نہیں سیکھا؟“ میں پروفیسر صاحب کے علم اور بیان کو بہت مانتا ہوں مگر چونکہ میں نے یہ ان سے نہیں سیکھا تھا سو واضح انکار کر دیا۔ اب کیا تھا، وہ موقع کی تلاش میں رہنے لگے۔ ایک روز ہم تینوں ایک جگہ اکٹھے ہوئے تو مفتی جی پروفیسر صاحب سے کہنے لگے یہ آپ کو کبھی نہیں مانتا۔ پروفیسر صاحب نے یہ سن کر جواب دیا ”اللہ کا شکر ہے۔ جہاں سے عقیدت شروع ہوتی ہے وہیں سے جہالت بھی شروع ہوتی ہے۔ ویسے پروفیسر صاحب بہت پیارے آدمی ہیں اور دیگر علوم کے علاوہ علم الاعداد پر ان سے زیادہ مہارت میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔“



تارڑ صاحب سے میری غیر رسمی نوعیت کی دوستانہ ملاقاتیں جاری رہیں۔ ایک روز میں نے ان سے فون پر کہا کہ میں نے ایک بڑا ادیب اور شفیق دوست جان کر ان کے ساتھ سینکڑوں گھنٹے گزارے ہیں لیکن کبھی ان کے تخلیق ادب کی روٹین کے حوالے سے بات نہیں

ہوتی۔ اس پر فون میں ان کی آواز گونجی۔

”آج کچھ فارمل نہیں ہو رہے۔ ابھی کیا کر رہے ہو؟“

میں نے جواب دیا کہ فارمل ہوں تو کہنے لگے ابھی آ جاؤ تھوڑی دیر کے لیے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں اور وہ آئے سانسے، ان کی اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے سگریٹس لگا رکھی تھی اور میں نے گرم پائے ہائک حمام رکھا تھا۔ وہ بول رہے تھے۔

”میرے اندر ابھی بہت creative juice ہے۔ سطرناموں، اور ناولوں کے علاوہ سینکڑوں کالم چھپ چکے ہیں۔ میں چالیس برس تک باقاعدہ ڈائری لکھتا رہا ہوں۔ وہ میں نے ضائع کر دی ہیں۔ خطوط ان کے علاوہ ہیں۔“

میرے ذہن میں مختلف ادیب تھے۔ ان کے لکھنے کی روٹین تھی۔ ان میں سے اور حان پاک جیسا تنازعہ نوبل انعام یافتہ ادیب بھی تھا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ جب کبھی کسی نئے اہم شہر کے سفر پر نکلوں تو اس شہر سے متعلق کسی اہم ادیب کی ادبی تخلیق کو ساتھ میں لے لوں۔ استنبول کے سفر میں پاک کی استنبول اور پیرس کے سفر میں ہمنگوے کی اے مودریل فیست لندن پر تو بے شمار کتابیں ہیں اور نیویارک پر نیویارک جیسے اعلیٰ معیار کے جریدے کا خاص نمبر۔ شمالی علاقہ جات کو تارڈ کی آنکھ سے دیکھا ہے تو لاہور کو چاچا ایف ای چودھری کے منیر احمد کو انٹرویو اور اے۔ حمید کی کتابوں سے۔ کتابیں بہت ہیں اور زندگی کے دن کم۔ اور حان پاک باقاعدہ ارادہ اور پابنگ کر کے لکھتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے اور گراف پیپر استعمال کرتا ہے۔ بہت سے نئے ادیبوں کے برعکس تخلیقی تحریر کے لیے کمپیوٹر کا استعمال نہیں کرتا۔ ایک تحریر کو تین سے چار مرتبہ لکھتا ہے۔ بکر انعام یافتہ بالکل اوپن اسٹڈی کا لکھنے کا انداز نرال ہے۔ وہ کیردار کاغذ پر لکھتا ہے۔ ابتدائی تین، چار مسودے ہاتھ سے تحریر کرتا ہے۔ پھر فنی پکڑ کر ان مسودوں کے کئی اقتباس کاٹ کر دوسرے اقتباسات کے ساتھ چسپاں کر دیتا ہے۔ وہ اقتباسات، اور بعض اوقات پورے ابواب کی ترتیب تبدیل کرتا رہتا ہے۔ تاہم وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کو اپنا معروف ناول ”انگلش پیڈنٹ“ دو تصوراتی جھلکیوں کی شکل میں نظر آیا تھا جن کو اس نے لفظی بحث سے جوڑ کر ناول کی شکل دے دی۔ ”ریمنز آف دی ڈے“ جیسے اعلیٰ پائے کے انعام یافتہ ناول کا مصنف کا ڈاڈا اشی گرو بھجے ناول لکھ چکا ہے۔ وہ دو سال ناول پر ریمرج کرتا ہے اور ایک سال اسے لکھنے میں صرف کرتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے تحریر کرنے والا یہ مصنف باقاعدہ سائنسی انداز میں فلوچارٹ بنا کر ہر کردار اور پتہ پتہ کے علیحدہ فونڈر بناتا ہے۔

تارڈ صاحب کو میں نے کئی مرتبہ اپنے سامنے کوئی مسودہ مکمل کرتے دیکھا ہے۔ وہ اپنی اسٹڈی کی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ ایسے میں ایک ٹیبل لیپ ان کے دائیں ہاتھ ہوتی ہے جو بوقت ضرورت وہ روشن کر لیتے ہیں۔ ان کی نشست آرام دہ ہوتی ہے اور وہ کرسی پر بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے بارے میں میں نے پڑھا تھا کہ وہ بچوں کے شور و غل میں صوفے پر ٹیک لگا کر بھی لکھ لیتی رہی ہیں۔ کچھ لوگ فزیشنل نشست پر بھی لکھتے ہیں۔ تارڈ صاحب کے ابتدائی مسودے کی تحریر رواں اور شکستہ ہوتی ہے اور اس میں کاٹ چھانٹ کم ہوتی ہے۔ وہ ایک مسودے کو دس تین مرتبہ درست کرتے ہیں۔

اس روز میں نے کہا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کہتے تھے کہ ادیب کے لیے تسلسل سے لکھنا بہت ضروری ہے۔ پھلے وہ بعد میں غیر معیاری یا غیر ضروری تحریروں کو ضائع کر دے۔ تارڈ صاحب نے اس بات سے اتفاق کیا اور کہنے لگے۔

”لکھتے رہنا اہم ہے کیونکہ اس سے قلم رواں رہتا ہے۔ جب میرا تخلیقی جذبہ عروج پر تھا تو میں نے ابتدائی کتابیں جیسیر لین روڈ اور گولڈنڈی کے شور و غل میں دکان پر بیٹھ کر لکھیں۔ بعد میں یہی کتابیں میرا ابتدائی تعارف بنیں۔ گرا آپ کی تخلیقی قوت۔ تو رہے تو آپ کہیں بھی بیٹھ کر لکھ سکتے ہیں۔ میں نے شروع کی کتابیں ”تحریر والوں کو دیر“ ”سنگ میل پبلشرز کے یو صاحب ان دنوں درمی کتابیں چھاپتے تھے



اور ادبی کتابیں چھاپنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے کشور تہذیب کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے التحریر والوں سے کہیں لیکر ان کو دینے سے اخلاقی بنیادوں پر معذوری ظاہر کی لیکن اگلی کتاب کا وعدہ کر لیا۔ یہ ستر کی دہائی کا واقعہ ہے۔ نیاز صاحب نے میری اگلی کتاب ”ننانہ بدوش“ کے لیے مجھے پچیس ہزار روپے کی خطیر رقم کی پیشکش کی جو اس زمانے میں کسی بھی کتاب کے لیے دی جانے والی سب سے بڑی رقم تھی۔ یہ اس دور میں میری کتابوں کی مقبولیت کا ایک پیمانہ بھی تھا۔ میرے کوئی معاشی مسائل نہ تھے۔ میں ایک ایسے سیاح تھا جو ہر وقت دنیا کی مسافروں کے لیے بے چین رہتا تھا۔ قریہ قریہ پھرتا، شہر شہر خاک چھانتا، رُک سیک اٹھائے پھرتا، سلیپنگ بیگ میں سو جاتا، کچھ مل جاتا تو کھلے لیتا مگر نہ بھوکا رہ لیتا۔ طرح طرح کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا اور ہر رنگ کے آدم سے ملتا۔ متنوع بولیاں سنتا اور کئی لیوں کو چومتا منزل پر منزل فتح کرتا جاتا۔ واپسی پر یہ سب خزانہ کاغذ پر الٹ دیتا۔ انسان کو ایک مرتبہ زندگی ملتی ہے۔ بند کمروں میں کیوں گزار دے۔ زمین بہت وسیع ہے۔ یہ اس کے لیے میدانِ دعوت ہے۔ سو کیوں نہ اس کے اسرار کو کھولے۔

جب میں بتائی سفر میں پر نکلا تو حقیقی کہانیاں اور ان کے زندہ کردار مجھے قدم قدم پر ملے۔ میں نے انہیں صرف تراش خراش کر کاغذ پر لکھ دیا۔ شائد اسی لیے مجھے کبھی writers block کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہاں بعض اوقات کوئی خاص پتھرنس قابو میں نہیں آتی یا پھر کوئی آئینہ یا ذہن سے نکل گیا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ذہن، وُف ہو گیا ہو۔ اگر تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور کانوں کو تیز رکھو تو مشاہدے اور تجربے کے بل پر جلد جان جاؤ گے کہ اس دنیا میں ہر طرف بے شمار کہانیاں اور کردار نکھرے پڑے ہیں۔ تمہیں انہیں اس طرح چننا ہے جیسے ندن کے فواروں کے گرد کبوتر دانہ چنے اور چگتے ہیں۔ ایسے میں سفر اور تجربہ بہت اہم ہے۔ دیگر تہذیبوں سے واسطہ تو تخلیقی صلاحیت کوئی جہتیں عطا کرتا ہے۔ ”تاریخ صاحب کی بات کے حق میں یہ دلیل کافی ہے کہ عبداللہ حسین کی سیاحت اور مغرب میں قیام اور قرآن العین حیدر کا مغربی ادب کے وسیع مطالعے کے ذریعے ان کی تہذیب کے جائزے نے ان کے اعلیٰ ادب کو تخلیق کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ شاعروں میں اقبال، فیض اور راشد کی مثالیں کافی ہیں۔

”اُردو زبان کا سب سے بارہ بکتے والا اور مشہور ہونے والا ناول ’پیار کا پہلا شہر‘ جس کے پچپن سے زیادہ ایڈیشن بک چکے ہیں پہلے سے میرے اندر موجود تھا۔ سرور سکھیرانے مجھے سے ”دھنک“ کے لیے کوئی تحریر مانگی۔ مجھے یورپ جانے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے پوچھا کہ کتنے دن ہیں۔ انہوں نے بارہ روز بتائے۔ میں نے بارہ دنوں میں ’پیار کا پہلا شہر‘ لکھ کر ان کے حوالے کیا اور یورپ نکل گیا۔ واپسی پر اس تحریر کی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔“

”عمر کے ساتھ حقیقی فعالیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟“ یہ سوال کرتے ہوئے میرے ذہن میں جمیل احمد تھے جن کا ناول ’دی وینڈرلگ‘ فالکن بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اپنا یہ پہلا ناول انہوں نے اٹھتر برس کی عمر میں مکمل کیا۔ اس کے علاوہ جوزے ساراماگو کی بین الاقوامی پذیرائی والی تحریریں اُس نے بہت پھورنی کی عمر میں لکھیں۔ ان کا جواب تھا۔

”انسان کسی بھی عمر میں تخلیقی طور پر فعاں ہو سکتا ہے۔ میرے وہ ناول جن پر مجھے ادبی وقت دی گئی ’راکھ‘ جسے وزیراعظم ادبی ایوارڈ ملا اور ’بہاؤ‘ جسے اعلیٰ ادبی شہرہ پارہ مانا گیا، میں نے پچاس برس کی عمر کے بعد لکھے۔ دیگر ناول تو اس کے بھی بعد لکھے۔ ہاں وہ سفر نامے جن سے مجھے شہرت ملی، میں نے اپنے ابتدائی زمانے میں لکھے۔ اس لیے اعلیٰ ادبی تخلیق کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔“

مجھے ذاتی طور پر ان کا ناول ”ذا کیا اور جولابا“ بھی بہت پسند ہے۔ میرے لیے یہ بات، آج بھی معہ ہے کہ اسے وہ پذیرائی نہیں ملی جس کا یہ مستحق تھا۔

”کسی بھی ادیب کی شہرت اور پہچان عموماً اس کی ایک ناول بنتا ہے۔ قرآن العین کی پہچان ”آگ کا دریا“ عبداللہ حسین کا تعارف ”اُداس نسلیں“ بانو قدسیہ کو شہرت ”راہِ گدھ“ سے ملی۔ میرا تعارف تو پھر دو ناول ہیں ’راکھ‘ اور ’بہاؤ‘۔ اب میں تمہیں ایک

اور ادبی کتابیں چھاپنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے کشور ناہید کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے 'اتحریر والوں سے کتابیں لکھان کو دینے سے اخلاقی بنیادوں پر معذوری ظاہر کی لیکن اگلی کتاب کا وعدہ کر لیا۔ یہ ستر کی دہائی کا واقعہ ہے۔ نیاز صاحب نے میری اگلی کتاب "خانہ بدوش" کے لیے مجھے پچیس ہزار روپے کی خطیر رقم کی پیشکش کی جو اس زمانے میں کسی بھی کتاب کے لیے دی جانے والی سب سے بڑی رقم تھی۔ یہ اس دور میں میری کتابوں کی مقبولیت کا ایک یہ نہ بھی تھا۔ میرے کوئی معاشی مسائل نہ تھے۔ میں ایک ایسا سیاح تھا جو ہر وقت دنیا کی مسافتوں کے لیے بے چین رہتا تھا۔ قریہ قریہ پھرنا، شہر شہر خاک چھانا، رُک سیک اٹھائے پھرنا، سلیپنگ بیک میں سو جانا، کچھل جانا تو کھالیتا وگرنہ بھوکا رہ جاتا۔ طرح طرح کے مناظر سے لطف اُنداز ہوتا اور ہر رنگ کے آدم سے ملتا۔ متنوع بولیں سنتا اور کئی لیوں کو چومتا منزل پر منزل فتح کرتا جاتا۔ واپسی پر یہ سب خزانہ کاغذ پر الٹ دیتا۔ انسان کو ایک مرتبہ زندگی ہنی ہے۔ بند کمروں میں کیوں گزار دے۔ زمین بہت وسیع ہے۔ یہ اس کے لیے میدانِ دعوت ہے۔ سو کیوں نہ اس کے اسرار کو کھولے۔

جب میں ابتدائی سفروں پر نکلا تو حقیقی کہانیاں اور ان کے زندہ کردار مجھے قدم قدم پر ملے۔ میں نے انہیں صرف تراش خراش کر کاغذ پر لکھ دیا۔ شاید اسی لیے مجھے کبھی writers block کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہاں بعض اوقات کوئی خاص بھوکشن قابو میں نہیں آتی یا پھر کوئی آئیڈیاز ذہن سے نکل گیا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ذہن ماؤف ہو گیا ہو۔ اگر تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور کانوں کو تیز رکھو تو مشاہدے اور تجربے کے بل پر جلد جان جاؤ گے کہ اس دنیا میں ہر طرف بے شمار کہانیاں اور کردار بکھرے پڑے ہیں۔ تمہیں انہیں اس طرح چننا ہے جیسے لندن کے فواروں کے گرد کیورتوانہ چھنے اور چھگنے ہیں۔ ایسے میں سفر اور تجربہ بہت اہم ہے۔ دیگر تہذیبوں سے واسطہ تو تخلیقی صلاحیت کوئی جہتیں عطا کرتا ہے۔ "تارڑ صاحب کی بات کے حق میں یہ دلیل کافی ہے کہ عبد اللہ حسین کی سیاحت اور مغرب میں قیام اور قراۃ العین حیدر کا مغربی ادب کے وسیع مطالعے کے ذریعے ان کی تہذیب کے جائزے نے ان کے اعلیٰ ادب کو تخلیق کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ شاعروں میں اقبال، فیض اور راشد کی مثالیں کافی ہیں۔

"اُردو زبان کا سب سے زیادہ بکتے والا اور مشہور ہونے والا ناول 'پیار کا پہلا شہر' جس کے بچپن سے زیادہ ایڈیشن بک چکے ہیں پہلے سے میرے اندر موجود تھا۔ سرور سکھیرائے مجھے سے "ادھنک" کے لیے کوئی تحریر مانگی۔ مجھے یورپ جانے کے لیے بیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے پوچھا کہ کتنے دن ہیں۔ انہوں نے بارہ روز بتائے۔ میں نے بارہ دنوں میں 'پیار کا پہلا شہر' لکھ کر ان کے حوالے کیا اور یورپ نکل گیا۔ واپسی پر اس تحریر کی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔"

"عمر کے ساتھ تخلیقی فعالیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟" یہ سوال کرتے ہوئے میرے ذہن میں جمیل احمد تھے جن کا ناول 'دی ریڈ رنگ فائلن' بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اپنا یہ پہلا ناول انہوں نے اٹھتر برس کی عمر میں مکمل کیا۔ اس کے علاوہ جوزے ساراماگو کی بین الاقوامی پذیرائی والی تحریروں اس نے بہت بھجورٹی کی عمر میں لکھیں۔ ان کا جواب تھا۔

"انسان کسی بھی عمر میں تخلیقی طور پر فعال ہو سکتا ہے۔ میرے وہ ناول جن پر مجھے ادبی وقعت دی گئی 'راکھ' جسے وزیراعظم ادبی ایوارڈ ملا اور 'بہاؤ' جسے اعلیٰ ادبی مہرہ پارہ مانا گیا، میں نے پچاس برس کی عمر کے بعد لکھے۔ دیگر ناول تو اس کے بھی بعد لکھے۔ ہاں وہ سفر نامے جن سے مجھے شہرت ملی، میں نے اپنے ابتدائی زمانے میں لکھے۔ اس لیے اعلیٰ ادبی تخلیق کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔"

مجھے ذاتی طور پر ان کا ناول "ڈاکیا اور جولاہا" بھی بہت پسند ہے۔ میرے لیے یہ بات آج بھی معصم ہے کہ اسے وہ پذیرائی نہیں ملی جس کا یہ مستحق تھا۔

"کسی بھی ادیب کی شہرت اور پہچان عموماً اس کی ایک ناول بتاتا ہے۔ قراۃ العین کی پہچان "آگ کا دریا" عبد اللہ حسین کا تعارف "اُداس نسلیں" بالو قدسیہ کو شہرت "راجہ گدھ" سے ملی۔ میرا تعارف تو پھر دو ناول ہیں 'راکھ' اور 'بہاؤ'۔ اب میں تمہیں ایک

دلچسپ بات بتاؤں کہ جب مجھے ”راکھ“ پر ایوارڈ ملا تو اس فیصلہ کرنے والی جیوری میں شرکت صدیقی بھی تھے۔ ایوارڈ کے بعد میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ تو وہ کہنے لگے کہ انہوں نے تو راکھ کو دوٹ نہیں دیا تھا۔ لیکن چونکہ ایوارڈ ناول کو ملنا تھا اس لیے ”راکھ“ کو ملا۔ میں نے ازراہ تجسس پوچھا کہ انہوں نے کس کتاب کو دوٹ دیا تھا تو وہ بوسے ”یاک سرائے“۔ یہ بھی میری ہی کتاب تھی۔ چنانچہ مجھے بے پناہ مسرت ہوئی۔“

جب میں نے ان کے کرداروں کی سشت اور چٹاؤ کے حوالے سے استفسار کیا تو ان کا جواب تھا ”میرے بیشتر کردار حقیقی زندگی سے اٹھائے گئے ہیں۔ بڑے ناولوں کے وہ کردار زیادہ طاقتور ہوتے ہیں جو حقیقی زندگی سے اٹھائے گئے ہوتے ہیں۔“ ”خس و خاشاک زمانے“ میں ایک کردار امیر بخش کا ہے۔ یہ کردار میرے والد کا ہے۔ وہ بہت آزاد خیال شخص تھے۔ ان کے فلسفہء زندگی کا ایک اہم ستون یہ نکتہ تھا کہ اس دنیا میں زور آوری سب کچھ ہے۔ اس کے سامنے مذہب، قبیہ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔“

تاریخ صاحب کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اپنے والد کو یاد کر کے وہ آبدیدہ ہو گئے تھے۔ میں نے عام زندگی میں قریبی رشتوں کے حوالے سے ان کو بہت رقتی القلب پایا۔ ایک مرحہ بتانے لگے کہ جب سے ان کے بھائی کی وفات ہوئی ہے وہ کوئی پرانا غمگین نغمہ نہیں بن سکتے۔ ان کی آنکھیں بھرتی ہیں۔ وہ ایک مکمل خاندانی آدمی ہیں۔ ایسا سیلانی طبع آدمی۔ اپنے بیٹے سلجوق کو سال ہاسل اسکول پر خود سکول چھوڑنے جا تا رہا، بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دوائی اور قابل ذکر معاشرتی مقام دلایا، بیٹی کو اعلیٰ ترین میڈیکل کالج سے ڈاکٹر بنایا اور اس کے ذکر پر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں کہ وہ امریکہ میں ہے۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ تو زن نے ان کی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے وہ بیک وقت تخلیقی اور خاندانی امور میں متاثرین حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

”سفر نامہ جہاں آپ کی ایک طاقتور پہچان ہے وہیں کمزوری کا باعث بھی ہے کہ آپ کے ناولوں میں بھی ذرا آتا ہے۔“ میرے اس اعتراض پر انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میرے ناولوں کے لوکیل اور کردار متنوع رہیں۔ یہ کثیر لہجہ ہیں۔ یہ میرے وسعت مشاہدہ کی دلالت کرتے ہیں۔ ان میں اور سفر نامے میں بہت فرق ہے۔ یہ قطعی طور پر مختلف چیزیں ہیں۔“

ان کی اس بات سے مجھے اپنے پسندیدہ شعر پابلو نرودا کی وہ بات یاد آ گئی جس میں اس نے کہا تھا کہ کسی ملک کی صحیح نمائندگی کرنے کا حق ایسے ادیب کو ہی ہو سکتا ہے جو اپنے ملک کے موسموں اور درختوں کو اس طرح جانتا ہو جیسے اپنے ہاتھ کی پشت کو۔

جب میں نے ان کی لکھنے کی روٹین کے بارے میں سوال کیا تو وہ بولے ”کالم اور ہنگی پھلکی تحریریں دن میں لکھتا ہوں۔ سنجیدہ ادب جیسے ناول رات کو آٹھ بجے سے بارہ بجے تک لکھتا ہوں۔ میں ناول پر دن میں کام نہیں کر سکتا۔“

میں نے بات کاٹی

”کیا کبھی ایہ ہو کہ آپ ایک سین یا کردار کو لکھ رہے ہیں اور صبح ہو گئی ہو؟“

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا

”نہیں۔ میرے لیے جسمانی اور دماغی طور پر صحت مند ہونا بہت ضروری ہے۔ میری صبح کو واک کی روٹین ہے۔ اور میں اس کو تبدیل نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں لکھتے لکھتے کبھی ایک ماحول اور کردار کو اپنے اوپر اس طرح طاری کر لیتا ہوں کہ اس کے ٹرانس میں چلا جاتا ہوں۔ اب یہ ٹرانس حویل بھی ہو جاتا ہے۔ جب تک یہ ٹرانس نہیں ٹوٹتا جب تک میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔“

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولے

”تم نے مشاہدے کے حوالے سے بات کی تھی۔ اب تو میڈیا اس طرح اپنے ناظر کو گھروں کے اندر تک لے جاتا ہے کہ آپ کو وہیں سے مشاہدے کے لیے بہت کچھ دستیاب ہو جاتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ زندگی کے متفرق رنگوں کو دیکھنے کے لیے آپ کو ہر اس مقام سے ہوا ناچا پیجے جسے چاہے معاشرہ ناپسندیدہ جانے۔“

”یعنی دیوار کی دوسری جانب کو جانا چاہیے۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”ہاں۔“ انہوں نے قطعیت سے کہا۔

”آپ نے کبھی ٹولس لیے؟“ میرا اگلا سوال تھا۔

”نگات نوٹ کر لیتا ہوں مگر باقاعدہ ٹولس نہیں لیتا۔ بس لمحہ موجود میں رہنے کی دانستہ کوشش کرتا ہوں۔ اس سے مشاہدے میں گہرائی بھی آ جاتی ہے اور جزئیات یادداشت کی دیوار پر نقش بھی ہو جاتی ہیں۔“

تارڑ صاحب نے بات ختم کی۔

”میں ایک عام دیسی گھرانے میں پیدا ہوا۔ گھر نہ خاص مذہبی نہ تھا۔ شاید اس لیے مذہب کی جانب خصوصی رغبت پیدا نہ ہوئی۔ یہ صرف رب کا کرم ہے کہ مجھ ناچیز سے اردو ادب کے لیے چند چیزیں لکھوالیں۔ میں نے دودھ، قطر میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کی تقریب میں رب کی خاص مہربانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا ’وگر نہ میری اوقات تو یہ تھی کہ میری بیوی نے شادی کے چند روز بعد ہی اپنے میکے میں جا کر کہہ دیا تھا کہ اس شخص کی عزت کرنے کی خاص ضرورت نہیں کیونکہ یہ کوئی قابل ذکر بندہ نہیں۔“



زوال پذیر تہذیبوں کی زبوں حال زبانوں کے قد آدراویب بھی بالآ خاک میں مل کر خاک ہوتے ہیں۔ ڈسٹ ان ٹو ڈسٹ اینڈ ایشن ٹو ایشن۔ جو چند خوش گمان احباب کہتے ہیں کہ وقت آنے پر بڑے ادیب کا تعین خود بخود ہو جاتا ہے جی کے خوش کرنے کو اچھا سامان کرتے ہیں۔ اپنے وقتوں کی عظیم زبانیں رومن اور سلطنت اپنے بڑے دماغوں کے ساتھ پیوند خاک ہوئیں۔ ایک چھوٹے سے جزیرہ انگلشیہ کے دکانداروں کی اکھڑ زبان انگریزی مستبر ٹھہری اور اس کا ایک اوسط دماغ بھی عظیم ٹھہرایا گیا۔ اسٹنی فلفظ ان حقیقات کو حاصل ہے جو زندہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر محفوظ ہوئیں۔

اُردو کی سی رواں، وسیع فضاء اور ریشمی زبان کی بد قسمتی کہ اس کو ایک ایسی زوال آمادہ تہذیب نصیب ہوئی جو اب تک نہ تو تہذیب کے تمام عناصر ترکیبی پر پورا اُتر پائی ہے اس لیے شاید اب تک ایک مکمل تہذیب بن ہی نہیں پائی اور نہ ہی مستقبل قریب میں مواصلات کے ذرائع میں ترقی کے بموجب دیگر زبانوں کی غیر معمولی ترقی کے باعث اس کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔

اس زبان کا بھرپور ادبی ذخیرہ چند نسلوں کی ڈنی آبیاری کر کے مستقبل کے لیے فقط چند محققین کے شوق تحقیق کا سامان رکھتا ہے۔ اپنے عروج کے زمانے میں بھی اس کے ادیب کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا گیا جو عبرتناک ہے۔ اس کا علو خود اس کے اندر ہے۔ یہ ایک ایسا کنواں ہے کہ جو اس سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے دوسرا ادیب اس کی ٹانگ کھینچ کر اسے اندر گھسیٹ لیتا ہے۔ زوال آمادہ، خود شکن، بدبودار، متعفن معاشرت میں یہ چلن عام ہوتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب منومر اتو ایک میان نے اخبارات کی سرخیوں میں جگہ پائی ”ایک خوش نگار مر گیا تو اس میں دکھ کس بات کا۔“



یہ معاشرہ اس نقال کی طرح لاچار ہے جو اپنے سے برتر تہذیب کی ناکام نقالی کر کے خود خوشی کا سامان کرتا ہے۔  
ایک روز تارڑ صاحب حسرت بھرے لہجے میں مجھ سے کہنے لگے

”یاد رہے جب سے میں نے ڈان اخبار میں انگریزی میں کالم لکھنا شروع کیا ہے مجھے کی لوگ نے ہیں جو کہتے ہیں تارڑ صاحب آپ تو بڑے کلمے آدی لکھتے۔“

جب تارڑ صاحب نے نیم خندہ لہجے میں یہ بات کی تو میری نظروں کے سامنے سے ان کے کئی درجن اردو نثری مہر پارے گزر گئے۔ وہ تو یہ بات ہنستے ہوئے کہہ گئے مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی نے میرا دل ٹھنی میں دبا کر مسل ڈالا ہو۔ ہم احساس کمتری کے مارے وہ لوگ ہیں جو شکستہ اردو بولنے میں عزت سمجھتے ہیں اور غلط انگریزی بولنے والے کو ناقابل معافی جانتے ہیں۔ ہم عیب لوگ ہیں۔

موت کے درمیان میں ہتلا اور مسکور تارڑ صاحب ایسے کاہن ہیں جو بے جان الفاظ کو چھو کر زندگی دیتے ہیں۔ ان کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت کو جاننے کے لیے یہی بہت ہے کہ اردو کا سب سے زیادہ معروف ہونے اور کہنے والا ہلکا پھلکا رو مانوی ناول ”پیارا کا پہلا شہر“ انہوں نے فقط بارہ دن میں لکھا تھا۔ سنجیدہ ادب میں تارڑ صاحب کے خزانے میں بین الاقوامی معیار کی بے شمار اعلیٰ ادبی تحریروں ان کے قد آور ہر جہت ہونے کی دلالت کرتی ہیں۔

میں تارڑ صاحب سے فقط اتنا کہنا چاہتا ہوں

’تارڑ صاحب! آپ تو پھر خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اپنی زندگی میں اتنی شہرت اور تھوڑی معاشی آسودگی مل گئی ورنہ یہاں تو حبیب جالب اور کئی ادیب حسرت کے ہاتھوں مر گئے۔ ساغر صدیقی فٹ پا تھوں پر ایڑیاں رگڑتا مر گیا اور جوش جس کو لینے نہرونگے پیر بھاگا چلا آتا تھا، ایک فلیٹ میں کسمپرسی میں مر گیا۔ آپ تو پھر خوش قسمت ہیں۔

تارڑ صاحب اگر آپ اتنے بھی خوش قسمت نہیں۔ آپ کو تحریر نے فقط شہرت دی، معاشی خوش حالی نہیں۔ بہت سے لوگوں کو آپ کی پیٹھ پیچھے بُرائی کرتے سنا۔ آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے کبھی ان بوزنوں کا ذکر آپ سے اس لیے نہیں کیا کہ آپ کا دل ضد کئے۔ آپ بہت حساس انسان ہیں۔ آپ کے منہ سے میں نے بیش تر لوگوں کا ذکر محبت اور عزت سے سنا۔ لیکن ان لوگوں کا کیا کروں جو آپ کے تخلیقی مقام کے اعتراف میں نخل سے کام لیتے ہیں۔ جب میں ان سے استفسار کرتا ہوں کہ اگر تارڑ پاکستان کا سب سے ہمہ جہت اور وسیع ترین حلقہ اثر والا بڑا ناول نگار اور سفر نامہ نگار نہیں ہے تو وہ پھر کون ہے تو وہ بظاہر جھانکنے لگتے ہیں۔

تارڑ صاحب! میری ہم دردی آپ کے ساتھ ہے۔ آپ سے کہیں کم معیار کے لکھنے والے لاطینی امریکی، مشرقی یورپی ادیب ان ملکوں میں مرا آکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں اور اپنی زندگی ہی میں ان ممالک کا تہذیبی چہرہ قرار پاتے ہیں۔“

ہم وہ لوگ ہیں جو کڑا ہیوں اور کہیوں پر ہزار ہا روپیہ لٹا دیتے ہیں لیکن کتابوں پر چند روپے خرچ نہیں کرتے بلکہ بسوں، اسٹیشنوں اور جاموں کی دکانوں میں دو چار روپے کے اخبار کے حصے، غرے ایک دوسرے سے چھینتے نظر آتے ہیں۔ ہم لہجہ اسٹیج ڈراموں سے محفوظ ہوتے ہیں اور بے ہودہ جکتوں پر بدبودار تہمتیں لگاتے ہیں۔ وہ تہذیبی شائستگی جو ہماری پہچان تھی دو چار نسل پہلے ہی ختم شد ہوئی۔ جو باقی تھی وہ ٹیلی ویژن کے مختلف مباحثوں میں چاک ہوئی۔ ہمارے اندر کوئی ایک ایسی Sadistic Instinct ہے جو ہمیں کسی دوسرے کی عوامی توہین پر محفوظ ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ ایسے دور میں تارڑ جیسا شائستہ شخص اور قد آور ادیب اپنی نسل کے آخری لوگوں میں سے ہے۔

ہم جو تباہ کن مغلیہ اسلامی تہذیب اور نکسین ہندوستانی اساطیری روایات کے امین تھے، خود خنجر ہی کے اس مقام افسوس پر کھڑے

ہیں جہاں اعلیٰ تہذیبی و تخلیقی دانش کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہم لڑنے والوں کے ناموں سے چوکوں اور سڑکوں کو موسوم کرتے ہیں اور کسی ادیب کو مقام عزت و مرتبت پر فائز کرنے کے لیے اس کی موت کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ فرانس نہیں جہاں سارتر کے مرنے پر پیرس کی تاریخ کا دوسرا ایذا جتنا زہاں اٹھایا جاتا ہے اور فرانس ماتم میں ادب جاتا ہے۔

مستغفر حسین تارڑ مشاہیر اور تجربے کے ان کچے جنگلوں سے گزرا ہے کہ اس کے ہالوں میں تخلیق کے جکتود کہتے ہیں، ایسے جکتو جو شائد اٹھائے کے پستانوں کی پریاں ہیں۔

اگر کبھی کوئی مجھ سے پوچھے کہ مجھے دوبارہ زندگی گزارنے کا موقع ملے تو میں کیسی زندگی کی خواہش کروں تو میں بلا تردد کہہ دوں گا

"تارڑ جیسی۔"

باگ

عبدالله حسین



اپنے یورپین طرز کے نفیس فرنیچر سے آراستہ کمرے میں بیٹھے لمبے چوڑے گورے چٹے عبداللہ حسین فی دی پرنشر ہونے والا براہ راست بیچ انہماک سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے "ادیب کے لیے لازم ہے کہ وہ زندگی کے تمام معاملات میں بھرپور دل چسپی رکھتا ہو۔ یہ اس کی تحریر میں تجربہ، طاقت اور تازگی لے کر آتے ہیں۔ گوشہ نشینی اسے فراریت اور ذہنی انجماد کی جانب لے جاتی ہے۔"

"کس طرح کے معاملات میں دل چسپی؟" میں نے پوچھا۔

"کھیل، سیاست، ادب، فلم، ذائقے دار پکوان، مجبیتیں اور معاشرتی معاملات، سبھی۔"

ان ملاقاتوں سے پہلے اُن کے بارے میں سن رکھا تھا کہ گوشہ نشین ادیب ہیں۔ بیسویں صدی کے عظیم فلسفی برٹریڈ رسل نے آخری عمر میں دعوتوں میں جانا قریباً ترک کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ رسل سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اُس نے کہا "تقریب کا مصنوعی ماحول اور رکی دھوئیں وقت کا ضیاع ہیں۔ اونچی سوسائٹی کے لوگ اوپری گفت گو کرتے ہیں جو بنیادی فہم سے خالی ہوتی ہیں چنانچہ وقت ضائع ہونے کے ساتھ اشرافیہ کی سطحی گفت گو سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔"

کچھ ایسا ہی معاملہ افغانستان کے نابغہ روزگار شاعر رسول حمزہ توف کے ساتھ درمیش رہا۔ انھوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب "میرا افغانستان" میں اپنے بین الاقوامی مرتبے کے پیش نظر دی جانے والی اعلیٰ ملکی اور غیر ملکی ادبی و سفارتی دعوتوں سے لوٹ کر اپنے سادہ و محنت کش، شہر کی قصبائی لوگوں میں واپسی روح کو سرشار کرنے والے تازہ اور خالص انسانی ماحول میں واپس آنے سے مماثل قرار دی۔

گوشہ نشین عبداللہ حسین نے کھل کر تو کوئی ایسی بات نہ کہی لیکن اُن کے مزاج نے کچھ ایسے ہی معاملات کی خبر دی کہ وہ بھی شاید بے معنی گفت گو پر تنہائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ قریباً چالیس برس برطانیہ میں گزار کر وطن واپس آنے والے، اردو کے اہم ناول و افسانہ نگار نے ایک گفت گو میں مجھ سے کہا "جب میں ایسے خوب صورت لوگوں میں ہوتا ہوں جو میری طرف متوجہ ہوں تو میں محفل میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے خود سے بھی باتیں گھڑ لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی مخصوص دبی دبی ہنسی ہنسنے لگے اور گویا مجھے نصیحت کرنے لگے "اگر آپ کسی شخصیت پر لکھنا چاہتے ہیں تو جہاں اُس کی شخصی و فنی خوبیوں کا تذکرہ کریں، وہیں شخصی و تخلیقی کم زوریوں پر بھی لکھیں۔ اس سے آپ کی تحریر میں غیر جانب داری اور توازن پیدا ہوگا۔ مجھ پر لکھیں تو میری خامیوں کا بھی ضرور تذکرہ کریں۔ اس سے مجھے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ مجھے جو کام یا بیانیہ کامی ملنا تھی، زندگی ہی میں مل گئی۔ البتہ یہ بات آپ کی تحریر کو ٹیکھا کر کے نکھارنے کا باعث بنے گی۔"

بعد ازاں انھوں نے اپنی شخصی کم زوریوں پر سیر حاصل گفت گو کی۔

وقت کے فریم دھندلا جاتے ہیں اور ہاؤس کوپ میں ایک منظر ابھرتا ہے۔

کراچی میں سمندر کنارے انگریزی راج کے انداز کا بیچ لگژری ہوٹل رات کے اندھیرے میں یوں دک رہا تھا جیسے کسی شہزادی کی سیاہ زلفوں پر ہیرے کا تاج۔ اس کے پہلو سے گزرتی آبنائے عرب پر واقع بندرگاہ کی روشنیاں جھللا رہی تھیں اور ماحقہ باغ میں ایستادہ قاتلوں میں عروس البلا کی اشرافیہ ہاتھوں میں مشروبات لیے کپ شپ میں مصروف تھی۔ زیادہ تر مرد عمدہ و نفیس سوٹوں اور خواتین دیدہ زیب ساڑھیوں میں تھیں۔ شہر بھر کے اہم سفارت کار مختلف گوشوں میں کھڑے سیاست و ثقافت پر بات چیت کر رہے تھے۔ یہ تقریب برطانوی سفارت خانے کی معاونت سے دنیا بھر سے آئے اہم ادیبوں کے اعزاز میں سجائی گئی تھی۔ اس تمام رونق سے علیحدہ ایک طویل القامت دانش ور خاموشی سے سب دیکھ رہا تھا۔ میزبان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُن صاحب کی جانب اشارہ کر کے کہا "وہ رہے عبداللہ حسین صاحب۔ آپ کے ساتھ ہونے والی نشست کے مہمان خصوصی۔"

اُس ادبی میلے میں عبداللہ حسین کے ساتھ ایک پروگرام کی نظامت مجھے کرنا تھی۔ کتابوں کے حوالے سے انھیں خوب جانتا تھا مگر شخصیت کے بارے میں بہت کم۔ سو اُس شب عبداللہ حسین ناول و افسانہ نگار کے قد آور ادبی پورٹریٹ کے پیچھے بیٹھے اصلی اور خالص انسان،



گجرات میں پیدا ہونے والے آدمی سے ملاقات یادگار رہی۔ صرف وہی ملاقات نہیں، بعد میں کئی ادبی میلوں، کانفرنسوں، ان کے بچے، ہونٹوں، سمندر میں بہتی کشتی اور میرے گھر پر بھی ملاقاتیں رہیں۔

اُس میلے کی اگلی صبح، اُن کے ساتھ نشست سے قبل اُن سے ملنے ہوئے پہنچا تو سویر کا ہوش مند ماحول رات کے خواب ناک شبستان کی جگہ لے چکا تھا۔ راتیں رومان اور قدرے سرمئی، قدرے سیاہ و صند کے سے عبارت ہوتی ہیں۔ دن کھرے، نکال میں اعلیٰ چاندی کے چمچنے سکو کی طرح حقیقی ہوتے ہیں۔ رات کے قدرتی خمار میں دل پذیر مانوی قرن ہا قرن کے بوسیدہ سورج کی مضحل روشنی میں بے کشش پیمانی ناری نظر آتی ہے۔ کمال نظر کا نہیں، مقام اور وقت کا ہے۔ رات کے پر تکلف اسکا لری جگہ اڑھڑتے جاگڑا اور وزشی پا جامہ پہنے ایک بے تکلف، گھمراہ، انتہا آدمی بیٹھا تھا۔ میں نے اُس گھرے آدمی کو تجویز دی کہ بیٹھک سے پہلے لباس تبدیل کر لیا جائے تو اُس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے میری گزارش رد کردی اور بولا ”کیا فرق پڑتا ہے، کپڑے نہیں، اُن کے اندر کا آدمی اہم ہوتا ہے۔“

مضحل میں اُس آدمی کی بے لاگ، سادہ اور طیست میں رچی بسی گفت گو لوگوں کی عمومی مصنوعی گفت گو سے علیحدہ خالص اور چوکھی لگی۔ جو معلوم نہ تھا، اعتراف کیا اور جو نقطہ نظر تھا، اُسے بے لاگ بیان کر دیا۔

ایک مرتبہ ایک تقریب میں اُن سے پوچھا گیا کہ وہ اتنی ادنیٰ، چھوٹ چار انچ کی جسمانی قامت کے کیوں کر ہیں تو پلٹ کر انھوں نے جواب دیا۔ ”میں نے اپنے والدین کا خوب سوچ سمجھ کر انتخاب کیا تھا۔ دونوں خاصے لمبے تھے۔“

آدم جی ایوارڈ، حاصل کرنے والے ناول ”اوس نسلیں“ کے مصنف، ”باگھ“، ”نادار لوگ“، ”رات“، ”قید“ جیسے شاہ کار ناول اور ”نشیب“، ”دور“، ”قریب“ جیسے یادگار افسانوی مجموعے تخلیق کرنے والے عبداللہ حسین، محمد خان کے نام سے بختون بنوں سے ہجرت کر کے پنجابی گجرات میں آباد ہونے والے ایک زمین دار اور سرکاری ملازم کی پانچویں اور آخری بیوی سے پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت اُن کے والد جوان کے بہ قول ”میرے دادا بھی ہو سکتے تھے باون برس کے تھے۔ اُن سے بڑی تین بہنیں تھیں اور وہ اکلوتے بیٹے تھے۔ وہ چھ ماہ کے تھے کہ والدہ فوت ہو گئیں۔ سب سے چھوٹا، اکلوتا بے ماں کا بیٹا باپ کے لیے بے حد عزیز غمیرا۔ والد ننھے محمد خان کے لیے تشویش آمیز تحفظانہ رویہ رکھتے تھے۔ ابتدائی چار جماعتیں گھر ہی میں پڑھائی گئیں۔ بعد ازاں اسکول جانا شروع کیا تو ایک ملازم ساتھ اسکول لے جایا کرتا اور ساتھ واپس لاتا۔ بچپن کے ابتدائی نقوش میں اپنے ہم عمروں سے دوری کے دورے میں والد سے دوستی کی یاد نے رنگ بھرے۔ والد اُسے اپنے ہم راہ شکار اور زمینوں پر لے جایا کرتے تھے۔ دونوں کھیتوں میں سیر کرتے۔ اسکول میں داخلے کے بعد ایک ہندو لڑکا بل دیو کرشن اُس کا گہرا دوست بنا۔ بل دیو کی بہن پشپا محمد خان کی کلائی پر راکھی باندھا کرتی۔ گویا ان میں بہن بھائی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ ”میں مسلمان ہونے کی وجہ سے اُن کے باورچی خانے میں نہ جاسکتا تھا۔“ عبداللہ حسین یاد کر رہے تھے۔ ”میرے ہم جولیوں کی مائیں تھیں، میں اپنی ماں کی کمی بہت محسوس کرتا تھا۔ اسی لیے میں بہت شرمیلا بچہ بن گیا، خود گمن!“

”چھ ماہ کا تھا تو میری ماں کا ایک آپریشن ہوا جو کامیاب نہ ہوسکا، وہ وفات پا گئیں۔ بڑی بہن، جو اُس وقت سترہ برس کی تھیں، نے مجھے پالا۔ ہم سادہ لوگ تھے، درمیانے درجے کے زمین دار۔ خاندان میں زیادہ تر لوگ سرکاری ملازمت میں تھے۔ چند ایک کی زمینیں تھیں، وہ بھی اوسطاً پچیس تیس ایکڑ تک۔ والد ایک سائز انسپکٹر تھے۔ میں بیس برس کا تھا تو وہ بھی 72 برس کی عمر میں وفات پا گئے۔“

والد کی وفات نے نو جوان محمد خان کو اس حد تک متاثر کیا کہ اُس پر نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا اور اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔

داخل تہائی اور ڈکھ زندگی بھر کے اس کے سانچے رہے۔

عبداللہ حسین ایک نادیدہ خول میں بند رہتے تھے۔ جذباتی سطح پر کوئی ان سے زیادہ قریب مشکل ہی سے ہو پاتا تھا۔ شاید اس کی

وجہ بچپن میں اُن کا اپنی ذات میں سمٹ جانا تھا۔

اپنے ایام طالب علمی کا تذکرہ یوں لائق سے کرتے تھے جیسے وہ دور کسی اور پر گزرا ہو۔ "میں ایک عام طالب علم تھا۔ سترہ برس کی عمر تک میری قد و قامت بھی دیکر طلبہ جیسی تھی۔ یک دم یہ بڑھنا شروع ہوئی اور انیس برس کی عمر تک میں اپنے موجودہ قد کو پہنچ گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ میرا قد بڑھتا دیکھ سکتے تھے۔"

ایک دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ عبدالقد حسین نے ادب میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی بلکہ اس سے بہت مختلف شعبہ چنا۔ "میں نے گجرات میں زمیں دار کالج سے گریجویشن کے بعد سیمنٹ کے کارخانے میں بہ طور کیسٹ ملازمت اختیار کی۔ تین سال ملازمت کے بعد ایک اور سیمنٹ فیکٹری میں نو برس نوکری کی۔ اسی دوران کولبو پلان کے تحت کینیڈا جانے کا موقع ملا جہاں سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کر کے چار مختلف شہروں کی سیمنٹ فیکٹریوں میں مختصر تجرباتی کام کر کے پاکستان واپسی ہوئی۔"

"اس سارے دور میں ادب کہاں تھا؟"

یہ سن کر وہ مسکرا کر بولے۔ "مجھے ادب وراثت میں نہ ملا، بلکہ یہ وقت گزاری کا ایک مشغلہ تھا۔ میری ماں کے رشتے داروں میں رفیع جبر ایک مشہور اور کامیاب فلم اور ڈراما نگار اور میرے حقیقی کزن تھے۔ ان کی اور میری والدہ سوتیلی بہنیں تھیں۔ اب ان کے بیٹے رفیع جبر تھیٹر بہت کامیابی سے چلا رہے ہیں۔"

"آپ نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ آپ نے یوریت سے تنگ آ کر لکھنا شروع کیا۔ جب تک انسان میں بنیادی جوہر نہ ہو وہ، ایک اچھا خط نہیں لکھ سکتا، اہم ناول تو بڑی بات ہے۔" میں نے رائے کا اظہار کیا تو سنجیدگی سے کہنے لگے۔ "ایسا ہی ہوگا۔ البدت شعوری طور پر نہ تو میں اردو ادب کے اساتذہ میں بیٹھا اور نہ ہی مجھے یہ جینیاتی وراثت میں ملے۔ میں واؤڈ خیل کی سیمنٹ فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ اجاڑ بیابان علاقہ تھا، وہاں آٹھ گھنٹے کام کرنے، آٹھ گھنٹے سونے کے بعد بھی آٹھ گھنٹے سچ رہتے تھے۔ اس دور میں ٹی وی میڈیا کوئی اور دل چسپی کا سامان نہ تھا۔ سو میں نے وقت گزاری کے لیے لکھنا شروع کیا۔ جب ابتدائی چند صفحات لکھ ڈالے تو کہانی بننا شروع ہو گئی اور اس نے مجھے، اپنی گردنت میں لے لیا۔ اردو کی ادبی زبان میں میری تربیت نہ ہوئی تھی۔ اپنی اس کمی کا ازالہ کرنے کے لیے میں چھوٹے چھوٹے جیسے لکھتا تھا، واقعات اور ماحول کے شیش محل کو ان چھوٹی چھوٹی کالج کی ٹکڑیوں سے تفسیر کرتا تھا۔ ایک وقت تو ایسا آیا، میں ناول میں اس حد تک ڈوب گیا کہ اس کے ایک کردار سے ملنے گجرات کے ایک دور افتادہ قصبے میں گیا۔ اس کا نام صوبے دار خدا داد خان تھا۔ اُسے پہلی جنگ عظیم میں وکٹوریہ کراس ملا تھا۔ میں ایک چھوٹے پرائیج لائن ریلوے اسٹیشن پر اترا، تاکا لیا اور اس سے ملنے پہنچ گیا۔ اس کے گھر تک کپارستہ بھی نہ جاتا تھا۔ چٹاں چہ کھیتوں کے بیچ چلا ہوا اس تک جا پہنچا۔ اس سے مجھے پہلی جنگ عظیم کے بارے میں یا تو اسطرح قیمتی تجربات اور معلومات کے علاوہ کئی کتب ملیں۔ ان میں سے اس دور کے ماحول اور زمانے کو اپنے ذہن میں نقش اور بیان کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر میں لاہور میں ملازمت کر رہا ہوتا تو شاموں کو کافی ہاؤس، ریسٹورانٹ یا دیگر تفریحی معاملات میں مشغول رہتا۔ یوں اپنے اندر موجود ادیب جسے میں نے واؤڈ خیل کے بیاباں میں دریافت کیا، لاہور کی پڑھائی زندگی میں خوابیدہ ہی رہتا۔"

محمد خان نامی سیمنٹ فیکٹری کے گم نام کیسٹ نے ایک روز اپنا ناول مکمل کیا اور اُسے چھپوانے کے لیے لاہور چلا آیا۔ یہاں اُس کی ملاقات "سوریا" کے مدیر اور "نیا ادارہ" کے ناشر چودھری نذیر احمد سے ہوئی۔ اس ادارے کے تحت "نیا ادارہ" نامی معروف طباعت گھر سے نمایاں کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ مدیر نے کیسٹ سے چند روز بعد آنے کا کہا۔ سو دسے کو حنیف رائے، شیخ صلاح الدین اور محمد سلیم الرحمان نے پڑھا۔ چند روز بعد محمد خان کی سلیم الرحمان صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اُس ناول کی بہت تعریف کرتے ہوئے شائع کرنے کی نوید سنائی۔ اب دو مسائل ان کھڑے ہوئے۔

اس زمانے میں کرنل محمد خان نام کے ایک معروف ادیب ادیب کے میدان میں متحرک تھے۔ ایک نواز محمد خان کا سامنے آنا

تاریخ کے لیے ابھرنے کا باعث بننا۔ چنانچہ ایک قلمی نام کی ضرورت تھی۔ سینٹ ٹیکری میں محمد خان کا ایک طاہر عبد اللہ حسین نامی ساتھی تھا۔ اُس کا نام انھیں خاصا پسند تھا۔ پس اُس کے نام سے عبد اللہ حسین کا لاحقہ لے کر محمد خان نے اپنا قلمی نام پالیا۔

دوسرا مسئلہ ادبی شناخت کا تھا۔ عبد اللہ حسین کو دب میں کوئی نہ جانتا تھا۔ اس مسئلے کا ایک حل یہ تجویز ہوا کہ یہ چند افسانے لکھ کر چھپنے کے لیے دیں جن سے ان کا ادبی حلقوں میں تعارف ہو جائے۔ عبد اللہ حسین چند روز بعد افسانے لے کر ”سوریا“ کے دفتر پہنچے۔ افسانے اگلے شماروں میں نہ صرف شائع ہوئے بلکہ ایک اہم ادیب کی آمد کے پیغام پر بھی ثابت ہوئے۔ ادب میں عبد اللہ حسین ملکی و غیر ملکی تجربات و مشاہدات کے پھولوں سے کشید کیا جانے والا عطر بلوریں بوتلوں میں سجا کر لائے تھے۔

پس اس کے بعد اُن کا ناول ”اداس نسلیں“ کے عنوان سے شائع ہوا اور انگریزی محاورے کے مطابق ”اس کے بعد سب تاریخ کا حصہ ہے۔“

یہ اُس دور کا واقعہ ہے کہ ادھر ”اداس نسلیں“ چھپتا ہے اور ایک برس بعد ادھر ارجنٹائن کے، بعد میں اندھے ہو جانے والے لاہوری، لوئی بورجیس کی ”Labyrinths“ (بھول بھلیاں) سامنے آتی ہے جو ”Magical Realism“ (طلمسائی حقیقت کشائی) اور Meta Fiction (حداِختراع) کا دروازہ بین الاقوامی ادب میں کھول دیتی ہے۔

”اداس نسلیں“ میں تقسیم، فسادات، جنگ، محبت جیسے آفاقی موضوعات برتے گئے تھے۔ ثالثی کے ناول ”اینا کیرافینا“ میں شادی شدہ اینا کی کاؤنٹ ورائسکی سے محبت، ”دراپڈز“ ایسے جنگ کے وسیع کیوں پر جنگ کی تاب ناک عکاسی کرنے والے عظیم ناول سے لے کر دستو دسکی، شولوخوف، ہمنسکو، مارکیز بھی آفاقی موضوعات چھوٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ادھر منقسم ہند پر لکھتا ہے اور ادھر خوش دلت سنگھ ”A Train to Pakistan“ (ریل گاڑی۔ منزل پاکستان) لکھ کر میدانِ ادب و صحافت میں اترتا ہے اور احمد ندیم قاسمی (پیشہ بلور مشیر) لکھنے کو کھلے کیسوں کے ساتھ جہانِ افسانہ میں اُتارتا ہے۔

عبد اللہ حسین حقیقت نگار ہیں یا نہیں، نثر میں مبالغہ آمیز فوسل سازی کے قائل ہیں یا نہیں، ”اداس نسلیں“ میں ساخو جلیا نوالہ بارغ کے حوالے سے موت کا ایک منظر ہے۔ ”پھر اور گولیاں اور ایک فلا بازی، اور اس طرح جب سرکس کے مسخرے کی طرح کرتب دکھانے کے بعد وہ زمین پر آیا تو کب کا مر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی جوش و خروش تھا اور وہ بد شکل نہ ہوا تھا۔ کیوں کہ اُس نے موت دیکھی ہی نہ تھی۔ یہ عجیب و غریب موت تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم گرتی ہوئی لاشوں میں چھپ گیا۔ یہ سارا قصہ چند لمحے کا تھا۔“

اس منظر میں نہ تو موت کے وابستہ رومان ہے، نہ مرنے والے کے آخری ڈانگا اور نہ ہی اُس کی نظروں کے سامنے گھومتے ماضی کے مناظر۔ فقط ایک جان دار کی موت، مرغانی یا بشری موت، غزالِ شب کی خاموشی اور اداس موت، اچانک خاتمہ۔ البتہ ناول میں فیم کا کردار، ”آگ کا دریا“ کے گوتم تلیم، ”راکھ“ کے مشابہ، دستو دسکی کے ”جرم و سزا“ کے رسکو لیکوف، ولیم تھیکرے کے ”وینٹی فیئر“ کی بلی شاپ، مارکیز کے ”تنہائی کے سو برس“ کے کرنل آر یلیانو اور موراکامی کے ”نارنجین ڈوڈ“ کی میڈوری کے ہم راہ لازوال کرداروں میں شمار ہوتا ہے۔

پہلی ملاقات کے کئی ماہ بعد اُسی بیچ لکھری ہوٹل کے ایک کمرے میں مسندری ہوا میں پھر پھڑاتے پردوں کی جانب پشت کیے عبد اللہ حسین کو میں نے ان کے اندازِ تحریر پر ایک بار ایک بیس قاری اور ادیب کا جملہ سنا ہے کہ ”آپ کی نثر کھانک سے آکر لگتی ہے اور دل دو باغ پر ہم جاتی ہے۔ یہ سادہ، موثر اور کچھ حد تک مردانہ ہاتھوں سے لکھی گئی بلاغی زبان ہے۔ جب آپ نے لکھنا شروع کیا تب ریشمی زبان کا رواج تھا۔“

خان صاحب نے پنجابی میں چند غیر مبہم الفاظ بولے اور کہنے لگے ”مجھے اپنی زبان کے بارے میں شروع سے یہ خیال رہا ہے کہ



اسے موثر اور آلائشوں سے پاک ہونا چاہیے۔ ہر جملہ کہانی میں کوئی اضافہ کرتا ہو۔ میں اپنے ذہن میں ایک مکمل تصویر بناتا ہوں اور اسے لفظوں میں کاغذ پر لکھ لیتا ہوں۔ باقی یہ مردانہ اور رسمی دانی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔“

میں نے لقمہ دیا۔ ”منٹو بھی ایسا موثر اور براہ راست اظہار کرتا تھا۔“

عبداللہ حسین بولے ”منٹو کی زبان صحافیانہ تھی۔ اس کی نثر میں کئی بنیادی خامیاں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے بڑے اعلیٰ افسانے لکھے۔ عمومی طور پر اس کی کہانیاں معاوضے کی خاطر غلت میں لکھے گئے افسانے ہوتے تھے۔ اس کے سیکڑوں افسانوں میں سے درجن بھر افسانے عمدہ ہوں گے، بقیہ اس کے تخلیقی اور ادبی مرتبے سے کم تر ہیں۔ دراصل اسے غربت اور شراب نے بہت خراب کیا۔ وہ ایک بوتل کے پیسوں کے لیے جو بھی ممکن ہو، غلت میں لکھ ڈالتا، نہ اسے دوبارہ دیکھتا اور نہ ہی اس میں ترامیم کرتا۔ بس پبلشر کے پاس جانے کی کرتا۔ چنانچہ اس نے بہت لکھا، سیکڑوں کہانیوں میں سے درجن بھر اچھی کہانیاں لکھ لینا بڑی بات نہیں۔ اس کی ذہانت اور فن پر دست رس کوڑو دلو سی لگا گئی۔ میں غلام عباس کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اس کے ہاں فن پر دست رس، مضبوط کہانی، رواں پلاٹ اور خوبی بیان ہے، موضوعاتی تنوع ہے۔ اسے بڑھ کر ایک عمدہ ادیب کو بڑھنے کا احساس ہوتا ہے۔“

ایک روز میرے استفسار پر انھوں نے کہا۔ ”میری نظر میں قرآن العین خیدر اردو کی سب سے بڑی ناول نگار ہے۔ اس کی زبان کی ثقافت اور قدامت نئے قارئین کے لیے نا آشنا سی، بہر حال اس کا مقام ملے ہے۔ افسانہ نگاری میں چیخوف کا کوئی ہم سر نہیں۔ اس کی تحریر میں خاص اداسی ہے، کہانی قاری کے اندر اتر جاتی ہے اور اس کی ذات کا حصہ بن جاتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر دست و دوں کی بے مثال ادیب ہے، وہ عظیم ہے۔ لیونالٹائی اس سے اس درجے متاثر تھا کہ جب گھر سے نکلا اور دروازہ در ہو کر ایک اسٹیشن پر سردی میں ٹھہرنا مردہ پایا گیا، تو اپنی اسٹڈی میں دست و دوں کی کا ناول ”برادرز کرامازوف“ پڑھتا اور اندھا رکھ کر گیا تھا۔ یہ میرا بھی پسندیدہ ناول ہے۔“

ایک کہادت ہے کہ دنیا دو طرح کے لوگوں میں تقسیم ہے۔ پہلے وہ جو دست و دوں کی کو عشق کی حد تک پسند کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اسے فقط پسند کرتے ہیں۔

خان صاحب امر ہو جانے والے خیالات کو لغو مانتے ہیں۔

”میرے مرنے کے بعد بھلے میری کتابیں کچرے دان میں پھینک دی جائیں، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے قطع نظر، ایک تحریر کا درست مقام وقت ہی متعین کرتا ہے۔“

اس گفت گو سے چند ماہ پہلے کی بات ہے۔ ایک ادبی محفل کے دوران ایک صاحب نے ان سے ذومعنی سوال کیا کہ وہ لندن میں قیام کے دوران روزگار کے لیے لوگوں کے ہاں گھروں پر مشروبات پر مختار فراہم کیا کرتے تھے۔

عبداللہ حسین نے صاف گوئی اور معصومانہ دیانت داری سے اُن صاحب کی بات کی تصحیح کی۔ ”یہ غلط ہے۔ لندن میں تو میری اپنی ہار تھی۔ لوگ خود چل کر میرے پاس آیا کرتے تھے۔“

یہ اُسی محفل کا تذکرہ ہے کہ انھوں نے ایک اعتراف کر کے سامعین کو متحیر کر دیا۔

”مجھے اردو لکھنی نہیں آتی۔ میں سادہ زبان اور چھوٹے جملے لکھتا ہوں۔ میں اپنے تجربات، مشاہدات اور خیالات کو فکشن میں سیدھے حقیقی انداز میں لکھتا ہوں جس سے ایک تصویر بنتی جاتی ہے۔ ابتدا میں نقاد میری زبان پر تنقید کیا کرتے تھے۔ ناقدین کی نظر میں ماضی کی میری وہی خامی اب میری خوبی بن چکی ہے۔ وقت کے ساتھ دور ماضی کے اہم ادیبوں کی نقل اور پر شکوہ الفاظ والی رسمی زبان غیر معروف ہو گئی ہے۔ آج لوگ ایسی ہی سادہ اور حقیقی زبان میں فکشن پڑھنا چاہتے ہیں۔“

ادیبوں کے لیے مخصوص کمرے میں چائے پیتے ہوئے میں نے اس جانب اشارہ کیا کہ خود اُن کا شمار بھی اردو کے صف اول کے



بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے تو میری بات زد کرتے ہوئے بولے "میں کوئی بڑا اوزار، عظیم و عظیم ادیب نہیں، بڑے توانا لسانی، دستور کی پیروی اور اس قبیل کے دوسرے ادیب تھے۔ میں انھیں پڑھتا ہوں تو صحیح معنوں میں بڑا ادیب پڑھتا ہوں۔ ہماری اوقات کیا ہے، میری دنیا کے ایک غریب ملک کی زبان کے ادیب۔"

کراچی میں سب سمندر واقع ہوٹل کے کمرے کی جنوبی سمت کھلتی کھڑکی سے آتی بحیرہ عرب کی ٹھیکیں ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اٹھ اٹھ پھینٹے دودھ کی سی رنگت والی شام کو مجھے بتانے لگے۔

"میں نے اپنی زندگی کی کئی دہائیاں انگلینڈ میں گزاری ہیں۔ وہاں لوگوں میں وضع داری ہے، نام در اور بڑا ادیب ششہ مزاج اور عاجز ہوتا ہے۔ نمود و نمائش کو مستاپن مانا جاتا ہے، جب کہ خود نمائی ہمارے ہاں عام ہے۔ اپنی عظمت کے گن گانا اور خود کو بڑھ کر پیش کرنا پس ماندہ معاشرت کی علامات ہیں۔"

یہ کیسے ممکن ہے کہ برطانیہ میں طویل قیام کی وجہ سے مزاج میں روایتی انگریزی رنگ نہ چڑھا آیا ہو۔ امجد اسلام امجد نے ایک مرتبہ ڈیفنس لاہور میں اپنے گھر چند احباب کو کھانے پر مدعو کیا۔ عبداللہ حسین کو انھوں نے خاص دعوت دی۔ دونوں کے گھر بیدل لاصلے پر ہیں۔ گھر کا پتا پوچھنے پر امجد صاحب نے رستہ سمجھاتے ہوئے روایتاً کہہ دیا کہ اُن کا گھر بس قریباً چالیس گھروں کے فاصلے ہی پر ہے۔ دعوت کے وقت پر عبداللہ حسین صاحب کا انتظار شروع ہو گیا۔ دیر ہو گئی اور وہ نہ آئے تو امجد صاحب نے اُن کے گھر فون کیا۔ فون عبداللہ صاحب ہی نے اٹھایا۔ امجد صاحب نے حیرت سے کہا کہ سب ان کے انتظار میں ہیں اور وہ اب تک گھر سے روانہ ہی نہیں ہوئے۔ عبداللہ صاحب نے کہا کہ انھوں نے پورے چالیس گھر گئے اور دائیں بائیں دیکھا۔ اس پاس کوئی گھر مطلوبہ پتے کا نہ تھا، سو وہ واپس لوٹ آئے ہیں۔

عبداللہ حسین کے مزاج بارے میں ایک بات سے جب میں آگاہ ہوا تو میرے دل میں اُن کی عزت مزید بڑھ گئی۔ وہ نہ تو کسی سے زیادہ دیر تک ناراض رہ سکتے تھے اور نہ ہی کر سکتے تھے۔ اگر کبھی کسی سے ناراض ہو کر غصے سے بات کر بھی لیتے تو جلد مٹا لیتے۔ ایک مرتبہ امجد صاحب سے کچھ ناراض ہوئے تو اگلے روز انھیں گل رستہ بھجوا کر من لیا۔

بیاسی تراس سالہ بیمار تھا ادیب کس آوازی میں زندگی بسر کرتے ہوں گے، صرف وہی جان سکتے تھے۔ بڑھاپے میں مختلف عوارض کے ہاتھوں پریشان شخص کے لیے کبھی کبھار چڑچڑاہو جانا عین فطری ہے مگر اپنے سے جو نیر اور کم عمر شخص سے معذرت کر کے اُسے مٹا لینے کے لیے بہت دل گروہ چاہیے۔

میں ایک ادنیٰ آدمی، مشت غبار مانند ہوں جسے اُن جیسے چند بڑے لوگوں کی محبت میں بیٹھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ رکارڈ کے لیے ایک قطعی ذاتی نوعیت کی بات بیان کر رہا ہوں۔ وہ میرے گھر تشریف لا کر مجھے سرفراز کرتے رہے۔ ایک مرتبہ وہ تشریف لائے تو میں اُن کی مدارات کے لیے پڑجوش تھا۔

میری مسلسل آمدورفت پر انھوں نے بے تکلفی سے مجھے ڈانٹ کر دھمادیا۔ جاتے ہوئے غالباً میرا اتر اچھو دیکھ کر مجھے سینے سے لگایا اور بعد ازاں ایک برقی نامہ (e-mail) بھیجا۔ وہ اپنا نام عام رواج Hussain سے مختلف Hussein لکھتے تھے۔ ۲۷ february 2014 (۱۲ روز اتوار) ۱۲ بج کر ۵ منٹ کی اُن کی بے شمار e-mails میں [abdullahhusseinpak@yahoo.com](mailto:abdullahhusseinpak@yahoo.com) سے 2 فروری 2014 (۱۲ روز اتوار) ۱۲ بج کر ۵ منٹ کی اُن کی بے شمار e-mails میں ہے جب میں یہ e-mail پڑھتا ہوں تو بے اختیار میری آنکھیں بھر آتی ہیں اور میں اُن کی عظمت، وراپنی نالائقی کے بوجھ تلے دب جاتا ہوں۔

وہ لکھتے ہیں۔

"میں تین ہفتے سے مسلسل بیمار، اداس ہوں اور ہر وقت بڑھاپے اور موت کا سوچتا رہتا ہوں۔ درحقیقت میں تم دونوں (مراد: میں اور میری بیوی) کو اپنا حقیقی رشتے دار سمجھتا ہوں جیسے بیٹا، بیٹی یا بھتیجا، بھتیجی۔ یہ ایسا نازک مقام ہوتا ہے جہاں آپ چھوٹوں پر اپنا حق سمجھنے لگتے

ہیں۔ اس روز ہمارا ہنگامی میں مہس پریشان کر دیا جس کا مجھے الموس ہے۔ کسی اجنبی کو دکھ دینا تو درکنار، میں مہس کوئی دکھ نہیں کرواؤں گا۔  
 نہ انخواستہ اگر میں کسی ہمارا ہنگامی میں (کسی کو) دکھ دے بھی دوں تو مجھے عرصہ یہ غلط رہتی ہے۔ دیکھو، میں ایک پڑھا آدمی ہوں۔ میں جو کچھ  
 بھی کہہ رہا ہوں، ان الفاظ کو ایسے شخص کی بات مت جانو جسے زمانہ مہدائے حسین کے نام سے جانتا ہے بلکہ یہ ایک بیانیہ سا۔ پڑھے شخص کے  
 الفاظ ہیں۔ تم اس بات کو سمجھو پادے جب میری عمر کو پہنچو گے اور آگے مستقبل کی جانب بہ وقت دیکھ پادے گے۔ وہاں مہس اندھیرے کے  
 کچھ اور دکھائی نہ دے گا۔ پیار۔“

ادبی و تحقیقی معاملات پر صاحب صلاح دیتے اور دیانت دارانہ راہ نمائی فرماتے۔ میں نے اوائل جوانی کے چند افسانے پیش کیے تو  
 اُن کا خطہ وصول کر کے مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ انھوں نے انتہائے محبت سے راہ نمائی کی خاطر میری تحریر کی چند سطریں بھی نقل کی تھیں۔  
 9 مارچ 2013 کے خط میں اُن کی بڑی بڑی شکستہ تحریر میں رقم ہے۔

”ذیہ عرفان! افسانوی ادب کا سب سے بڑا جزو اس کی نثر ہوتی ہے۔ نثر کے اعداد اس کے جملے اور اُن کی ساخت ہوتے ہیں۔  
 جملے ایسے ہونے چاہئیں کہ صاف طور پر پڑھنے والے کی نہ صرف سمجھ میں آئیں بلکہ اُس کی عقل میں بھی بیٹھیں تاکہ وہ ان کا قائل ہو جائے۔  
 یہی بلاغت کا اصول ہے۔ مزید حتی الامکان جملے طویل نہیں ہونے چاہئیں۔

### طوالت کی مثال

”سیاہ ہوتی دیواروں اور رنگ آلود پنکھوں والے وارڈ میں کھانسی کراہتے نیم جاں مریضوں کے بیچ سے گزرتے اور اُن کے پھل  
 کے چھلکے فرش پر بکھیرتے، میالی چائے اور رنگین شربت کے چیمینوں کی خستہ چادروں پر بوجھاڑ کرتے اور گھڑیاں سنبالے میلے سے تارداروں  
 کو پھلاتے ہوئے جب وہ وارڈ کی جھنڈاٹھٹ سے باہر کھلی تازہ فضا میں آ نکلا تو اُس نے اپنے بیٹے شاہ دین سے دو ہی باتیں کہیں۔“  
 یہ جملہ طویل اور جھجک ہے اور اس میں clause اور sub-clause کا کوئی فرق نہیں رکھا گیا، نتیجے کے طور پر یہ پڑھنے والے کو  
 اپنی حقیقت کا قائل کرنے کے بجائے اسے کنفیوز کرتا ہے۔

### ساخت کی مثال

”مٹا ہڑ بڑا کر کر رہا اور نیند کے خمار میں پھر سے گم ہو گیا اور وہ باہر برآمدے میں لٹکتے پلاسٹک فریم میں جڑے شیشے میں دیکھ کر تیل  
 میں چڑے بالوں میں کنگھا کرتے شاہ دین سے لڑ پڑا جس کی وجہ سے اُس کی نماز قضا ہو گئی تھی۔“  
 اس کے بجائے

”مٹا ہڑ بڑا کر کر رہا اور نیند کے خمار میں پھر سے گم ہو گیا۔ باہر برآمدے میں لٹکتے پلاسٹک فریم میں جڑے شیشے میں دیکھ کر شاہ دین  
 تیل میں چڑے اپنے بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔ امام دین باہر نکل کر شاہ دین سے اس بنا پر الجھ پڑا کہ اُس کی بے پروائی کی وجہ سے اُس کے  
 باپ کی نماز قضا ہو گئی تھی۔“

ویسے اسی طرح ہی چلنے دیں تو بھی ٹھیک ہے۔ یہاں سب چلتا ہے۔ کئی لکھنے والے ایک خاص طبقے میں بے حد مقبول ہوتے ہیں  
 مگر سنجیدہ قاری اور نقاد حضرات انھیں خاطر میں نہیں لاتے۔ آخر کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔“

اردو کے ناقدین کے حوالے سے وہ ہمیشہ شکوہ کناں رہے۔ اُن کا خیال تھا کہ نقاد جدید ادب نہیں پڑھتے اور گزشتہ کے مطالعے کی  
 بنیاد ہی پر جگالی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ حقیقی معنوں میں تحقیقی و نکتہ رس تنقید نہیں کرتے۔

لاہور ڈیفنس میں اُن کے خوب صورت بیٹھے میں بیٹھے ایک مرتبہ میں نے اُن سے گزارش کی ”میرے محدود مطالعے نے مجھے تین  
 ناقدین کو دیگر سے ممتاز کرنے پر مجبور کیا ہے۔“

دو توجہ سے سن رہے تھے۔

”محمد حسن عسکری کی تنقید نہ صرف دل و دماغ پر اثر کرتی ہے بلکہ سوج کے نئے زاویے سے بھی روشناس کرتی ہے۔ ان کی تجزیاتی تحریر مسرت بخشتی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی بات کی نہ تک پہنچ جاتے ہیں اور عین اسی نکتے کو سر کو توجہ دیتے ہیں جس کی کوکھ سے جند کر تحریر کی کوئیل نے سر نکالا ہوتا ہے۔ وہ سات پردوں میں چھپی بات کو دیکھ سکتے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ممتاز شیریں، منٹو کی غریب کے پس پردہ نفسیاتی عوامل اور ان کے تجزیاتی مطالعے پر جس آسانی سے پہنچ کر ’س کا مدلل ابلاغ کرتی ہیں، وہ قابل ستائش ہے۔“

اس پر عبداللہ حسین نے اس طرح منہ بنایا جیسے دانت تلے کڑوا بادام آگیا ہو یا زبان پر کونین کی کوئی گھل گئی ہو۔ انھوں نے ناقدین کو اپنے مخصوص انداز میں خوب صلواتیں سنائیں۔ اُن کو شکوہ تھا کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ چار پانچ دہائی پرانی کتابوں ”نشیب“ اور ”اُداس نسلیں“ پر ٹوک جاتے ہیں۔ اُس کے بعد ان کے ناولوں اور کہانیوں کی کتاب ”غریب“ پر کوئی بات نہیں کرتا۔ فرنیٹک انھیں ان کے معیار پر اعتراض ہے تو کم از کم اس کا حوالہ جانی اظہار کریں۔

اس کے بعد انھوں نے محمد حسن عسکری کی بے حد تعریف کی اور بولے کہ وہ واقعی ایک پڑھے لکھے اور متاثر کن ناقد تھے۔ شمس الرحمان فاروقی کو بھی انھوں نے ”بڑا اور پڑھا لکھا آدمی“ قرار دیا۔ ممتاز شیریں کے حوالے سے انھوں نے اعتراف کیا کہ اس حوالے سے اُن کا مطالعہ قابل ذکر نہیں البتہ تعریفی تہ کوہ کیا۔

”اُداس نسلیں“ اُن کے لیے نازک الفاظ تھے۔ ادھر ”اُداس نسلیں“ کا ذکر آیا، ادھر ان کا پارا چھنے لگا۔ کراچی آرٹس کونسل کی ایک تقریب میں امجد طفیل صاحب نے اُن کے ناول ”باگھ“ پر سیر حاصل بات کی تو خوشی سے اُن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں نے اُسی تقریب میں یہ طور خاص اُن کی کہانیوں کی مجموعے ”غریب“ کا ذکر کیا تو حسب معمول میرے کندھے کا سہارا لے کر چلتے ہوئے کہنے لگے ”یار توں آج ’غریب‘ دا ذکر کر کے چٹکا کیتا۔ ایہ کیہ گل ہوئی کہ جدوں میرے افسانیاں دا ذکر ہوندا اے لوکاں نوں ’نشیب‘ دے علاوہ کچھ نظر نہیں آؤندا“

(تم نے آج ’غریب‘ کا تذکرہ کر کے اچھا کیا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جب میرے افسانوں کا ذکر ہوتا ہے لوگوں کو ”نشیب“ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا)

پھر ایک بات سنائی۔ ”جھپٹے دنوں میں ایک کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک دانش ور میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ اُس نے کھانا کھاتے ہوئے مجھ سے کہا ’آپ کے ناول ’اُداس نسلیں‘ کا اتنا ذکر ہوتا ہے جب کہ ”نشیب“ بھی ہمارے افسانوی ادب کا سرمایہ ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ اپنی تعریف سن کر میں خوش ہو جاؤں گا۔ میں نے سوچا اس کا مطلب ہے کہ میں نے ان دو کتابوں کے بعد اپنی زندگی کے پچاس برس ضائع کر دیے۔“

ایک مرتبہ ہشتے ہوئے بتایا ”میرا ناول ”اُداس نسلیں“ کا نام اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ میں نے جھپٹے دنوں اخبار اٹھایا تو اُس کے اندر ایک فچر کا عنوان تھا ”اُداس نسلیں۔“ میں نے سوچا کہ شاید میرے ناول پر ہے۔ چناں چہ اُسے پڑھنے لگا۔ اُس میں لکھا تھا کہ آج کل کی نوجوان نسل محنت نہیں کرتی، والدین کی عزت نہیں کرتی اور تعلیم پر توجہ نہیں دیتی۔ اس لیے یہ کام پایاں حاصل نہیں کر پاتی۔ سو بااوس ہو جاتی ہے۔ یہ دور ایسا ہی اُداس نسلیں پیدا کر رہا ہے۔ میں نے اپنے ناول کے عنوان کا ایسا حشر بھی سوچا بھی نہیں تھا۔“

میں نے اُن کی دل آزاری اور اپنی سرزنش کے خوف سے کبھی اُن کے سامنے اعتراف نہ کیا کہ مجھے بھی اُن کی تمام تصانیف میں لولا نشیب اور تانیا اُداس نسلیں زیادہ پسند ہیں۔ اُن کا خاکہ لکھا تو اُس کا عنوان بھی اُن کے پنے پسندیدہ ناول ”باگھ“ کے نام پر رکھا۔ خاکے کا مسودہ انھیں حقائق کی درستی کے لیے بھیجا تو چند اعتراضات سے ہٹ کر انھیں اس کا عنوان خاصا پسند آیا۔



انھیں "اداس نسلیں" سے گویا ایک چڑی ہو گئی تھی۔ چڑ کے حوالے سے مشہور دینی راہ نما اور سیاست دان مفتی محمود مرحوم کا ایک دل

چسپ واقعہ سینہ بہ سینہ سفر کرتا ہوا مجھ تک پہنچا۔ اس کے راوی غالباً نامی گرامی سیاست دان جاوید ہاشمی ہیں۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک مرتبہ مفتی محمود دیگر چند سیاست دانوں کے ہم راہ پابند سلاسل تھے۔ اُن کی بھاری سیاسی شخصیت، مذہبی مقام اور تندرستی وجہ سے خاص عزت تھی۔ البتہ دیگر سیاسی قیدی اک دو بچے سے خوب چہلپس کرتے۔ انھوں نے وقت گزاری کے لیے ایک دوسرے کو مختلف نام دے کر ان کی چھیڑیں بنائی ہوئی تھیں۔ مفتی صاحب یہ سب دیکھتے اور حیران ہوتے۔ ایک روز بول اٹھے "بھئی یہ سب جعلی نام ہیں۔ آپ لوگ ان سے اتنا چڑتے کیوں ہیں، نظر انداز کر دیا کریں۔" اگلے روز ایک قیدی اُن کی ہیرک میں آیا اور سودا بانہ گزارش کی "مفتی صاحب ذرا سوئی دھاگا عنایت کیجیے گا۔" مفتی صاحب بولے "بھائی میرے پاس سوئی دھاگا نہیں۔" چند لمحے بعد دوسرا قیدی آیا اور بولا "مفتی صاحب ذرا سوئی دھاگا عنایت کیجیے گا۔" مفتی صاحب بولے "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے پاس سوئی دھاگے کا کیا کام؟" تھوڑی دیر میں تیسرے قیدی نے وہی سوال دہرایا تو مفتی صاحب جھلا کر بولے "بھائی کوئی دین کی بات ہو یا شرعی مسئلہ ہو تو پوچھیے۔ ایک عالم کے پاس سوئی دھاگے کا کیا کام؟" جب چوتھے قیدی نے بھی وہی بات دہرائی تو کچھ غصے سے بولے "میرے پاس سوئی دھاگا نہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیے۔" غرضیکہ یہ گردان جاری رہی۔ جب دسواں، گیارہواں قیدی مفتی صاحب کی ہیرک میں داخل ہوا تو مفتی صاحب بھرے بیٹھے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی پھٹ پڑے "تمہیں بھی سوئی دھاگا ہی چاہیے ہوگا۔ کیوں بے اپنی کسی عزیزہ کے اعضاء کی سلائی کرنی ہے۔" (الفاظ کو دائرہ شائستگی میں لانے کی خاطر بدل دیا گیا ہے) یہ سن کر باہر اکٹھے ہوئے قیدیوں کے بلند بانگ قہقہے چھوٹے تو مفتی صاحب اصل ماجرا مجھ کے خفیف ہو کر رہ گئے۔

عبداللہ حسین صاحب کو اوآخر میں لفظ چوراسی "84" سے بھی چڑ ہو گئی تھی۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ جب میں نے اُن کے حوالے سے خاکہ نمایا دواشتیں لکھیں تو انھوں نے مسودے پر دو بنیادی اعتراضات کیے۔ ایک تو اُن کی عمر کے حوالے سے تھا جو تراسی برس چند ماہ تھی۔ دوسرا اعتراض اختتام پر تھا۔

پہلے اعتراض پر وہ غصے میں پھٹ پڑے "بھئی میری عمر 83 برس ہے۔ تم نے جگہ جگہ 84 برس لکھا ہے تاکہ پڑھنے والے یہ تاثر لیں جیسے میں کوئی بہت بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے یہ غلط گردان بالکل پسند نہیں آئی۔"

چناں چہ میں نے سوائے ایک دو جگہ کے یہ تذکرہ ہی حذف کر دیا۔ معاملہ اعداد کا نہیں، کچھ اور تھا۔

وہ خود نمائی سے گریزاں تھے چناں چہ ایسے لوگوں کو زیادہ پسند کرتے جن کی تخلیق بولی تھی بجائے ان کے جو خود بولتے تھے۔ البتہ اس معاملے میں ایک انحراف یہ تھا کہ جب "اداس نسلیں" کے ابتدائی ایڈیشن چھپے تو ان پر "اردو کا عظیم ناول" لکھا گیا تھا۔ غالباً یہ پبلشر کی ضرورت تھی۔ بلاشبہ بین الاقوامی معیار کے اہم ناولوں کے پر تو صغی رائے رقم ہوتی ہے۔ دوستوں کی سے لے کر نالٹائی اور میلان کنڈیرا تک اہم ادیب عموماً اپنی تخلیقات کے معیار پر نہ تو شرمندہ رہے ہیں اور نہ ہی متذبذب۔ اسی لیے وہ ان کی خوبیوں کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

اُن کے مزاج کے حوالے سے اُن کی تحریر کا نمونہ ہے جو انھوں نے میرے لکھے خاکوں پر رقم کیا۔ ابتدائی چند جملوں کے بعد وہ رقم

طراز ہیں۔

"جن ادیبوں پر انھوں نے کاوش کی ہے اُن میں سے مجھے دو میں زیادہ دل چسپی پیدا ہوئی ہے۔ اوّل عاصم بٹ، جو واقعہ ایک بند کوزے کے مانند ہیں۔ جس طرح عرفان جاوید نے اُن کے ایک ایک پت کو تحصیل کر اُن کا باطن ظاہر کیا ہے، ایک معرکے سے کم نہیں۔ اب جب بھی میں عاصم بٹ کا خیال کروں گا وہ ایک ادھ چھلے پیاز کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ دوم نصیر کوئی صاحب۔ ان کی روداد نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ وہ تنگ دستی میں گزارا کرتے رہے، صلہ کچھ طلب نہ کیا، عقیدہ کسی حالت میں ترک نہ کیا اور آخر میں گم نامی کی موت



مرے۔ یہ ایک عام آدمی کے Jerusalem کی کہانی ہے۔ میرے نزدیک نصیر کوئی ایک نہایت اچھے کے کردار ہیں جو نامساعد حالات کے مقابل اپنے اصول ترک کرنے سے انکار کرتے کرتے ڈیر ہو گئے۔ ایک معمولی آدمی کو عام در لوگوں کے برابر کھڑا کر کے عرفانِ حادہ نے انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔“

عبد اللہ حسین صاحب نے نسبتاً غیر معروف ادیبوں کو مشہور اور اہم ادیبوں پر فوقیت دی۔ محمد عاصم ہت "داؤد" "ہاتھام" اور "اشتہار آدمی اور دیگر کہانیاں" جیسے عمدہ ناولوں اور انسانوں کے خالق اور نصیر کوئی پنجابی زبان کے شاندار شاعر اور "ہر گھر سے بھنو لکھے گا" جیسی نظم کے خالق، محنت کش فن کار اور

ایک مرتبہ کراچی مجھے، انھیں اور مستنصر حسین تارڑ صاحب کو انگریزی کے نوجوان ناول نگار اور ایشیا کے اعلیٰ ذی ایس سی ادبی ایوارڈ یافتہ مصنف ایچ ایم نقوی اور ان کی بارہوی جی اعلیٰ ترین درس گاہ میں پڑھانے والی باوقار بیگم نے اپنے وسیع فوالبی انداز کے بیچلے میں کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ وہاں شہر کی منتخب اشرافیہ جس میں بیرونی فلم سازوں، اسرکی اور یورپی جرائد کے نمایندوں کے علاوہ زندہ دل اور دل کش خواتین موجود تھیں۔ ایک جانب قدیم طرز کے آلات موسیقی دھرے تھے۔ نقوی کو ساٹھ اور ستر کی دہائی کے آن دیکھے کراچی کی یادوں سے عشق ہے۔ اس کے ہاں جا کے محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی اسی دور میں چلا گیا ہو۔ ابھی گراموفون بند کر کے ریڈیو کھولا جائے گا اور فیلڈ مارشل ایوب خان کی براہ راست تقریر ریڈیو فریکوئنسی میں کھڑکڑاہٹ کے معمولی خلل کے ساتھ بھرپور مردانہ آواز میں گونجنے لگے گی۔ جیسے میٹروپول کے قریب واقع مے کدے سے ہجوم رند اس برآمد ہوگا اور صدر کے ایرانی ہونٹوں سے چٹو کباب کھا کر گھروں کا رخ کرے گا۔ جیسے مولانا مودودی کے استقبال کو آنے والا تھا انھیں مارتا سندھ شہر کراچی کے انتخابی چہرے پر جماعت اسلامی کی سبز مہر ثبت کر دے گا۔ گویا یہ ماضی کی کسی گم شدہ دہائی میں عبد اللہ حسین سے مختصر سی بات چیت تھی، حال کی گفت گو تھی جس میں ماضی کی گونج تھی۔ ایک dejavu تھا، التباس تھا۔ عمومی طور پر بین الاقوامی سطح کے نمایاں ناول نگار کہتے آئے ہیں کہ اس موضوع پر لکھنا چاہیے جس کے بارے میں مشاہدہ یا تجربہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان ناولوں کو اپنے دور کی نمایندہ دستاویزی تحریریں بھی جانا جاتا ہے۔ اس بارے میں خان صاحب کا کہنا تھا کہ آج تک کے تمام ناولوں میں لیونٹالستانی کا معرکہ آرا ناول "دار ایڈ نہیں" (جنگ وامن) کو بلاشبہ اعلیٰ ترین تصنیف مانا جاتا ہے۔ اس ناول میں نیو لیونک جنگوں کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے، وہ جنگیں ٹالستانی کی پیدائش سے انیس برس قبل لڑی گئی تھیں۔ ان میں آسٹریلیز کی جنگ کی ایک چشم کشا منظر نگاری ملتی ہے جیسے کتاب کے صفحات سے ابھی تک گرم توپوں کا تازہ بارودی دھواں اٹھ رہا ہو۔ حقیقی دُور کو زمانے کے بندے نہیں باندھا جاسکتا۔ یہ تجربہ آمیز اور پراسرار تجربہ ہے۔

"پاکستان میں ابتدائی وقت گزار کر جب آپ برطانیہ جا آباد ہوئے تو بھی آپ کی کہانیوں میں دیسی خبر کی نمکین مہک اٹھتی نظر آتی ہے" میں نے رائے دی تو بولے۔ "یہ سب تخلیقی انفعالیات اور تصور کی لامحدودیت کے کرشمے ہیں۔ فرانسیسی نابضہ مارسل پرووست وہاں کے سماج کا مشاہدہ کر کے اٹھارہ برس کی عمر میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ اس نے کنارہ کشی کے دور میں فرانسیسی معاشرے کی اپنے حویل ناول "Remembrance of things past" "یاد سامانی ایام گزشتہ" میں تاب ناک عکاسی کی۔ اس سے پوچھا گیا تو وہ حیرت سے بولا "کیا، اٹھارہ برس ایک سماج کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کے لیے کافی نہیں؟" جب میں برطانیہ گیا تو پاکستان میں خاصا وقت گزار چکا تھا۔ یہاں کی معاشرت میرے شعور کے تار و پود میں رچ گئی تھی۔ میں نے کچھ لکھنا ہوتا، میں اس ذخیرے میں سے چند خوشے چن لیتا۔ میں عموماً زیادہ بہتر انہی چیزوں یا تجربات کے بارے میں لکھ سکتا ہوں جنہیں میں نے سونگھا، چکھا، چھوا ہوا یا جن مشاہدات و تجربات سے میں واقف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت کی بہتر عکاسی جزئیات میں ہوتی ہے۔"

احمد فراز سے پوچھا گیا کہ وہ خود نوشت کیوں نہیں لکھتے تو انھوں نے کہا "اگر اپنی سوانح لکھوں گا تو سچ لکھوں گا، اس سے کئی

شادیاں ٹوٹنے کا اندیشہ ہے، ہوا سے نہ لکھنا بہتر ہے۔"

محبت کے معاملات کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں "میں ایک باوقار آدمی ہوں اور وہ خواتین بھی باعزت ہیں۔ ایسے معاملات کا بیان اور اظہار سستا پن اور اوجھی حرکت سمجھتا ہوں۔"

انھوں نے ایک جگہ لکھا تھا: "عورتیں بے وطن ہوتی ہیں۔ جہاں بیٹھنے کی جگہ مل جائے، وہی ان کا وطن ہوتا ہے۔ عورت آباد کرنا جانتی ہے مگر اجاڑ دینے پر بھی قادر ہوتی ہے۔"

تصدق سہیل اور عبداللہ حسین پرانے دوست اور لندن کے ساتھی تھے۔ دونوں عمر رسیدگی میں وطن لوٹ آئے۔ عبداللہ حسین نے لاہور میں سکونت اختیار کی، تصدق سہیل نے کراچی میں۔ ایک اُردو کے بڑے ادیب تھے اور دوسرے معروف مصور ہیں۔ تصدق صاحب نے پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں افسانے بھی لکھے جو مستند ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ میرا تصدق صاحب سے خاصا اچھا تعلق ہے۔ انھوں نے جہاں خان صاحب کے لندن قیام میں اُن کی ذہانت، علمی گہرائی اور حاضر دماغی کی تعریف کی، وہیں ایک آدھ معاملے میں رقابت درآئے پر رنجیدگی کا بھی اظہار کرتے ہوئے کہا "وہ میرا دوست تھا، کوئی اور ہوتا تو دکھ نہ ہوتا۔"

یہ ستر کی دہائی کا واقعہ ہے۔ تصدق صاحب کی زندگی آرٹ اور برطانوی نازنیوں میں گزر رہی تھی۔ وہ مکمل برطانوی اطوار ہائے زندگی اختیار کر چکے تھے۔ اپنی ہم دردانہ توجہ، انگلیسیوں اور بانک پن کی وجہ سے لڑکیوں میں خاصے مقبول تھے۔

ان دنوں پاکستان سے برطانیہ جا کر قیام کرنا امر واقعی ایک ثقافتی دھچکا ہوتا تھا۔ دونوں معاشرہ میں قطبین کا فرق تھا۔ چنانچہ عمومی یورپی روایت کے تحت کسی گندی رنگت اور سیاہ بالوں والے پاکستانی لڑکے کا انگریز میموں میں مقبول ہونا عین فطری تھا۔ البتہ یہاں پر احباب ایسے واقعات اور تجربات کو دروغ گوئی پر محمول کرتے۔

قصہ مختصر، تصدق سہیل لندن کی بہار کی دہائی صبحوں کو اپنا پیٹنگ کا سامان لے کر سرسبز پارکوں میں چلے جاتے جہاں انگریز اور دیس دیس کے کالے، گندی، زرد اور سفید مرد عورتیں، لڑکے لڑکیاں اور بچے رنگین پھول دار کپڑے پہنے ہنس کھیل رہے ہوتے۔ وہاں کی تازہ خشک ہوا میں کسی ایسے گوشے میں جہاں دھوپ بدن کو حرارت بخش رہی ہوتی، وہ دانہ چٹکتے پرندوں کے بچ ایزل، کیٹوس، رنگ اور برش وغیرہ لے کر بیٹھ جاتے اور پینٹ کرنا شروع کر دیتے۔

اس معمول کی وجہ سے اُن کی کئی آرٹسٹ لڑکیوں، سیاح عورتوں اور تھک کر ستانے والی دوشیزاؤں سے ملاقات ہو جاتی۔ بیش تر سے یہ ملاقات سرسری، چند ایک سے دوستانہ اور کسی کسی سے رومانی رنگ اختیار کر لیتی۔

فرانسیسی چیخل شیریں بھی ایسی ہی لڑکیوں میں سے ایک تھی جس سے جوان مصور کی دوستی رومان میں بدل گئی۔ درحقیقت وہ تصدق کے دوست اور روم میٹ ٹونی کی دوست تھی جسے وہ تصدق کی تصویریں اپنی کہہ کر متاثر کرتا تھا۔ لڑکی ذہین تھی سو ایک روز ٹونی سے پوچھنے لگی "تمہیں کون سا آرٹسٹ پسند ہے؟"

ٹونی نے پکا سا اور ڈالی کے نام لے دیے۔ اُن سے یہی دو نام آتے تھے۔

شیری نے معنی خیز انداز میں اگلا سوال کیا "تمہیں Utrilo کی عریاں عورتوں کی تصویریں پسند ہیں یا Modigliani کی عمارتوں والی؟"

دل چسپ امر یہ ہے کہ Utrilo نے بھی عریاں اور Modigliani نے عمارتوں کی تصویریں نہیں بنائیں۔

"مجھے Utrilo کی عریاں تصویریں پسند ہیں" ٹونی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

ظاہر ہے، شیری مسکرا کے رہ گئی۔

اور شیریں کو تصدق سبیل کی تعداد بہت پسند آئی تھیں۔ اور لونگی کی پرانی گرل فرینڈ آن ہنگی۔ اس ہ لونگی نے تصدق سے کہا ”لوگی ڈہین ہے، ہم اسے سنبالو۔“

سو اس طرح ان دونوں میں تعلق بڑھا۔ تصدق شیریں کی ذہانت اور مطالعے سے اور وہ ان کے ٹیلنٹ سے متاثر ہوئی۔ وہ فرانسیسی، یونانی، ہسپانوی اور ہالین زبانیں روانی سے بول سکتی تھیں اور روسی، چینی اور جاپانی زبانیں سیکھ رہی تھیں۔ ”مجھے ہسپانوی مرد اچھے لگتے ہیں، اسی لیے ان کو چھاننے کے لیے میں نے Spanish زبان سیکھی“ اُس نے سادگی سے اعتراف کیا۔

یہ تعلق بڑھتے بڑھتے برسوں پر محیط ہو گیا۔ شیریں کا بہ یک وقت کئی لڑکوں سے رومانی تعلق تھا۔ یہ تصدق کے مزاج پر یوں گراں نہ گزرتا کہ اولاً ان کا تعلق دوستانہ رومان کا تھا اور شیریں نہ صرف انھیں اپنی فتوحات کے قصے سناتی بلکہ کھلکھلاتے ہوئے یہ بھی بتاتی کہ اُس نے کس طرح ایک بوائے فرینڈ کے دوست کو اُس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اُس کے سامنے رجھ لیا۔ ثانیاً اُن کا تعلق سمجھوتے کا تھا۔ چنانچہ دونوں ایک دوسرے کے تعلقات دیگر پر معترض نہ ہوتے۔

اب کہانی میں عبداللہ حسین داخل ہوتے ہیں۔

عبداللہ حسین ایک اونچے لمبے، وجیہ، بادقار اور بھرپور مرد تھے۔ آنکھوں سے ذہانت چمکتی تھی اور مطالعہ جھلکتا تھا۔ وہ ساقی فاروقی اور تصدق صاحب کے مشترکہ دوست تھے۔

ایک سہ پہر تین بجے تصدق کو عبداللہ حسین کا فون آیا۔ وہ ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ جب تصدق نے انھیں شیریں کا بتایا تو انھوں نے اس سے بھی ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دونوں دوستوں میں اس سے پہلے بھی شیریں کا ذکر ہو چکا تھا۔

شیریں اور تصدق کے بیچ بوریٹ اور اُچٹ پن کا دور گزر رہا تھا۔ عبداللہ حسین کے آجانے سے تازگی اور تہدیلی آجاتی۔ جب عبداللہ حسین آئے تو شیریں غسل کر کے اپنے لمبے گہرے بادامی بالوں کو جھٹکتے ہوئے داخل ہوئی۔ اُس کے خوب صورت چہرے پر پانی کے قطرے تھے۔ وہ عبداللہ حسین کو دیکھ کر سرعوب ہو گئی۔

دونوں کے بیچ ادب اور فلسفے پر بات چیت شروع ہوئی تو شیریں خاصی متاثر ہوئی۔

کچھ دیر بعد تصدق اپنی پینٹنگ بنانے میں مشغول ہو گئے۔ شیریں اور عبداللہ حسین اس طرح ایک دوسرے میں مگن ہو گئے کہ تصدق کی موجودگی سے گویا غافل ہو چکے تھے۔

شیریں بات بات پر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ یہ دیکھ کر تصدق صاحب کے دل میں رقابت کی چنگاری بھڑک اٹھی۔ ایک اور بات نے اس چنگاری کو ہوا دی۔

عبداللہ حسین شیریں کے ساتھ بات چیت میں ایسے محو ہوئے کہ چار گھنٹے گزر گئے، جب کہ وہ دو گھنٹے کے لیے آئے تھے۔ عبداللہ حسین کی گفت گو ادبی، علمی اور ذہنی تھیں۔

شام کو شیریں نے تصدق سے کہا کہ وہ لوگ عبداللہ حسین کو کھانے پر لے چلتے ہیں۔ تصدق نے طوہاؤ کرہا آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ لوگ لندن کے علاقے گولڈر گرین کے ایک خوب صورت چینی ریستوران میں چلے آئے۔

وہاں پر تینوں، ایک میز کے گرد بیٹھ گئے اور گپ شپ کرنے لگے۔ یک دم عبداللہ حسین صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔ تصدق صاحب سمجھ گئے کہ شیریں نے میز کے نیچے سے عبداللہ حسین صاحب کو آمادگی کا واضح اشارہ دے دیا ہے۔ یہ دیکھنے کے باوجود تصدق صاحب اُن جان بنے خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ اُن کا منصوبہ ساز ذہن ایک کہانی کا پلاٹ بن رہا تھا۔

اگلے روز تصدق صاحب نے عبداللہ حسین کو صبح سویرے فون کر دیا۔

انہوں نے فون پہلی گھنٹی پر ہی اٹھالیا جیسے وہ فون کال کے منتظر ہوں۔ تصدق صاحب کی آواز سنتے ہی انہوں نے شیریں کی تعریف شروع کر دی۔ تصدق صاحب نے بات بناتے ہوئے کہا ”شیریں کوٹم خاص پسند نہیں آئے۔ وہ کہتی ہے کہ تمہارا دوست مجھ سے بے وجہ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا رہا ہے۔“

یہ سن کر عبداللہ حسین ہنسنے میں آگئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولے ”وہ جھوٹ بولتی ہے۔ سب پیش قدمی اُس کی جانب سے تھی۔ یہ وہی تھی جس نے میرے گھنٹوں کو دیا تھا۔“ پس جس بات کا تصدق صاحب کو شک تھا، اُس کی تصدیق ہو گئی۔

یہ علیحدہ معاملہ ہے کہ اُسی شام تصدق صاحب نے شیریں سے قطع تعلق کر لیا۔ البتہ یہ پیوستہ معاملہ ہے کہ عبداللہ حسین ایسے خوددار اور وضع دار دوست نے بعد ازاں ایک طویل خط کے ذریعے تصدق صاحب سے معذرت چاہی اور اظہارِ ندامت بھی کیا۔ اس چھوٹی سی غلطی کے باعث اُن کے بچ ہلکی سرد مہری بھی ڈر آئی۔

”آج جب میں اُس واقعے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو خود ہی شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ بے وفائی شیریں کا جو ہر عام تھا۔ مجھ سے پہلے اور میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی وہ بے وفائی کی باقاعدہ مرتکب ہوئی تھی۔ ویسے بھی میں اُس سے وفا کی اُمید نہ کرتا تھا۔ ہم دونوں دو علیحدہ ملکوں میں رہتے ہوئے دوسرے لڑکے، لڑکیوں سے اپنی اپنی جگہ نجی تعلقات رکھے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو آزادی دے رکھی تھی۔ ہم تو اکٹھے بھی کبھی کبھار ہوتے تھے۔ میں عبداللہ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وہ واقعی ایک شریف اور باوقار دوست تھا۔ اسی لیے اب میں اُسے محترم عبداللہ حسین صاحب ہی کہہ کر بلاتا ہوں۔“ تصدق سہیل نے لمبی سانس بھرتے ہوئے مجھ سے حالِ دل بیان کیا۔

ایک مرتبہ عبداللہ حسین کراچی آ رہے تھے۔ میں نے تصدق صاحب سے تذکرہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے خان صاحب سے تذکرہ کیا تو وہ بھی پرانے دوست کو ملنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ تارڑ صاحب انہیں پیدائشی نام محمد خان کی رعایت سے خان صاحب کہتے تھے۔ خان صاحب کی مصروفیات میں شریک ہونے کے باعث میں بھول ہی گیا تھا کہ انہوں نے تصدق صاحب سے ملاقات یا دلائی۔ میں نے مضور کو فون کر کے وقت کا تعین کیا اور چند گھنٹے چرا کر عبداللہ حسین صاحب کو تصدق صاحب کے فلیٹ کے نیچے کافی شاپ میں لے گیا۔

تصدق صاحب منتظر تھے۔ وہ اٹھلاتے ہوئے، گلیس لگا کر، سر پر ہیٹ پہنے بیڑھیاں اترے اور بے قرار ہو کر خان صاحب سے ملے۔ خان صاحب بیماری اور گھنٹوں کی کم زوری کی وجہ سے بیڑھیاں نہ چڑھ سکتے تھے۔ کئی دہائیوں کے بعد یہ دواہم دوستوں کی ملاقات تھی۔ خان صاحب نے تصدق صاحب کو پنجابی میں کافی پینے کی دعوت دی تو وہ شرارت سے دہلی دہلی ہنسنے اور بولے ”اب میں کچھ اور نہیں پی سکتا۔ بھلے وہ کافی ہی ہو۔“

دو پرانے دوستوں کے راز و نیاز میں زیادہ دیر قفل نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اجازت لی اور چند گھنٹوں کے لیے چلا آیا۔ ملاقات کے بعد تصدق صاحب بہت سرشار تھے۔ چند روز بعد ملاقات میں گویا ناپچتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے۔ ”آپ نے میری عبداللہ سے ملاقات کرا کے بہت اچھا کیا۔ مجھے اُس سے پھر سے پہلے والا پیار ہو گیا ہے۔ اب میری اُس سے کوئی ناراضگی نہیں۔ آئندہ جب بھی میرے سامنے اُس کا نام لیں تو جناب عبداللہ حسین صاحب کہیں۔“

یہ کہہ کر کچھ دیر توقف کیا، چہرے پر تشویش طاری کرنے کی اداکاری کی اور بولے۔ ”میرا دوست بیمار رہنے لگا ہے اور کم زور ہو گیا ہے۔ اس کا ایک علاج میرے پاس موجود ہے۔“

میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ ”وہ کیا؟“



بولے۔ ”اسے اچھی اور خوب صورت خواتین کی صحبت مل جائے تو پھر سے جوان ہو جائے گا۔ بڑھوں کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کی بیماریاں سن سن کر خود بیمار پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے میں جوانوں میں رہتا ہوں۔“  
یہ تجویز میں نے خان صاحب تک پہنچائی تو دو جھجلا سے گئے۔ ”اک تے تصدق دے حواس جواب دے گئے میں“ (ایک تو تصدق کے حواس جواب دے گئے ہیں)۔

عبداللہ حسین صاحب کی شادی اپنی بڑی بہن کے سرال میں ہوئی۔ بہن کے دیور کی بیٹی سے، عمر میں ان سے تین برس چھوٹی تھیں۔ بچپن سے یہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس شادی سے ان کے ہاں بیٹا اور بیٹی پیدا ہوئے۔ برطانیہ قیام کے دوران جب خان صاحب مختلف ذرائع معاش سے وابستہ تھے، ان کی بیگم وہاں ڈاکٹر کے طور پر فرائض سرانجام دیتی رہیں۔  
”میری بیوی بہت اعلیٰ ظرف، بڑے حوصلے اور دل کی مالک ہے۔ اُس نے میری بے اعتدالیوں سے سمجھوتا کیا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی طلیہ زندگی بسر کرنا شادی کو مضبوط کرتا ہے۔ اس طرح شادی بھی برقرار رہتی ہے اور انسان اپنے ادبی و دیگر مشاغل بھی قائم رکھ سکتا ہے۔“

”ہجرات میں اوائل جوانی میں میں خاصا خوب صورت نو جوان تھا۔ مجھے نہ صرف لڑکیوں کی توجہ ملتی تھی بلکہ بہت سے مرد بھی میرے پیچھے ہوتے تھے۔“ خان صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے کہتے تھے۔

وطن واپسی پر خان صاحب اپنی بیٹی کے گھر سے ملحق خوب صورت انیکسی میں قیام رکھتے تھے۔ بیگم مقام دیگر پر سکونت پذیر ہیں۔ خان صاحب کے حوالے سے ایک خود گن شخص کا تصور سامنے آتا رہا ہے۔ ایک ایسا شخص جو یا تو قریبی اقارب کے معاملے میں زیادہ جذباتی نہیں یا اس کا اظہار نہیں کرتا۔ انھیں میں نے اپنے رشتوں خصوصاً بیٹی کے معاملے میں بہت جذباتی اور حساس پایا۔ اُن کی ذاتی گفت گو میں بیٹی کا تذکرہ کسی طور آ ہی جاتا تھا۔ بیٹی لاہور میں ایک ریستورنٹ کی مالکہ ہیں اور باپ سے عشق کرتی تھیں۔

ایک دفعہ بتانے لگے۔ ”میں خاصا بیمار رہنے لگا ہوں۔ میری بیٹی کہتی ہے کہ خدا نخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو لوگ ایک بڑے ادیب سے محروم ہو جائیں گے۔ اصل نقصان میرا ہوگا۔ میرا باپ، میرا عشق ہے۔ میری زندگی اس کے بغیر نامکمل ہوگی۔“

میں نے چراغ سحری کی مدھم لٹوں میں، آخری دور میں جب سے خانہ حیات سے در ماندگان ہست دیود تھکے، بہکتے قدموں نکلے چلے آتے ہیں، قد آور ساقی کو دیکھا۔ سو یہ قصے محدود وقتوں کے ہیں۔

طویل القامت ادیب کندھے جھکا کر چلتے، کسی کو دیکھتے تو چند لمحوں بعد ہی آنکھوں میں شناسائی کی چمک آتی، سگریٹ پیٹے تو زور سے ایش ٹرے میں راکھ پھینکتے، وہ باہر نکھر جاتی تو اسے نظر انداز کر کے گفت گو میں مشغول ہو جاتے۔ بیٹے کا بھی سرسری تذکرہ ہو جاتا جو برطانیہ میں مقیم ہے۔

عجب معاملہ یہ ہے، گو اردو ادب میں اُن کا تذکرہ اہم ترین لوگوں میں ہوتا ہے، اُن کے بچوں اور نواسے نواسیوں میں اردو کا وہ ذوق پیدا نہ ہو پایا۔ شاید اس کی وجہ اُن کا برطانیہ میں طویل قیام تھا۔ اسی لیے اُن کے لاہور میں مقیم نواسے نے اپنے نانا کا محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا ”میرے نانا ایک مشہور آدمی ہیں جن کی تصویریں اخباروں میں چھپتی ہیں۔ وہ ایک ایسی زبان میں لکھتے ہیں جسے میں پڑھ نہیں سکتا۔“

عمدہ کھانے کے بہت شائق تھے۔ گھر میں کھانا خود بھی پکاتے تھے۔ لذیذ کھانے کا ایک لقمہ چکھتے ہی اس کی تعریف کرتے۔ بسیار خورد تھے۔ ایک مرتبہ ہمیں ایک کھانے میں جانے کو اس لیے تاخیر ہو گئی کہ احمد شاہ صاحب کو اُن کی مصنوعی بتیسی لانے میں دیر ہو گئی۔ دانت یا تو جھڑ چکے تھے یا پھر کم زور ہو چکے تھے۔ اچھے جملے پر بچے کی طرح قہقہہ لگاتے جو خاصی دیر تک جاری رہتا۔ مزاج میں زندگی آمیز حرارت تھی۔

یہی وجہ ہے کہ کیلوں، کھانوں، موسیقی، کتابوں اور عورتوں میں دل بکھی رکھتے۔

خواتین سے جلد افلاطونی جذباتی وابستگی اختیار کر لیتے اور حقیقی طور پر ان کے خیر خواہ ہو جاتے۔ یہ صین قرہن فطرت ہے۔  
فکری سطح پر بین الاقوامی آفاقی نظریات کے حامل تھے۔ جنرل ایپے اور زمانے کے بلبلے سے آزاد تھے۔ چنانچہ ان کے فلسفیانہ خیالات کا یہ کوتاہ نظر معاشرہ فی الحال تحمل نہیں ہو سکتا۔ چند نمونے پیش ہیں۔

وہ مذہب کے حوالے سے تشکیک کا شکار نہ تھے۔ اوائل عمری میں تقسیم کے فسادات نے ان کا ذہن اس حد تک متاثر کیا کہ وہ مقامی و تاریخی اور مذہبی اخلاقیات کے محور سے آزاد ہو کر بنیادی انسانی آفاقی اقدار کے مدار میں چلے گئے، یک زوجگی کو قطعی طور پر انسانی فطرت کے خلاف قرار دیتے اور اسے ”عرقید“ سے تعبیر کرتے رہے۔ ”جب انسان آزاد پیدا ہوا ہے تو آزاد زندگی گزارے۔ شوہر اور بیوی کا ایک دوسرے کو شادی کے ادارے میں رہتے ہوئے آزاد کر دینا نہ صرف ان کے درمیان رشتے صحت مند کرتا ہے بلکہ بنیادی انسانی جبلت کے بھی صین مطابق ہے۔ اس طرح ان میں محبت بھی بڑھتی ہے۔“

اہل خانہ سے محبت کی رنگین ڈور سے وابستہ ہونے کے باوجود شادی کے قائل نہیں تھے۔  
”شادی انسان کی صلاحیتوں کو کھاجاتی ہے۔“ (اس ماحول سے ان کی کڑواہٹیں)

یک زوجگی اور اسی سے تا عمر بندھے رہنے کو تجرباتی تنوع کے لیے بڑی رکاوٹ۔ نئے ہوئے کہتے تھے ”ایک تخلیقی کار کا سب سے بڑا دشمن بچے کا پگھلنا ہوتا ہے۔ سائرل نامی مصنف نے اپنے وقت کی ایک معروف کتاب ”Enemies of Promise“ (صلاحیت کے بیڑی) لکھی تھی جس میں ثابت کیا تھا کہ بہت سے ایسے باصلاحیت نوجوان جو بھرپور تخلیقی قوت کے ساتھ ابھرے، نقطہ شادی کے ادارے کی وجہ سے وقت سے بہت پہلے ختم ہو گئے۔ ازدواجی بندھن انسان کو جسمانی اور ذہنی طور پر (مرد و زن دونوں پر منطبق) مقید کر دیتا ہے۔ اس سے ذہنی پرواز کوتاہ ہو جاتی ہے اور بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی بقیہ صلاحیت بھی موقوف ہو جاتی ہے۔“

عبداللہ حسین صاحب نے یہ بات کہی تو ٹالسٹائی سے لے کر جس نے ناکام ازدواجی زندگی گزاری کہ اس کی بیوی بھری محفل میں گرم شور ہے کی قاب اس پر اٹھیل دیتی تھی، ریمینڈ کا روور تک یاد آتے ہیں جس نے پہلی شادی میں ناکامی کے بعد اپنے آپ کو شراب میں دھت رکھا (شادی کی ناکامی کی وجہ شراب میں دھت رہنا بھی ہو سکتا ہے، فریقین کے بیانات متضاد وجوہ کی جانب اشارہ کرتے ہیں)۔ اسی طرح بہت سی خواتین ادیب اور شاعر شوہروں کی طرف سے مسائل کا شکار رہیں۔

خان صاحب اس بارے میں کہتے۔ ”میری جتنی بھی شادی شدہ خواتین سے بے تکلفانہ گفت گورہی، نوئے فی صد سے زیادہ کو میں نے ازدواجی زندگی میں ناخوش پایا۔“

ذہن کا کیا کچھجے کہ اس جانب بھی چلا جاتا ہے جدھر کامیاب تخلیق کاروں نے پر مسرت اور بھرپور ازدواجی زندگیاں بسر کیں۔  
بہر طور اس تعلق کے زاویے لامحدود ہیں اور کامیابی اور ناکامی کی وجوہ متنوع اور بعض صورتوں میں ہمزہ نامعلوم ہیں۔ ٹھٹھے بیان کرتا ہے ”ناکام شادیوں کی بنیاد میں عدم محبت نہیں بلکہ دوستی کا فقدان ہوتا ہے۔“ دونوں فریقین کی توقعات کے حوالے سے آئٹن شائن کہتا ہے ”مرد عورت سے شادی کرتے ہوئے توقع رکھتا ہے کہ وہ شادی کے بعد ویسی ہی رہے گی، عورت مرد سے توقع رکھتی ہے کہ شاید وہ شادی کے بعد بدل جائے۔“ عموماً دونوں کو مایوسی ملتی ہے۔ ”معروف فلسفی سترائے نے تو ایک قدم بڑھ کر اور مشورہ دیا تھا ”میرا مشورہ ہے کہ تم شادی کرو۔ اگر تمہیں اچھی بیوی مل گئی تو تم خوش گوار زندگی گزارو گے بہ صورت دیگر فلسفی تو بن ہی جاؤ گے۔“

خان صاحب اپنے خیالات میں آفاقیت اور مقام و زمانے کی حدود سے ماورا ہیں۔

جیری آرچر بیسویں صدی کے مقبول ترین ادیبوں میں شامل ہے۔ وہ پاپولر ادب کا سرخیل ہے۔ اس کی کتابیں دسیوں کروڑ کی

تعداد میں فروخت ہو چکی ہیں (وہ برطانوی کی کنٹرولڈ پارتی کا نائب چیئر مین بھی رہا۔) انسانی امیر اور کامیاب سیاست دان ادیب لارڈ جفری آچر ایک بیسوا کے ساتھ مبینہ تعلقات کی وجہ اور نتیجاً بدنامی سے بچنے کے لیے جیل کا غذا کر کے موقع سے عدم موجودگی بہت کرنے کے الزام میں دو برس کے لیے جیل چلا گیا۔

یہ خبر دیکھنے پر سیاست و ادب میں تھلکہ مچا گئی۔

جب متعلقہ طوائف سے پوچھا گیا کہ اُس کے پاس زیادہ تر کیسے لوگ آتے ہیں تو اُس نے بلا جھجک کہا "شادی شدہ۔" اس سے سوال کیا گیا کہ کیا شادی شدہ مردوں سے تعلقات استوار کر کے وہ شادیوں میں رخصت لانے کا سبب بننے پر شرمندہ نہیں ہوتی تو اُس نے سادگی سے جواب دیا "یہ ہم بیسوا کیس ہیں جو شادیاں برقرار رکھتی ہیں ورنہ جانے کتنی شادیاں ٹوٹ جائیں۔" مغربی معاشرت میں دونوں فریقین کے مساویانہ حقوق کی بات ہوتی ہے، ایسی معاشرت میں مرد کو نفی حاصل ہے اور کثرت ازدواج کی قانونی و شرعی اجازت۔ چنانچہ دونوں کا موازنہ ایک مدلل تحقیق کا متقاضی ہے۔ ایک رات فون پر معمول کی بات چیت کرتے ہوئے میں نے ایسا سوال کر ڈالا جو میں کسی عام ذہنی سطح کے شخص سے نہ کر سکتا تھا۔ میں نے عرض کیا۔

"خان صاحب ہمارا معاشرہ پدرسری Patriarchal ہے۔ مرد کا کثرت زنت کا تصور تو سمجھ میں آتا ہے مگر کیا مرد، عورت کو جسمانی اور ذہنی طور پر آزاد کرنے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ آپ اس معاملے میں خود کو کہاں پر کھڑا پاتے ہیں؟" دوسری جانب خاصی دیر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد وہ کھنکھار کر بولے "ہماری طرح کے پابند اور متعید معاشروں میں فی الوقت ایسا ممکن نہیں۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے۔ میں علمی اور فکری طور پر اس سوچ کا قائل ہوں۔ عملی طور پر اپنے آپ کو ابھی پوری طرح آزاد نہیں سمجھتا۔"

وہ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ ادب تخلیق کرنے کے لیے کلیشے چھوڑنا پڑتے ہیں۔ پرانی سوچ کے بلے سے جہاں تازہ جنم لیتا ہے، اُس کی تعمیر ہوتی ہے۔

مکالمے بند معاشروں میں نہیں ہوتے۔ حقیقی زندگی میں اُردو کے دیوقامت ادیب کو میں نے اکثر و بیش تر تنہا کسی گوشے میں بیٹھے دیکھا۔ جہاں یاراں کا رخ برائی کے کھوکھوں یا پردہ بیسیں کے چہروں کی جانب ہوتا تھا۔ گواہ کاروں کے گرد پرستاروں کا غول صحت مند اور ثقافتی طور پر متحرک معاشروں کی علامت ہوتا ہے۔ تھلہ ہی طور پر فعال معاشروں میں تو ادیب بھی مٹ رہوتا ہے، شاید سب سے بڑا اشارہ۔

ایک ادیب اور شاعر معاشرے کو کچھ دیتا ہے۔ وہ زندہ، سوچنے اور محسوس کرنے والے معاشرے کی علامت ہوتا ہے۔ وہ ممالک جہاں اُسے مناسب معاوضہ نہیں دیا جاتا، کم از کم عزت ہی دی جائے۔ وہ لوگ قابلِ رحم ہیں جو ادیبوں کے کردار اور تخلیقات کا ذاتی سطح پر اثر کر اوتھے انداز میں احتساب کرتے ہیں۔ حساب تو اُس شے کا لیا جاتا ہے جو دی جائے۔ سیاست دان، سرکاری ملازم یا حکومتی اہل کار کا احتساب درست سمجھا جاتا ہے، چارے ادیب کو عزت ہی دے دی جائے۔ وہ سچی تو بلا قیمت اپنے خونِ جگر سے سوسائٹی کو زندگی بخشتا ہے۔

عبداللہ حسین سرکاری اعزازات کے خواہش مند نہ تھے۔ وہ کہتے تھے "مالی لاکھڑے کے بغیر اعزاز بے معنی ہے۔ اگر عسکری، سرکاری اور دیگر اداروں کے ملازمین کو مرے بچے پلاٹ اور دیگر مراعات دی جاتی ہیں تو کم، زکم نمایاں ادیبوں کو قابلِ ذکر رقم دی جانی چاہیے۔ میرے مرنے کے بعد اگر کسی چوک کا نام میرے نام سے منسوب کر دیا جائے تو مجھے کیا حاصل۔ میرے لیے اہم تو وہی شے ہے جو زندگی میں میرے لیے نواہت ہو۔"

تحریر کے حوالے سے صلاح مشورہ کرتے۔ اپنی انگریزی کتاب An Afghan Girl کا مسودہ رائے کے لیے معروف اور جوان انگریزی ادیبوں محمد حنیف اور ایچ ایم نقوی کو بھیج دیا۔ نقوی نے اپنے اگلے انگریزی ناول کا مسودہ انھیں پڑھنے کے لیے پیش کیا تو انھوں نے نہ صرف اسے بغور پڑھا بلکہ خاصی تعریف کی۔

ایک روز میں، مستنصر حسین تارڑ صاحب اور خان صاحب اکٹھے گاڑی میں جا رہے تھے۔ کسی بات پر ہنستے ہنستے عبداللہ حسین صاحب یکا یک چپ ہو گئے۔ چلتی گاڑی میں بھوں سکوت طاری رہا، پھر خان صاحب ہولے سے ہولے ”بھیا میں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہو۔“

تارڑ صاحب کسی کو خاطر میں کم ہی لاتے ہیں، عمر کے ساتھ در آنے والی عبداللہ حسین کی بے وجہ کی ناراضی کی گفت گو ہنستے ہوئے سن لیتے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ گزرتی عمر کے ساتھ انسان کے مزاج میں درستی اور تلخی آ ہی جاتی ہے۔

عموماً خان صاحب روزمرہ بول چال میں پنجابی، رکی گفت گو میں اردو اور برہمی میں انگریزی بولتے تھے۔ انھیں اکھنڈ بھارت میں ختم ہوتی اردو کا بہت دکھ تھا۔ چند کو تاہ نظر نہیں جانتے کہ اگر پاک وطن وجود میں نہ آتا تو بھٹے مسلمان اکھنڈ بھارت میں کتنی ہی بڑی اقلیت کیوں نہ ہوتے، ان کی زبان و ثقافت ویسے ہی معدوم ہوتی چلی جاتی جیسی کہ دنیا بھر میں اقلیتوں کی روایت رہی ہے۔

بڑھتی عمر نے ان کے حافظے پر خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے۔ ایسا کئی مرتبہ ہوا کہ کسی موقع پر گزشتہ ملاقاتوں سے متعلقہ جزئیات کا تذکرہ کر کے ان میں سے کوئی ایک موضوع چن کر اس پر اظہار خیال شروع کر دیتے۔

ایک شام ہم اکٹھے کراچی میں کھانے پر جا رہے تھے۔ میں گاڑی چلا رہا تھا، عبداللہ حسین اگلی نشست پر بیٹھے تھے، مستنصر حسین تارڑ، ان کی اہلیہ سمونہ اور میری بیوی پچھلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ہم شارع فیصل پر رواں دواں تھے جہاں زندگی پوری طرح تاب ناک تھی۔ گاڑی کے اندر قہقہے چھوٹ رہے تھے اور کراچی، لاہور کے موازنے، زندگی کے تجربات اور مختلف شخصیات کے بارے میں آراء کے حوالے سے گفت گو کی جا رہی تھی۔

عبداللہ حسین خاصی دیر سے خاموش تھے۔ میں نے ان سے پنجابی میں پوچھا۔ ”خان صاحب! خیریت ہے، آپ سچ لکھ رہی ہوئیں سے اب تک خاموش ہیں، ہمیں جس دوست کے ہاں جانا ہے وہاں بڑے زندہ دل لوگ ہوں گے، عمدہ لہذا کھانا ہوگا اور اعلیٰ موسیقی کا انتظام ہے۔ پھر یہ اُداسی کیسی؟“

انھوں نے نیم دلی سے قہقہہ لگایا اور بولے۔ ”کل صبح لٹریچر فیسیول میں اپنے سیشن کے دوران مجھے احمد شاہ ایسے بے باک اور جسے باز آدی کا سنا کرنا ہے۔ سوچ رہا ہوں اسے کس طرح سنبھالنا ہے۔“ اس کے بعد معصومیت سے بولے۔ ”اک تے، آصف (آصف فرخی) نے مینوں، وہ دے سامنے پاؤنا اے کہ آجا بھئی، جو کرنا اے کر لے۔ میں سوچیا اے کہ اوہدی ہر گل تے کہواں گا کہ ٹہی ٹھیک کر رہے او۔ بس اوہ آپے دی ٹھیک ہو جاوے گا۔“

(ایک تو آصف (آصف فرخی) نے مجھے اُس کے سامنے ڈال دیا ہے کہ آجا بھئی، جو کرنا ہے کر لے۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ اُس کی ہر بات پر کہوں گا کہ آپ درست کہہ رہے ہیں۔ بس وہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا)

اس پر میں نے عرض کیا۔ ”خان صاحب فکر نہ کریں۔ شاہ صاحب دل کے صاف آدمی ہیں اور آپ سے تو باقاعدہ محبت کرتے ہیں۔ بس وہ تو سیشن کو دل چسپ بنانے کے لیے شرارتیں کر لیتے ہیں۔“

پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کون سے پہلے حسین ہیں، اس سے پہلے بھی تو ایک حسین (اشارہ مستنصر حسین تارڑ کے اسلام آباد کے گزشتہ ادبی میلے میں احمد شاہ کے ساتھ گرم گرم دوڑوں کے سیشن کی جانب تھا) اُن کا سنا کر چپکے ہیں۔“



اس پر عبداللہ حسین نے سینے سے اُبلتا ہوا ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور گفتہ لہجے میں بولے۔  
 ”کتنا ہی اچھا ہوا مگر انتظار حسین کی بھی باری آئی جائے۔ ایک مرتبہ تو احمد شاہ انھیں بھی ہمارے گھر بھیج دے۔“  
 وقفے کے بعد بولے۔ ”مگر آصف فرنی ایسا کبھی نہیں کرے گا۔“  
 اس دوران کار بازو کی ایک سرک پر سڑکی اور موضوع بدل گیا۔

وہ قہقہہ اُن قہقہوں میں سے ایک تھا جو عبداللہ حسین اپنے قریبی رفقاء میں سرسری انداز میں کئی کئی کسی گفتہ بات پر لگاتے تھے۔  
 وہ صاحب فراش تھے، میں ان کی عیادت کو گیا تو شکوہ کرتے ہوئے کہنے لگے ”نہ جانے مجھ سے کون کون سی بڑی سی بیماریاں چپک  
 گئی ہیں۔ اور میری عمر ہی کیا ہے، فقط 83 برس۔ ادھر 90، 90 برس کے بابے بھائے پھرتے ہیں۔“ غالباً اُن کا اشارہ انتظار صاحب کی جانب  
 تھا جو نوے برس کے قریب کی عمر میں بھی پوری طرح فعال تھے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ادبی میلوں کے حوالے سے آزرہ ہو کر کہنے لگے ”اُردو ہماری زبان ہے۔ ہمارا بہترین ادب اُردو ہی میں  
 تخلیق ہوا ہے۔ ان ادبی میلوں کا ایک بڑا اہم انتظامیہ میں انگریزی زبان کے ادب کی غیر معمولی پذیرائی ہے۔ ہمارا انگریزی ادب ابھی  
 ابتدائی مراحل میں ہے اور ہماری جغرافیائی سیاسی اہمیت کی وجہ سے ان دنوں مرکز توجہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُردو کے نام ور اور اہم  
 ادیبوں کو ذیلی حیثیت دے کر انگریزی کے لوگوں کو بنیادی اہمیت دی جائے۔ نئے لکھنے والوں کو فنکشن کے مرکزی مقام پر بٹھایا جائے اور اُردو  
 کے اہم ادیبوں کو چھوٹے چھوٹے کرداروں میں دھکیل دیا جائے۔ یہ انتہائی قوی احساس کمتری کی علامت ہے۔“

اُن کی شخصیت میں دو متضاد جذبات واضح طور پر پوری قوت سے موجود ہوتے۔ مجھے اس کا دل چسپ مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔  
 کراچی لٹری فیٹیوول میں انتظار صاحب نے مرکزی لان میں منعقد ہونے والی افتتاحی تقریب کی صدارت کی۔ اُس چمکیلی صبح کولونیل انداز  
 کے سچ لکڑی ہوٹل کا سرسبز لان اور ٹینکین، بحری ہوا میں پھڑپھڑاتی قاتوں کے پس منظر میں ٹیل گوں سمندریوں جاذبِ نظر ہو رہا تھا جس طرح  
 اُس میں نیلا ہٹ اُٹھیل دی گئی ہو۔ اُس پر چند سمندری پرندے نیچی پرواز کرتے تھے اور قریب میں ایک گھٹا سمندری جھاڑیوں کا جزیرہ نما  
 اُسے دل کشی عطا کرتا تھا۔ ایسے میں سٹیج پر انتظار صاحب خطاب کر رہے تھے۔ سامنے برطانیہ، فرانس، جرمنی اور دیگر ممالک کے عہدائین صبح کی  
 چمکیلی دھوپ کی تمازت میں اپنے سرخ ہوتے گورے چہروں پر آئی نمی کی بوندیں پونچھتے اور اخباری پنکھے جھلکتے تھے۔ انتظار صاحب کے قدموں  
 کے سامنے قد آور، بورا و قار عبداللہ حسین بیٹھے تھے۔ اُن کی خواہش پوری ہو رہی تھی کہ اُردو کے ادیب کو مرکزی حیثیت دی جائے۔ مگر عبداللہ  
 حسین کے چہرے پر مسرت مترشح نہ تھی۔ البتہ منتظم و مہتمم آصف فرنی نے تعارفی کلمات میں دانائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامنے بیٹھے عبداللہ  
 حسین کی ایک تحریر کا حوالہ دیا تو عبداللہ حسین نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”آصف نے میرا بیڑا غرق کر دیا۔ اس نے سب لوگوں کے سامنے میری تعریف کر دی۔ اب سب ادیب میرے دشمن ہو جائیں

گئے۔“

گویا اپنا مرکب نگاہ ہونا ان کے مزاج بے اعتنا پر بھاری پڑ رہا تھا۔

برطانوی محاورے کے مطابق وہ تیز ناک کے مالک تھے اور اُن کا تجربہ اور چھٹی جس عموماً درست ثابت ہوتے تھے۔ جلد رہائے  
 قائم نہ کرتے اور جب قائم کر لیتے تو عموماً وقت اسے درست ثابت کر دیتا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کو ”بیابندہ“ (شریف آدمی) اور ٹھیکل عادل  
 زادہ صاحب (گوان سے کم ملاقات رہی) کو ”چنگا بندہ“ کہتے تھے۔ تارڑ صاحب کو بے حد عزیز جانتے تھے مگر ردِ اعتراضات کرتے تھے۔ پہلا  
 اعتراض اُن کے حج کے سفر نامے اور دیگر اُن تصانیف پر کرتے تھے جن میں مذہبی رنگ غالب آگیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ دائیں بازو کے  
 رجحان والے لوگوں نے اعلیٰ ادب کم تخلیق کیا، یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب کے اہم ناموں میں واضح مذہبی رجحان والے لوگ خال خال نظر آتے

ہیں۔ دوسرا اعتراض تارڑ صاحب کی زود نویسی پر ہوتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ تارڑ صاحب کی نثر کہیں کہیں ہنوی سے اتر جاتی ہے اور اس میں غیر ضروری الجھاؤ اور تفصیلات ڈرتی ہیں۔ ان دو معمولی اعتراضات سے ہٹ کر وہ تارڑ صاحب کو اپنا دوست، اہم ادیب اور خیر خواہ سمجھتے اور ان کی قدر کرتے تھے۔

تارڑ صاحب ادب، صحافت اور الیکٹرانک میڈیا کی معروف ہر ذیل عزیز شخصیت ہیں۔ اس کے برعکس طویل غیر ملکی قیام اور کچھ افتاد طبع کی وجہ سے لوگ عبداللہ حسین کے چہرے سے خاص واقف نہیں تھے۔ چنانچہ ایک ادبی میلے میں تارڑ صاحب کے پرستار اُن سے ملنے کے لیے سندھ کے دور دراز حصوں اور کراچی کے مختلف گوشوں سے آئے۔ اُن میں سے چند لوگ تحائف بھی لائے۔ ان کے چاہنے والے اس کے علاوہ ان کے لیے عمدہ دعوت اور کشتی پر سمندر کی سیر وغیرہ کا بھی خوب اہتمام کرتے۔

سارا دل تارڑ صاحب اور عبداللہ حسین صاحب کی سر پرستانہ رفاقت میں گزرا کر شام کو میں تازہ دم ہو کر ان کے ہاں دوبارہ پہنچا تو عبداللہ حسین، تارڑ صاحب کے کمرے میں گپ شپ میں معروف تھے۔ باتیں کرتے کرتے تارڑ صاحب نے ان تحائف کو بہت محبت سے سنبھالنا شروع کر دیا۔ سندھی اجرک، سوٹ کا عمدہ کپڑا، سجاوٹ کا سامان اور خوردنی سوغاتیں۔

سب غرضیکہ تارڑ صاحب تحائف کو سنبھال رہے تھے اور عبداللہ حسین صاحب کن آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اپنی پوری زندگی ادب کو دینے والے عبداللہ حسین کے چہرے پر حسرت تھی، بے اعتنائی، کوئی اور جذبہ میں سے درست طرح سے سمجھ تو نہ پایا لیکن اُن کے چہرے پر ایک رنگ واضح طور پر آ کر گزر گیا۔ (وہ اس وقت اپنے گھر پر تھے)۔

ایک محفل میں لوگ چند ایسے اہم ادیبوں، ڈراما نگاروں اور شاعروں کے گرد جمع ہو گئے تھے جو فی دی کے معروف چہرے بھی تھے۔ عبداللہ حسین ایک جانب تنہا بیٹھے یہ سب دل چسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میں چائے کا کپ تھاے ان کے پاس جا بیٹھا اور گپ شپ کرنے لگا۔ جب میں نے بعد کی ایک ملاقات جو اُن کی لاہور کے گھر ہوئی تھی، اُن کا نام اور کام معروف اور چہرے کے نسبتاً کم معروف ہونے کا تذکرہ کیا تو وہ قہقہہ لگا کر بولے ”میں بہت معروف ہوں۔ محلے بھر کے نوکروں میں مشہور ہوں، صبح سیر کے لیے لگتا ہوں تو ان سے خوب گپ بازی رہتی ہے۔ اپنے مالکوں کے گھریلو معاملات جی کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ مجھے ان سے کئی کہانیاں مل جاتی ہیں۔“

بعد میں سمجیدہ ہو کر بولے ”اس طرح میں اپنی آزادی کا لطف لیتا ہوں۔“

اسی طرح کراچی پریس کلب میں ایک تقریب کے دوران جب ”آج“ رسالے کے مدیر اجل کمال صاحب سے اُن کا تعارف کروایا گیا تو وہ بے اختیار اسٹج سے بول اٹھے ”اچھا آپ ہیں آج“ کے مدیر اجل کمال، جنہوں نے میرا افسانہ تراسیم اور نظر ثانی کے لیے واپس کر دیا تھا۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی، ہا ہا ہا۔“

عرصہ بعد مجھ سے کہا کہ اہم ادیبوں کی تحریروں کا نظر ثانی کے لیے واپس ہونا معمول کی بات ہے۔

سرولیم گولڈنگ اپنے لافانی ناول ”لارڈ آف فلائیز“ کی وجہ سے زیادہ معروف ہیں۔ انھیں اپنی وفات سے دس برس قبل 1983 میں نوبل انعام دیا گیا۔ ”لارڈ آف فلائیز“ کو اپنی پہلی اشاعت سے قبل میں مختلف پبلشرز نے رد کیا۔ اس کتاب کا ایک دل چسپ پہلا اس میں عورتوں کا عدم وجود ہے۔ سرولیم اپنے ناقدین سے اس حد تک برگشتہ تھے کہ اپنے کسی بھی نئے ناول کی اشاعت کے موقع پر ملک چھوڑ جاتے تھے۔ نوبل انعام ملنے کے نتیجے میں انھیں مزید عالمی شہرت ملی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی ایک تخلیق پبلشر کو بھجوائی تو اس نے اسے نظر ثانی کے لیے لوٹا دیا۔

”اُداس ٹیلیس“ کہنے کے بعد انھوں نے قریباً ڈیڑھ دہائی انتظار کیا۔ جب ایک خیاں نے انھیں تخلیقی طور پر متاثر کیا تو اگلے ناول ”باہم“ لکھا۔ باہم چیتے کے لیے ایسا لفظ ہے جو برصغیر میں، جہاں ہر چند میل بعد لہجہ اور زبان بدل جاتے ہیں، ہندو کش سے بحیرہ عرب تک

مستمل ہے۔ خان صاحب درحقیقت 'باگھ' کو اپنا سب سے اہم کام قرار دیتے ہوئے یقین سے کہتے تھے "ایک اہم ادبی کہادت ہے، ناول نگار کے صحیح مقام کا تعین اس کا دوسرا ناول کرتا ہے۔ دوسرا کام باب ناول دوسری شادی کی طرح زیادہ سوچا سمجھا گیا ہوتا ہے، اسی لیے دوسری شادی کی طرح دیر پا بھی۔"

گویا پہلا اچھا ناول لکھ لینا اتفاقاً یا حادثاتی فعل ہو سکتا ہے۔ فن کارانہ چابک دستی دوسرے ناول میں سامنے آتی ہے۔ ناول میں باگھ ایک کردار ہے جو آزاد جموں و کشمیر کے پہاڑوں میں دھاڑتا ہے تو اس کی گونج دل دہلا دیتی ہے۔ وہ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ایک معما ہے، اسرار کی دھند میں دور سے لشکارے کا گمان کرانا نامعلوم کا استعارہ۔ جس طرح عبداللہ حسین نے اپنے آپ کو عوامی شہرت سے دور، ذاتی زندگی کے محفوظ حصار میں گوشہ نشین رکھا۔ پس اپنے قلم کی خیرہ کن جولانوں کے ساتھ میدانِ ادب میں پڑ و تار چال چلتے ہوئے داخل ہوئے اور تمکنت سے شہ نشین ہوئے وہ ان کے تحت اشعر سے بہ صورت باگھ تخلیقی سانچے میں دھل کر نمایاں ہوا، ایک پڑ شکوہ اور بارع کردار، ادب میں "باگھ" کا زندہ استعارہ۔ ایک ایسے زندگی سے بھرپور ادیب جو مستقبل کی جانب نظر رکھتے تھے۔ اس معاشرے میں جوں بہت سے لوگ ساٹھ برس کی عمر کے بعد اپنے ایامِ گزشتہ کو دیکھ زدہ لہجے میں حسرت سے یاد کرنے لگتے ہیں عبداللہ حسین دوسری طرح کے آدمی تھے۔ ایک مخلص راتِ آبِ نائے عرب میں سمندری جھاڑیوں کے قریب سے ہو کر گہرے پانیوں میں جاتی کشتی میں بیٹھے ہوئے کہنے لگے "میں ایک تحریک لکھ کر ایسے سسٹم سے باہر نکال دیتا ہوں اور آگے چل دیتا ہوں" اس کے بعد اپنی مخصوص ہنسی بنے اور بولے "میرا ایک انگریزی ناول مکمل ہوا ہے، میں چند اور موضوعات پر لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں، ابھی کافی کچھ کرنا ہے۔" بات مکمل کر کے وہ دُور دیکھنے لگے۔ شاید کوئی اور فن پارہ انھیں دُور دھند لکوں سے نمایاں ہوتا نظر آ رہا تھا۔ کشتی نے رخ موڑ کر زور پکڑا اور تیزی سے گہرے پانیوں کی جانب روانہ ہوئی تو چاند کی رو پہلی کرنِ سطحِ آب سے منعکس ہوئی اور رات کے اندھیرے میں روشنی جھلکانے لگی۔

وہ روشنی حیاتِ آمیز نہ تھی۔ فلک پر تلوار قضا لہرائی تھی۔ سو عبداللہ حسین صاحب نے چند ماہ بعد عالمِ افلاک کا قصد کیا اور جہانِ خاکی سے جہانِ بالا کو اشغال کیا۔

انھوں نے اپنی وفات سے چند روز پہلے تاسف بھرے لہجے میں ایک اعتراف کیا۔ "مجھے ایک افسوس ہے۔ میں نے اپنی مرضی کے مطابق ایک بھرپور زندگی گزاری ہے، اپنے حصے کی شہرت کمائی ہے، کام پایا حاصل کی ہیں تو نا کامیوں بھی پائی ہیں، پر ایک غلطی ایسی ہے جسے میں اب درست نہیں کر سکتا، اسی کا افسوس ہے۔"

اُردو کے ہم گیر وقد آور ادیب نے توقف کیا اور بولے "میں اپنے اہلِ خانہ کو پوری توجہ نہیں دے پایا۔"

سگھن سالِ فنِ کار کی سُر مئی افسردگی کے پیچھے ایک کہانی تھی اور ایک عالم گیر حقیقت بھی!

جب وہ بیمار ہوئے تھے تو ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ مزید ٹیسٹ ہوئے تو خوف ناک تشخیص سامنے آئی، انھیں کینسر تھا۔ ماہور میں وہ گھٹنوں ڈاکٹر کے کلینک، اسپتال اور لیبارٹری کے باہر بیٹھے رہتے۔ کئی مرتبہ مجھ سے جھلائے لہجے میں کہا۔ "اس عمر میں اتنا انتظار نہیں ہوتا۔" انھی دنوں مستنصر حسین تارڑ بیمار ہو کر آپریشن کے لیے اسپتال گئے تو عبداللہ حسین کی پریشانی دیدنی تھی۔ بار بار بے چین ہو کر ان کی خیریت دریافت کرتے۔ اپنی فیس بک پر بھی سب کو ان کی صحت کے لیے دعا کرنے کی درخواست کی۔ اُن کا دلہانہ جذبہ غیر معمولی تھا۔ ادھر مستنصر حسین تارڑ کے بچے بیردن ملک سے باپ کی عیادت اور خدمت کو بھاگے چلے آئے۔ ڈاکٹر بیٹی، آپریشن کے دوران تھیمز میں باپ کے ساتھ رہی۔ بڑا بیٹا اقوام متحدہ کی اہم ذمہ داریاں چھوڑ کر پاکیتی سے لگ کر بیٹھ گیا اور چھوٹا بیٹا دن رات خدمت کرنے لگا۔ اُن کی بیگم بھی پورے دل و جان سے اُن کی صحت کے لیے دعا گو رہیں۔

ادھر کینسر کی تشخیص کے بعد عبداللہ حسین صاحب کی بیگم اور بیٹا، گو اُن کے لیے جذبہ ہم دردی میں پیش پیش تو رہے مگر جہاد داری

میں بڑھتے پائے۔ کینسر تیزی سے پھیلنا جا رہا تھا۔ تخلیق کار تنہائی کا شکار ہو گئے۔ پس اُن کی بیٹی، جو اُن کا عشق بھی تھی، بیٹوں سے بڑھ کر بہت ہوئی۔ چند جگہیں تو پڑ ہوئیں مگر بہت سی خالی رہ گئیں۔ انھوں نے لاشعوری طور پر اپنا موازنہ کیا اور خاندان کے ترازو میں تارڑ صاحب کا پلڑا بھاری پایا۔ تبھی وہ تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

”مجھے ایک افسوس ہے۔ میں نے اپنی مرضی کے مطابق بھرپور زندگی گزاری ہے، اپنے حصے کی شہرت کمائی ہے، کام پایا حاصل کی ہیں تو نا کامیاں بھی پائی ہیں۔ پر ایک غلطی ایسی ہے جسے میں اب درست نہیں کر سکتا۔ میں اپنے اہل خانہ کو پوری توجہ نہیں دے پایا۔“

اپنی تنہائی کا احساس فزوں تر تھا۔ ان کے تحت الشعور میں زندہ رہنے کی خواہش بے پناہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی کے ہر لمحے کا حساب رکھتے تھے۔ گویا 83/84 کی ٹکراو صردی مسئلہ نہیں تھا، ہاتھ سے بہتا پھیلتا عمر کا پار اتھام رکھنے کا معاملہ تھا۔ ایک بار کہنے لگے ”کسی پر لکھی تحریر ایسی ہونی چاہیے جو فوت ہوئے شخص کو زندہ سامنے لے آئے۔ ایسی نہ ہو جو زندہ کو اُسی میں دھندلا دے۔“ وہ بہ ظاہر کہتے تھے کہ انھیں جو کچھ کرنا تھا، کر لیا، اب چلے جانے کا وقت آنے کو ہے۔ درحقیقت ان میں زندگی کی خواہش بھرپور توانائی سے ہمہ وقت موجود تھی۔

اُن کی وفات کے کئی روز بعد میں تارڑ صاحب کے پاس اُن کی اسٹڈی بیٹھا عبداللہ حسین کو یاد کر رہا تھا تو وہ بولے۔ ”عبداللہ کا آخری دنوں مجھ سے والہانہ تعلق میرے لیے بھی حیران کن تھا۔ ہم دوست تو ضرور تھے مگر اپنے خون کے رشتوں سے بڑھ کر میرے لیے اُن کا فکر مند ہونا اچنبھے کی بات تھی۔“

تارڑ صاحب نے گہری سانس لی اور بولے۔

”انھیں شاید مجھ میں اپنی موت نظر آرہی تھی۔ وہ میری بیماری میں اپنا عارضہ دیکھ رہے تھے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ معین اختر کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک انٹرویو میں کہہ دیا کہ آئندہ شاید میں ناول نہ لکھوں۔ مجھ میں ہمت نہیں۔ میرا انٹرویو پڑھ کر معین اختر نے مجھے فون کیا۔ اُس کا اور میرا تعلق رکھی تھا۔ اُس روز وہ بہت اپنائیت سے دیر تک بات کرتا رہا۔ دلاسا دیتا رہا کہ مجھے ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ ابھی تو میری بہت عمر پڑی ہے۔ میں اس طرح اُس کے اچانک فون پر حیران رہ گیا۔ اُس فون کے دس چندرہ روز بعد وہ خود فوت ہو گیا۔“

کمرے کی سوگ و خاموشی کے دوران میں نے پوچھا ”آپ نے اتنے روز اسپتال میں پے درپے آپریشن کروانے میں، بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے بیچ گزارے ہیں۔ آپ کے سے نکتہ رس نے کوئی نئی بات سیکھی؟“

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ ”یہ شہرت، مقبولیت، نام، مقام سب نظر کا دھوکا ہے۔ It is all an illusion جو چیز اہم اور حقیقی ہے، وہ آپ کے خون کے رشتے اور چند ہم درد دوست ہیں۔ باقی سب فریب نظر ہے۔“

چند روز بعد ایک چائینز ہوٹل میں چچی دوپہر سے عافیت میں کھانے کھاتے ہوئے میں نے یہ مکالمہ امجد اسلام امجد اور اصغر ندیم سید جیسے دانش مندوں کے سامنے دہرایا تو وہ بے اختیار یک زبان بول اُٹھے ”کھر سچ ہے۔ بے شک یہی سچ ہے۔“

یقیناً عبداللہ حسین صاحب حقیقت آشنا تھے، سچ جانتے تھے اور سچ کے علم بردار تھے۔ اسی لیے شہرت اور مقبولیت کے فریب میں نہ آئے۔ زندگی بھر اس سے بے اعتنائی برتتے رہے۔ کھری بے لوث اور تخلیقی طور پر بھرپور زندگی گزاری۔

اس وقت رات کے پچھلے پہر جب لوگ اپنے گھروں میں گہری نیند کے مزے لے رہے ہیں اور سڑک پر کتوں کے بھونکنے اور چوکی دار کی سیٹی کی آوازیں خاموشی کے چہرے پر خراشیں ڈالتی ہیں، میں ٹیبل لیپ جلانے لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ الفاظ نظروں کے سامنے نمی کے باعث دھندلا جاتے ہیں۔ میرے کانوں میں جیتے جاگتے مخصوص ہلسی ہنستے، عام باتوں کے بیچ بین الاقوامی ٹیپے اور ادب سے چنیدہ جملے ناگتے، سر پرستانہ انداز میں ڈانٹتے، اس منافقانہ معاشرت میں ٹھک سے کھری بات داغنے، محبت بھرے عبداللہ حسین آ جاتے ہیں۔ عام بول چال میں پنجابی، غصے میں انگریزی اور رسمی گفت گو میں اردو بولتے آدمی۔ عمر کے ماہ و سال گزرنے کے ساتھ غالب دل کے اور قریب ہوتا



جاتا ہے اور اس کے اشعار کی تفہیم بروقتی جاتی ہے۔ اُس نے فلک سے شکوہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا۔ کیا تیرا گلزار، جو نہ مرنا کوئی دن اور۔  
مذہب کی جانب اُن کا رجحان قابلِ رشک نہ تھا اور خواب و اسرار کو وہ انسانی تحت اشعار کی خامہ فرسائی اور وہم سمجھتے تھے۔ انات  
سے چند روز پہلے انھوں نے اپنا ایک خواب سنایا، وہ متذبذب، حیران اور بھیگے لہجے میں بولے:

”کل رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب میں میں نے سمندری چٹان پر تین سی گل (سمندری پلگے) دیکھے۔ اُن پاکیزہ  
پرندوں کے سفید بدن اور پروں سے نور پھوٹ رہا تھا۔ اُن میں ایک جانب کے پرندے نے درمیان کے پرندے کی جانب اشارہ کرتے  
ہوئے کہا ”یہ تمھاری ماں ہے“ میں نے درمیانی پرندے کو بغور دیکھا۔ اُس نے مجھے پیار سے اپنے پروں میں لے لیا جہاں مجھے بے پناہ شفقت  
اور محبت محسوس ہوئی۔“

اگلے روز میں نے یہ خواب آصف فرخی کو سنایا اور ہم دونوں اداس اور افسردہ ہو گئے۔ ہوتے بھی کیوں نہ۔ عبد اللہ حسین صرف چھ  
ماہ کے تھے جب اُن کی ماں فوت ہو گئی تھیں۔ ہر کی کی کا احساس اور مامتا کے لیے تڑپ نئے محمد خان (عبد اللہ حسین) کی عمر بھر کی ساتھی رہی۔  
انھوں نے یہ کی اپنے باپ میں پوری کی۔ دونوں گجرات کے قریب کھیتوں، جنگلوں، دریا کنارے، پہلے میں نکل جاتے، لمبی سیریں کرتے،  
پرندے سکتے اور شکار کرتے۔ جب عبد اللہ حسین کی عمر بائیس چوبیس برس کی تھی تو والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ حساس، ورثہ عبد اللہ حسین کو باپ کی  
موت گویا کھا ہی گئی۔ پس وہ گوشہ نشین ہو کر نزد یک ڈاکٹر کا شکار ہو گئے۔

وہ نزد یک بریک ڈاکٹر سے تو نکل آئے لیکن گوشہ نشینی اور تنہائی اُن کے عمر بھر کے رفیق رہے۔ اس تنہائی میں اُن کی رغبت ادب کی  
جانب بڑھی، مطالعہ اور اک کا دروازہ بھی تھا، ورنہ کارستہ بھی۔ اپنے مشاہدات کے حوالے سے عبد اللہ حسین نے بیان کیا۔

”میں بچپے مرکز اور ایک صبح کو دیکھتا ہوں جب میں اسکول کا طالب علم تھا۔ میں ساری رات مسلسل فائرنگ کی آوازیں سنتا رہا  
تھا۔ صبح سویرے ہم لڑکوں نے اسکول جانے کے بجائے سانکلوں پر ریوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ بڑوں سے ہندوؤں اور سکھوں کو ہندوستان لے  
جانے والی ٹرین کو ہمارے اسٹیشن پر قبضہ کیوں نہ روک لیا تھا۔ وہ قبائلی کشمیر میں لڑنے کے لیے جاتے ہوئے ہمارے شہر میں ٹھہرے ہوئے  
تھے۔ انھوں نے ٹرین کے مسافروں کو ڈنچ کرنا شروع کر دیا۔ ہمارے شہر کے لوگ بھی جوش و جذبہ سے اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہم نے  
اپنے ڈرائنگ کے استاد کو دیکھا۔ وہ شاعر اور گلوکار تھا اور ہمارا مثالی استاد بھی۔ اُس نے ایک بہتے موئے شخص کو گھم گھما ہوا کر زمین پر گرالیا اور  
بے وردی سے اُس پر ایک بڑی قینچی کے وار کرنے شروع کر دیے۔ اُس نے گرتے گرتے کو سامنے سے چیر کر اُس کی صدری کی جھینیں پھاڑ لیں۔ اُن  
میں کرنسی نوٹ اور سونے کے زیورات تھے۔ ماسٹر سردار نے لوٹ مار کا سامان سمیٹا اور پیچھے مرکز دیکھے بغیر وہاں سے بھاگا۔ پلیٹ فارم لاشوں اور  
زخمیوں سے آنا پڑا تھا۔ میں سولہ برس کا بھی نہ ہوا تھا۔ پس وہ نہ صرف ہمارے خوابوں کا خاتمہ تھا بلکہ دنیا سے بھی ہمارا رومان ختم ہو گیا۔ بعد میں  
ہم میں سے بہت سے گوشہ نشین اور کئی جلاوطن ہو گئے۔ ہم جہاں کہیں بھی گئے، ناخوش رہے۔ ہم ایک مضطرب اور گرم شدہ نسل کے لوگ ہیں۔“  
میں نے اُن سے کئی مرتبہ پوچھا کہ وہ برطانیہ میں اتنی دہائیاں گزار کر واپس کیوں چلے آئے تو مختلف وجوہ بیان کیں۔ یہ ایک شام  
کا واقعہ ہے کہ مجھ سے کہنے لگے ”تم پوچھتے رہتے ہو کہ میں واپس کیوں چل آیا۔“

پھر خاصی دیر بعد بولے ”آخر میں بندے کو واپس آنا ہی ہوتا ہے۔“

عبد اللہ حسین نے اپنی لڑوال کر داری کہانی ”جلاوطن“ میں لکھا تھا ”جلاوطن اپنے قبیلے کی کشش سے کبھی چھکارا نہیں پاسکا،  
چاہے وہ اپنے قبیلے سے مایوس ہی کیوں نہ ہو چکا ہو۔“  
اور اُس ٹھٹھرتی اداس رات میں جب اوس کھڑکیوں کے شیشے کو دھندلاتی تھی، مجھ سے ایک راز بیان کیا۔ کہنے لگے کہ انھوں نے  
اپنی قبر کے کتبے کے لیے شعر وصیت کر رکھا ہے۔ میرے سوال پر شعر پڑھ دیا۔

آئے عشاق مجھے وعدہ فردا لے کر

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ زبّ زبّ لے کر

اس مرتبہ وہ اپنی معمول کی ہنسی نہ بنے۔ گم سم رہے، میں بھی چپ رہا۔ کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آہستہ آہستہ یہ خاموشی دھواں دھواں کرے سے نکلی اور شہر بھر میں پھیل گئی۔

وفات سے ایک ماہ قبل میری اُن سے بات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ وہ افسانے کے امام انتون چیخوف کا افسانہ ”مورت اور اس کے ہم راہ مکتا“ ”The Lady with the Dog“ دوبارہ پڑھ رہے تھے۔

”اس افسانے کی زیریں سطح پر بننے والی اداسی مجھے ہائٹ (Haunt) کرتی ہے“ انھوں نے بتایا تھا۔ یہ وہ شاہ کار افسانہ ہے جس پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اپنے وقت کے چیمپئن روسی ادیب ”لولینا“ ایسا ہنگامہ خیز شاہ کار لکھنے والے ولادیمیر لوبوکوف نے اُسے عالمی ادب کی اعلیٰ ترین کہانیوں میں شمار کیا تھا۔ اسی گفت گو میں انھوں نے پھر ہدایت کی ”دوستووسکی کا ناول ”برادرزکرا ما زوف“ ضرور پڑھو۔ اسے پڑھنے کے بعد تمہیں پھر کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

ایک شام میرے ادیب دوست محمد عاصم بٹ کو فون کیا اور کہنے لگے ”مجھ سے بہت لوگ رابطہ کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے طویل انٹرویو اور ادب پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اپنی زندگی کا آخری انٹرویو تمہیں دوں گا۔“ عاصم نے یہ بات اپنی بیوی کو بتائی تو وہ رونے لگی۔

عبداللہ حسین نے کئی نسلوں اور لاکھوں لوگوں کو متاثر کیا، اُن کو پڑھے بغیر اُردو ادب کا مطالعہ مکمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب وہ فوت ہوئے تو ایکسٹرا ٹک اور سوشل میڈیا تعزیت اور افسوس کے پیغامات سے متحرک ہو گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں برقی پیغامات کا تبادلہ ہوا۔ صدر اور وزیراعظم نے دلی افسوس اور تعزیت کا اظہار کیا۔ سب ہوائی تھا، سو ہوائی رہا۔ افسوس ناک حقیقت تو یہ ہے کہ اُن کے جنازے میں مٹھی بھر لوگ شریک ہوئے اور تدفین میں کتنی کے لوگ۔ یوں تہذیبی اور علمی طور پر بے حس ہوتی ہماری قوم نے عظیم ادیب عبداللہ حسین کے جنازے کے ساتھ بالآخر اپنے انجام کی بھی خبر روے دی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

کامریٹ

احمد بشیر



نیلیم احمد بشیر سے میں نے ایک مرتبہ پوچھا کہ اپنے مرحوم والد سے متعلق اُن کے ذہن میں پہلا تاثر کیا آتا ہے۔ وہ بلا توفیق بولیں ”جلال“۔

”انہیں مرضی کے خلاف بات پر غصہ آ جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے گاڑی خریدی۔ دنیوی معاملات میں وہ بے وقوفی کی حد تک سادہ تھے، ایک شناسانے ٹوٹی پھوٹی کھنار گاڑی لے دی جس میں بے شمار نقائص تھے۔ اب کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُن سے شکایت یا اُسے تبدیل کرنے کی بات کرتا۔ جب برداشت نے جواب دے دیا تو میں نے ایک رقعہ لکھا جس میں محتاط لفظوں میں گاڑی بدلنے کا لکھا اور ان کے سامنے رکھ کر بھاگ گئی۔ وہ رقعہ لے کر خاموش رہے۔ بعد ازاں انہوں نے گاڑی بیچ دی۔“

”ایک مرتبہ حکم دیا کہ گھر میں زرہ پلاؤ بنے گا، سو روزانہ گھر میں وہی پکتا رہا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اُن کا حکم نالے۔ اسی طرح ایک روز گھر آ کر اعلان کیا کہ بادشاہ جہاں گیر قیے میں موتیے کے پھول ڈلوا کر پکواتا تھا۔ گھر میں موتیا قیہ بنے گا۔ ہم نے احتیاطاً ساتھ میں دال بھی بنائی۔ اب جو موتیا قیہ بن کر سامنے آیا اور انہوں نے پہلا قیہ لیا تو منہ بنایا۔ قیے خاصے کڑوے تھے۔ ہم نے تو دال کھانی شروع کر دی۔ وہ کچھ دیر بادلِ نحوستہ موتیا قیہ کھاتے رہے، پھر بولے ”ذرا یہ دال بھی چکھا دینا“ اور بڑی رغبت سے دال کھانے لگے۔ ہم نے کچھ نہیں کہا، دس ہی دن میں ہنٹے رہے۔“

”اماں بتاتی ہیں کہ ایک منڈا (لاکا) انہیں اکثر ملنے آیا کرتا تھا لیکن پھر وہ نہ تو اُن کے جنازے میں آیا اور نہ ہی بعد میں۔ ارے، تو وہ ٹم تھے۔ کہاں کھو گئے تھے؟“

نیلیم احمد بشیر نے یہ پوچھا تو مجھے احمد بشیر سے اپنی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ تب تو وہ رقیق قلب کی حد تک نرم خواورِ شگفتہ مزاج تھے۔ غصہ تو انہیں جیسے چھو اتک نہ ہو۔ جب بھی ملے، اُن کے پاس داستانیں ہوتیں اور چونکا دینے والے تاریخی انکشافات۔ ممتاز منشی، کرشن چندر، میراجی، قدرت اللہ شہاب، ابن انشا، حفیظ جالندھری، صفدر میر، مولانا حسرت موہانی، چند خواتین اور ان سب سے بڑھ کر چراغِ حسرت کے تذکرے۔

سردیوں کی اُس ٹھنڈی شام لاہور میں بارش کی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ کر کر مٹی پر پانی کے گنبد نما جلیبے بنا رہی تھیں۔ لبرٹی مارکیٹ گل بزرگ لاہور میں موسلا دھار بارش کے دوران دکانوں، گاڑیوں اور سڑکوں کی رنگارنگ روشنیاں جھلملارہی تھیں۔ قریب ریستورانوں، دکانوں اور ہوٹلوں میں لوگوں کی چہل پہل تھی۔ سردیوں کی راتوں میں ویسے بھی ریستورانوں میں رش بڑھ جاتا ہے۔ کسی ریستوران کا دروازہ کھلتا تو سرد کشی ہوا اندر کو بکتی اور لوگوں کے قہقہوں کی گونج اور عمدہ گرم کھانوں کی اشتہا آمیز مہک باہر کو اُبلتی۔ زندگی اپنی جولانیوں کے ساتھ چلتی تھی۔ لاہور کے سب سے فیشن ایبل، مہنگے اور پُر رونق مرکز کی بغل میں اُسی شام ایک سرسبز سڑک پر واقع کوٹھی کے ایک کشادہ کمرے میں، بشیر احمد بشیر صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ کمرے میں نرم حدت تھی، حزن تھا اور ایک لفظ تھا جو گونجتا تھا ”میلہ۔“

ابھی میں نے اُن کا سوانحی ناول ”دل بھٹکے گا“ تازہ تازہ پڑھا تھا اور اُس کے سحر میں گرفتار تھا۔ ناول بھی کیا تھا، خود نوشت ہی تھی۔ ایک مونہا تھا۔ منظر نگاری، واقعات، شخصیات اور امتزاقات کے رنگوں سے مصور کی گئی ایک تصویر، ہمہ گیر وہمہ جہت داستان۔ اُس لذت آمیز اور آگے آموز سرگزشت پڑھنے کے کچھ ہی عرصے بعد ایک مشترکہ شناساکے باعث ملاقات کی صورت بن گئی۔

اُس ابراہیم لود شام کو جب میں احمد بشیر صاحب سے ملنے کے لیے اُن کے داماد کی کوٹھی پر پہنچا جہاں وہ قیام پذیر تھے اور اندر پیغام بھجوایا تو وہ میرے ہی منتظر تھے۔

اُن کے کمرے میں چاروں طرف کیونٹ رہ نماؤں اور فلسفیوں کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں۔ کارل مارکس، لینن، اسٹالن، ماؤ اور دیگر کیونٹ کا ہر چاروں جانب سے جھانک رہے تھے۔



دانش ور، ادیب، صحافی، ہدایت کار، سوشلسٹ، ورتحرک سماجی کارکن، معروف انسانہ نگار، نیم احمد بشیر اور ملی وٹن اسکرین کے نام ور چہرے بشری انصاری اور دیگر باصلاحیت بلیوں اور ایک بیٹے کے والد احمد بشیر 24 مارچ 1923 کو ایمن آباد میں پیدا ہوئے مری نگر سے گریجویشن کی اور ایک دل چسپ واقفے کے نتیجے میں صحافت میں آئے۔ اردو اور انگریزی صحافت سے وابستہ رہے۔ اپنے بے باک اور استدلالی انداز کی وجہ سے شہرت پائی۔ اسی دوران قریباً تمام مایہ ناز ادیبوں سے ذاتی تعلق رہا جنہیں خاکوں کی صورت میں قلم بند کیا۔ بعد ازاں یہ خاکے ”جو ملے تھے راستے میں“ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ انگریزی تحقیقی مضامین ”Dancing with wolves“ کے نام سے کتابی صورت میں آئے۔ اردو کالموں کو ”خون جگر ہونے تک“ کا کتابی نام دیا۔ ایک طویل سوانحی کلاسیکی ناول ”دل بھٹکے گا“ کے عنوان سے لکھا۔ اس کے علاوہ بے شمار کالم اور مشاہیر میں ادب کے ساتھ خطوط کتابی صورت میں ہنوز تازہ اشاعت ہیں۔ وہ باغیانہ حد تک انقلابی، بائیں بازو کے نظریات کے پے در اوپر عملی زندگی میں انھی پر کار فرما، کھرے دانش ور اپنی طرز کے انوکھے شخص تھے۔

میں نے اُن کی کتابوں میں درج واقعات اور کرداروں کے حوالے دیے تو خوش ہوئے اور جوش میں آکر بہت سی بیان کردہ باتیں دہرانے لگے اور کئی نئے موضوعات چھوئے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ اتنی بھر پور زندگی صحافت، ادب، فلم سیاحت، سیاست اور تحقیق میں گزار کر اور ٹائیڈ روزگار لوگوں کے بچ رہ کر وہ اپنی زندگی کو مرکز کیسے دیکھتے ہیں؟ مسکرائے ور بولے۔ ”میلہ میں زندگی میں ایسے داخل ہوا جیسے بچہ میلے میں داخل ہوتا ہے۔ میلہ عروج پر ہے۔ ایک جانب بندر کا تہ شاہور ہا ہے تو دوسری جانب موت کے کنوئیں میں بغیر سائنلر موٹر سائیکل دوڑ رہی ہے۔ ایک شامیانے کے پیچھے جل پری ہے تو رستے میں توڑنے کی قال والا بیٹھا ہے۔ سامنے جھولے ہیں تو پیچھے تازہ گر ماگرم قتلے۔ اچانک ایک طرف بین کی لے پر جھومتا سانپ اپنی جانب متوجہ کرتا ہے تو سوانگ بھرے ایک بہر دیا سامنے سے گزر جاتا ہے۔ ایک طویل قطار کانظروں سے تعاقب کرتے ہیں، وہ تو ایک وسیع پنڈال میں لگے سرکس سے شروع ہوتی ہے۔ ٹھٹھے لچھوں دارا چلا آتا ہے تو کبھی مروٹوں والا۔ رنگینی ہے، موسیقی ہے، تماشہ ہے اور عجائبات ہیں۔ بچہ حیرت اور شوق سے یہ سب دیکھتا چلا جا رہا ہے کہ یک دم میلے کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ اتحاد وقت گزر گیا، اُسے پتا ہی نہ چلا۔ اب اُسے میلے سے باہر نکلنا ہے۔ بس میں بھی زندگی کے میلے کی رنگینی میں ایسا منہمک ہوا کہ وقت گزرنے کا خیال ہی نہ رہا اور باہر نکلنے کا مقام اور وقت آ گیا۔ میلہ چلتا رہے گا، بس میں نہ ہوں گا۔“

اُن کی زندگی واقعی ایک میلے کی طرح آتش آنا رنگوں، دھنکی روشنیوں، لمبائی خوشبوؤں، گلابی رومانوں، لپچاتے ذائقوں اور جادو اثر موسیقی سے عبارت تھی۔ بعد کی کئی نشستوں میں انھوں نے اپنی زندگی ورق ورق کھولی، کچھ جانی کچھ ان جانی باتیں کہیں۔ اُن کی آواز آج بھی میری سماعت میں زندہ ہے۔

باہر بارش کے موٹے موٹے قطرے گہرے بادلوں سے نمودار ہو کر زمین پر گر کر پھٹ رہے تھے۔ ور ٹھنڈ میں اضافہ کر رہے تھے۔ اندر کھڑکی کے ایک کمرے کے ماحول کو ایک بوڑھا انقلابی گرما رہا تھا۔

احمد بشیر صاحب نے اپنے چاروں طرف آویزاں کمیونسٹ لیڈروں کی تصاویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ اچھے لوگ تھے۔ عظیم لوگ تھے۔ عام انسان کی بھلائی کے نظریے میں کیا خرابی ہے؟ اگر اس نظریے سے لادینیت نکال دی جائے تو یہ ایک عمدہ فلسفہ اقتصادیات و معاشرت ہے۔ انسانی بھلائی کا عمدہ نظام ہے۔“

اس کے بعد انکشاف کیا۔ ”میں نے اپنا سوانحی ناول 1971 میں لکھنا شروع کیا، بیس برس لکھتا رہا۔ روس میں کیوزم کا خاتمہ ہوا تو دل ٹوٹ گیا۔ خودنوشت کا تانا بانا اسی نظام کے گرد بنایا گیا تھا۔ ساری محنت رائیگاں گئی۔ یہ موجودہ کتاب تو میں نے چند ماہ میں لکھ ڈالی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کمیونل ازم کے غیر منصفانہ اور ظالمانہ نظام کو وقتی کام بانی پاتا دیکھ کر جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ سچ پوچھو تو ایک شدید ڈپریشن میں چلا گیا۔“ اُن کی آواز میں مایوسی و رآئی۔ ”مثلاً، جاگیر دار اور صنعت کار کے گٹھ جوڑ سے وجود میں آنے والا استعماری نظام تادیر قائم نہیں رہے

گا۔ غریب مزدور اور کسان پھراٹھے گا۔ میں زندہ نہیں رہوں گا، خاک میں مل کر اسی طرح خاک ہو جاؤں گا جیسے چند پرندہ اور نباتات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں مگر اس دنیا کا مظلوم سوشلزم کا اس سورج کو پھراٹھرتے دیکھے گا جو نئی الحال فروب ہو گیا ہے۔“

میں نے پوچھا کہ کس شخصیت نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا تو بولے۔ ”کارل مارکس۔ سپر جینس آدمی تھا۔ وہ ایک فرد واحد تھا جس کی تحریروں نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اُس نے انسانی بھلائی کا ایک جامع نظام دیا تھا۔ میرے جیسا اُس کا پرستار بھی اُسے پوری طرح سمجھ نہ پایا۔ اُس کی تحریروں کی گنگناہ اور پیچیدہ ہے۔ وہ یورپی تاریخی حوالوں میں گندمی ہوتی ہے، اُسے سمجھنے کے لیے یورپی تاریخ، اقتصادیات، فلسفہ اور سماجیات پر قابل رشک دست زس ضروری ہے۔ ہمارے ہاں کے قد آور سوشلسٹ لوگوں نے بھی مارکس کو پوری طرح سمجھ کر نہیں پڑھا۔“

میں نے سچا ڈھکھڑاہٹ سے غور کیا تو کہنے لگے کہ گوان دانشوروں نے کچھ حد تک یہ نظریہ سمجھا تھا مگر پوری طرح اپنی گرفت میں نہ لائے تھے۔

احمد بشیر صاحب اس موضوع پر بات کر رہے تھے تو مجھے وہ دن یاد آگئے جب میں گورنمنٹ کالج لاہور کا طالب علم تھا اور دوپہر میں انارکلی کے تقسیم ہند سے قبل کے قائم شدہ ایک مخصوص ہوٹل میں کھانا کھانے جایا کرتا تھا۔ میرے رستے میں قانون کی کتب کا ایک کتب خانہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں وہاں چلا گیا۔ سامنے ہی کارل مارکس کی لازوال کتاب ”داس کیپٹل“ کا نا انصاری کا اردو میں تلخیص کردہ نسخہ دھر تھا۔ میں نے خرید لیا اور چند روز ہی میں ختم کر ڈالا۔ تب سے نا انصاری کا نام میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ جب میں نے اُن کا حوالہ دیا تو احمد بشیر صاحب بتانے لگے کہ وہ ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو داس کیپٹل کی روح کچھ حد تک گرفت میں لائے۔

میں نے اُن سے پوچھا کہ قدرت اللہ شہاب جیسے صوفی منش اور مذہبی آدمی سے اُن کی کیسے بھی تو انھوں نے اُن کی شخصیت کے نئے گوشے دیکھے۔ یہ سب بعد میں، پہلے زمانی اور واقعاتی ترتیب۔

میں نے اُن کے سوانحی ناول ”دل بھلے گا“ کے حوالے دیے تو انھوں نے اشتیاق سے پوچھا کہ مجھے اُس میں کون سے حصے سب سے زیادہ پسند آئے۔ میں نے کشمیر، تقسیم، احوال ادباء اور منظر نگاری کا تذکرہ کیا۔ اس پر وہ خوش ہو کر بولے کہ وہ سب انھوں نے قطعی طور پر کچل لیا ہے۔ اس کے بعد مزے لے کر اُس میں بیان کردہ کئی واقعات تفصیل سے دہرائے اور کئی نئے واقعات سنائے۔ اُن کے ہاں سے رخصت ہونے لگا تو انھوں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ وہ اندر آئیں تو خواہش کا اظہار کیا کہ ”Dancing with Wolves“ کا ایک نسخہ مجھے دیا جائے۔ اُس نسخے پر دست خط کرتے ہوئے بتایا کہ اس کتاب پر انھیں صحیح معنوں میں فخر ہے۔ پھر تاکید کی کہ میں اس میں تقسیم پنجاب پر اُن کا طویل تحقیقی مضمون ضرور پڑھوں۔ یہ انکشاف بھی کیا کہ اس کتاب کے پبلشر نے اسے مارکیٹ میں نہیں آنے دیا تاکہ اپنے آمدنی کے گوشوارے میں خسارہ ظاہر کرے جس کی وجہ سے یہ کتاب بازار میں دست یاب نہیں اور نایاب ہے۔ میں نے کتاب کی ورق گردانی کی تو اہم تاریخی واقعات کا نادر تحقیقی مجموعہ تھی۔

سردیوں کی بارش میں ہونے والی وہ ملاقات بعد کی کئی بے تکلفانہ نشستوں کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ انھوں نے بے شمار موضوعات پر اظہار خیال کیا اور دل کھول کر کیا۔ وہ بولتے، میں سنتا اور لکھتا۔ وہ اُن مول لمحات آج بھی میرا اثاثہ ہیں۔ یادوں کے جادوگر میں ہر سو دیکھتے لمحات بکھرے پڑے ہیں۔

ایک شام میں نے کشمیر کا ذکر کیا۔ ”آپ کی سوانح میں کشمیر کی بہت عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔“

”کشمیر پر لکھتے ہوئے مجھے شدت سے احساس ہوا کہ کس طرح الفاظ کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ الفاظ جذبات اور مناظر کو حقیقت کے قریب تر بیان نہیں کر سکتے۔ میں امریکا سے لے کر سکاٹ لینڈ تک گھوما ہوں مگر کشمیر کی تو بات ہی اور تھی۔ شاید اس میں جوانی کے خمار کا بھی دخل تھا۔“

بات کرتے ہوئے وہ ماضی میں کھو گئے تھے۔

”ایک مرتبہ میں نے ڈونگے پر دریائے جہلم سے جھیل ڈل کا سفر کیا تھا۔ ڈونگا مکالوں، مسجدوں، مندروں، درگاہوں، بازاروں اور دھوبی گھاٹ کے بیچ میں تیرتا ہوا جھیل ڈل کے دہانے تک جا پہنچا۔ دریا کا پاٹ خاصا تنگ تھا۔ طالع اور اس کے ساتھی اُس کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی زنجیر پکڑ پکڑ کر ڈونگا آگے بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم جھیل میں آ گئے۔ جھیل کے اوپر شفاف اور دکتی نیلے پانی کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک نور بھرا سکون تھا۔ جھیل ایک پیارے کے مانند تھی جس کے ہر طرف سرسبز کھنے درختوں سے بھرے پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ گنجان درختوں سے پرندے اڑتے اور اُڑاری بھر کر دوسرے حصے میں گم ہو جاتے۔ اُن کی چھبھاہٹ کی دھیمی مدھر آواز لوری کا کام دیتی تھی۔ انھی جنگلوں میں سے چشمے اور جھرنے چامری کی طرح دھکتے پانی کو جھیل میں نرمی سے اتارتے تھے۔ جھیل کا پانی بالکل شفاف تھا، پانی میں نہ نظر آتی تھی۔ نہ میں سر جھاڑیاں اور نہ آب رنگ دار اور دل کش پھولوں کی بلیں تیرتی لہراتی تھیں۔ اس سبزے اور بیلوں میں چھوٹی چھوٹی رنگین مچھلیاں اٹھکیلیاں کرتی تھیں۔ ڈونگے سے یہ سب یوں نظر آتا تھا جیسے وہ سب شفاف شیشے کے نیچے ہو۔ جھیل کی سطح پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں تیر رہی تھیں جن پر سیاح لینے ہوئے تھے۔ جھیل کے کناروں پر گھاٹوں کے ساتھ ہاؤس بوٹ بندھی ہوئی تھیں۔ ان کے ریشمی پردے جب ہوا میں لہراتے تو اندر عالی شان پالش شدہ قیمتی لکڑی سے بنے کمرے نظر آتے۔ یہاں زیادہ تر یورپی لوگ سکونت پذیر تھے۔ چند بوٹ ہاؤس ایسے تھے جن پر مرد مختصر لباس میں ارغوانی جام تھاے غسل آفتابی کرتے نظر آتے اور ان کی عورتیں سڈول مرمریں بدنوں کے ساتھ چھپاک سے پانی میں اتر کر مچھلی کی طرح تیرتی نظر آتیں۔ موسم دیکھتے ہی دیکھتے بدل جاتا۔ چمکا سورج بدلیاں چھپا لیتیں، ٹھنڈی ہوا کے نرم لپٹے بدن سہلاتے گزر جاتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو پہر میں شام کا سماں ہو جاتا۔ ایسا رومانوی ماحول ہو جاتا کہ دل بے وجہ محبت کرنے کو چاہتا۔ ہر شے سے محبت ہو جاتی۔ وہیں مجھے ایک محبت بھی ہوئی تھی۔“

وہ کشمیر کے حسین نظارے اور ماحول میں کھو کر چپ ہو گئے۔

میں نے خاموشی ختم کرنے کے لیے کشمیری کھانوں شب دیگ، میوہ جات اور ساواں میں اُبلتی کشمیری چائے کا تذکرہ کیا تو بولے۔ ”کشمیر کے کھانوں میں کچھ تو وہاں کی پہاڑی ضروریات اور کچھ علاقائی روایات کا حصہ تھا تو وسطی ایشیائی اثرات کو نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ عمدہ اور لاجواب پکوان ہوتے تھے جنہیں پکانے میں ایسی فن کاری چاہیے تھی جیسی ایک مصور یا نقاش میں ہوتی ہے۔ بس ایک خامی تھی۔ وہاں کے لوگ صفائی پسند نہ تھے جس کی وجہ سے گھروں، بستروں اور رضائیوں سے ایک مخصوص بسا اُٹھتی رہتی۔ بیش تر وقت اتنی ٹھنڈ پڑتی اور پانی کی فراہمی کے لیے پہاڑوں پر سفر کرنا پڑتا تھا کہ مقامی لوگ نہانے دھونے میں کفایت شعاری سے کام لیتے۔“

کشمیری کھانے کے تذکرے سے جیسے انہیں گویا ایک اور بات یاد آ گئی۔

”یہ اُس زمانے کی بات ہے جب بچپن میں ایک مرتبہ میں بیمار پڑ گیا تھا اور مجھے علاج کے لیے لاہور لایا گیا تھا۔ میں اندرون شہر کے ایک کوچے میں ٹھہرا ہوا تھا اور دن بھر پڑ روتی گلی میں دیکھتا رہتا تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک ریڑھی والا چند بے سبائے ایک گھر کے سامنے آن رکا، اُس نے ایک عجیب و غریب چولہے پر نیلے رنگ کی آگ جلائی اور ایک پتلی میں پانی اُبالنا شروع کر دیا۔ جب پانی اُبل گیا تو اُن ڈبوں میں سے کچھ چیزیں نکال کر اُس میں ڈالیں اور ایک پیالی میں بھر کر سامنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔“

”کیا تھا اُس پیالی میں؟“ میں نے تجسس ظاہر کیا۔

”اُس میں پٹن کی چائے تھی جو ابھی تازہ تازہ پنجاب میں متعارف کروائی گئی تھی۔“

”کہا جاتا ہے کہ یہ ابتدا میں مفت فراہم کی جاتی تھی اور نعرہ بلند کیا جاتا تھا کہ یہ گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ اسی لیے کامیاب

ہوئی تھی۔“

انہوں نے میری معلومات کی تصحیح کی۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہے۔ پنجاب میں ٹھنڈک پہنچانے والے بہت سے مشروبات عام تھے۔ لسی، ستوکا شربت، فالسے اور شہوت کا شربت، کانچی، سکنجین، بادام کا شربت اور بہت سے ٹھنڈی تاثیر والے مشروبات۔ چائے کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ کیلجی جلا دیتی ہے۔“

انہوں نے گرم چائے کا ایک گھونٹ بھر اور بات جاری رکھی۔ ”دراصل لیٹن چائے شروع میں مریضوں کو دی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ بازاروں، محلوں میں پیک فریزز کے بسکٹ مفت میں دیے جاتے تھے۔ ایسی لوگ یہ سوچ کر چائے پیتے کہ اس کے ساتھ وہ بسکٹ کھانے کو ملیں گے جو گورے کھاتے ہیں۔ ابتدائی برسوں میں بڑی طرح ناکام ہونے کے بعد چائے آہستہ آہستہ پنجاب میں پی جانے لگی اور کئی دہائیوں کے بعد بھی مقبول تو نہ ہوئی مگر قابل قبول ہو گئی۔“

چائے کے حوالے سے احمد بشیر کی زندگی ایک اتفاقی معاملے کے نتیجے میں اس ڈگر پر چلی آئی جس پر انہوں نے بقیہ زندگی گزاری۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ احمد بشیر کی ممتاز مفتی اور دیگر ابھرتے ہوئے ادیبوں سے قریبی دوستانہ تعلق تو ضرور تھا مگر انہوں نے کبھی ادب و صحافت میں آنے کا سنجیدگی سے سوچا نہ تھا۔

ممتاز مفتی اور احمد بشیر اکٹھے رہتے تھے۔ ایک روز ممتاز مفتی نے اخبار میں اشتہار دیکھا کہ ایک نیا اخبار نکلنے والا ہے جسے معروف ادیب اور صحافی مولانا چراغ حسن حسرت نکال رہے تھے اور اس کے لیے عملے کی ضرورت تھی۔ ممتاز مفتی جو احمد بشیر کی بے روزگاری پر تشویش آمیز ہم دردی میں مبتلا رہتے تھے، نے نوجوان احمد بشیر کو زبردستی اخبار کے دفتر بھیج دیا۔

نوجوان احمد بشیر وہاں پہنچے تو بھاری تن و توش کے مالک کو مدد کی کرسی میں دھسے دیکھا۔ احمد بشیر کو دیکھ کر ان صاحب نے تشریف آوری کا سبب پوچھا تو احمد بشیر نے سٹپٹا کر اپنا نام بول دیا۔

ان صاحب نے احمد بشیر کو غور سے دیکھا اور کہا۔ ”خوب نام ہے مولانا! فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کروں؟“

تب احمد بشیر کو معلوم ہوا کہ وہ مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔

”انہوں نے آپ کو مولانا کیوں کہا؟“ میرے سوال میں اشتیاق تھا۔

”یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔“ احمد بشیر نے وضاحت کی۔

احمد بشیر نے ملازمت کی خواہش کا اظہار کیا تو حسرت صاحب نے ٹکسا جواب دے دیا کہ تمام آسامیاں بڑھ چکی ہیں۔ احمد بشیر مایوسی سے لوٹنے لگے تو چراسی چائے لے کر اندر داخل ہوا۔ چراسی کے چائے مانے اور حسرت کے چائے تنہا نہ پینے کی عادت نے احمد بشیر کی آنے والی زندگی کے رخ کا تعین کر دیا۔ انہوں نے احمد بشیر کو چائے ساتھ پینے کی دعوت دے ڈالی اور یہ نوجوان سامنے بیٹھ گیا۔ مولانا حسرت اپنے زیر تالیف مسودے سے فارغ ہوئے تو احمد بشیر سے اس کے تجربے کا پوچھا۔

احمد بشیر نے صاف بتا دیا کہ صحافت کا کوئی تجربہ نہیں۔

احمد بشیر کو توقع تھی کہ یہ مولانا چائے پی کر اسے فارغ کر دیں گے۔ خلاف توقع مولانا نے مسکرا کر کہا کہ انہیں نا تجربہ کار بندوں کی ضرورت ہے تاکہ انہیں اپنے مطابق ڈھال سکیں۔ مولانا نے بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔ ”گویا آپ کم و بیش ان پڑھ ہیں؟“

احمد بشیر نے انہیں بتایا کہ اُس نے کچھ تراجم کر رکھے ہیں جو بمبئی میں رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ معروف ادیبوں جن میں کرن چندر میراجی وغیرہ شامل تھے، کے ہم راہ قیام کیا ہے۔ کچھ بین الاقوامی ادب پڑھا ہے، کوک شاستر پڑھی ہے، موسیقی کی شہد ہے۔



اس پر مولانا حسرت نے بے اختیار کہا ”آپ عجیب آدمی ہیں مولانا! آپ نے ترقی پسند ادیبوں کو بڑھا ہے، جنسی علوم سے واقف ہیں، بین الاقوامی ادب کو بھی دیکھا ہے اور ہند کی آوارہ گردی کی ہے، چائے پیتے ہیں اور شراب بھی پی لیتے ہیں۔ اگر آپ کو اچھی محبت مل جائے تو آپ گھر سکتے ہیں۔“

یہاں مولانا حسرت کا اچھی محبت سے غالباً اپنی جانب اشارہ تھا۔ باتیں کرتے ہوئے انھیں یاد آیا کہ وہ احمد بشیر کو ملازمت سے تال چکے ہیں چنانچہ دوبارہ معذرت کی۔ احمد بشیر کرسی سے اٹھنے لگے تو حسرت نے پوچھا۔ ”اب آپ کہاں جائیں گے مولانا؟“ اس پر احمد بشیر نے جواب دیا ”گھر جاؤں گا مولانا“

مولانا حسرت نے کچھ دیر سوچا اور یہ کہہ کر کہ یہ وقت گھر جانے کا نہیں، اپنے ساتھ والگا ہوٹل میں چلنے کی دعوت دے دی۔ وہاں جا کر دونوں میں خوب جھی۔

باتوں باتوں میں مولانا حسرت نے احمد بشیر سے حسب خواہش تن خواہ کا پوچھا تو احمد بشیر نے پانچ سو روپے بول دیے۔

اتنی تن خواہ تو بہ مشکل مولانا کی تھی۔ حسرت نے چونک کر پوچھا ”اتنے پیسے آپ کو کون دے گا؟“

احمد بشیر نے پٹاخ سے جواب دیا ”تو نہ دیجیے۔ یہ تو فقط میری خواہش ہے، ارادہ نہیں۔“

کافی دیر سے یہ گفتگو جاری تھی کہ مولانا حسرت کو اپنا آرڈر یاد آ گیا اور انھوں نے بیرے کو آواز دی۔

ہوٹل میں سبھی انھیں جانتے تھے اور عزت کرتے تھے۔ منیجر بھگت گاہا آیا اور پوچھا۔ ”بیرا کون سا تھا، بوڑھا یا جوان؟“

حسرت نے مخصوص مسکراہٹ سے کہا ”جب آرڈر دیا تب تو جوان تھا۔“

منیجر بیرا اُن کا آرڈر لے آیا اور دونوں کافی دیر تک مشروبات خمر اور ایک دوسرے کی محبت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

رات گئے مولانا نے احمد بشیر کے ہم راہ ٹھمری سننے معروف طوائف کوڑے کے کوٹھے کا رخ کیا۔ وہاں مولانا کی بہت تپاک سے آؤ

بھگت کی گئی۔ جب گاؤں کے سے ٹیک لگا چکے تو بولے۔ ”دیس کا الاپ ہو جائے مولانا کوڑ صاحب۔“

رنگ و موسیقی کی بہار اُس رات اپنے جو بن چمکی جب اخبار کا چرچا اسی اخبار کی کچی کاپی لے کر آ گیا۔ مولانا حسرت نے وہیں بیٹھے

بیٹھے اُسے درست کیا اور کوٹھے سے اُترنے کا قصد کیا۔ تنگ میز میزوں سے اُترتے ہوئے بولے۔ ”کل دفتر وقت پر پہنچ جائیے گا۔ میں دیر سے

آنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ تن خواہ آپ کی دو سو روپے ماہ وار ٹھمری۔“

یوں احمد بشیر کی یہ طور صحافی اخباری دنیا میں آمد ہوئی۔ مولانا چراغ حسن حسرت کی بابت شراب کے تذکرے پر انھیں دینی حلقوں

کے فیضان و غضب کا سامنا کرنا پڑا۔

جارج آرویل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک خود نوشت تھی جی ہو سکتی ہے جب اس میں مصنف اپنی شخصی خامیوں کا اعتراف

کے۔

برطانوی تاریخ دان فلپ گوڈیلانے پرمراج جملہ کسا تھا کہ خود نوشت ایک ایسی موثر مصنفہ اظہار ہے جس میں آپ دوسروں کی

خامیاں پوری سچائی اور دیانت سے بیان کر سکتے ہیں۔

احمد بشیر نے اپنے خاکوں اور سوانحی ناول میں اپنے بارے میں ہر جگہ بے دھڑک ہو کر لکھ دیا۔ ان کی تحریر میں نہ تو تلقین تھی اور نہ ہی

دعوتِ رندی۔ ایک عذر آدمی کا ادبی رنگ میں اظہارِ حقیقت تھا۔ ان میں بعض اعترافات خوف ناک حد تک سچے تھے۔ اُردو ادب کی کوکھ چند

استغیاثات کے سوا اس قسم کے صاف اور سچے اظہار سے دیرانا ہے۔

احمد بشیر صاحب نے جدھر اپنی نئے نوشی کا ذکر کیا، وہاں اسے نہ تو باعشِ عزت قرار دیا اور نہ ہی اس پر نام ہوئے۔ پس اس کا

تذکرہ کر کے آگے بڑھ گئے۔

دوستوں کے ہم راہ جہلم میں ایک عزیز کے چند و نصائح کی ضد میں پہلی مرتبہ جرمہ ہائے آتش نوش کیے تو احمد بشیر کی کیفیت عجیب ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے قرب و جوار کی روشنیاں مدھم مدھم ہو گئی ہوں اور چاند کچھ بڑا بڑا لگنے لگا ہو۔ ایک ان جانا بوجھ اتر کر، ہلکے پھلکے ہو کر زندگی میں مزہ بڑھنے کی کیفیت طاری ہوئی۔ منافقت یا دنیا داری کا لبادہ اترتا معلوم ہوا۔ حجاب اٹھتے گئے۔ بعد کی تحریروں سے اس کے تلخ ذائقے کے ساتھ ایک سرور و سرشاری کی کیفیت کچھ ایسی منسلک ہوئی کہ کبھی لباسِ خرد چاک ہوا اور کبھی پاسباںِ عقل رخصت ہوا پر کبھی کبھی، کہ حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ بات جو عموماً کھل کر کہی نہ جاتی تھی، ایسی کیفیت میں سینے سے اُبل کر ہونٹوں تک چلی آتی۔ مزاج میں بغاوت تھی، معاشرتی روایات کے برعکس تجربہ کرنے کی سنسنی رگ و پے میں ارتعاش قائم رکھتی۔ نو جوانی کی عمر تو ویسے بھی زندگی کے ہر نئے ذائقے سے آشنا ہونے کی خواہش سے عبارت ہوتی ہے۔ حسرت کے علاوہ بھی کوشے پر جانا ہوا۔ وہ کوشا سستے ماحول میں بھیگا ہوا تھا جہاں روایتی رقص و موسیقی کے بجائے عوامی سطح کا بجزا ہوتا تھا۔ وہاں احمد بشیر کا دل بہت خراب ہوا۔ ماحول اجنبی اور مصنوعی تھا۔ تماشاخی ٹین کے سپاہی لگے اور طوائف کے پسینے کی بدبو تیز عطر میں مل کر طبیعت بوجھل کر گئی۔

آخری دنوں کی بات ہے کہ مجھ سے کہنے لگے ”جسمانی تکلیف اتنی بڑھ جاتی ہے کہ کوئی بھی دوست اور ساتھی یا نہیں آتا۔ پس کبھی کبھار چراغِ حسن حسرت یا داتے ہیں جنھوں نے چھ ماہ ہی میں میری اردو کی تمام غلطیاں نکال کر مجھے زبان میں رواں کر دیا تھا۔ بعد میں میں نے ساری زندگی انگریزی میں لکھا لیکن وہ اردو والی مہارت آئی اور نہ اعتماد۔ انگریزی میں صفدر میر (ڈان والے زینو) ذہن میں بجلی کے لٹکارے کی طرح کوند جاتے ہیں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اردو اساتذہ کی زنجیر کی آخری کڑی تھی۔ ان کے بعد تو گویا سلسلہ ہی بند ہو گیا۔“ ممتاز مفتی سے دوستی کا احوال سنایا۔

”میں ایک ملازمت چھوڑ کر گورداس پور میں عزیز کے ہاں چلا آیا۔ ممتاز مفتی اُن کا دوست تھا۔ جب ہماری دوستی ہوئی تو مفتی مجھ سے چند رہ برس بڑا تھا۔ شروع میں میں نے آپ جناب سے بات کرنے کی کوشش کی تو مفتی نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ میں اُسے نام سے پکاروں۔ گرو آدمی تھا، بہ ظاہر سادہ سا بے کشش آدمی۔ بات کرتا تو اُس کے گُن کھلتے۔ ہماری ملاقات ہوئی تو وہ اس وقت نام درادیب بن چکا تھا۔ بالعموم انسان اور بالخصوص نسوانی نفسیات پر گہری نظر رکھتا تھا۔“

”خواتین میں خاصے مقبول ہوں گے؟“ میں نے پوچھا تو جواب دیا۔

”بالکل، مقبول تھا مگر بات مقبولیت سے آگے نہ بڑھتی تھی۔ حد درجے ڈر پوک تھا۔ باتوں میں شیر تھا۔ عمل کی باری آتی تو چہرہ زرد پڑ جاتا اور ہاتھ ہیر کاٹنے لگتے۔ جو تجزیے تھے، مطالعے اور مشاہدے کی بنیاد پر تھے یا دوستوں کے معاملات کے سبب سے۔“

تقسیم کا واقعہ ہے۔ لاہور میں ہر جانب آگ لگی تھی، قتل عام ہو رہا تھا اور لوٹ مار جاری تھی۔ نو جوان احمد بشیر خوروں سے کھیتا ہوا، شام کو میوہ اسپتال کے چوک سے ہوتا ہوا شاہ عالمی جا پہنچا۔ اسے حویلی سے اپنی ممانی کے گہنے لے کر آئے تھے۔ وہ آنکھ پچا کر حویلی میں داخل ہوا اور متعلقہ کمرے میں جا پہنچا۔ وہاں سامان الٹا پڑا تھا اور تلائیاں، رضائیاں بکھری پڑی تھیں۔ ممانی کا سامان کہیں نظر نہ آیا۔ وہ سگریٹ سٹاکر کش لگانے لگا۔ اتنے میں ایک خوب روہندو لڑکی اُسے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سمجھ کر نیچے اتر آئی۔ اندھیرے میں اُس کے نقوش تو نمایاں نہ تھے البتہ آواز سے نہایت ٹپک رہی تھی۔

اُس نے احمد بشیر کو ہندو محافظ سمجھ کر اُس کا نام پوچھا تو احمد بشیر نے ایک فرضی نام بے مل بول دیا۔ نام سن کر اُسے خیال آیا کہ کبھی احمد بشیر مسلمان نہ ہو۔ اُس نے چند ایک سوال کیے تو واضح ہو گیا کہ یہ نو جوان ہندو محافظ نہیں بلکہ مسلمان ہے۔ خطرہ بھانپ کر اُس نے دم گدائی کہ وہ سیٹی بجا دے گی جسے سن کر اس کے ساتھی آجائیں گے۔ اُس نے سیٹی ہونٹوں سے لگائی تو احمد بشیر نے اُس کے ہاتھ مضبوطی سے

پکڑے۔ چوڑیاں ٹوٹ کر کچی کچی ہو گئیں۔ وہ سہم گئی تو احمد بشیر نے اسے بے ضرر جان کر چھوڑ دیا۔ وہ بیڑیوں کی جانب یہ کہہ کر چلی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو بلاتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ باہر سے کنڈالگا کر چلی گئی۔

احمد بشیر گھبرا کر کسی نئی آفت کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔ اسنے میں کر لیو کا سائرن بجا اور رات ڈھلنے لگی۔

رات گئے کنڈا کھلنے کی آواز سے احمد بشیر اپنی ادنگھ سے جاگ گیا۔ سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں روٹیاں اور بھاتی تھی۔ اُس نے حقارت سے کہا کہ وہ چاہتی ہے کہ احمد بشیر خالی پیٹ کالی مانا کی بکری نہ چڑھے۔

اس دوران ان دونوں میں فاصلے پر رہ کر بات چیت ہوئی۔ لڑکی احمد بشیر کی بے وقوفی اور بہادری سے متاثر ہوئی جس سے وہ خطروں کے بیچ اپنی ممانی کا زیور لینے کو پڑا تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ اس کے قریب آئی تو معاملات نے اُن ہونا رخ لیا اور ایک کم زور لمحے میں فاصلہ من و تو ختم ہوا۔

لڑکی نے سسکتے ہوئے رات گزار دی۔ صبح سویرے جب کر لیو کھلا تو احمد بشیر پیچھے دیکھے بغیر خاموشی سے بیڑیاں اُتر گیا۔ انسانی فطرت کا تلوں ہے کہ ایک لمحے کا اوتار دوسرے لمحے کا انسان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاتل گرم پستول تھامے حیرت سے خود کلامی کرتا ہے۔ ”یہ میں نے کیا کر دیا؟“ ریو الور کا ٹریگر انسان کے تحت الشعور نے دبایا ہوتا ہے اور اُس کی دھمک سے اس کا خوابیدہ شعور بیدار ہو کر خود شناسی کے ایک خوف ناک زاویے سے آگاہ ہو کر خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔

شاید ایسا ہی کوئی لمحہ تھا جب پشیمانی کے تحت احمد بشیر نے یہ سارا واقعہ متنازعہ مفتی سے بیان کر دیا۔ یہ وہی ممتاز مفتی تھا جسے احمد بشیر کا باپ ایک ایسا پختہ عمر شرارتی مرد سمجھتا تھا جو اُس کے بچے کو خراب کرتا تھا۔ مفتی ساری تفصیل سن کر ہنس دیا اور احمد بشیر کو سمجھایا کہ اس نے کوئی قابلِ عداوت حرکت نہیں کی بلکہ لڑکی خود اس قربت کی خواہش مند تھی۔ پان کی گلوڑی منہ میں رکھتے ہوئے مفتی اسے اس طرح سمجھاتا ہے جیسے گھر کا کوئی بڑا بچہ کو سمجھاتا ہے کہ اُس لڑکی نے دروازے پر کنڈالگانے کے باوجود اپنے کسی ساتھی کو اس لیے نہیں بلایا کہ وہ احمد بشیر کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ کھانا لے کر دوبارہ ایک ایسے لڑکے کے پاس آنا جس سے اُسے خطرہ تھا، ظاہر کرتا ہے کہ لڑکی خود اس کی جانب مائل تھی۔

”وہ میری جانب کیوں مائل تھی؟“ احمد بشیر نے کڑوے لہجے میں پوچھا۔

مفتی اُسے پیار سے سمجھاتا ہے کہ عورت تحفظ کی متلاشی ہوتی ہے۔ وہ بہادر مردوں سے محبت کرتی ہے۔ یہاں احمد بشیر اُس لڑکی کے ساتھیوں سے زیادہ بڑا ثابت ہوا جو یوں خطرات میں کود گیا۔ ایسے میں لڑکی کے مخصوص نسوانی تحت الشعور نے اُسے ایسے بہادر مرد سے قربت پر اکسایا اور وہ خود ہی اس کے پاس چلی آئی۔ مفتی نے اُسے دھیرے سے سمجھایا ”اُس لڑکی نے رو کر تمہارے جذبہ مردانگی کو بیدار کیا اور اُسکیا کہ تم اُسے لڑکی سے عورت بنا دو۔ تم نے خود کچھ نہیں کیا۔ فقط اُس کے اشاروں پر چلے۔ لڑکی کسی بہادر مرد سے عورت بننے کی طلب گار رہتی ہے۔ تم نے اس کی خواہش پوری کر دی۔“

تقسیم سے قریباً نصف صدی بعد جب میں نے اس واقعے کی تصدیق چاہی تو احمد بشیر صاحب نے اس کی تصدیق تو نہ کی پر اس میں مبالغے اور افسانہ طرازی کے تڑکے کا اشارہ دیا۔

ذہین و نکتہ رس احمد بشیر بعد میں شادی کرتا ہے، چار بیٹیوں اور ایک بیٹے کا باپ بنتا ہے۔ اپنی بیوی سے مثالی محبت کرتا ہے اور بیٹیوں کو بیٹیوں کی طرح پالتا ہے۔ ایک کوشنرادی کہتا ہے تو دوسری کورانی۔ بیٹیوں کو دیکھ کر آنکھوں میں نرمی ہی نرمی، پیار ہی پیار ہوتا ہے۔ بڑی بیٹی کو ساتھ سلاتا اور نکیہ بیچ میں رکھتا ہے تاکہ کروٹ بدلتے ہوئے بچی کو تکلیف نہ ہو۔ نرم دل اتنا کہ ڈراؤنی فلم دیکھ ہی نہیں پاتا اور یا تو ٹی وی بند کر دیتا ہے یا کمرے سے اٹھ جاتا ہے۔ کسی فچر فلم میں غم گین منظر آئے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ یہ وہی احمد بشیر ہے جو عورت کی بے

اعزاز و عزت کرتا ہے۔ وہ ہر مظلوم کے ساتھ ہے۔ عورت کو بہت مظلوم جانتا ہے۔ ہر دم اُس کے تحفظ اور اُس کی عزت کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ اپنی بیٹیوں کو اتنا اعتماد دیتا ہے کہ نیکلم احمد بشیر ادب اور بشری انصاری اداکاری میں نام ور ہوتی ہیں۔

کبھی تحریر کی بات چلی تو میں نے پوچھا کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مشق کرنے ہی سے زبان نکھرتی ہے اور چند معروف ادیبوں کا حوالہ دیا جو کہتے ہیں کہ روزانہ لکھنا چاہیے، اس سے تحریر میں روانی رہتی ہے۔ انھوں نے جزوی طور پر اتفاق کرتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے کہ تمہی لکھنا چاہیے جب لکھنے کو کچھ ہو۔“

تخلیقی ارتکاز توجہ کا ایک دل چسپ واقعہ سنایا۔

”مرزا ہادی رسوا کا بنیادی شعبہ تعلیم کیسی تھا۔ اس مضمون کا امتحان دیئے لکھنؤ سے لاہور آئے تو اُس دور میں شہر میں ہوٹل تو تھے نہیں، چند سرائے تھیں۔ مرزا ہادی رسوا نے اسٹیشن پر اتارتے ہی تانگے والے سے کہا کہ انھیں لاہور کی سب سے معروف اور بڑی طوائف کے کوٹھے پر لے جایا جائے۔ کوٹھے پر پہنچ کر انھوں نے طوائف کے ہاں سامان اُتارا اور تین روز کا محاذ ادا کر کے اُس کے ہاں قیام کیا۔ دن میں امتحان دیتے اور شام کو وقت کوٹھے پر گزرتا۔ تین روز بعد اپنا سامان اٹھایا اور واپس لکھنؤ کو ہو لیے۔ شہر کے معروف تاریخی ورثے دیکھنے کی ذرہ برابر خواہش نہ کی۔ بعد میں شہرہ آفاق ناول ”امراؤ جان ادا“ لکھا اور ادب میں نام امر کیا۔“

لاہور، پنجاب اور پنجابی سے احمد بشیر کے والہانہ قلبی تعلق کے متعلق ایک مکالمہ قابل ذکر ہے۔ ہماری پہلی ملاقات کا واقعہ ہے۔ میں نے کراچی میں اُن کے قیام اور اردو زبان پر دست دس سے متعلق یہی تاثر اخذ کیا کہ غالباً اردو اُن کی مادری زبان ہے۔ میں نے اُن سے اس تاثر کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔ ”کیا ایسی رنگین اور زرخیز زبان کوئی غیر پنجابی لکھ سکتا ہے؟“ اس سوال میں اُن کی پنجابی ثقافت سے غیر معمولی محبت اور جانب داری ٹپکتی تھی۔

پنجاب کی تقسیم نے انھیں بہت دکھی کیے رکھا۔ جاٹ ادھر بھی تھے، ادھر بھی، کشمیری ہندوستان میں بھی تھے، پاکستان میں بھی، راج پوت ہندو بھی تھے، مسلمان بھی۔

قائد اعظم کی بصیرت اور سکھوں کی پنجاب کو بہ طور اکائی رکھنے کی خواہش پر احمد بشیر صاحب کے تاریخی اور اُن جانے انکشافات حیران کن تھے۔ احمد بشیر نے بتایا۔

”تقسیم سے پنجاب میں فسادات شروع ہو چکے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کی عمارت کے باہر گولہبار کر اعلان جنگ کر دیا تھا۔ گیانی ہری سنگھ کے ماسٹر تارا سنگھ سے تعلق کو دہائی بھر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ ابتدائی گرم جوشی کے تعلقات میں سرد مہری جب در آئی جب گیانی ہری سنگھ نے ماسٹر تارا سنگھ سے کہا کہ سکھوں میں ذات پات کے تعصبات در آئے ہیں جو بابا گورو نانک کی تعلیمات کے مطابق ہیں۔ انھوں نے یہ مطالبہ بھی کر دیا کہ نچلے درجے سے تعلق رکھنے والے سکھوں کے لیے علیحدہ نشستیں مخصوص کی جائیں۔“

احمد بشیر صاحب نے توقف کر کے بات جاری رکھی ”اب جو فسادات کا آغاز ہوا تو گیانی ہری سنگھ قائد اعظم سے ملاقات کے لیے دئی گئے۔ ان کے ہم راہ ماسٹر ہزارہ سنگھ بٹھیا تھے۔ گیانی صاحب کے الفاظ میں ”جناب صاحب کے ہاں ہمارا خورشید حسن خورشید نے استقبال کیا۔ وہ جناب صاحب کے کمرے میں گئے اور لوٹ کر ہمیں اندر کمرے میں قریب داخل کیا۔ ہمارے سامنے ایک پردہ دار اور بار عب فضا تھا جس میں خود اعتمادی واضح طور پر نظر آتی تھی۔ جناب صاحب نے بردباری سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”ہمارے سکھ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے کہا ”جناب، سکھ ریاست پاکستان میں رہتے ہوئے خود مختاری چاہتے ہیں۔ ہم دنیا میں اپنی واحد ماں دھرتی پنجاب کی تقسیم نہیں چاہتے۔“

”میں نے گیانی صاحب سے پوچھا کہ کیا انھوں نے انگریزی میں بات کی تھی؟“ احمد بشیر نے بتایا۔



”اس پر گینانی صاحب کا جواب تھا ”نہیں۔ ہم جناح صاحب کی انگریزی دہائی کا کہاں مقابلہ کر سکتے تھے۔ ہم نے اردو میں اس کی تھی جو وہ آسانی سے سمجھ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس طرح بنگال بھی اقصیٰ نہ ہوگا اور کشمیر بھی خود بہ خود پاکستان کو مل جائے گا۔ جناح صاحب نے کچھ دیر سوچا اور بولے ”آپ بارہ آنے مانگ رہے ہیں جب کہ میں آپ کو پورا اردو دینا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ مجھ سے پاکستان میں رہتے ہوئے خود مختار ریاست کی خواہش کر رہے ہیں جب کہ میں آپ کو مکمل ہسٹلریاں ریاست، جالندھر کے ضلع جہاں سکھ اکثریت میں ہیں، گورداسپور، فیروز پور اور امرتسر کے علاوہ ننکانہ صاحب بھی دینا چاہتا ہوں جس کی رہداری لاہور اور شیخوپورہ میں ہوگی۔“ ہم یہ سن کر دم بہ خود رہ گئے۔ جناح صاحب نے توقف کر کے کہا۔ ”ماسٹر تارا سنگھ کو میرا پیغام دے دیں کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہی صحیح معنوں میں سکھوں کی جانب سے مذاکرات کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے میں اُن کے دروازے پر مرمت مرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے انہیں یہ تجویز بھجوائی ہے لیکن اُن کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اگر وہ اس سے بھی زیادہ چاہتے ہیں، میں انہیں دینے کو تیار ہوں۔“

احمد بشیر نے گینانی صاحب کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا ”گینانی صاحب کہتے تھے میں یہ تجویزے کر لوٹ آیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ماسٹر تارا سنگھ جناح صاحب سے ملاقات کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ اُن پر سردار فیمل کا بہت اثر تھا جو انہیں جناح صاحب سے ملاقات نہ کرنے پر آمادہ و پابند کر چکے تھے۔ واپس آکر میں کرتار سنگھ کے پاس یہ فیاضانہ پیش کش لے کر گیا اور انہیں اسے قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ میں نے اس تجویز کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب کی تمام زرخیز زمین کے مالک سکھ ہیں۔ ہمارے گوردوارے پورے پنجاب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر پنجاب تقسیم ہو گیا تو مغربی پنجاب کے ہندو ہجرت کر کے مشرقی پنجاب میں آجائیں گے۔ اُن ہندو مہاجرین سے ہندو کثرتی ملک میں ترجیحی سلوک کیا جائے گا۔ ہم ہر صورت گھائے میں رہیں گے۔ ہمارے لاکھ پور (فیمل آہاں) شیخوپورہ اور سرگودھا کے معزز سکھوں پر مشتمل ایک جتنے نے، ماسٹر تارا سنگھ سے ملاقات کی۔“

ماسٹر تارا سنگھ کے جواب کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن مکالمات کو بیان کرنے لگے ”جواب میں ماسٹر تارا سنگھ گینانی صاحب پر غصے میں دھاڑا ”تھیں جناح سے سکھوں کی طرف سے ملنے کی اجازت کس نے دی؟ میں نہ تو مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتا کرنا چاہتا ہوں ورنہ ہی جناح سے ملوں گا۔“

”آپ نے وضاحت کرنے کی ہمت نہ کی؟“ احمد بشیر صاحب نے گینانی جی سے پوچھا تھا۔

”میں نے ہمت کر کے کہا کہ اس تقسیم کے نتیجے میں ہندو، مسلمان اور سکھ قتل ہوں گے، کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ سکھ مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا کر کے اُن سے زیادتی کریں گے۔ یوں وہ گوردو گاند سنگھ کی تقسیمات کی نفی کر کے سکھ دھرم سے نکل جائیں گے۔ جواباً مسلمان ایسا سلوک سکھ عورتوں سے کریں گے۔ یوں ہم دونوں صورتوں میں خسارے میں رہیں گے۔“ ماسٹر تارا سنگھ نے پوچھا۔ ”تم کہاں سے تعلق رکھتے ہو؟“ میں نے بتایا کہ میں امرتسر کے نزدیک ایک گاؤں سے ہوں۔“

”ماسٹر تارا سنگھ نے کہا۔“ اسی لیے تم ایسے خیالات رکھتے ہو۔ میں راول پنڈی کے قریب ایک ایسے گاؤں سے ہوں جسے مسلمانوں نے جلاڈالا۔“

”میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ”ماسٹر جی! یہ ذاتی دشمنی کا معاملہ نہیں۔ سکھوں کے مستقبل اور پنجاب کی تقسیم کا معاملہ ہے۔“

ماسٹر جی غیظ و غضب میں کانپنے لگے اور کرپان پر ہاتھ رکھ کر دھاڑنے لگے۔ مجھے خطرہ ہوا کہ اُن کے جاں نثار مجھے قتل کر ڈالیں گے چناں چہ مصلحت جانتے ہوئے اجازت لے کر نکل آیا۔“

”ماسٹر تارا سنگھ نے اچھی خاصی پیش کش ضائع کر دی۔“ میں نے احمد بشیر صاحب سے کہا تو وہ بولے۔

”بعد میں اس کا ماسٹر تارا سنگھ جی کو بھی احساس ہو۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

انہوں نے اس واقعے کا غیر متوقع انجام سنایا۔

”گیانی جی ماسٹر تارا سنگھ کی مخالفت کی وجہ سے پاکستان چلے آئے اور گوردوارہ ننکانہ صاحب میں قیام پذیر ہو گئے۔ تقسیم کے بعد ماسٹر جی کو اپنی سنگین غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ انہیں اُن کا پتہ بھی چھوڑ چکا تھا، چنانچہ درد ہائیوں کے بعد اپنے گناہوں کے کفارے کے لیے وہ ننکانہ صاحب آئے۔ گوردوارے کے روایتی طریقے کے مطابق یا تری کو سکھوں کی مقدس مذہبی کتب سے سنا نا اور پڑھنا ہوتا ہے جس کے لیے پاکستان میں واحد گرتھی گیانی جی تھے۔ گیانی صاحب سے حکومت پاکستان نے اس کے لیے درخواست کی تو کسی قدر تردد کے بعد وہ مان گئے۔ ماسٹر جی اور گیانی جی کا آمنا سامنا ہوا تو ابتداً ماسٹر جی انہیں پہچان نہ پائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پہچانے تو بری طرح رونے لگے اور بولے ”گیانی اچھے معاف کر دو، میں نے پتہ کے خلاف بڑا گناہ کیا ہے۔“ اس کے بعد انہوں نے گیانی جی کو واپس ہندوستانی پنجاب چلنے کا کہا تو گیانی جی نے یہ کہہ کر اُن سے معذرت کر لی کہ ماسٹر جی کی مجرمانہ حرکت کی وجہ سے ان کے 128 رشتے دار قتل ہو گئے جن کا خون اُن کے سر ہے۔ ماسٹر جی نے ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگی۔ ننکانہ صاحب کے دورے کے ایک برس کے اندر اندر ماسٹر جی سوگ بائیں ہو گئے۔“

احمد بشیر صاحب نے یہ داستان ختم کی تو ہم دونوں ایک سوگ دار خاموشی میں کھو گئے۔

”مشرقی پنجاب کے ایک سکھ دانش ور جس دنت سنگھ کنول نے بھی 1981 میں اس سارے معاملے کی میرے سامنے لاہور میں

تصدیق کی تھی۔“ احمد بشیر صاحب نے بتایا۔

”ہمارے ملک میں تحقیقی صحافت کی کوئی جگہ نہیں۔ زندہ قومیں تاریخ پر تحقیق کرتی ہیں۔ ایسے صحافی اور محقق عمدہ معاوضے پاتے ہیں۔ وہ قومیں سوچ بچار کے بعد نئی پالیسیاں اس تحقیق کی روشنی میں بناتے ہیں۔ تحقیق کا بنیادی عنصر ہر دو قسم کی ذرا بے سامنے رکھ کر درست صورت حال سامنے لانا ہوتا ہے جب کہ یہاں کسی غلط العام بات کو دلائل کے ساتھ رد کیا جائے تو گالیوں اور دشنام طرازی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محقق کی نیت پر ٹک کیا جاتا ہے اور اس کی تحقیق کے پیچھے سازشی کہانیاں گھڑ کے اس سے منسوب کر دی جاتی ہیں۔“ احمد بشیر کے لب و لہجے میں دکھ کا گہرا رنگ جھلک رہا تھا۔

”میری وہ تحریریں زیادہ مقبول ہوئیں جو سطحی یا عمومی نوعیت کی تھیں۔ یہی چیز ایک قوم کی ذہنی سطح اور قومی رویے کی عکاسی کرتی ہے۔“ انہوں نے تاسف سے یہ کہتے ہوئے ایک اور تاریخی حقیقت بیان کی۔

”یہ غلط طور پر مشہور ہے کہ ہند میں اسلام محمد بن قاسم لے کر آیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حجاج بن یوسف سے اختلاف کی بنیاد پر پانچ سو عمانی مسلمان پہلے ہی الور میں آجے تھے۔ اُن میں سے چند راجا داہر کے باقاعدہ مشیر مقرر ہوئے جو اُسے سفارت اور جنگ کے معاملات میں مشاورت دیتے تھے اور دربار میں اچھا خاصہ رسوخ رکھتے تھے۔ حجاج بن یوسف نے ہند پر حملے کا منصوبہ خلیفہ کے سامنے منظوری کے لیے رکھے ہوئے پیش کش کی تھی کہ سندھ پر حملے میں جتنے اخراجات ہوں گے، وہ ان سے دگنی مالیت سندھ سے لوٹ کر لوٹائے گا۔ حجاج ایک سنگ دل آدمی تھا۔ اُس نے بیس ہزار لوگ قتل کرائے تھے اور اس سے ڈر گئے مرد اور عورتیں اپنی قید میں رکھے ہوئے تھے۔ اس سنگ دلی کے باوجود وہ ایک اعلیٰ منتظم تھا جس نے کوفے کے تیز رفتار پیغام رسالوں کے ذریعے سندھ پر حملے اور جنگ کی نگرانی اور منصوبہ بندی کی تھی۔ اُس کے احکامات تھے کہ شکست خوردہ فوج کی تمام سپاہ قتل کر دی جائے، مفتوحہ مردوں اور عورتوں کو غلام بنا کر عراق روانہ کر دیا جائے، جن میں کاری گروں اور مختلف علوم کے ماہرین کو استثناء حاصل تھا۔ حجاج اور محمد بن قاسم کی دست یاب خط و کتابت میں حجاج واضح طور پر آقا اور محمد بن قاسم ماتحت نظر آتا ہے۔ محمد بن قاسم کی ہر جنگی چال درحقیقت حجاج کی چال تھی۔ وہ ایک سعادت مند اور رحم دل لڑکا تھا۔ جب راجا داہر کی شکست کے بعد اُس کی بیٹیوں کو لٹے میں دھت خلیفہ کی خواب گاہ میں پیش کیا گیا تو انہوں نے خلیفہ کو بتایا کہ وہ محمد بن قاسم کے ہاتھوں پامال ہونے کے باعث اُس کے

لائق نہیں رہیں۔ چنانچہ محمد بن قاسم جو اپنے عروج پر تھا، کو کھال میں ہی کر لانے کا حکم دیا گیا۔ پیغام ملنے ہی ایک نیل ذبح کر کے محمد بن قاسم کو اس کی کھال میں ہی کر بخدا اور روانہ کیا گیا۔ پہلا مسلمان سالار ہندوستان میں تیسرے روز جاں بحق ہو گیا۔ بعد ازاں داہر کی بیٹیوں نے اعتراف کیا کہ انھوں نے انتقام میں جھوٹ گھڑا تھا۔ تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اُن دونوں لڑکیوں کو ہاتھیوں کی ٹانگوں سے زنجیروں کے ساتھ باندھ کر بخدا کی گلیوں میں کھینٹا گیا لیکن اب رحم دل ابو خیر محمد بن قاسم کو قبر سے دوبارہ زندہ نہ کیا جاسکتا تھا۔“

احمد بشیر صاحب نے یہ قصہ طولانی چند جملوں میں سمیت کر ختم کر دیا۔ ”بیش تر تاریخی روایات کا ماخذ بیچ نامہ ہے۔ مسلمان عورت کے اغوا اور قزاقوں کے ہاتھوں پامالی کا واقعہ صرف ایک کہانی ہے۔ انسانی ہوس قصہ مطمئن کرتی خود ساختہ کہانی!“

احمد بشیر ہندستان کے تہذیبی ورثے سے محبت کے حوالے سے عہد ساز شاعر میراجی کا ذکر کرتے تھے۔

”میں نے صحیح معنوں میں کوئی ہندستانی دیکھا تو وہ میراجی تھا۔ سراپا ہندستانی! میں میراجی کو تقسیم سے قبل کرشن چندر کے بمبئی والے گھر کو در لاج میں ملا تھا۔ کو در لاج اندھیری کے ساحل پر ناریل کے ہرے بھرے جھنڈ میں واقع تھی۔ اس کے ارد گرد آم اور چیکو کے پیڑ جنگلی پھولوں کی جھاڑیاں اور گھنے درختوں کے بیچ کچے نم رستے تھے۔ وہاں کوئل کوکئی، قوے اور چڑیاں شور مچاتے اور طرح طرح کے پرندے بھیرا کرتے تھے۔ کو در لاج میں پورے ہندستان کے ادیب، فلمی اور سیاسی لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود اس کے بڑے بڑے کمروں میں ایک ایسی خاموشی اور سکون ہوتا جیسا دور جنگلوں میں ڈاک جنگلوں یا ڈھتھی حویلیوں میں ہوتا ہے۔ پہلی منزل کافرش لکڑی کا تھا، سو ایک ایک چاب پٹلی منزل پر سنائی دیتی۔ وہاں پہلے روز میں نے اور مفتی نے قیام کیا تو میراجی سے ایک سرسری ملاقات ہوئی۔ اگلی صبح جب افق پر سفید روشنی چھا رہی تھی تو میں نے جھاڑی بالوں والے سادہ سست نما میراجی کو باہر جھرد کے میں طلوع ہوتے سورج کی جانب رخ کیے، دھیان لگائے گم سم بیٹھے دیکھا۔ اس کے بعد جب میں اسے سلام کرتا، وہ گویا ڈانٹ کر مجھے آداب کہتا۔ عجب ملنگ آدمی تھا، سستے جاسوسی رسالے پڑھتا، ہاتھوں میں بیویوں والی گیندیں تھا، رعب سے یوں بات کرتا گویا قطعی حکم جاری کر رہا ہو۔ بات کرتے کرتے اپنے اندر گم ہو جاتا۔ اُس نے اپنے اندر ہی لذت کوئی کارستہ تلاش کر لیا تھا۔ خالص ہندستانی تھا چنانچہ کبھی گفت گو میں مذہبی عصبیت نہ جھلکتی۔ وہ ایسا درخت معلوم ہوتا جو ہند کی مٹی میں اُگتا تھا اور اپنی فکر میں غیر محدود تھا۔“

میں نے شوق سے پوچھا۔ ”اُن کی کوئی خصوصیت؟“

”چھٹی حس بہت تیز تھی۔ بٹا کا معاملہ فہم اور کم زور دل تھا۔ ایک مرتبہ میں میراجی اور ممتاز مفتی بس میں سفر کر رہے تھے۔ ابھی سفر کا آغاز تھا کہ اُس نے یہ کہہ کر ہمیں گھسیٹ کر باہر کھینچ لیا کہ بس پر حملہ ہونے والا ہے۔ ہم بس سے اترے تو زندگی معمول کے مطابق تھی۔ خیر ہم نے دوسری گاڑی پکڑ لی۔ اگلے روز خبر پڑی کہ واقعی اُس بس پر گول بیٹھے میں حملہ ہوا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ یہ ظاہر ملنگ آدمی اپنی زندگی سے کتنا پیار کرتا تھا۔“

کرشن چندر ممتاز مفتی کا دوست تھا۔ احمد بشیر کی وہیں کو در لاج میں کرشن چندر سے پہلی ملاقات ہوئی۔

”بہت سادہ آدمی تھا، دیکھنے میں بالکل ادیب نہ لگتا تھا۔ چھوٹا سا قد اور اڑتے ہوئے بال، تو ننگی ہوئی تھی اور تھوکنے کی عادت تھی۔ اُس کی بیوی ایک سادہ سی گھریلو عورت تھی جو زیادہ تر سفید کپڑے پہنتی تھی۔“

”کرشن چندر اتنی موثر، دھیمے رومان والی اور خوب صورت زبان کیسے لکھتے تھے؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ جذبے جو اُس کی تحریروں میں نظر آتے تھے، کہیں اُس کے اندر چھپے ہوئے تھے۔ شاید اُن تشنہ جذبوں کی تکمیل وہ اپنی تحریروں

کے ذریعے کرتا تھا۔“ احمد بشیر صاحب نے تجزیہ کیا۔

اپنے وقت کے ایک اور معروف شاعر عبد الحمید عدم کے بارے میں بتانے لگے۔



”میں ملٹری اکاؤنٹس میں ملازمت کرتا تھا۔ عبدالحمید عدم وہاں افسر تھے۔ ایک مرتبہ تن خواہ بروقت نہ ملے اور الاٹنٹس کے پاس نہ ہونے پر ملازمین نے ہڑتال کی تھان لی۔ عدم بھی ہم درروں میں شامل تھے۔ انھوں نے ہڑتالیوں کی فہرست لے لی تاکہ مجمع محل سے ہڑتال منظم ہو سکے۔ کچھ دیر بعد سرکردہ ہڑتالی جیل میں قید تھے۔ دراصل عدم نے وہ فہرست انگریز افسر کو دے دی تھی۔“

قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کا تذکرہ چٹارے لے لے کر کئی مرتبہ کیا۔ حفیظ جالندھری کے ساتھ ملازمت کرنے ہوئے ہی صاحب طرز مزاح نگار، شاعر اور سفرنامہ نگار ابن انشا سے دوستی قلبی تعلق میں بدل گئی۔

”حفیظ جالندھری کے تحت مجھے امریکی امداد کے دیہات سدھار کے ایک پروگرام میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اپنی طرز کے واسطے آدمی تھے۔ مجھے پہلی ملاقات ہی میں بتا کر متاثر کر دیا کہ قائد اعظم اہم سیاسی امور میں اُن سے مشورہ کرتے تھے۔ کشمیر سے تعلق بن کر ان کی آنکھوں میں چمک آگئی اور اعتراف کیا کہ اُن کے اصرار پر پنڈت جواہر لال نہرو نے پاکستان کا منصوبہ تسلیم کیا۔ ان کا لہجہ خود پرستانہ کے بجائے عاجزانہ ہوتا تھا۔ عاجزی سے انھوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ پاکستان بنانا اکیلے اُن کا کام نہ تھا، اس میں قائد اعظم نے بھی ان کا ہاتھ ساتھ دیا۔ بعد میں تقسیم کے وقت جالندھری میں اپنے بے شمار عزیزو، قارب کی شہادت کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے بھی بہت مشکل سے اپنے جذبات قابو میں رکھے۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تمام قصے حفیظ جالندھری کے نہ صرف اپنے تخلیق کردہ بلکہ وہ ان پر صدقِ دل سے یقین کر بیٹھے تھے۔ جالندھری میں تو تقسیم کے وقت فسادات ہوئے ہی نہ تھے۔ اُن کا مزاج پل میں تولہ پل میں مار ہوتا تھا۔ اسی لیے اُن کے ساتھی اور ماتحت بہت محتاط رہتے تھے۔ اُن کا غصہ بھی ایک منصوبہ بندی کے تحت ہوتا تھا۔ وہ اپنا ڈرائیور مبینے کی آخری تاریخوں میں ناراض ہو کر فارغ کر دیتے تھے جب اُسے تن خواہ دینے کی تاریخ نزدیک آ جاتی تھی۔ ایک محتاط ڈرائیور نے مبینا بھراجی خاصی ڈرائیونگ کی، آخر میں کہیں گاڑی تیز رفتار ہو گئی تو حفیظ صاحب نے گاڑی روکوائی اور باہر نکل کر ایک راہ گیر سے اپنے بارے میں پوچھا۔ لوگ قومی ترانے کے خالق کو خوب جانتے تھے۔ راہ گیر نے انھیں بہت عزت دیتے ہوئے شعر پڑھا اور بول۔ ”واللہ، یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ حضرت آپ ابوالاثر ہیں، قومی ترانے کے خالق۔“ اس پر حفیظ صاحب ڈرائیور کو بھول گئے اور راہ گیر پر برس پڑے۔ ”بے موقع شعر پڑھیے۔“ پھر بات کا بسرا دوبارہ پکڑ لیا اور اپنے بے شمار القابات گناتے ہوئے لجاجت سے درخواست کی کہ وہ انھیں برا کہے۔ یہ سن کر وہ سنبھل کر قسم کا راہ گیر، پچکپانے لگا۔ بہت اصرار پر اُس نے انھیں برا کہہ دیا۔ اس کے بعد حفیظ جالندھری نے اُس سے درخواست کی کہ وہ اُن سے پوچھے کہ انھوں نے برا بھلا کہنے کی درخواست کیوں کی۔ اُس نے تذبذب میں سوال ڈھرا دیا تو حفیظ صاحب نے جواب دیا۔ ”میں اس لیے پانی ہوں کہ میں نے اس شخص کو ڈرائیور رکھ ہوا ہے۔“ یہ کہہ کر حفیظ صاحب مڑے تو ڈرائیور وہاں سے غائب تھا۔ وہ مبینے کی آخری تاریخ تھی۔“

حفیظ صاحب کے مزاج سے متعلق احمد بشیر نے ایک اور بات بتائی۔

”وہ اپنی خیالی دنیا میں رہتے تھے۔ کبھی کبھار باہر نکلتے تو چنگھاڑتے یا آنسو بہاتے ہوئے، خاصا ڈراما کر لیتے تھے۔“

”کچھ لوگ اُن کے شاہ نامہ اسلام کو بہت بڑا کارنامہ نہیں سمجھتے۔“ میں نے رائے دی تو جیسے انھیں کچھ یاد آگیا۔

”انھوں نے میری (احمد بشیر) کی درخواست پر ابن انشا کو ادارے میں ملازمت کے انٹرویو کے لیے بلایا۔ ابن انشا اُن دنوں

اسبلی ٹوٹنے کے بعد وہاں مترجم کی ملازمت سے فارغ ہو کر بے روزگار تھا۔ وہ کبھی کبھار مزاحیہ کالم اور انگریزی مضامین لکھ لیتا تھا۔ خبر جب انٹرویو ہوا تو وہ ابوالاثر کو خاصا پسند آیا۔ ایسے موقع پر ابن انشا نے ایک غیر متوقع بات کہہ دی۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”اُس نے حفیظ جالندھری کو بتایا کہ اُس نے اُن پر روزنامہ ڈان میں ایک مضمون لکھا تھا۔ حفیظ جالندھری نے نیزے سے

پوچھا۔ ”کیوں بر خوردار کیا لکھا تھا؟“



”ابن انشا نے بتایا کہ اُس نے لکھا تھا کہ حفیظ صاحب نروس بریک ڈاؤن کے سلسلے میں ایک ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ حفیظ صاحب نے فوراً اپنی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”یہ تو ہر حساس آدمی کا مسئلہ ہے بلکہ مجھے تو شاید اس وقت بھی نروس بریک ڈاؤن ہے۔“ اس پر ابن انشا نے کہا کہ ڈاکٹر نے حفیظ صاحب کو دماغی کام کرنے سے منع کیا اور آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ حفیظ صاحب نے یہ سن کر ٹھنڈی سانس بھری اور بولے۔ ”ہاں بر خوردار! مگر فکرِ سخن، تقسیم کے فسادات میں شہید ہونے والے عزیزوں کا غم اور غمِ روزگار آرام کہاں کرنے دیتا ہے، میں دماغی کام نہ کروں تو مر جاؤں۔ ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کون سا دماغی کام کر رہا ہوں تو میں نے اُسے بتایا تھا کہ میں شاہ نامہ اسلام کی چوتھی جلد مکمل کر رہا ہوں۔“

”یہ سن کر ابن انشا نے ڈرتے ڈرتے کہا ”قبل اس کے کہ آپ کو کوئی ہتادے، میں خود ہی ہتادیتا ہوں کہ میں نے یہ واقعہ من و عن لکھ دیا تھا۔ البتہ اس میں ایک اضافہ کیا تھا۔ یہ وہ بات تھی جو عبد المجید سالک صاحب نے مجھے بتائی تھی۔“

”وہ کیا بر خوردار؟“

”میں نے لکھا کہ ڈاکٹر نے یہ سن کر کہ آپ شاہ نامہ اسلام پر کام کر رہے ہیں، آپ سے کہا اس سے آپ کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ میں نے تو دماغی کام سے منع کیا ہے۔“

”پھر تو حفیظ جانندھری صاحب غیظ و غضب میں خوب رہاڑے ہوں گے؟“ میں نے ہنستے ہوئے احمد بشیر صاحب سے پوچھا۔

”نہیں۔ اُن پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں نے ابن انشا کو کھسک جانے کا اشارہ کیا۔ اُس سے باہر چھوڑ کر لوٹا تو حفیظ صاحب ہنوز سکتے کے عالم میں تھے۔ اُن کا چہرہ اُسی طرح پتھر یا رہا اور ہونٹ ملے یہ سالک کا آدمی ہے۔“

معاصرانہ چشمک کا یہ واقعہ سنا کر احمد بشیر صاحب کافی دیر مسکراتے رہے۔

”ابن انشا کیسے آدمی تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”شن دار“ وہ بے ساختہ پنجابی میں بولے۔ ”بہت معصوم اور انتہا کا جذباتی۔ اُس پر خودکشی کے دورے پڑتے تھے۔“

میں نے انشا پر لکھے گئے ایک تھیسس میں پڑھا تھا کہ اُن کے دل میں لاہور کے خلاف ایک جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ چوں کہ انھیں لاہور میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لیے ان میں کڑواہٹ بھر گئی تھی۔ میں نے احمد بشیر صاحب سے پوچھا تو انھوں نے حیرت سے بتایا کہ کبھی انشا نے ایسی کوئی بات اُن سے نہیں کی تھی۔ ابن انشا اور ناصر کاظمی مختلف حوالوں سے جن میں اے حمید مرحوم کے مضامین بھی شامل ہیں مجھے اُس چاندنی کی ہلکی رومانوی روشنی میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح قدرت اللہ شہاب کی شخصیت سے بھی اسرار وابستہ ہیں۔

”ابتداً ابن انشا کے چھوٹے بہن بھائی اور بوڑھے ماں باپ لاہور رہتے تھے۔ اُن کے اخراجات وہ خود اٹھایا کرتا تھا۔ اُس میں ایک بے ساختہ حس مزاح تھی۔ عام طور پر مزاح لکھنے والے عام زندگی میں سنجیدہ ہوتے ہیں جب کہ وہ عام زندگی میں تحریروں سے بڑھ کر غریف تھا۔ اُس میں جینیاتی طور پر خودکشی کا رجحان تھا۔ جب کبھی وہ ایسی کیفیت میں ہوتا میں اُسے بہلا مکھسلا کر خودکشی کے طریقوں پر منصوبہ باندھتا یہاں تک کہ اُس کی یہ کیفیت ختم ہو جاتی۔“

”کبھی آپ نے انھیں حقیقت میں طویل ڈپریشن کی کیفیت میں دیکھا؟“

”ہاں۔ کراچی میں اُسے ایک شادی شدہ لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ لڑکی نے اپنے شوہر کو بھی اعتماد میں لے لیا تھا۔ عشق یک طرفہ تھا۔ انشا اُس لڑکی پر خرچہ کرتا رہتا۔ میں اُسے سمجھاتا کہ وہ لڑکی اسے بے وقوف بنا رہی ہے۔ وہ ایک ہی رٹ لگائے رکھتا کہ اُسے اپنے دل پر اختیار نہیں۔ ایک مرتبہ تو اُس کی اتنی بڑی حالت ہو گئی کہ وہ اُس لڑکی کے ہاتھ آئی بینڈ کے گھر کے باہر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تو لڑکی نے اندر سے گھر بند کر لیا، بڑی مشکل سے وہ واپس ہوا۔ وہ بیدارشی طور پر رومانوی شخص تھا۔ چھوٹی عمر میں اُس کی شادی ایک ایسی لڑکی سے کر دی گئی

جوا سے ناپسند تھی، عمر میں بھی اُس سے بڑی تھی۔ ان کی بھینہ نہ تھی۔ اُس کے اندر محبت کی پیاس بڑھتی رہی۔ اگر کراچی والی لڑکی نہ ہوتی تو کوئی اور لڑکی بھی ہو سکتی تھی۔“

”وہ لڑکی کون تھی؟“ میرے اس سوال پر وہ خاموش ہو گئے۔ بس اتنا اشارہ دیا۔

”حافظ جالندھری صاحب کے عزیزوں میں سے ایک لڑکی تھی۔“

ابن انشا کے بارے میں احمد بشیر صاحب نے زیادہ بات نہیں کی، البتہ اُن کی جواں مرگی کا افسوس کرتے رہے۔

خود احمد بشیر نے اپنی زندگی میں ہالیم اور جواں میں بالخصوص کئی محبتیں کیں لیکن عشق صرف ایک کیا، اپنی بیوی سے عشق۔ وہ ذرا آنکھوں سے ادھمیل ہو تھیں تو یہ بے چین ہو جاتے۔ بیوی نے بھی اُن کا اس طرح خیال رکھا جس طرح بچوں کا رکھا جاتا ہے۔ وہ ان کی ہم نوا اور ہم روح ثابت ہوئیں۔ ان کے شوق کے کھانے کباب، مچھلی، کرپے گوشت، کھلے بہت رچاؤ سے بناتیں۔ دونوں شام کو کھٹے پھل کھاتے۔ امرود اور آڑو زیادہ رشت سے کھاتے۔ یہ شادی ویسے بھی اُن کی پسند کی تھی۔ اس سے پہلے ایک بیاہ ہوا تھا جو بہت مختصر مدت کے لیے چلا تھا۔

”وہ عورت مجھے ماں لگتی تھی، محبت کے بجائے عزت کرنے کو جی کرنا تھا۔“ ایک قریبی عزیزہ جس سے پہلی شادی ہوئی تھی، کے بارے میں جھپکتے ہوئے ایک مرتبہ اعتراض کیا۔

دوسری بیوی سے جب بنی پیدا ہونے والی تھی تو بیوی روانہ کے مطابق چالیس دن کے لیے میکے گئی۔ بنی کی پیدائش کے چودہ دن بعد وہ بیوی سے واپس چلے آئے کاغذ ساز کرنے لگے۔ بیوی کے والدین اتنی جلدی اپنی بیٹی کو واپس بھیجنے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ چار ماہا کرتے ہوئے بیوی کو پانچ ہزار کا بھل ٹیک بہ طور حق مہر بھجوا دیا۔ یہ دیکھ کر بیوی کے ماں باپ بہت برہم ہوئے اور اپنی بیٹی سے کہہ دیا کہ وہ واپس اپنے شوہر کے پاس نہ جائے۔ بنی نے زیادہ ضد کی تو اُس کے والد نو سو لودہ بنی کے ہم راہ اسے سرال کے دروازے پر چھوڑ کر بغیر کسی سے ملے لوٹ گئے۔ احمد بشیر نے جب بیوی اور بنی کو باہر دیکھا تو پشیمان ہوئے اور بے اندازہ خوش بھی۔ اسی واقعے سے بھی فیصلہ کن اختیارات کا فیصلہ ہو گیا اور آج وہ احمد بشیر فیصلے کرتے رہے اور جیکھا نہیں مانتی رہیں۔

البتہ دفتر میں ساتھ کام کرنے والی خاتون سے کراچی میں عشق آمیز دوستی کی۔ صبیحہ نام کی پنجابی پر وقار اور خوب صورت دہلی خاتون تھیں۔ جیلز پارٹی کی شیریں رحمان انہی کی بیٹی ہیں۔ وہ خاتون سازمی اور موتیوں والے بلاؤز میں اتنی بڑکشش لگتیں کہ اُس پاس کے لوگوں کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ ان خاتون سے دوستی کو کبھی نہ چھپایا۔ پرانے زمانے تھے، بیوی بھی وسیع القلب تھی، صبیحہ کے گھر آنے جانے پر کوئی اعتراض کیا بلکہ اُن سے دوستی کر ڈالی۔ اب صورت کچھ یوں بنی کہ احمد بشیر کی دوست اور بیوی آپس میں بہترین سہیلیاں بن گئیں۔ جب کبھی صبیحہ کا گھر آتا ہوتا تو وہ خوشی میں بیوی کو کہتے۔ ”آج صبیحہ نے آنا ہے، اُس کے لیے خاص کھانا بناؤ۔“ اور بیوی بھی ہنستے ہوئے اپنی سبلی کے لیے بارہی خانے ہلی جاتی۔ یہ لوگ اسٹینٹن فرنگ کی خاطر ساحل سمندر اور دیگر جگہوں پر چلے جاتے۔ اس دوستی میں رنگہ غلوں کے سوا کوئی اور رنگ نہ تھا۔ ہاں رنگہ شوق کبھی کبھی جھلک اُٹھتا۔

زمانہ اُلٹی قلا بازی لگا ہے۔ اُن کی زندگی میں شباب یاد اُن کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔

”چند اہم اور قابل قدر ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شباب صاحب کے عہدے سے متاثر تھے۔ اسی لیے ان کی توصیف کرتے رہتے۔“ میری بات سن کر احمد بشیر صاحب غصے میں آ گئے۔

”ایسی بالکل کوئی بات نہیں۔ یہ بکواس ہے۔ شباب صاحب کی وفات کے بعد اُن پر اعتراضات جموٹ اور بددیانتی ہے۔ اشتقاق، معنی، مانو یا مجھے اُن کی ملازمت سے علیحدگی کے بعد ایسی باتوں سے کیا حاصل۔ وہ واقعی صوفی درویش آدمی تھے۔ آج ہر گئی کوپے میں سرکاری افسر پھرتے ہیں۔ اُس دور میں وہ بہت اونچے عہدے پر تھے۔ وہ ہماری تحریف سے بے نیاز تھے۔“

بات شہاب صاحب کی روحانی وارداتوں پر ہوئی تو احمد بشیر صاف گوئی سے بولے۔  
 "میں نے اُن سے وابستہ کوئی کشف یا روحانی واردات اپنی آنکھوں سے تو نہ دیکھی مگر اُن میں چند ایسے اوصاف دیکھے جو شاید اُن کی ماں جی سے انھیں وراثت میں ملے تھے۔"

ایک واقعہ ہے کہ جب شہاب صاحب وزارت تعلیم کے سیکریٹری اور احمد بشیر صاحب معمولی ملازم تھے تو دونوں میں ممتاز ملحق صاحب کی وجہ سے ایک تعلق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ایک روز صبح سویرے قدرت اللہ شہاب کا احمد بشیر کو فون آیا۔ اُن کی آواز میں نکلت اور پہچان تھی۔ انھوں نے احمد بشیر سے کہا "آپ فوراً میرے دفتر آجائیں۔"

احمد بشیر، شہاب صاحب کے دفتر پہنچے تو وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ انھوں نے سیکریٹری سے کہہ دیا کہ اندر نہ تو فون ملایا جائے اور نہ ہی کسی کو آنے دیا جائے۔ اس کے بعد احمد بشیر سے بولے "آج میں بے انتہا خوش ہوں۔ مجھے بتا دیا گیا ہے کہ مجھے کب مرنا ہے۔"

شہاب صاحب، خلاف مزاج اپنی مسرت چھپانے لگے۔

"آپ نے کب مرنا ہے؟" احمد بشیر نے سوال کیا تو وہ بولے۔

"میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ مجھے ممتاز مفتی سے پہلے موت آئے گی۔"

یہ کہنے کے بعد شہاب صاحب بے ربط گفتگو کرنے لگے۔

بعد میں یہ پیش گوئی سونی صد درست ثابت ہوئی۔ شہاب صاحب مفتی صاحب سے پہلے فوت ہوئے اور مفتی صاحب نے طویل

عمر پائی۔

میں نے احمد بشیر صاحب سے پوچھا کہ شہاب صاحب نے یہ راز انہی سے کیوں بیان کیا جب کہ اُن کے زیادہ قریبی دوست

موجود تھے تو احمد بشیر نے کہا۔ "شہاب صاحب نے اس کی کئی وجوہ بیان کی تھیں۔ جو بات مجھے سمجھ میں آئی، یہ تھی کہ اُس روز میں ہی با آسانی

میر تھا۔ باقی دوستوں میں کوئی دور تھا تو کوئی شہر سے باہر۔ اپنے دل کا بوجھ ہٹا کرنے کے لیے انھوں نے مجھے مناسب سمجھا۔"

بعد میں، ایک مرتبہ میں نے نایم احمد بشیر سے شہاب صاحب کے متعلق پوچھا تو وہ بولیں۔

"شہاب صاحب سادہ سے آدمی تھے۔ معمولی ساحلیہ، سفید شلوار قمیص پہنے آتے تھے۔ یہ تو اُن کے فوت ہونے کے بعد بتا چلا کہ

وہ خاصہ اہم آدمی تھے۔ جب وہ آخری مرتبہ ہمارے ہاں آئے تو کافی مضطرب تھے۔ کچھ دیر ابا کے پاس بیٹھے رہے پھر چلے گئے۔ ابا نے بعد

میں بتایا کہ وہ اعتراف کر کے گئے تھے کہ پاکستان کے چند مسائل کے وہ بھی بلا واسطہ ذمہ دار تھے۔ ابا نے حیرت سے یہ ضرور کہا تھا کہ نہ جانے

یہ اعتراف کرنے وہ خاص اُن کے پاس کیوں آئے تھے۔"

احمد بشیر، شہاب صاحب کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے کہ اُن کے ساتھ کئی مرتبہ مسجد گئے۔ شہاب صاحب نماز پڑھتے رہتے اور یہ

باہر انتظار کرتے رہتے۔ شہاب صاحب نے انھیں کبھی مجبور نہیں کیا کہ یہ اُن کے ہم راہ نماز پڑھیں۔

ایک روز ڈھلتے پھلتے سورج کی مدھم پھلی روشنی میں، آخری دنوں میں، باتیں کرتے کرتے شہاب صاحب کے حراج کا بتانے

لگے کہ وہ کبھی بھی کھل کر اختلاف نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر اُس روز بدھ ہو اور انھیں کہا جائے کہ آج جمعرات ہے تو کہتے کہ ہاں شاید

آج جمعرات ہی ہے۔ اور اگر پھر کہا جائے کہ نہیں آج بدھ ہے تو بھی کہتے کہ آپ درست کہہ رہے ہیں، آج بدھ ہی لگتا ہے۔ کبھی کسی کی دل

آزاری نہیں کرتے تھے۔"

میں نے کریدا "شہاب صاحب نے اپنی کتاب میں مختلف وظائف کا ذکر کیا ہے تو کیا مسجد میں نماز ادا کر کے وہ وظائف بھی پڑھا

کرتے تھے؟"

”نہیں وہ مسجد میں فقط نماز ادا کرتے تھے، وظائف رات ہی کو ادا کرتے تھے۔“  
 میں نے مزید استفسار کیا کہ کیا شہاب صاحب اور مفتی صاحب ایسی ہستیوں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ کسی روحانی واردات سے گزرے تو ان کا جواب مکمل لہجے میں تھا۔ کہنے لگے ”میں بڑا معمولی آدمی ہوں مگر سچ یہ ہے کہ مادے کے علاوہ میرا کسی بھی شے پر زیادہ اعتبار نہیں اور نہ ہی مجھے کبھی کوئی روحانی تجربہ ہوا۔ البتہ ایک بہت بڑی ہستی اور قوت کا میں قائل ہوں۔“  
 ”خوابوں پر بھی یقین نہیں جن میں پہلے سے اشارہ کر دیا جاتا ہے یا کوئی امر اوعز یا بزرگ آکر جھٹک دکھا جاتا ہے؟“ میں نے پوچھا تو بولے ”نہیں۔ میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ لوگ ایسی بہت باتیں سناتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، سچ ہو مگر میں نہیں مانتا۔ میرے بیوی بچے تو کچھ عرصے سے میری موت کے خواب بھی دیکھ رہے ہیں، موت تو لازم ہے۔“ یہ ان دنوں کی بات ہے جب انھیں کینسر تشخیص ہو چکا تھا۔

اُسی روز باتیں کرتے کرتے بے ترتیب سانس ہوا کریں، سچے سے ٹیک لگائی اور شریر لہجے میں بولے۔  
 ”مولویوں کو میں نے بہت مشکل میں ڈالے رکھا ہے۔ ان کے خلاف خوب لکھا اور بولا ہے۔ بھلا ملائیت نے آج تک دنیا کی تاریخ میں انسان کو کبھی کوئی فائدہ دیا؟ حضرت محمد ﷺ تو بہت نیک انسان تھے، دانش ور تھے، بہت اچھے انسان تھے مگر یہ مثلاً تو فقط باعث نقصان ہیں۔“ جو طے تھے راستے میں ”کے پہلے ایڈیشن میں تو مثلاً اُس کے خلاف کچھ نہیں تھا لیکن بعد میں میں نے خوب لکھا ہے جو کافی مشہور ہوا ہے۔“

”کبھی دھمکیاں نہیں ملیں؟“  
 ”بہت۔ میں عدالت میں چلا گیا۔ پولیس نے کہا ہم آپ کو سپاہی دے دیتے ہیں۔ میں نے کہا سپاہی ملیں گے تو ان کے چائے پانی کا خرچہ بھی اٹھانا ہوگا سو میں نے انکار کر دیا۔“  
 ”آپ ملائیت کے خلاف بھی لکھتے رہے اور ضیا کے خلاف بھی تو کبھی صحافت میں مشکل پیش نہیں آئی؟“  
 ”بہت آئی۔ ڈان کے اخبار ”Star“ میں لکھتا تھا۔ ضیا کے خلاف بہت لکھا۔ یوسف ہارون صاحب اس کے مالک بھی تھے، بعد میں گورنر بھی ہوئے۔ ایڈیٹر مجھے بہت پسند کرتا تھا۔ سو وہ میرا نام بدل کر مضامین چھاپتا رہا۔ کبھی ایک نام سے تو کبھی دوسرے نام سے۔ بلکہ ایک لڑکی نے مجھ سے ملنے کے اخبار میں اس پر ایک مضمون بھی لکھا تھا، شاید Tracking the star یا Star Track کچھ اس طرح کا نام تھا۔“  
 ”خالد احمد کچھ نظریاتی نظر آتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ بے شک بہت پڑھا لکھا اور سمجھ دار قابل آدمی ہے مگر اُس کا بھی کوئی خاص نظریہ نہیں۔“  
 احمد بشیر صاحب نے جوانی میں شاعری بھی کی۔ ایک نظم سناتے جس کا ایک مصرع کچھ یوں تھا۔  
 میں مٹی کا اک توتا بیٹھا سوچ رہا ہوں

ہالی وڈ میں فلم کے حوالے سے ایک برس کی ٹریننگ لی اور بڑے سہانے خواب لے کر واپس آئے۔ ممتاز مفتی کی تحریر کردہ اور انجمن الشاعری پر مشتمل فلم ”نیلا پرست“ کچھ اس چاؤ سے بنائی کہ اس میں تجریدیت کے تجربے کر ڈالے اور اُسے کلاسیکی موسیقی سے سجایا۔ فلم ریلیز ہوئی تو لوگوں کی فہم سے ماورا ہونے کی وجہ سے فلاپ ہو گئی۔ نتیجتاً جتنی طور پر شدید دھچکے کا شکار ہوئے اور مالی طور پر نکال ہو گئے۔ غم بے چارگی میں پکارتے پائے گئے ”ڈاکٹروں بلاؤ۔“

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ بوڑھا سو شلسٹ دانش ور ایک زمانے میں ماورائی علوم، علم نجوم، بڑے جوں، علم جفر کا نہ صرف قائل تھا بلکہ عملی طور پر دعا، وظائف اور روحانی معاملات میں شریک بھی رہا تھا۔



سیاروں کی چال کے حوالے سے اُس نے لکھا تھا کہ ہر شخص کی زندگی میں دو مرتبہ ساڑھتی آتی ہے۔ اس سے مراد انتہائی اہمیت کے ہیں جس میں ستاروں کی حرکت کا بہت اہم حصہ ہے۔ اہم ترین سیارہ زحل ہے جو تیس برس کی مدت میں دنیا کا چکر پورا کرتا ہے گویا ساڑھ برس کی عمر کے شخص کی زندگی میں دو چکر۔ اس کا ایک درجہ اڑھائی برس کا ہوتا ہے۔ خوش قسمت لوگوں کی زندگی سے یہ ایک درجے میں نکل جاتا ہے اور بد نصیب لوگوں کی زندگی میں یہ تین ڈھائے یعنی ساڑھے سات برس بعد اُن کو لاچار و خوار کر کے نکلتا ہے۔

ان علوم کا شوق فقط ایک مشغلے کی حد تک تھا۔ ایک مرتبہ ایک گھڑ دوڑ کا نہایت محنت سے حساب لگا کر انھوں نے دوست کے حوالے کر دیا۔ ان کا حساب عین درست ثابت ہوا اور دوست ایک ہی دوڑ میں خاصی رقم کما گیا۔

اپنی بہن پروین عاطف کے شوہر بریگیڈیئر عاطف کے ہاکی سے عشق کے معترف تھے۔ اُن بریگیڈیئر کے پیدائشی برج عقرب کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ ایسے لوگ مزا جاکم ہوتے ہیں اور دل کا بھید چھپانا خوب جانتے ہیں۔

ایک مرتبہ فیض احمد فیض سے ایک شاعر (غالباً منوبھائی) نے مشورہ مانگا کہ وہ کس زبان میں شاعری کریں تو فیض صاحب نے جنت اشعور کے تخلیقی عمل پر اثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے کلاسیک مشورہ دیا تھا ”جس زبان میں خواب دیکھتے ہو۔“

اسی لیے جب احمد بشیر کے فوت ہونے کے کافی عرصے بعد نیلیم احمد بشیر نے مجھے بتایا کہ انھوں نے اپنے والد کو خواب میں دیکھا تھا کہ وہ قبر سے باہر پھلوں کی ایک ریڑھی پر لیٹے ہیں۔ بیٹی کو دیکھ کر انگریزی میں کہتے ہیں ”I am alone and hungry“ (میں تنہا اور بھوکا ہوں) تو مجھے اس خواب میں زیادہ سچائی نظر نہ آئی کہ احمد بشیر نے انگریزی سے کبھی محبت نہ کی تھی۔ شاید نیلیم نے خواب میں انھیں اپنے لاشعور کی نظروں سے دیکھا تھا۔

اس کی بہ نسبت اکمل عظیمی نے انھیں خواب میں جو دیکھا، وہ زیادہ قریب حقیقت ہے۔ اکمل عظیمی نے پینتیس برس امریکا میں قیام کیا۔ اپنے خواب میں وہ احمد بشیر کو واشنگٹن کے سمیٹھ سونین عجائب گھر کے باہر دیکھتے ہیں اور ان کے قریب جاتے ہیں۔ احمد بشیر انھیں دیکھ کر بولنے کی کوشش کرتے ہیں مگر بول نہیں سکتے۔ کافی کوشش کے بعد وہ دو لفظ بولتے ہیں۔ ”ماسٹر مدن۔“ ماسٹر مدن ایک نوجوان لڑکا تھا جو لڑکپن میں فوت ہو گیا لیکن گائیکی میں لازوال نام بن کر زندہ رہ گیا۔

احمد بشیر کو گائیکی سے عشق تھا۔ یہ خواب اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اس سے گمان کا پرندہ ایک ایسے گھونسلے میں پھنستا ہے جہاں ماسٹر مدن اور احمد بشیر اکٹھے ہوں۔ شاید یہ ترکیب درست نہیں کیوں کہ احمد بشیر گھونسلے پر یقین نہ رکھتے تھے۔ وہ ذاتی ملکیت کے شدید خلاف تھے۔ اسی لیے کوئی ملکیت نہ رکھی اور دانستہ گھر نہ بنایا۔

یہ وہی احمد بشیر ہیں جو قحط بنگال دیکھ کر دہائیں مار مار کر روئے تھے۔ ”وہاں سڑکیں بھوکے جگنے لوگوں کی لاشوں اور لاغر جسموں سے اُٹی پڑی تھیں۔ ایک جانب ایک شیر خوار ماں کے سینے کو منہ لگائے دودھ کی آخری بوندیں چوستے ہوئے مرچکا تھا۔ اُس کی ماں بھی مردہ تھی۔ دوسری جانب مردہ بچے نے مردہ ماں کی انگلی مضبوطی سے تھامی ہوئی تھی۔ کچڑ، گندگی اور پکھرے کی گاڑی سڑک سے گزرتی تو لوگ اُس کے گرتے پکھرے سے چاول کے دانے تلاش کرتے آپس میں لڑ پڑتے۔ کوڑے کے ڈمیروں پر انسان اور کتے خوراک کی تلاش میں جھگڑتے تھے۔ وہ قحط مصنوعی تھا۔ گودام خوراک سے بھرے ہوئے تھے لیکن بھیڑیہ کی طرح خون خوار سرمایہ دار مزدور اور کسان کا خون پی رہا تھا۔“

یہ کہتے ہوئے احمد بشیر کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے اور آواز کانپنے لگی تھی۔ انھوں نے سرمایہ دار کو گالی بھی بکی تھی۔ ایسی گالی جس میں خلوص اور ہم دردی کی مہک تھی۔ یہ وہی احمد بشیر تھے جنھوں نے پیش کشوں کے باوجود کبھی اپنے نظریات پر سمجھوتا نہیں کیا۔ کئی ملازمتیں کیں اور خود ہی چھوڑ دیں۔ ملال کلاسیک، بلکہ غریب آدمی کی زندگی بسر کی۔

”ابا کبھی گھر خوش خوش آتے اور اُن کے ہاتھوں میں پھل یا مٹھائیاں ہوتیں تو وہ بھی باتیں ہوتیں۔ نوکری ختم ہونے کی خوشیاں نوکری ملنے کی خوشی۔ ایک مرتبہ ہم خاصی مالی مشکل میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ ابا گھر واپس آئے تو انھوں نے اپنا ہاتھ کوٹ پہنا ہوا نہیں تھا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بتایا۔ ”رستے میں ایک ضرورت مند مل گیا تھا، اُسے دے دیا۔“ یہ اُسی دور کی بات ہے جب ہمارے لیے ایک ایک آنے کی اہمیت تھی کہ غیر متوقع طور پر گھر خالی ہاتھ لوٹے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولے۔ ”تین ہزار روپے لے کر آ رہا تھا کہ ایک غریب آدمی مل گیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی بیوی بیمار ہے۔ وہ سارے پیسے اُسے دے دیے۔“ نیلم نے اُسی سے بتایا۔

احمد بشیر آخری مرتبہ اسپتال گئے تو اُن کے ہاتھوں میں مسولینی کی کتاب تھی۔ یہ کتاب اُس نظام کی علامت تھی جس میں ہر انسان برابر تھا۔ ایک نو نہال ماں کی لوری سننے سننے بھوک سے بڑھال ہو کر مندی آنکھوں سے اُس پاس منڈلاتے ملتھر گدھوں کی آنکھوں کی چمک کا سامنا نہ کرتا ہو۔ بد بودار سرمایہ دارانہ استعمار مزدور کے سینے پر پھیر رکھ کر اُس سے خون نہ جھکواتا ہو۔ انسانی برادری ایک مالا کے موتیوں کی طرح برابر ہو اور سن مٹتی ہو۔

میں احمد بشیر صاحب سے آخری مرتبہ ملا تو انھوں نے مجھ سے کہا ”میں نے چند روز میں کینسر سے مر جانا ہے۔ ڈاکٹر بتا چکے ہیں۔ میرے گھر والے بھی تیار ہیں۔ میں ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں ظالم سرمایہ دار اور کٹھن ملا کے تراشے خدا کو نہیں مانتا۔ میں ایک ایسی لازوال قوت کو تو پھر بھی مان سکتا ہوں جس کا میں نے مشاہدہ اور تجربہ تو نہیں کیا، پر جو مظلوم کے لیے شفیق اور مہربان ہو۔“

نیلم نے بتایا تھا کہ اُن کے ابا نے مرتے دم اپنی تمام اولاد کو اپنے سرھانے کھڑے دیکھ کر کہا تھا۔ ”میں نے جائیداد نہیں بنائی اسی لیے تم سب یک جا ہو۔ میری کچھ ملکیت ہوتی تو تم اس کے بٹوارے کے جھگڑے میں پڑ کر یوں میرے پاس اکٹھے اور متحد نہ ہوتے۔“

”اُن کے دوست فوت ہوتے تو وہ ان کے جنازوں میں نہ جاتے اور یہ کہتے۔ ”میرا دوست تو مر گیا، اب افسوس کس سے کروں؟“

احمد بشیر اکٹر مولانا روم کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے۔

خام بدم، پختہ خدوم، سو ختم	حاصلِ عمرم سے سخن بیش نیست
خام تھا، پختہ ہوا، تمام ہوا	میرا حاصلِ عمر فقط تین لفظ

اس کے علاوہ گنگنایا کرتے۔

اُس پاس کوئی گاؤں نہ دریا

اور بدریا چھائی ہے

احمد بشیر نامی، ہم درو، غریب پر در انقلابی تو نہ رہا لیکن اُس کا خواب اس دھرتی پر زندگی بسر کرتے ہر محنت کش کا خواب ہے جسے کسی

صورت پورا ہوتا ہے۔ اس بدریا کو بلا تفریق برساتا ہے۔

# کھلکھلاتا آدمی

عطاء الحق قاسمی



الحرم اہل لاہور میں مجلس اقبال کی جانب سے تقریب کا اہتمام تھا۔ نوے کی دہائی تھی۔ غلام حیدر دائیں صاحب وزیر اعلیٰ پنجاب تقریب کی صدارت کر رہے تھے۔ چوں کہ وہ بہت بنیادی سطح سے ترنی کرتے ہوئے وزارت اعلیٰ کے عہدے پر متمکن ہوئے تھے اس لیے اس تعلیم کے چند ہی مراحل طے کر پائے تھے۔ ان کے دذریوں میں تو ایک دذریا یہ بھی تھے جن کے متعلق مشہور ہے کہ ایک فائل ان کے سامنے لائی گئی تو انھوں نے اپنے سیکریٹری سے پوچھا۔ ”مجھے کیا لکھنا ہے؟“ اُس نے کہا کہ بس آپ اس پر ”Seen“ یعنی ”پڑھ ادیکھ لیا“ لکھ دیجیے۔ انھوں نے اس پر سنجیدگی سے خوش خط انداز میں ”س“ لکھا اور فائل لوٹا دی۔

رسی انداز کی تقاریر جاری تھیں۔ تقریب کا ماحول بوجھل تھا اور حاضرین جمابہیں لے رہے تھے۔ اتنے میں سٹیج سیکریٹری نے اعلان کیا کہ عطاء الحق قاسمی صاحب اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ سلک کی سنہری قمیص اور کلف والی سفید شلوار میں لمبوس قاسمی صاحب اسٹیج پر آئے اور انھوں نے تقریب کا آغاز ایک واقعے سے کیا۔

ایک صاحب کا اکلوتا بیٹا قتل کے کسی جھوٹے کیس میں گرفتار ہوا اور جیل چلا گیا۔ مقدمے کی کارروائی بھی شرع ہو گئی۔ ان صاحب نے انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے بیٹے کے لیے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیے۔ اس دوران مقدمے کی کارروائی نے سنجیدہ رخ اختیار کر لیا۔ اپنے بیٹے کی پھانسی کے اندیشے میں جتلا باپ نے جیل کے ایک جج کو سفارش کروائی کہ وہ ساری زندگی کے لیے اُس کا مقروض رہے گا اگر اُس کے بیٹے کو عمر قید کی سزا دے دی جائے۔ مقدمے کا فیصلہ ہوا تو بیٹے کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

چند روز بعد کسی تقریب میں باپ کی ملاقات جج سے ہوئی تو آنکھوں میں احسان کے آنسو بھرے وہ جج کا انتہائی شکر گزار ہوا۔ جج نے ہم دروازہ انداز میں باپ کا کندھے کو تھپتھپایا اور بولا۔ ”وہ تو آپ کی خواہش پر میں نے ناخلف کو عمر قید کی سزا پر جیل بھیج دیا ورنہ دوسرے جج تو اسے بڑی کرنا چاہتے تھے۔“

قاسمی صاحب نے یہ واقعہ ختم کیا تو پورا ہال تہمتوں سے گونج اٹھا اور دائیں صاحب، جو گلاس منہ سے لگائے پانی پی رہے تھے، کو اچھوٹا گیا اور اُن کی قمیص جھینٹوں سے بھیگ گئی۔ پس اس کے بعد قاسمی صاحب کی تقریر کے شگفتہ ذومعنی اور پرمعنی جملوں کی پھوار برسی رہی اور وہ جان محفل ٹھیرے۔ تقریر ختم کر کے وہ باہر کی جانب روانہ ہوئے تو قریب آدھا ہال خالی ہو گیا۔

یہ میرا قاسمی صاحب سے پہلا سامنا تھا۔

عطاء الحق قاسمی، صف اول کے کالم نگار، شاعر، مدیر اور سفر نامہ نگار کے قدموں کے نشان 1943 سے امرتسر، دیرا ہاں لاہور ماڈل ٹاؤن، اچھرہ سے ہوتے ہوئے نہر کنارے نئی بستیوں میں جا نکلتے ہیں۔

اُردو کے معروف ابتدائی سفر نامے ”شوق آوارگی“ سے ابھرنے والے تخلیقی دہانے کہیں نوائے وقت اور جنگ کے کالموں اور بین الاقوامی مشاعروں میں ظہور کیا تو کہیں ”معاصر“ ایسے موقر ادبی جریدے کی ادارت میں کیتھارسس پایا۔ ایم اے او کالج کی تدریس سے روزگار کا سورج طلوع ہو کر ناروے کی سفارت اور سرکاری اداروں کی سربراہی کے مناصب پر دمکا۔

گھر والوں کی پسند سے بیاہ کیا۔ شرط فقط اتنی رکھی ”لو کی قبول صورت، تعلیم یافتہ اور خاندانی ہو۔“

ایک زمانے میں نوائے وقت لاہور کے سنجیدہ حلقوں میں مقبول ترین روزنامہ تھا۔ کالم نگاروں کی ایک کھکشاں اخبار میں ملوث افروز ہوتی تھی۔ حبیب الرحمان شامی، نذیر ناجی اور عطاء الحق قاسمی کے علاوہ اے حمید، م ش اور دیگر نمایاں تخلیق کار۔ ایسے میں جہاں بیشتر کالموں کا رنگ سیاسی ہوتا اور یہ کالم بچوں کے غیر سیاسی ذہن کے لیے اجنبی ٹھیرتے، وہیں کبھی کبھار عطاء الحق قاسمی کا فکاہیہ کالم ظرافت و تشکیق کا دلچسپ و رنگین امتزاج ہوتا۔

اے حمید اور عطاء الحق قاسمی کی تحریریں کو پڑھ کر امرتسر سے ہجرت کر کے آنے والے دادا جی تو اکثر فرمایا کرتے۔ ”ایک ابھری



یقیناً ان کاموں میں کشمیری چائے کی ٹمکنیں مہک اور ہاتر خوانوں کی منگلی اور پہاڑی پھلوں کے مرنوں کی مخصوص قدرتی مٹاس ہوتی تھی۔

بہت برسوں بعد عطاء الحق قاسمی صاحب سے ملاقات ایک دلچسپ اتفاق کا نتیجہ تھی۔

میں نواز شریف کی حکومت گرا کر مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا۔ جہاں ہر طرف ایک خوف کا عالم تھا، وہیں جمہوری مکتوں میں اضطراب پایا جاتا تھا۔ بہت سے کالم نگار سرخ بادشاہ کے مانند چاند رخ بدل کر ابن الوقتوں کی صف میں کھڑے ہو چکے تھے۔ یہ نیا معاملہ نہ تھا بلکہ قلم کے سوداگر الفاظ کی گھڑی کندھوں پر ڈالے پھرتے تھے اور ان میں اکثر حالات کے مطابق بازار حیات میں دکان چاکر مطلوبہ سودا بیچنے میں مشغول ہو جاتے۔ ان پر بعد میں ایک صاحب نے ”کالم نگاروں کی قلابازیاں“ نامی کتاب بھی لکھی جس میں بارہ اکتوبر سے پہلے اور بعد کے کالم نقل کر کے ضیافت طبع اور عبرت کا انتظام کیا گیا۔

ان سب ابن الوقتوں میں عطاء الحق قاسمی ایک ایسا شخص تھا جو مخالف اسباب کے باوجود اپنے نظریے اور سیاسی فکر پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس کی سوچ سے اختلاف تو کیا جاسکتا تھا مگر اس کی استقامت اور ہاشمیری قابل رشک تھی۔

ایک روز میں ایک دوست کے ہم راہ چائے پر لاہور کے ایک ہوٹل میں گیا۔ وہیں قاسمی صاحب اپنے اہل خانہ کے ساتھ قریبی میز پر کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ اُن کو وہاں دیکھ کر مسرت کی ایک کیفیت نے مجھے آن لیا اور میں نے ویٹر کو بلا کر ایک پرچی قلم دی جس پر اُن کے کردار کی مضبوطی سراہی گئی تھی۔ پرچی پڑھ کے قاسمی صاحب کچھ ہی دیر میں ہماری میز پر آ گئے۔

تعارف ابتدائی مراحل میں تھا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے میرے تعلق اور خود اُن کے اپنے رسالے ”معاشر“ میں چھپنے والی میری چند تحریروں کے حوالے سے مجھے پہچان کر وہ بہت تپاک سے ملے۔ وہ کافی دیر پڑ جوش نگینو کرتے رہے اور پھر اُنھ کو واپس اپنی میز پر چلے گئے۔ جاتے ہوئے غلطی سے میرے دوست کی گولڈ لیف کی ڈیبا ساتھ لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنی میز پر پڑی گولڈ لیف کی دو ڈبیوں کو غور سے گھور رہے ہیں۔ ہماری نظریں ملیں تو وہ مسکرائے اور دوست کی ڈیبا واپس کرنے آئے اور پختالی میں بولے: ”عرقان، میرے رسالے کے دفتر آنا۔“ اور دوبارہ ایک بھر پور منقہ کر کے لوٹ گئے۔

مشہور امریکی ادیب اور فقرہ باز، رک نوٹن سے ایک جملہ منسوب ہے جس کا مقامی محاورے میں مہلوم کچھ یوں ہے کہ ایک متاثر کن فن پارہ پڑھ کر اُس کے ادیب سے ملاقات یوں ہی ہے جیسے مشن کی کسی عمدہ لذت پسند ڈش کو کھانے کے بعد آپ کی ملاقات بکرے سے کرو دی جائے۔

اس کے برعکس وہ اپنی تحریروں سے کہیں بڑھ کر زندہ دل، حاضر جواب اور حساس انسان ہیں۔

قاسمی صاحب کی ذات جس ایک محور کے گرد گھومتی ہے، وہ اُن کے مرحوم والد ہیں۔ ایک مرتبہ میں اُن کے ساتھ معاشرے کے وارث روڈ والے دفتر میں کھانے کی مصروفیت سے نئے توٹی وی چینل ”چیو“ کی ٹیم پر ڈرام ”ایک دن جیو کے ساتھ“ ریکارڈ کرنے آ گئی۔ قاسمی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں اُن کے ہم راہ بیٹے یا سر کے ہاں چلوں تو میں نے اسے اُن کی مصروفیت میں بے جا مداخلت گروانے ہوئے اجازت چاہی۔ بعد میں پر ڈرام چلا تو دیکھا وہ اپنے والد کی قبر پر اشک بار ہو گئے۔ اس وقت اُن کی اشک باری کا درد کچھ میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ کیوں کہ بے شمار ملاقاتوں میں انھوں نے اپنے والد کا تذکرہ والہانہ انداز میں کیا تھا۔

والد اور بچپن کے تذکرے سے ایک ننھ سا، کھٹکھریا لے بالوں والا بچہ میرے پردہ تصور پر ابھر آتا ہے۔ یہ بچہ کئی بیٹیوں اور ایک بیٹے کے بعد ایک تعویذ کی برکت سے پیدا ہوا تھا۔ اس امر کا تذکرہ بھی بچے محل نہ ہوگا کہ شدید بچہ بعد میں جس کسی کو بھی ایک صوتی بزرگ کا

عطا کر دے وہ تعویذ دیا گیا، اس کی فرین اولاد کی خواہش پوری ہوئی۔ سب سے چھوٹا ہونے کے ناطے وہ گھٹکھریا لے بالوں اور گوری چٹی رنگت وہ بچہ باپ کا لاڈلا ٹھہرا۔ باپ مذہبی رجحان والا درویش مفت آدمی تھا۔ قناعت اس کی گھٹی میں اس طرح ڈال دی گئی تھی کہ بہت بعد میں مجسم کے بعد اُسے مالی غیر سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا تو اُس نے ٹھکرا دیا۔

اس دور کے وزیر آباد میں وقت نیم خوابیدگی کے عالم میں ستارہ تھا۔ چھوٹا سا بڑا سکون شہر چند محلوں پر مشتمل تھا اور محلے ہندوں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی حویلیوں، مکانوں، دکانوں اور تھڑوں کے بیچ سے گزرتی گلیوں اور سڑکوں کے بیچ وچنگ سلسلوں کا جال تھا۔ ان گلیوں میں طرح طرح کے رنگین کردار زندگی بسر کرتے تھے۔ چوں کہ خواہشات و ضروریات کم اور ذہن رسا کی پہنچ محدود تھی چنانچہ وہ چند محلے اور گلیاں ساکنان شہر کی کل کائنات تھیں۔ گرم دو پہروں میں وہ بچہ اپنے مکان کی چھت پر چڑھ آتا اور کبھی نیچے پکڑا رنگتے رنگ سازوں اور مرچیں کوٹی عورتیں نکا کرتا اور کبھی نیلے کاٹج آسان پر تیرتی سیاہ چیلوں اور ٹھکیلیاں کرتی رنگین چنگیں معصومانہ اشتیاق سے دیکھا کرتا۔ شاموں میں لوہے کا راڈ تھاے ایک پیسے کو جسے ”ریڑھا“ کہتے تھے گلیوں میں دوڑاتا پھرتا تھا یا پٹو گرم کھلا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ کھانے کے لیے ماں کی آواز اسے گھر کے اور بلا لیتی۔

دو پہر کو کھانے میں آئے میں کندھے ٹمک والی روٹی کے ساتھ خربوزے دیے جاتے، رات کو سبزی میں مٹھی بھر گوشت ڈال کر پکا لیا جاتا۔ سردیوں میں ساواں میں اُٹلی نمکین کشمیری چائے چلتی رہتی۔

جب کبھی تفریح کا ارادہ بندھتا تو سارا خاندان چناب کا رخ کرتا جہاں وہ اپنے باپ کی پیٹھ پر بیٹھ کر تیراکی اور غسل کا لطف لیتا۔ وزیر آباد کی سنسان گلیوں میں آج بھی اس کی آواز گونج رہی ہے۔

چناب میں آج بھی ایک تو منہ باپ اپنے گھٹکھریا لے بالوں والے بچے کو پیٹھ پر بٹھائے تیر رہا ہے اور بچہ کھلکھلا کر اتنا اُٹس رہا ہے کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

قاسمی صاحب کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے تھے۔

”ہم لوگ متوسط پاکستانی گھرانے کا نمونہ تھے لیکن ہم غریب نہیں تھے کیوں کہ ہمارے گھر میں گوشت پکتا تھا۔ میری ماں اپنے حصے کی بوٹی آنے والے کسی بھی مہمان کے لیے رکھ لیتی تھی اور خود ہنڈیا کو روٹی سے پونچھ کر کھا لیتی تھی۔ یہ میری ماں کی عظمت یا پھر ہماری محرومی کا احوال تھا۔ میری ماں چوں کہ بیمار رہتی تھی اس لیے اباجی مجھے نہلاتے تھے اور جب تک میں آنکھوں میں جماعت میں چلا گیا، وہ مجھے نہلاتے رہے۔“

ایک بات میں نے قاسمی صاحب سے نہیں پوچھی کہ اُن کے اباجی کو آخری غسل کس نے دیا تھا۔

میں قصداً اس موضوع پر اُن سے بات نہیں کرتا، مبادا وہ رنجیدہ ہو جائیں۔ جب اُن کی رگوں میں ریگتے خون میں وہ حدت باقی نہیں، جذبات کی شدت آج بھی اُن کے اندر دھمال ڈالتی ہے۔

یہ عجیب آدمی ہے، جب عشق کرتا ہے تو شدید کرتا ہے اور نفرت کرتا ہے تو بھی اُس کی سرخ تپش اس کے گالوں پر کشمیر کی لال شاموں کی طرح اُتر آتی ہے۔

آخری عمر تک ان کے والدان کے ساتھ رہے۔ کبھی ناراض ہو کر گھر سے چلے جاتے کہ بڑی بہن کے ہاں جا رہے ہیں لیکن شام تک لوٹ آتے۔

ایک مرتبہ واپس نہ لوٹے۔ سب رشتے داروں کو فون کیے۔ سب نے بتایا کہ اُن کے ہاں نہیں ہیں۔ گھبرا کر کھانے میں فون کیے، کوئی اطلاع نہ تھی۔ ہسپتالوں میں جانچ کی تو میہ ہسپتال سے پتا چلا کہ اس حلیے کی ایک لاش لائی گئی ہے۔

”وہ دن میری یادداشت میں آج بھی بڑی طرح دھڑکتا ہے۔ میں چھوٹک چھوٹک کر قدم رکھتا مردہ خانے میں داخل ہوا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بیت القضا میں داخل ہوا تھا۔ جب دہشت ناک، حائل تھا۔ ایک جانب لاشیں کٹری تو دوسری جانب لٹی تھیں۔ مجھے مطالعہ لاش تک لے جایا گیا۔ اُس مردہ شخص نے دھوتی پہنی تھی جب کہ باجی دھوتی نہیں پہنتے تھے۔ چنانچہ کچھ حوصلہ والا اور میں گھر لوٹ آیا۔“

دروازہ کھولا تو باجی سامنے کھڑے تھے۔ میں رو پڑا اور اُن سے لپٹ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ بارش کی وجہ سے رات کو بڑی ہمیشہ کے ہاں ٹک گئے تھے۔ پھر مجھے دلاس دیتے ہوئے بولے۔ ”مجھے یہ تو بتا چل گیا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“ عطا صاحب نے مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ ”اب بھلا محبت جانچنے کا یہ کوئی طریقہ تھا جو باجی نے ایجاد کیا۔“

ایک روز قاسمی صاحب سگریٹ کی راکھ راکھ دان میں جھاڑتے ہوئے وحشی آواز میں بولے۔ ”جب لیا جی فوت ہوئے تو مجھے بہت مدت تک ان کی موت کا یقین نہ آیا۔ بہت دنوں تک میں اس واقعہ کا شکار رہا کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور باجی وہ سامنے سے اپنی مخصوص چال چلتے ہوئے آئیں گے اور مجھ سے کہیں گے کیا بات ہے، بڑے دنوں سے اخبار میں تمہاری خرافات نہیں چھپیں اور میں مسکرا دوں گا۔“

وہ کافی دیر خاموش رہے۔ یہاں تک کہ اُن کے دفتر کی میز پر پڑی لپ کی پیلی روشنی اُن کی آنکھوں میں جھلکانے لگی۔ ”باجی اپنی وفات کے بعد دس سال تک روزانہ رات کو متواتر میرے خواب میں آتے رہے۔ دس سال تک ہر رات۔ پھر جب میں اس سانحے سے جذباتی طور پر سمجھوتا کرنے کے کچھ قابل ہوا تو اس ملاقات میں وقت لے آئے۔“

بولتے بولتے وہ چونک گئے۔ ”عجیب بات ہے۔ بہت دن ہو گئے اباجی سے خواب میں ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“

”جذباتی“ کا لفظ اُن کی شخصیت کا سوزوں احاطہ کرتا ہے۔ وہ اپنے تعلقات میں بہت جذباتی ہیں۔ کسی سے اُن کی جذباتی وابستگی قائم ہو جاتی ہے تو اُس شخص کے ساتھ وہ جی جان سے ہو جاتے ہیں اور نگہ چینبوں کے حوالے سے زور و زنج ہیں۔ بعض اوقات احباب کو خاصا ناراض بھی کر دیتے ہیں۔

ادب میں احمد ندیم قاسمی سے وابستگی ہوئی تو انتہا تک گئے۔ ان کے ہمدین کے لیے دل میں کچھ ایسا بال آیا کہ آج تک دور نہیں ہوا۔

ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی دونوں ادب کی قابل قدر شخصیات ہیں۔ ان میں کچھ غلط فہمی پیدا ہوئی تو ڈاکٹر صاحب پر لطیف انداز میں چوٹ کر ڈالی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں لکھا۔ ”ڈاکٹر وزیر آغا کی سب سے بڑی خدمت اُن کے وہ باغات ہیں جن کے کیٹو اور، ٹے بے مثال ہیں۔“ یہاں عطا صاحب کا اثر رہا کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے کیٹو، مالٹے کے باغات کی جانب تھا۔

منصورہ احمد، احمد ندیم قاسمی کی منہ بولی بیٹی تھیں۔ کچھ ندیم صاحب کی سرپرستہ محبت اور کچھ افتاد طبع کے باعث اُن کا لب و لہجہ اور رویہ بعض اوقات ندیم صاحب کے رفقاء کے ساتھ بے باک ہو جاتا تھا۔ اس رویے نے جہاں پروین شاکر جیسی نفیس خاتون کو آب دیدہ کر دیا، وہیں اختر حسین جعفری جیسے عمدہ شاعر اور مرتجاں مرغ شخص کو بھی دکھی کر دیا۔

اسی طرح منصورہ نے عطاء الحق قاسمی کو بھی اس حد تک رنج کر دیا کہ وہ اس سے قطع کلائی پر مجبور ہو گئے۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کی وفات کے بعد منصورہ تنہا رہ گئیں۔ وہ سب لوگ جو ندیم صاحب کی وجہ سے انھیں رعایت دیتے تھے، پیچھے ہٹ گئے۔ یہاں تک کہ وہ بیمار پڑ گئیں۔ اسی بیماری میں انھوں نے اپنے اشاعتی دارے ’اساطیر‘ کا دفتر اتفاقاً عطا صاحب کے دفتر کے

برابر میں منتقل کر دیا۔

میں جب عطاء صاحب کے ہاں جاتا تو منصورہ کی مزاج پڑسی کے لیے اُن کے ہاں بھی چلا جاتا۔ چند ایک مرتبہ جب میں نے عطاء صاحب سے اُن کا تذکرہ کیا تو خاموش رہے، بالآخر دیکھی لہجے میں بول پڑے۔ ”میں کیا کروں مجھ سے منافقت نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب میں میرے آئیڈیل احمد ندیم قاسمی سے آخری دنوں میں رفقاء کو علیحدہ کرنے میں منصورہ نے ناقابل معافی کردار ادا کیا ہے۔“ منصورہ کی وفات کے بعد کہنے لگے۔ ”اگر صرف موت کی وجہ سے کسی کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو پھر بڑی بیک بھی معافی کا جواز بنتا ہے۔“

جب یہی جذباتی وابستگی سیاست میں آئی تو درمیان کا رستہ اختیار نہ کیا بلکہ کھل کر حمایت اور مخالفت کی۔ بیشتر وقت اپوزیشن کا ساتھ دیا۔ بھٹو کی حکومت میں اس کی غلط پالیسیوں کی مخالفت کی، ضیا کے ناقدین میں شامل رہے اور جب مشرف کا طوطی بول رہا تھا تو بائیں دہل اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ نواز شریف کا تو اُن کی جلاوطنی کے دور میں بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی وابستگی مستقل رہی اور حالات کی قیدی نہ بنی۔

ایک مرتبہ بہت دکھ میں کہنے لگے کہ پہلے وضع داری کا زمانہ تھا۔ کبھی سیاسی مخالفت کی وجہ سے ذاتی نوعیت کے ریکہ حصہ نہ ہوتے تھے۔ ہر ذی شعور انسان کے سیاسی نظریات اور وابستگیاں ہوتی ہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ سیاسی رائے سے اختلاف رکھنے والے دشمن طرازی سے باز نہیں آتے۔ ایک روز ایک خاتون جو اُن کے ایک دوست کی بیگم تھیں اور ایک مخصوص سیاسی جماعت سے ہم دردی رکھتی تھیں، کہنے لگیں۔ ”قاسمی صاحب آپ کب تک اُس مخصوص سیاسی راہ نما کی چھچھری گہری کرتے رہیں گے۔“

اس پر قاسمی صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ ”بھائی! ہم دونوں میں یہ قدر تو مشترک ہے۔ ہم دونوں چھچھری گہری ہیں۔ آپ ایک جماعت کی تو میں دوسری جماعت کا۔“

اس حوالے سے اُنھوں نے 1970ء کی دہائی کا ایک واقعہ سنایا۔ ایک مرتبہ اُن کا اسکوٹر چوری ہو گیا تو اُنھوں نے اس کے حوالے سے چور کے نام ایک کالم لکھ ڈالا۔ اسی کالم کے تسلسل میں کئی کالم نگاروں نے کالم لکھے جن میں پیپلز پارٹی کے ترجمان ”سادات“ کے ایک کالم نگار سہیل ظفر بھی تھے۔ چند روز بعد چوران کا اسکوٹر واپس چھوڑ گیا جس پر اُنھوں نے کالم لکھا ”شکریہ چور صاحب“ اور اس میں لکھا کہ نہ معلوم کس کالم نگار کے کالم سے متاثر ہو کر چور کو رقم آیا اور اس نے چوری شدہ اسکوٹر واپس لوٹا دیا البتہ پیپلز پارٹی پر لطیف چوٹ کرتے ہوئے لکھا کہ گمان غالب یہی ہے کہ ”سادات“ کے کالم کو ”پارٹی کا حکم“ سمجھتے ہوئے چور نے اسکوٹر واپس کیا ہے۔ چند روز بعد سہیل ظفر سے ملاقات ہوئی تو وہ ہنستے ہوئے ان کے گلے لگ گئے اور بولے ”شرارت تو تم پر ختم ہے لیکن بھئی تم نے جملہ بہت شان دار لکھا تھا۔“

ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ رات کو میں نے قاسمی صاحب کو فون کیا، اور کسی حوالے سے کوئی بات معلوم کرنا چاہی۔ وہ غالباً کہیں مصروف تھے، بات مختصر کر کے فون بند کر دیا۔ چوں کہ معلومات بہت ضروری نہ تھیں، فقط ایک سرسری حوالے کے لیے درکار تھیں، میں انھیں نظر انداز کر کے سو گیا۔

اگلے روز چھٹی تھی سو میں آرام سے سو کر اٹھا۔ موبائل پر دیکھا تو علی الصبح سے ان کی تین چار کالیں آچکی تھیں۔ کچھ پریشان ہو کر میں نے فون مایا تو اُنھوں نے دوسری گھنٹی ہی پر فون اٹھا لیا۔

فون اٹھانے کے بعد درمی حال احوال دریافت کرنے کے بعد گزشتہ رات میری جانب سے پوچھی گئی بات کا بہت تس اور وضاحت سے جواب دیا۔ جب میں نے کہا کہ یہ بات اتنی اہم تھی تو پنجابی میں بولے۔ ”عرفان! شام کو میں کہیں مہمانوں کے مصروف تھا، چنانچہ آپ کی بات کا تفصیلی جواب نہ دے پایا۔ رات کو بستر پر لیٹا تو خیال آیا کہ میری مصروفیت کو آپ نے بے اعتنائی پر محمول نہ کر لیا ہو۔ صبح اٹھنے ہی



میں نے پہلا کام یہ کیا کہ آپ کو فون کیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔

ہماری ملاقاتیں بے شمار جگہوں اور مقامات پر محیط ہیں۔ اُن کا گھر، معاشرہ کا دفتر، ملا ہو اور کراچی کے ہوٹل ہوں یا میرا گھر، ہر جگہ اُن کی ذات کا نقش موجود ہے۔

ان تمام مقامات میں میری سب سے زیادہ جذباتی وابستگی ”معاشرہ“ کے دفتر سے ہے۔ یہ دفتر نہیں، ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ داخل ہوتے ہی سامنے استقبالی میز پر خاتون سیکریٹری بیٹھی ملے گی، ساتھ میں چھوٹا سا باورچی خانہ ہے۔ استقبالی کمرے کے ساتھ راہ داری جیسا کمرہ ہے۔ کھانے کی میزنگی ہے۔ یہ کمرہ اُن کے صدر کمرے میں کھلتا ہے۔ کمرے میں ایک جانب ٹی وی ہے اور سامنے ایک میز کے پیچھے کھلی سرخ و پید رنگت اور مسکراتے چہرے والے قاسمی صاحب کسی کتاب پر جھکے یا فون پر قبضہ بارگشتہ کرتے نظر آئیں گے۔ وہ ان چند رونق لوگوں میں سے ہیں جن کے وجود سے ایک پھیکے خاموش کمرے میں زندگی کی روداد جاتی ہے۔ کمرے کے پہلو میں ایک اور کمرہ ہے جہاں قیلوے کے لیے ایک آرام دہ بستر بچھا ہے اور چند کپڑے ٹنگے ہوتے ہیں۔ اس آرام کمرے سے وابستہ ایک غسل خانہ ہے۔ ان کا دفتر گویا ایک مکمل یونٹ ہے۔

اس دفتر سے میری بے شمار یادوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اسی میز کے گرد کرسیوں پر میری مٹی بھائی سے لے کر احمد فراز تک جانے کتنے نابھہ روزگار لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ نہ جانے کتنے اجنبی شہر دوں اور قصبوں کے لوگوں سے ملا ہوں جو اُن سے ملنے چلے آتے ہیں۔ میں اور قاسمی صاحب وہاں تنہا ہوتے ہیں تو یوں کہیں، تکلف کے سبھی لباس اُتار کر ایسی ایسی دیوایاں ہمارے بیچ اترتی اور گدگداتی ہیں کہ قبضوں کی رنگین پھوار سے سبھی درود یوار دیوالی رنگ ہو جاتے ہیں۔ ابھی وہ کسی سے فون پر گفتگو کر رہے ہیں کہ مجھے دیکھ کر فون پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں۔ ”ذرا انتظار کرنا پڑے گا، جاؤ، نہ منافقت جاری ہے۔“

ایک روز میں نے اُن سے کہا کہ پرانے وقتوں میں لوگ داناؤں اور جہاں دیدہ لوگوں سے نصیحت کی فرمائش کرتے تھے، تو کیا آپ مجھے کوئی نصیحت کریں گے۔ یہ سن کر انھوں نے آنکھیں موند لیں اور انتہائی سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں اور فرمایا۔ ”میری صرف ایک نصیحت ہے اور وہ یہ کہ کبھی کسی کو نصیحت نہ کرنا۔“

خوش خوراک اور کھانے کا عمدہ ذوق بھی رکھتے ہیں۔ اعلیٰ ریسٹورانوں کے ولایتی کھانوں پر عمدہ کپے ہوئے دیسی پکوانوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہماری ایک روایت جی آر بی ہے۔ اکثر دو پہر میں جب ہم اکٹھے ہوتے ہیں تو نیلا گنبد پر واقع غلام رسول کے مٹن چنے یا دیسی مرغ کے ساتھ تیر ہوئے مرغ چنوں کا کھانا کھاتے ہیں۔ منہ میں گھل جانے والے ذائقہ دار مٹن چنے، خستہ نمکین لذیذ نان اُن کے دفتر میں منگوا لیے جاتے ہیں اور گرم گرم، کھانے کی میز پر سجا دیے جاتے ہیں جہاں کتری گئی پیاز اور دیسی کے کھنے رستے کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔ دفتر میں کوئی مہمان موجود ہوا تو وہ بھی بھرپور رغبت سے شامل طعام ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بقول اُن کے بندہ ”کوئیک ہو جاتا ہے۔“ کبھی کھانے کا پردہ گرام پہلے سے طے شدہ ہو تو وہ اپنے گھر سے کشمش، کھوئے، دیسی باداموں اور دیگر میوہ جات میں رچاؤ نقدہ دار زدہ لے آتے ہیں جو کھانے کے بعد گرم گرم کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ بعد میں الپچی والی چائے کے ساتھ وہ گولڈ لیف سلگا لیتے ہیں اور میں نیم غنودگی میں اجازت چاہتا ہوں۔

اگر کبھی زبان کا ذائقہ بدلنا ہو تو چوہر جی کے ساتھ واقع خان بابا کے ہوٹل کا مخصوص عمدہ پلٹا ہوا مٹن، کرپے گوشت، دیسی گھی میں بھاری دال یا سوندھی خوشبو والا دہی پلاؤ منگوا لیا جاتا ہے۔ اس میز پر بہت سے لوگوں کا ٹلر ٹوٹا ہے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے اُن کے

مہمان ہندو ادیب کا منہ ایسے عمدہ کھانے کو دیکھ کر یوں پانی سے بھر آیا کہ اس نے اپنے دھرم کو کچھ دیر کے لیے ہالائے ملحق رکھ کر کھانے سے روک دیا۔

اس کے علاوہ ان کے گھر میں سردیوں کی کھڑے دروازوں میں اعلیٰ درجے کے میوہ جات سے تو کئی مرتبہ لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے۔ کھانے کے معاملے میں ان کا اصول ہے کہ بہت ہوا در عمدہ ہو۔ کھانے سے زیادہ دھ کھانے پر یقین رکھتے ہیں۔

ایک روز میں ان کے ساتھ کراچی کے ایک ریسٹوران میں بیٹھا تھا کہ ایک حسین خاتون ہمارے سامنے سے گزری۔ میں نے خاتون کے حسن کو سراہا "ناشاء اللہ"۔ اس پر انھوں نے بے اختیار میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولے۔ "انشاء اللہ کہو، عرفان بھائی انشاء اللہ۔"

اسی طرح ایک مرتبہ تاسف سے سنانے لگے کہ کس طرح غلط فہمی انسان کو منزل کے قریب پہنچ کر بھی اس سے محروم کر دیتی ہے۔ "اداعلیٰ جوانی کی بات ہے۔ جہاں گردی کا خط سوار تھا۔ سو میں پھر تاجر اور تاجر کی جانکلا۔ استنبول میں ایک ترکی لڑکی سے کچھ عرصے کی بات بنی کہ بہت گفتگو کی حدود سے نکل کر آگے تک چلی گئی۔ سو وہ اگلے روز ہوٹل میں ملنے آئی اور اس نے وہاں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ رات کچھ بیت گئی تو میں دبے پاؤں اپنے کمرے سے ہر نکلا۔ سامنے ہوٹل کا ایک نوجوان ملازم کرسی میزڈا سے بیٹھا تھا اور حلق نظروں سے میرے کمرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کم بخت کی قومی غیرت کچھ غلط وقت پر جاگ گئی تھی۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ ہم دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔

رات کا پچھلا پھر گزر گیا اور اب تک گزرا انتظار کا ہر منٹ مجھ پر بہت بھاری گزرا تھا، دبے قدموں پھر کمرے سے باہر نکلا۔ عالم نہ صرف جاگ رہا تھا بلکہ ٹھنکی باندھے میرے کمرے کی جانب گھور رہا تھا۔ چنانچہ میں اُسی طرح دبے پاؤں واپس کمرے میں جا کر سو گیا۔

صبح ناشتے کے وقت میں کمرے سے نکلا تو باہر وہی ترکی نوجوان اور میری تازہ شناسا لڑکی ترکی زبان میں کچھ بھڑک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ نوجوان میری جانب اشارہ کر کے اپنی زبان میں کچھ اونچی آواز میں بولنے لگا۔ اُس کی گفتگو سن کر لڑکی کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ پیر پختی ہوئی میرے قریب آئی اور بولی۔ "تمہارے اندر غیرت کی ذرہ برابر بھی رقی نہیں۔ اس بندے نے تمہارے سامنے میرے لیے نہ جانے کون کون سے مغلطات کہے ہیں مگر تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کوئی ترک نوجوان ہوتا تو اس کے دانت توڑ ڈالتا۔ میں تم سے کسی بھی طرح کا تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔"

اس پر میں نے مسکینی سے قسم کھائی کہ مجھے تو ترکی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا۔ پھر بھی میں اس کے دانت توڑنے کی کوشش کر سکتا ہوں لیکن وہ لڑکی غصے میں پھٹکتی مجھے اور اُس نوجوان کو برا بھلا کہتی وہاں سے چلی گئی اور میں بے بسی سے اُسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔

"عورت کا حسن حس لطیف کے مالک کس مرد کو متاثر نہیں کرتا۔ کچھ ہی وقفے بعد کسی نہ کسی ایسی خاتون سے سامنا ہو جاتا ہے جس کا حسن آج بھی مہبوت کر دیتا ہے۔ جب میں ایم اے او کالج میں پڑھتا تھا، تو انارکلی میں ایک ایسی حسین خاتون سے سامنا ہو گیا کہ میں دنیا مافیہا سے بے گانہ دیکھتا رہ گیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ ایک انگریزی کے پروفیسر کی بیوی تھی۔ جب وہ پروفیسر ناراض ہوا کہ میں اس کی بیوی کو تاک رہا تھا، تو مجھے اپنے اس والہانہ پن پر بہت غصہ آیا اور شرمندگی بہت ہوئی۔ اسی طرح پروفیسر شاکر کی پوری شخصیت خوب صورت تھی۔ اس کے حسن میں مگلوئی تقدس تھا۔"

ایک روز بتانے لگے۔

"میں جوانی میں اس احساس کم تری کا شکار تھا کہ شاید میں قبول صورت بھی نہیں۔ اسی لیے جب کوئی لڑکی میری جانب متوجہ ہوئی

تھی تو میں اسے اپنی غلط فہمی پر محمول کرتا تھا۔ ابھی چند سال پہلے مجھے میرے ایک پرانے دوست نے عہد گزشتہ کی ایک لڑکی کے بارے میں بتایا کہ وہ مجھے پسند کرتی تھی اور میرے قریب آنا چاہتی تھی۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں اسے کسی اور نظر سے دیکھتا تھا۔ اگر کبھی مجھے اس کی جانب سے اس طرح کا اشارہ ملا بھی تو میں نے اسے اپنی ذاتی اختراع جانا اور ایک احساس شرمندگی کے ساتھ غلط فہمی سمجھتے ہوئے جھک دیا۔ چند روز پہلے کی بات ہے کہ جی سی یونیورسٹی میں ایک پرانی کلاس فیلو سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اب تک بوجھلے میں داخل ہو چکی تھی۔ اُس نے ملاقات کے دوران انکشاف کیا کہ اُس دور میں وہ مجھے پسند کرتی تھی۔ اُس کی بات سن کر پہلے تو میں نے اُس کے سفید ہوتے بال دیکھے، پھر اپنے اوپر نظر دوڑائی اور بولا۔ ”ایہہ سن دیکھن کی فیدہ (یہ بات بتانے کا اب کیا فائدہ)“

یہ کہتے ہوئے قاسمی صاحب نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

ایک واقعہ میں نے کچھ عرصے پہلے سن رکھا تھا۔ میں نے اُن سے اس کی تصدیق چاہی۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہم جنس پرست شاعر افتخار نسیم (افتی نسیم) شکا کو سے تعلق رکھتا تھا۔ اُسے امریکا کے کسی مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔ قاسمی صاحب سمیت پاکستان سے بھی کئی شعرا اس مشاعرے میں مدعو تھے۔

جس ہوٹل میں قیام تھا، وہاں ایک کمرے میں دو افراد کو ٹھہرانے کا انتظام تھا۔ اتفاقاً جس کمرے میں قاسمی صاحب کو ٹھہرنا تھا، اس میں ان کا رفیق افتی نسیم تھا۔ کاؤنٹر پر یہ انکشاف ہوا تو قاسمی صاحب نے کمرے میں ٹھہرنے سے معذرت کر لی۔ افتی قریب ہی کھڑا تھا۔ اُس نے جب یہ دیکھا تو ہم دردانہ لہجے میں قاسمی صاحب کی بارعرب شخصیت دیکھتے ہوئے اُن سے مخاطب ہوا۔ ”میں گے ضرور آں پر فکر نہ کرواغا نہیں“ (میں ہم جنس پرست ضرور ہوں مگر اندھا نہیں)۔

قاسمی صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے محنت واقعہ کی بھرپور تردید کی اور اصل حقائق بیان کیے۔

”میں شکا کو گیا ہوا تھا، وہاں ایک جگہ افتخار نسیم سمیت چالیس پچاس کے قریب لوگ مدعو تھے۔ کسی نے بتایا کہ گزشتہ رات افتخار نسیم زمانہ لباس میں محفل میں آگیا تھا۔ یہ سن کر میں نے محفل سے رخصت کی اجازت لی اور اپنے کمرے میں آکر سر درد کی دوا کھا کر سو گیا۔ میں ایسے لوگوں کو ناپسند نہیں کرتا۔ غالباً یہ وقتی کج روی اور جینیاتی ترکیب کے غلام ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہم دردی کے قابل ہیں۔ میں ان کے جینیاتی فلسفے سے کبھی اختلاف کرتا ہوں اور ان کے لیے میرے دل میں افسوس اور رحم کے سوا کچھ نہیں۔“

ہاسٹیلچا، ایام گزشتہ سے رومانوی وابستگی اُن کی شخصیت کا ایک بہت نمایاں پہلو ہے۔ وہ عام زندگی گزارتے ہوئے ایک دم ماضی کے دھند لکوں میں کھو جاتے ہیں۔ بچپن اور جوانی کی ان سرسبز پہاڑی چوٹیوں پر چھائے وقت کے روئی کے گالوں جیسے بادلوں کے اندر سے ایک بچے کے کھیلنے کی معصوم آوازیں آتی ہیں۔

امر ترس کی دھندلی گلیوں میں تانگے میں جے گھوڑے کی ٹاپیں ہیں، دذریا باد کی ایک مسجد سے صبح ازل کہ ہر صبح، صبح ازل کا پرتو ہے کے وقت بلند ہوتی اذان کی ٹٹھی مدھر آواز ہے، ماڈل ٹاؤن کی سڑکوں پر دوڑتے نیلے بسریٹا اسکوٹر کی پھٹ پھٹ کا شور ہے، چوڑیوں کے چھٹکے اور مٹرمٹم نسوئی قہقہوں کی جل ترنگ سنائی دیتی ہے۔

امریکا کے ایک ہوٹل میں ہندو سکھ دوستوں کا ہلا گلا ہے، اور ایک قبرستان کی خاموشی میں صدائے اشہد اللہ ہے۔ ماضی ان کی گفتگو، کالموں اور دیگر تخلیقی کاموں میں یوں وردو کر جاتا ہے جیسے کئی چاندنی راتوں کو قرآن کی منجھ آئینہ جھیلوں پر بیاں اُترا کرتی ہیں۔

ایک روز کہنے لگے کہ لمحہ موجود کے گزرنے کا اس لیے بھی انتظار کرتا ہوں کہ آئندہ دن اسے ماضی کا وقت جان کر اس کی یاد سے

مخلوط ہوؤں۔

ان کا تاملیجا لوگوں کی یہ نسبت مخصوص ادوار اور جگہوں سے وابستہ ہے۔ مگر نہ ابھی تو ان کے بیشتر دوست بساط حیات پر اپنے قدموں کی چالیں چلتے ہیں۔

پرانے دوستوں سے ان کے وہ پہلے سے مراسم نظر نہیں آتے۔ ایک روز اس کی توجہ میں ایک واقعہ سنایا۔ افسانہ نگار منشا یاد ایک مرتبہ اُس دور کے مشہور تاریخی، ادبی نگار نسیم جازوی کے پاس گئے۔ منشا یاد کی جوانی کا زمانہ تھا، نسیم جازوی صاحب پیری کی چٹان پر بیٹھے تھے۔ منشا یاد نے اُن سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ انھیں اپنے حلقہ یاروں میں شامل ہونے کا اعزاز بخش دیں۔ اس پر جازوی صاحب کہنے لگے۔ ”میر خوردار! یہ عمر نئی دوستیاں بنانے کی نہیں، بلکہ پرانی دوستیوں پر نظر ثانی کرنے کی ہوتی ہے۔“ یہ واقعہ سن کر اپنے تجربے و مشاہدے کی بنیاد پر کہنے لگے کہ بچپن کے دوستوں سے تب تک دوستی بھرپور انداز میں قائم رہتی ہے جب تک وہی سلیخ ایک رہے یا دلچسپی کا شعبہ اور سلسلہ روزگار ایک ہو۔

اس کے بعد بتانے لگے کہ جب کبھی ان کی اپنے بچپن کے دوستوں سے ملاقات ہوتی تو کچھ ہی دیر بعد کرنے کو کوئی بات نہیں رہتی۔ ان سے محبت اور اپنائیت کا ایک تعلق تو قائم رہتا ہے مگر دوستی میں وہ پہلے سادہ مادی نہیں رہتا۔ ہوتا کچھ یوں ہے کہ انسان کسی مخصوص سلیخ پر پختہ چکا ہوتا ہے جب کہ دوست کسی دوسری سلیخ پر زندگی گزارتے ہیں۔ رجحانات اور خیالات کا تقاضا مسلسل رابطے میں موبہوم سی رکاوٹ سے کچھ بڑھ کر ہی ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک روز کہنے لگے کہ مراد اور عورت کی دوستی تا دیر نہیں چلتی۔ یہ تعلق کی کسی نچ پر رومان کا رنگ اختیار کر لیتی ہے یا اس پر دوستی سے ہٹ کر دیگر عوامل اثر انداز ہو جاتے ہیں۔

ایک شام ہم دونوں کراچی میں سمندر کے اندر تک چلے جاتے ایک دلکش ریستوران میں بیٹھے تھے۔ سمندر کی لہروں پر چھوٹی کشتیوں کی روشنیوں کی جھللاہٹ اور چاند کی راہبلی چاندنی میں نیچی پرواز کرتے سفید پرندے اسے ایک خوب صورت شام بنا رہے تھے۔ ابھی کھانے میں دیر تھی چٹاں چادر اور حرکتی کپ شپ جاری تھی کہ سمندر کی جانب دیکھتے ہوئے وہ گویا ہوئے ”مجھے سمندر میں سیر کرنے سے بہت لڑکھٹا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ڈوب جاؤں گا۔ ایک مرتبہ میں چند دوستوں کے ساتھ ایک کشتی میں تھا کہ سچ سمندر وہ چٹکولے کھانے لگی۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔ میرا ایک دوست قہقہہ لگاتے ہوئے بولا مجھے تو تیرنا آتا ہے، البتہ تم سب ڈوب جاؤ گے۔“ یہ سن کر میں نے اُس بد بخت کو جواب دیا۔

”اوپر کے تو تم بھی فرق صرف اتنا ہے کہ ہم ادھر ہی ڈوب جائیں گے اور تم کوئی ایک کلو میٹر دور جا کر ڈوب جاؤ گے۔“ چٹکولوں پر بات چل نکل تو ایک اور واقعہ سنائے لگے ”ایک مرتبہ میں اور کل زارہ افاجو دھری فوکر جہاز میں سفر کر رہے تھے کہ اچانک فلائٹ ناہموار ہوئی اور جہاز چٹکولے کھانے لگا۔ یہ جھٹکے اتنے بڑھے کہ لوگوں نے ہا آواز بلند مانیں پڑھنا شروع کر دیں۔ جہاز نے چند ایک غوطے لیے تو کل زارہ افاجی آواز میں مجھ سے مذاق کرنے لگا اور ہم دونوں قہقہے لگنے لگے۔ وہ کہنے لگا ”یار پیچھے ہریالی دیکھو۔ کم از کم ہاری قبریں بڑھنا ہزاروں میں ہیں گی۔“ وہ بولتا جاتا اور ہم قہقہے لگاتے جاتے۔ اتنے میں ہم نے ارد گرد دیکھا تو لوگ ہمیں خشکیں نظروں سے گمہ رہے تھے اور زیر لب یقیناً اہلکار کہہ رہے تھے۔ کچھیں نشستوں سے تو چند ایک مسافروں نے باقاعدہ بکواس بھی کی۔ خدا خدا کر کے جہاز بخیریت لینڈ کر گیا۔“

”ماشائے اللہ تو آپ کو دیکھ کر ہی نظر آ رہا ہے کہ جہاز بخیریت لینڈ کر گیا“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اصل بات تو اس کے بعد ہے۔“ حاکمی صاحب نے گویا انگٹوں میں جھنسن پھونک دیا۔

”وہ کیا؟“



"وہ یہ کہ اس موضوع پر میں نے کالم لکھا اور اس میں یہ سارا واقعہ مزاحیہ انداز میں لکھ کر آخر میں لکھا کہ اس فلاسٹ کے تمام مسافروں میں درحقیقت سب سے زیادہ خوف زدہ ہم دونوں تھے۔ ہم فقط اپنے خوف کو لپیٹے مار رہے تھے۔"

اسی طرح اپنے ایک فنکشن میں جب ایک صاحب نے اُن سے پوچھا کہ انھوں نے ایچے سفر کیے "شرقی آوارگی" جیسا اور سفر کیا۔ کیوں نہیں لکھتے تو بولے "سیاحت تو آج بھی کرتا ہوں مگر اب مجھ میں "حیرت" ختم ہو گئی ہے۔ یہ حیرت ہی ہے جو شوق کو ہوا اور نظر کو تازگی دیتی ہے۔"

بچے کی حیرت ہی اُس کی استاد ہوتی ہے۔ حیرت کی موت کا اس سے بہتر اور کیا تذکرہ ہو سکتا ہے۔

اپنے ایک اور دوست منی بھائی مرحوم کو بہت یاد کرتے ہیں۔

منی بھائی اور ان کی بیگم بیوٹن امریکا کے ایک بڑے گھر میں رہتے تھے۔ قاسمی صاحب اس گھر میں ان کے مہمان ہوئے تو منی بھائی نے ان کو اپنے گھر کا ایک کمرہ دکھایا۔ کمرے میں بچوں کے کھینے کا سامان بہت سیٹے سے دھرا تھا اور درود پوار کو بچوں کے مخصوص انداز سے رنگا اور سجایا گیا تھا۔ بچے قاسمی صاحب کو نظر نہ آئے تھے چنانچہ بچوں کا پوچھ بیٹھے کہ وہ کہاں ہیں۔

اس پر منی بھائی خاموش ہو گئے۔

قاسمی صاحب نے دوبارہ پوچھا تو منی بھائی نے دھیمی آواز میں کہا کہ اولاد کی نعمت سے محروم ہیں اور اولاد کا کوئی امکان نہیں۔ پس یہ کمرہ ان کی اس حسرت کی علامت ہے کہ اگر ان کے ہاں اولاد ہوتی تو وہ اس کمرے میں رات لگائے رکھتی۔ اس کے بعد شعر پڑھا۔

ہر گھر میں ایک ایسا کونا ہوتا ہے  
جس میں چھپ کے ہم کو رونا ہوتا ہے

قاسمی صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے عام راقف کار بھی آگاہ نہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مذہب اور معاشرتی حوالے سے روشن خیالی اور کشادگی پہلے سے بڑھ گئی ہے۔

ان کی اپنی ولادت تصویر کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ یہ ضعیف القہو دی نہیں تو اس امر کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ اس پر کہنے لگے کہ آج بھی بہت سے واقعات ماورائے عقل ہیں اور انسانی سائنسی جستجوچوں کے ابھی مقام کامل تک نہیں پہنچی اس لیے ان کے اسرار جان نہیں پائی۔ مگر س کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ان کے ایک دوست نے کہا "بسم اللہ پڑھ کر بھڑک پڑو، وہ ڈنک نہیں مارے گی۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اس عالم نے ایسا ڈنک مارا کہ میری چیخ نکل گئی۔"

پھر ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ ہمارے ہاں روایت ہے کہ جب کسی کا دم آخر میں ہوتا ہے تو اس موقع پر اس کے سر پر سورۃ یسین پڑھی جاتی ہے تاکہ اس کی مشکل آسان ہو، مگر وہ اسے اپنی موت کا خطبہ اشارہ سمجھ لیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ دل چھوڑ بیٹھتا ہے اور انتقال فرما جاتا ہے۔ پھر ہنس کر کہنے لگے۔ "کیسی عجیب بات ہے ہم لوگ ایک زندگی بخش آیت سے موت کا کام لیتے ہیں۔"

جب ان کے برادر بزرگ ضیاء الحق قاسمی صاحب کا انتقال ہوا تو یہ کراچی آئے۔ جب میں نے ان کو رنجیدگی کے اندوہ سمندر میں ایسا غوطہ زن دیکھا کہ پہلے بھی نہ دیکھا تھا۔

بعد ازاں ایک روز میرے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ وہ شام ایک امانت ہے۔ پس اس میں خیانت ممکن نہیں۔ اب اس اشارے میں غالباً کوئی مضائقہ نہیں کہ اس سامنے کے بعد سے رنجیدگی کثر ان کو اپنے غم حلقے میں لیتی ہے۔ اب رنجیدہ کر دینے والی غزلیں، یہاں تک کہ قلمی گانے بھی نہیں سن سکتے۔

ناہ روزگار مزاجیہ ادا کار چارلی چپلن کا یہ قول معروف ہوا۔ ”مجھے ہارش میں چلنا اس لیے اچھا لگتا ہے کہ اس طرح میری آنکھوں سے ہتے آلود دنیا کو نظر نہیں آتے۔“ چارلی دنیا کو ہنسا کر تھک جاتا تھا اور گھر لوٹ آتا تھا تو ساری ساری رات اپنی ماں کے قدموں میں بٹھارہا تھا وہی ماں جس نے غربت اور شدید تنگی میں اپنے بیٹے کو محبت اور محنت سے پالا تھا، مگر اب جب بیٹا کام یاب اور معروف ہو گیا تو ایک دہائی عارضے کے باعث اُسے پہچان نہیں سکتی تھی۔

یہ المیہ تمام بڑے تخلیق کاروں، مزاح نگاروں کے ساتھ رہا کہ دنیا ان کی باتوں پر تالیاں بجا کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتی ہے آخر میں اسٹیج کی چکاچوند میں وہی نابز تہا کھڑا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح قاسمی صاحب کی زندگی میں چند حادثات ایسے ہیں جن کی یادیں لوٹ لوٹ آتی ہیں اور انھیں رنجور کرتی ہیں۔

قاسمی صاحب کی ادب پر گہری نظر ہے۔ ان کے والد ادب کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، اپنے بچوں میں بھی یہی ذوق پیدا کرنے کے لیے گھر میں رسالے، کتابیں لے آتے تھے۔ وہ کہتے تھے ”صحیح زبان کا خیال رکھو، جو بھی زبان بولو درست بولو، ورنہ زبان بدو عادی ہے۔“ ادب کچھ ایسے ان کے مزاج کا حصہ بنا کہ اکثر کہتے ہیں کہ انھوں نے کبھی کسی صنف میں ارادی محنت نہیں کی بلکہ کوئی بھی ہاتھ ہے جوان سے یہ سب کراتا ہے۔ بلکہ یہ ایسا کام ہے جو وہ اپنی خوشی کے لیے کرتے ہیں اور اس حصولِ مسرت کا انھیں معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔

کنفیڈیشن نے کیا خوب کہا تھا۔ ”کوئی ایسا کام تلاش کرو جس سے تمہیں عشق ہو، تمہیں ساری زندگی کام نہیں کرنا پڑے گا۔“ ایک زمانے میں قرۃ العین حیدر کے ناول ”آگ کا دریا“ کے بارے میں یہ متنازع بات مختلف مکتبہ ہائے فکر میں وجہ بحث بنی کہ یہ ناول نہیں بلکہ تاریخ کو خوب صورت نثر میں دستاویز کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے بات ہوئی تو میں نے شکیل عادل زادہ اور دیگر چند بڑے ادیبوں کا حوالہ دیا جو اس تبرے کو درست مانتے ہیں۔ اس پر قاسمی صاحب نے بھی اتفاق کیا اور اضافہ کیا۔ ”اردو ناول میں قرۃ العین حیدر سے بڑا کوئی نام نہیں۔ وہی یقیناً سب سے قد آور ادیب ہیں۔“ آخر شب کے ہم سفر نے تو مجھے بے اختیار کر دیا۔ ”چاندنی بیگم“ بھی بہت بڑا ناول تھا۔ اس کا نام کچھ اور ہونا چاہیے تھا کیوں کہ قاری اسے چاندنی بیگم کے گرد بٹنا گیا ناول سمجھ کر پڑھنا شروع کرتا ہے، جب چاندنی بیگم ابتدائی صفحات میں فوت ہو جاتی ہے تو قاری اس میں اپنی دلچسپی کھو بیٹھتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی نثر نے جہاں ان کی روح کو بالیدگی عطا کی وہیں اقبال کی شاعری نے دم بخود کر دیا۔

ان دو بڑے ناموں کو دیگر سے ممتاز اور قد آور قرار دیتے ہیں۔ عظیم ادیب کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہی تخلیق کار عظمت کے درجے پر فائز ہو سکتا ہے جسے عوام و خواص دونوں پسند کریں۔ اس خیال کی دلیل کے طور پر وہ ٹیگور، غالب، شیکسپیر، رومی، سعدی اور میر کا حوالہ دیتے ہیں۔

”کوئی باصلاحیت تخلیق کار نظر انداز نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں ایک شعر تو چھوڑو، ایک مصرع والے شاعر بھی موجود ہیں جنہیں شہرت ملی۔“ دو ٹوک انداز میں قاسمی صاحب نے ایک روز میرے ساتھ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے گویا فیصلہ سنایا۔ پھر ٹی ایس ایلیٹ کا قول سنایا۔ ”جب کوئی کلاسیک پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے سے پہلے اور بعد کے سو سال کھا جاتا ہے۔ یہاں اقبال سب پر بازی لے گیا۔ اُس خورشید کی آب و تاب کے سامنے سب ستارے ماند ہوئے۔ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے بحرِ پیدا۔“

غالب بھی انھیں پسند ہے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے ”غالب کی واحد مشکل یہ ہے کہ اُس کے کئی اشعار کی تشریح کے لیے ہاتھ کا ”کیشن“ بٹھانا پڑتا ہے۔“

ایک روز میں نے انھیں اپنا ایک تجربہ سنایا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ اسلام آباد کے ہوٹل میں ایک امریکی سے میری کافی اچھی مپ شپ اور دوستی ہو گئی۔ یہ بہت پہلے کا واقعہ

وہ امریکی کوہ نور دی کا شوق رکھتا تھا اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں کوہ پیالی کے ارادے سے آیا تھا۔ پہلا ہر ایک معصوم اور بے ضرر جوان تھا۔ اس کے ہاں مخصوص امریکی بے تکلفی اور مزاح بدرجہ اتم موجود تھا۔  
ہوٹل میں اس کا قیام چند روزہ تھا۔

یہ چند روز گزرے تو روانگی کی صبح آن پہنچی۔ میں نے ناشتے کے بعد اسے نیک خواہشات سے رخصت کیا اور اپنے معمول کے کام سے نکل پڑا۔

اگلی صبح میں ناشتے کے کمرے میں پہنچا تو اسے وہاں پا کر حیرت کا شکار ہو گیا۔  
مجھے اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ جھینپ گیا۔ میں اس کی میز پر آن بیٹھا تو وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔“  
”تمہارا ذاتی معاملہ ہے، یقیناً تم نے سوچ کر فیصلہ کیا ہو گا۔“  
”نہیں یاں، تمہارا ملک یقیناً ایک خطرناک ملک ہے۔“  
”وہ کیسے، کیا ہوا؟“

”بات یوں ہے کہ میں نے یہاں سے اپنی منزل کا قصد کیا۔ اس کے لیے جب میں بس اسٹینڈ پہنچا تو وہاں ایک بس تیار کھڑی تھی۔ میں وہاں واحد غیر ملکی تھا۔ مجھے بہت عزت دی گئی اور سب سے اگلی نشست خالی کروا کر ڈرائیور کے برابر میں بٹھار دیا گیا۔“  
”پھر؟“

”پھر یہ کہ جب میں نے ڈرائیور کی جانب دیکھا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بھیگا تھا۔ ڈرائیور مجھے دیکھ کر مسکرایا، اور دو انگلیوں سے فتح کا نشان بنا کر اس نے بس کو ایک جھٹکے سے اشارت کیا اور یوں مرکزی شاہ راہ کی راہ کی جیسے گھوڑے کو ریس کے لیے ایڑ لگاتے ہیں۔“  
”واقعی؟“

”کمراسٹ کی قسم۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تمہارے ملک کی سڑکیں یک رو یہ ہیں۔ چنانچہ جب ہم روانہ ہوئے تو سامنے سے ٹریفک آرہی تھی۔ یہاں تک تو خیر تھی۔ لیکن اس نے بس کا پریشہ ہارن آن کیا، دو نیچے گانے لگائے اور ریس دے دی۔ کچھ دیر تو خیریت سے گزری۔ پھر اس نے ایک گاڑی کو اس طرح سے اوور ٹیک کیا کہ ہم سنے سے آتی ہوئی بس کو گولی کی طرح جھوٹے ہوئے گزر گئے۔ جب میں نے ڈرائیور کی جانب دیکھا تو وہ میری جانب دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ بس اس کے بعد توجہ ہو گئی۔ ایک دو یہ سڑک، ریس لگاتی جھوٹی بس مخالف سمت سے آتی بھاری گاڑیاں اور ان سے چھو کر بچتی ہماری بس۔ اس دوران جب بھی کسی بڑے حادثے سے بچتے تو میں ڈرائیور کی جانب دیکھتا، وہ بدستور میری جانب دیکھتے ہوئے مسکرا رہا ہوتا۔ بس ایک ہی بات میرے لیے تسلی کا باعث تھی۔“  
”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ چون کہ ڈرائیور بھیگا تھا، سو میں نے سوچا کہ یہ میری غلط فہمی ہے، وہ میری جانب دیکھ رہا ہے شاید وہ سامنے ہی دیکھ رہا ہو۔ مگر اس کا مسکراتا میری سمجھ سے باہر تھا۔“

”شاید نسوار کھارہا ہو، اس لیے مسکراتا دکھتا ہو۔“  
”بہر حال جب ہم منزل پر پہنچے تو میں سب سوار یوں کے بعد آخر میں بس سے اتر اور اس ارادے سے اتراک۔“  
”مسک۔“

”کہ لعنت ہے کوہ پیالی پر، زعمی ہے تو سب کچھ ہے۔“





اُن سے گزارش کی گئی کہ دوسرے مصرعے کے آخر میں لفظ ”مجھے“ کی کیا توجیہ ہے تو فرمانے لگے۔ ”مجھے“ دو لفظ ہے اور اس کا یہاں آنا برعکس اور لازم ہے۔“

قاسمی صاحب مسکراتے ہوئے اپنے اہل کے دفتر کی کھڑکی سے باہر سرسبز درخت دیکھ رہے تھے۔  
اس کے علاوہ ایک اور تخلیق کار الف الحارث ملاقات رہی۔

اُن کی ہیئت کچھ ایسی تھی کہ شیو بیڑی ہوئی ہوتی اور پا جامہ پیچھے سے پٹا ہوتا۔ زبان دان تھے اور اس میں کئی اختراعات کے موجد۔ مثال کے طور پر یہ انہی کی دریافت تھی کہ ”مٹی دودھ پیتی ہے“ کی زبان گری ہوئی ہے۔ اس کے بجائے فرماتے ”مٹی دودھ لیوتی ہے“ زبان کے حوالے سے درست ہے۔ مٹی کے دودھ بہانے کے علاوہ بھی جانوروں کے مختلف افعال کی زبان کی کچھ ایسی تصحیح فرمائی کہ یہ تحقیق انہی سے شروع اور انہی پر ختم ہوئی۔“

ان کے حلقہ احباب میں ڈاکٹر فضل الرحمان لاہوری بھی رہے جنہوں نے اپنے لیے ”محبیہ اردو“ کا خطاب تجویز کر رکھا تھا۔  
برسبیل تذکرہ جب قاسمی صاحب ڈاکٹر صاحب کو یاد کر رہے تھے تو مجھے وہ بات یاد آگئی کہ ایک موصوف بوجہ بجز اپنے نام کے ساتھ ”شک اسلاف“ لکھتے تھے۔ اُن کی پیروی میں حباب نے بھی اُن کے نام کے ساتھ ”شک اسلاف“ لکھنا شروع کر دیا۔  
خیر یہ تو جملہ ہائے معترضہ تھے۔ ڈاکٹر فضل الرحمان کی تصانیف میں نمایاں ترین ”مسکوں کے لطیف“ تھے۔ اُن کی خواہش صدارتی انتخاب لڑنے کی تھی اور انہوں نے اپنی کاہنہ بھی سوچ رکھی تھی جس میں منو بھٹی کو وزارت اطلاعات اور عطاء صاحب کو وزارت تعلیم مہینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

مونیچس قاسمی صاحب کی کم زوری ہیں۔ ایک مرتبہ حنیف رے مرحوم نے دل برداشتہ ہو کر بیچل پارٹی چھوڑی تو اعلان کر دیا کہ وہ پارٹی میں کبھی واپس نہ آئیں گے اور لوٹ آئے تو اپنی مونچھیں کنوا دیں گے۔ شوخی قسمت کہ انہیں کچھ ہی عرصے میں پارٹی میں لوٹ آنا پڑا۔ اس پر قاسمی صاحب نے ایک لطیف کالم لکھا۔ ”راے صاحب مونچھوں سمیت“ اسی طرح ایک مرتبہ انہوں نے اُس وقت کے وزیر معاشیات نوید قمر صاحب جو اپنی نوابی طرز کی نوک دار مونچھوں کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے، کو مشورہ دیا۔ ”نوید قمر صاحب جتنی محنت اپنی مونچھوں پر کرتے ہیں اگر اتنی پاکستان کی معیشت پر کریں تو ہم نہ جانے کتنی ترقی کر جائیں۔“

ایک مرتبہ میں اور قاسمی صاحب کراچی کے میریٹ ہوٹل میں سردیوں کی رات میں کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہوٹل کے ریستوران کے جھگڑاتے ماحول میں پس منظر میں گھلتی، سانہ ریل کے تاروں کو چھیڑتی موسیقی اور پرانی فلموں کے حسین گانے ایک خواب ناک اور کیف آگیاں ماحول بن رہے تھے۔ اندر کا گرم ماحول ہوٹل کے شیشوں کو دھندلا کر رہا تھا۔ اس دھند کے پار اوس میں نہائے سرسبز پودے روشنیوں میں جھللا رہے تھے۔ ہم پرانی فلموں کی بات کر رہے تھے۔ پس منظر میں محمد رفیع اور لانا مینگیکر کا ڈونسٹ ماحول کو رنگین کر رہا تھا۔ یکدم قاسمی صاحب کی آنکھیں ایک جانب مرکوز ہو گئیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ جب میں نے اُس جانب دیکھا تو ایک نوجوان مرد گلوکار پہلے رفیع کی آواز میں گاتا تھا اور پھر وہی گلوکار کی نسوانی آواز میں کمالی مہارت سے گاتا تھا۔ میں اس سے پہلے کئی مرتبہ وہاں کافی پی چکا تھا مگر اُس گلوکار کی اس حیران کن مہارت کا مشاہدہ نہ کر پایا تھا جسے قاسمی صاحب نے چند لمحوں میں لوٹ کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ سنسنش اور کچھ حیرانی سے میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ ابھر آئی۔ قاسمی صاحب نے پہچانی میں سرگوشی کی ”خدا کے رنگ نرالے ہیں۔“

ہم دونوں کو اپنی جانب سنسنش نظروں سے مسکراتا دیکھ کر نوجوان گلوکار کچھ ہنک گیا اور رفیع، ہا کی جگہ اس کی آواز پکے رنگ سے مماثل ہو گئی۔

میں ایک عشاءے میں مدعو تھا۔ اس کھانے میں علمائین شہر کے علاوہ نمایاں ادیب اور دانشور بھی مدعو تھے۔ قاضی صاحب لکھی دعوت تھی لیکن چند دیگر مصروفیات کی بنا پر وہ نہ آ پائے۔

عشاءے جاری تھا کہ ایک خوش شکل خاتون ہماری میز پر تشریف فرما ایک نام در ادیب کے پاس چلی آئیں اور ان کی قربت میں

پہل کر محبت سے اُن کی پیشانی کو چوم لیا۔  
اگلی صبح میں اور قاضی صاحب ایک جگہ ناشتے پر مدعو تھے۔ ناشتے کے بعد واپسی کے لیے میری گاڑی میں بیٹھنے لگے تو میں نے کونٹری رات کا ماجرا سنا ڈالا۔ قاضی صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا تو موضوع گفتگو شہری سیاست اور تہذیبی ارتقاء پھرا۔ سفر طویل تھا چنانچہ خوب سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ ابھی بات کسی سنجیدہ موڑ پر تھی کہ قاضی صاحب خاموش ہو گئے، پھر گویا ہوئے۔ ”بوسہ پیشانی پر لیا تھا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
کچھ توقف کے بعد گفتگو جہاں سے نوئی تھی وہیں سے جڑ گئی، سفر نصف سے زیادہ طے ہو گیا تو قاضی صاحب دوبارہ خاموش ہو گئے۔ پھر اچانک سوال کیا۔  
”خاتون خوش شکل تھی؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ قاضی صاحب نے لمبی سانس بھری اور عصری ادب پر دانشورانہ تبصرہ شروع کر دیا۔  
بحث نثری انحطاط سے ہوتی ہوئی عمومی معاشرتی تنزل تک آن پہنچی، یہاں تک کہ سفر اختتام پذیر ہوا۔ گاڑی سے اتر کر میں الوداعی مخاطب کے لیے اُن کی جانب بڑھا تو گلے ملتے ہوئے انہوں نے سرگوشی کی ”آج کل کی خواتین کا کوئی حل نہیں۔ انہیں مستحق اور غیر مستحق کی کوئی پہچان ہی نہیں“ اور چل دیے۔

ایک مرتبہ قاضی صاحب ایک ادبی میلے میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لائے۔ ہر جانب سے دعوت نامے تھے۔ پرے شامساؤں کا سیلہ تھا اور بیچ میں ان کی باغ و بہار شخصیت۔  
پرانے شامساؤں کے حوالے سے ایک قصہ ہے۔

ایک خاتون پاستو جانور خریدنے کے لیے ایک دکان پر پہنچی۔ دکان پر ہر طرح کا جانور تھا۔ انھی میں ایک بولنے والا تانبا بھی تھا۔ دکان دار نے ایک اچھے سلازمین کی طرح توڑنے کی خوبیاں بیان کیں۔

”یہ تو تانبا ذہانت گفتگو میں مہارت رکھتا ہے۔ کم جگہ گھیرتا ہے۔ خوراک کا خرچہ کم ہے اور اس کی باتوں سے دل بھی بہلا رہتا ہے۔“

”اس کی قیمت کیا ہے؟“ خاتون نے دریافت کیا۔

”نقطہ ایک سو روپے۔“

”وہ کیوں؟ اتنی کم کس لیے؟“ خاتون نے حیرت سے پوچھا۔

دکان دار نے جھپکتے ہوئے جواب دیا۔ ”در اصل یہ اس سے پہلے ایک قحبہ خانے میں رہا ہے اس لیے کبھی کبھار تانبا پسند یہہ جلتے ہیں بول جاتا ہے۔“

یہ سن کر خاتون نے تذبذب سے توتے کو دیکھا جو انتہائی سعادت مندی سے سر جھکائے کن اکھیوں سے خاتون کو نیک رہا تھا۔

”آپ کا جی بہلا رہا ہے گا اور اچھی تربیت سے اس کی یہ خامی بھی دور ہو جائے گی۔“ دکان دار نے خاتون کو تسلی دی۔

خاتون نے پرس سے سو روپے نکالے اور توڑتے کوہنجرے سمیت گھر لے آئیں۔  
نئے گھر آ کر تو تا کچھ دیر تو خاموش رہا لیکن خاتون کی جانب سے ناز برداری کرنے پر اٹھلا کر بولا۔ ”واہ بھی نیا گھر، نئے کمرے  
اور نئی نایکا!“

یہ سن کر خاتون چونک گئیں۔ پھر دکان دار کی اچھی تربیت والی بات کا سوچ کر خاموش ہو گئیں۔  
پورا دن گزر گیا یہاں تک کہ شام کو خاتون کی دونوں بیٹیاں گھر لوٹیں تو ان کو دیکھ کر تو تا بے اختیار بول اٹھا۔  
”واہ بھی، نیا گھر، نئے کمرے، نئی نایکا اور نئی بیسوائیں۔“  
یہ سن کر خاتون اور ان کی بیٹیاں سٹ پنا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں اور خاموش ہو گئیں۔  
اتنے میں خاتون کے شوہر جھکے ہارے گھر لوٹے تو ان کو دیکھ کر تو تا چپک اٹھا۔  
”واہ بھی نیا گھر، نئے کمرے، نئی نائک، نئی بیسوائیں اور آبا دہی پرانے چہرے۔ آداب بشیر صاحب!“  
تفہن برطرف، قاسمی صاحب سے میں نے اگلی دوپہر کھانے کے لیے اصرار کیا تو وہ بہت شفقت سے میری دعوت پر آمادہ  
ہو گئے۔

کراچی پر بے امنی کا بھوت سوار تھا۔ ابھی پچھلے روز ہی قاسمی صاحب نے اپنے کالم میں کراچی آمد سے پہلے اپنی تیاری کا تذکرہ  
کیا تھا جس میں یہ سستا ہوا اور موٹائل فون خریدنا بھی شامل تھا۔  
میں انھیں لینے کے لیے پہنچا تو وہ ہوٹل کے پائیں باغ میں سمندر کے کنارے رنگارنگ لوگوں میں گھرے سگریٹ سے لطف اندوز  
ہورہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں نرم اپنائیت بھری محبت عود کر آئی۔  
انھوں نے سگریٹ کے چند کش لیے اور جیب سے ہوا نکال کر اس میں سے کرنسی نوٹ اور ضروری کاغذات علیحدہ کر کے کوٹ کی  
اندرونی جیب میں ڈالنے لگے۔ پھر کوٹ اُتار کر اپنے ایک عزیز کے حوالے کیا کہ وہ اسے کمرے میں چھوڑ آئے۔ اس دوران مسکراتے ہوئے  
کہنے لگے۔ ”باہر ہم نے لٹ تو جانا ہے ہی، تو کیوں نہ ضروری چیزیں ہوٹل میں چھوڑ جائیں۔“  
میں نے ان سے ملٹی اتفاق کرتے ہوئے بات میں استفہامیہ طور پر اضافہ کیا۔ ”آپ نے کل رات فائرنگ کی آواز سنی تھی؟“  
”یہ شادی والوں کو فائرنگ نہیں کرنا چاہیے“ وہ تاسف سے بولے۔  
”وہ شادی کی نہیں، دہشت گردی کی فائرنگ تھی“ میں نے وضاحت کی۔  
”ہاں۔ لیکن یہاں تو نارگٹ کلنگ ہی ہوتی ہے نا؟“  
”ضروری نہیں۔ حال ہی میں کچھ قاتل پکڑے گئے ہیں جنھوں نے اپنے اعترافی بیان میں انکشاف کیا ہے کہ انھیں کوئی دیا  
جاتا تھا، ایک مخصوص تعداد میں لوگوں کو قتل کرنا ہے تاکہ شہر میں بے چینی اور خوف پھیلے۔ پس وہ اسلحہ لے کر نکلتے اور جو راہ میں نظر آتا، اسے گولی  
مار دیتے۔“

قاسمی صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں اور انھوں نے تشویش سے پوچھا۔ ”واقعی؟“  
”جی“ میں نے یقین دہانی کروائی۔

انتہاں کر انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ”لعنت بھیجو ہاہر کھانے پر، یہیں کھانا کھاتے  
ہیں۔ مریں گے تو اسی گولی سے جس پر ہمارا نام لکھا ہوگا۔ ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں کہ To whom it may concern کے  
زمرے میں شامل کیے جائیں۔“

یادوں کی زنجیر ہے جس میں سے واقعات لٹکے چلے آتے ہیں مگر بیش تر قطعی ذاتی اور امانت۔  
لاہور ان کے اعداد اس طرح رچا بسا ہے جس طرح صندل کے اندر مہک۔

ان سے ملاقات گویا ایم رفتہ کے اصل لاہور سے ملاقات ہے۔ اس میں نسبت روڈ اور اس کا ہریسہ، بھائی گیٹ کی قدیم چھوٹی اینٹیں، بوباری کے مغلیہ جھروکے، انارکلی کے رنگ ساز، قلعے کے پچھواڑے میں قیصیں اتار کر ریوڑیاں بنانے والے، تسی بلوتے پہلوان، دیسی گھٹی سے خستہ باتر خواتین اتارتے نان بائی، ٹھنڈی سڑک پر لگی چال چلتے گھوڑے، رائل پارک کی ٹکڑ پر پنڈاڑی سے پان لگواتے ہیر، ایبٹ اور میکلوڈ روڈ کے سینما گھروں سے نکلنے تماشاخی، موسیے کے ہار بیچنے لڑکے ہالے، چائے خانوں میں بحث کرتے ادیب، اندھیری منڈیروں پر سرکوشیاں کرتے محبوب، سبز چادروں میں لپٹی قبروں اور سنگ مرمر کے مزاروں کے مجاور، اگر بتیاں سلگاتے اور گلاب کی چٹیاں بکھیرتے سوگ دار اور دھال ڈالتے حال و حال کرتے سائیں لوگ بھی شامل ہیں۔ سبھی مختلف بھی ہیں، منفرد بھی اور ایک بھی روز است کو بھوگی گئی روح مقدس اور لباس خاک سبھی کو ایک کرتا ہے۔

پرانے لاہوریوں کی بے نیازی، خوش خوراک، بذلہ نجی، بے ریا فلک یوس قہقہے اور وفاداری کی اگر تجسیم کر دی جائے تو عطاء الحق قاسمی کہلائے۔

لوگوں کی بھیر میں اپنی طرز کا آخری آدمی، آخری لہوری! قاسمی صاحب ایک بھرے بڑے گھر کے سربراہ ہیں۔ انھوں نے کبھی تخلیق تلون کی آڑ میں اپنی اولاد کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ حقیقت آشکارا کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ جس طرح وہ امریکی بڑا سائش زندگی چھوڑ کر وطن لوٹ آئے، اسی طرح انھوں نے اپنی اولاد کو بھی پر جینے اور مرنے کا عزم پاک عطا کیا ہے۔

اپنے وطن کے لیے میں نے بے شمار دفعہ انھیں بے چین ہوتے دیکھا ہے۔ جو بہتر جانا، اس کا اظہار کیا ہے۔ کبھی مزاح کے لبادے میں تو کبھی بین السطور اظہار خیال کیا ہے۔ کبھی نہ تو دو درجد پد کی روایت کے مطابق سر بازار برہنہ کیا ہے اور نہ ہی لفظ کا تقدس بازار حیات میں نیلام کیا ہے۔

بیرونی ممالک میں سفارت سے لے کر ملکی اداروں کی کام یاب سربراہی کے باوجود ان میں اتنی عاجزی ہے کہ جن سے محبت کرتے ہیں، ان کے لیے نیگے چیر لپکتے چلے آتے ہیں اور جس سے اختلاف کرتے یا دکھی ہوتے ہیں منافقانہ یا کاری سے کام نہیں لیتے۔

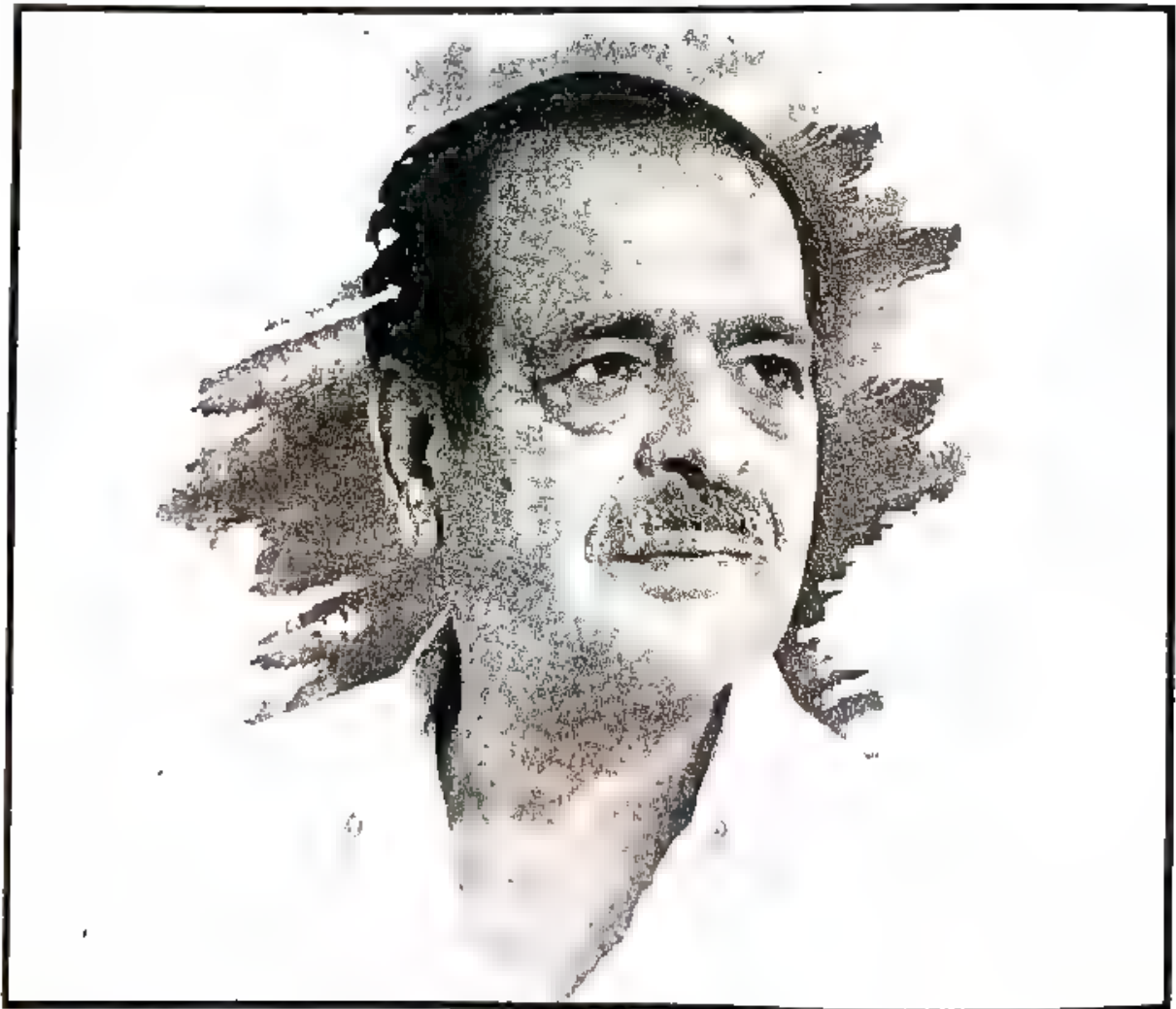
وہ ایک چھوٹا، ننھا سا بچہ جو چناب میں اپنے بابا کے کندھوں پر بیٹھا ہنستے ہنستے بے جاں ہو جاتا تھا۔ اتنا ہنستا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے، اب بڑا ہو چکا ہے۔ وہ آج بھی ہنستے ہنساتے بے جاں ہو جاتا ہے، اتنا بے جاں ہو جاتا ہے کہ اس کی آنکھوں کی نمی میں چاندنی، پاک چاندنی جھللائے لگتی ہے۔ وہی چاند جس کی وہ بچپن میں ضد کرتا تھا۔ آج بھی وہ اسی چاند کی ضد کر رہا ہے۔

میں عطاء الحق قاسمی نامی شخص کی ادبی مقدس سے پر خلوص وابستگی اور والہانہ محبت کی گواہی دیتا ہوں۔ میں بے نام چہرہ ہوں اور غبارِ راہ سے بڑھ کر کچھ نہیں، اپنی حقیقت سے واقف ہوں۔ واقعہ حقیقت ہوں، اسی لیے گواہی دیتا ہوں۔



# بازیگر

شکیل عادل زادہ



نوجوان کلیل عادل زادہ، عظیم اداکارہ مینا کماری کی زندگی میں ایک جانب سے داخل ہوتے ہیں چند دن گزرتے ہیں، کچھ مکالمات بولتے ہیں اور دوسری جانب سے نکل جاتے ہیں۔ اُس وقت کلیل عادل زادہ کون ہیں اور مینا کماری کون، ایک سننے کی کہانی ہے۔

مینا کماری ہندوستانی فلمی تاریخ کی ناقابل فراموش ہیروئن رہی ہے۔ بے مثال اداکارانہ جوہر کے ساتھ جذباتی اداکاری میں وہ ملکہ رکھتی تھی۔ ایک جانب وہ پردہ سیمس کی عظیم فن کارہ ٹھہری جو 1970 کی دہائی تک گیسری چکا چونے میں دکتی رہی، دوسری جانب اُس کی زندگی بچے در بچے حادثات کی وجہ سے ایک زمانے کے لیے ٹرجمیڈی کی علامت بنی رہی۔ اُس کی فلم ”صاحب، بی بی اور غلام“ میں اُس کی روز و شب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہ فلم بعض ناقدین ہندوستانی سینما کی عظیم ترین فلم سمجھتے ہیں۔ اُس کی کہانی اور مینا کماری کی زندگی کی داستان متوازی سفر کرتی ہیں۔

ماہ جنین بانو کے نام سے جنم لینے والی بچی کی کہانی دروانگیز ہے۔ اُس کی پیدائش کے وقت اُس کے والد علی بخش کے پاس ڈاکٹر گاڈے کو دینے کے لیے معاوضہ بھی نہ تھا، وہ اُسے چند گھنٹوں کے لیے تیم خانے چھوڑ گیا۔ جب بچی سات برس کی ہوئی تو باپ کی خواہش پر اُسے مینا کے نام سے چائلڈ ایکٹر کے طور پر ایک فلم میں کردار دیا گیا۔ بچی کی خواہش تھی کہ اُسے عام بچوں کی طرح اسکول بھیجا جائے جب کہ اُسے زبردستی فلموں میں کام کی مزدوری پر لگا دیا گیا۔ یہیں سے اس کی نفسیاتی تخریب کا آغاز ہوا۔ وہ اپنی دیکھی زندگی کے باعث المیہ اداکاری میں زندگی پھونکنے پر معروف ہوئی۔ ساری زندگی وہ محبت کی تلاش رہی۔ یہی پیاس اُسے اپنے وقت کے اہم فلم ڈائریکٹر کمال امر دھوی کے نزدیک لے آئی۔ کمال امر دھوی پہلے سے شادی شدہ تھے۔ مینا جو اب تک مینا کماری کے نام سے فلمی دنیا میں مشہور ہو چکی تھی، جلد ہی کمال امر دھوی کی بیوی بن گئی۔ شادی کے بعد کمال امر دھوی نے مینا کو فیصلہ سنا دیا کہ چوں کہ مینا سید نہیں اس لیے وہ اس سے کوئی اولاد پیدا نہیں کریں گے۔ اس اعلان نے مینا کو ایک جذباتی دھچکے سے دوچار کیا۔ یہ وہی مینا ہے جو بعد میں ”پاکیزہ“ میں اُمرو جاتی ہے۔ یہ وہی مینا ہے جو کمال امر دھوی سے علیحدگی کے بعد کثر سونے نوشی سے انتالیس برس کی عمر میں جگر کے عارضے میں مر جاتی ہے۔ ابھی اُس کی موت بہت دور ہے جب چند مہمان اُس کے ہاندر ادا لے گھر میں آکر ٹھہرتے ہیں۔ ان مہمانوں میں ایک بائیس سالہ لڑکا بھی ہے، جو بہت جلد مینا کے قریب ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اپنا منوس و غم خوار جانتی ہے اور اُس کے ساتھ رات رات بھر دل کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ وہ لڑکا بھی جذباتی طور پر مینا کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ اُس سے مینا فلمی دنیا کے مصنوعی پن اور زندگی کی بے معنویت پر باتیں کرتی ہے۔ وہ ضد کرتی ہے کہ لڑکا وہیں بسینی ٹھہر جائے۔ لڑکا مجبور ہے۔ سو واپس چلا آتا ہے۔ زندگی کی فلم کی ریل یہاں تھمتی ہے۔

زندگی بھی عجیب معاملہ رکھتی ہے۔ اُس لڑکے سے ملاقات کے دو برس بعد مینا کماری شہرہ آفاق ڈائریکٹر، ایکٹر گرو دت کی شاہ کار فلم ”صاحب بی بی اور غلام“ میں پرانی وضع کی ڈھیٹے جاگیر داری نوابی تہذیب کی علامت ایک خاندان میں چھوٹی بہو کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ شوہر ایک عیاش شخص ہے، شراب اور طوائفوں کا رسیا۔ چھوٹی بہو ایک شریف اور خاندانی عورت ہے۔ شوہر کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے وہ شراب پینا شروع کر دیتی ہے۔ معاملہ اعتدال سے اُدھر نکل جاتا ہے۔ اسی دوران اُس عالی شان بھری پڑی حویلی میں ایک نوجوان آکر ٹھہرتا ہے۔ وہ موٹنی سینڈور ٹیکسری میں ملازم ہے۔ جلد ہی وہ چھوٹی بہو کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے۔ چھوٹی بہو اُس سے حال دل بیان کرتی ہے۔ یوں اُس کی شکل میں اُسے ایک چارہ ساز میسر آ جاتا ہے۔ فلم میں اُس لڑکے کا کردار گرو دت نے خود ادا کیا۔

نوٹنی بکھرتی اُداس و غم زدہ مینا کماری کی حقیقی زندگی میں یہ کردار کلیل نامی ایک گم نام لڑکے نے ادا کیا۔ وہ لڑکا بعد میں کلیل عادل زادہ کے نام سے معروف ہوا۔ یہ وہی کلیل عادل زادہ ہیں جو بعد ازاں ”سب رنگ“ رسالہ نکالتے ہیں اور اسے بام عروج تک لے جاتے ہیں۔ ”امبر تل“، ”انکا“، ”اقابلا“، ”بازی گز“ نامی سلسلے وار کہانیاں شروع کرتے ہیں اور ایک زمانے کو اپنا گرویدہ کر لیتے ہیں، اُردو کے اساتذہ کے استاد ٹھہرتے ہیں اور بین الاقوامی ادب کے اعلیٰ ترین ادبی شاہ پاروں کو اُردو قارئین کی خواب گاہوں تک لے آتے ہیں۔

ایک چھت تلے اہم ترین ادیبوں اور مترجموں کو اکٹھا کر کے "سب رنگ" کی اشاعت 1976 میں قریباً پانچ لاکھ تک لے جاتے ہیں جو ایک ریکارڈ تھا۔ حتیٰ طور پر اس کے قارئین کی تعداد ستر لاکھ تک چلی گئی، دس افرادنی ڈائجسٹ، ہنگی آبادی سات کروڑ لاکھ ستر ہزار (بہ حوالہ مردم شماری) شرح خواندگی 26.20% (خواندہ آبادی ایک کروڑ چار لاکھ۔ اقوام متحدہ اعداد)۔ گویا پاکستان کی خواندہ آبادی کا ہر دسواں شخص سب رنگ پڑھ رہا تھا۔ یہ ایک انقلاب تھا۔

میرے، اُن سے عقیدت اور محبت بھرے شب دروز میں انھوں نے بہ شمار واقعات گھونٹ گھونٹ سنائے، کئی ذاتی حکایتیں بیان کیں اور اس تعلق کی رہنمائی چادر میں اپنی داستانِ حیات کے کئی لعل، عقیق، زمرد، سچ موتی جڑے۔ انھی قیمتی پتھروں سے ایک مالا تیار ہوتی ہے۔ سو پہلے ان کی حیاتِ جاوداں کا رنگارنگ ہار، بعد میں ذاتی مشاہدات و تاثرات کی سب رنگ رہنمائی چادر۔

ایک مرتبہ امجد اسلام امجد صاحب نے فکلیں صاحب کو ایک قہقہہ آواز لطفہ سنا شروع کیا۔ اُس لطفی کی ظرافت اور برہنگی کے باعث لوگ اُسے سن کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ جیسے جیسے لطفہ آگے بڑھتا رہا فکلیں صاحب سنجیدگی اور انتہاک سے اُسے سنتے رہے۔ لطفہ ختم ہوا تو امجد صاحب خروں ہو کر دل تھامے فکلیں صاحب کو دیکھنے لگے۔ فکلیں صاحب نے کچھ دیر توقف کیا، ہنگی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر ابھرائی اور وہ بولے "کیا کہنے؟" اس "کیا کہنے" میں اُن کی شائستگی اور خود اعتمادی کے ساتھ پوری شخصیت موجود ہے۔

آشفستہ سر، ہمد صفت، فلک پیما، حسن پرست، قادر الکلام اور غیر منقسم ہندوستان کے شہر مراد آباد میں پیدا ہونے والے اردو ادیب کے قد آور اور رجحان ساز ادیب فکلیں صاحب کے بارے میں پانچ دل چسپ حقائق بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

فکلیں صاحب زادہ حافظ قرآن ہیں، ان کا تعلق پنجابی سوداگران سے ہے، وہ اردو میں کم زور ہونے کی وجہ سے انٹر میں پہلی کوشش میں کامیاب نہ ہو پائے تھے، فکلیں صاحب دل زادہ اُن کا پیدا ہونے کا نام نہیں بل کہ معروف شاعر جون ایلیا نے تجویز کیا تھا، وہ وہ فکلیں صاحب کے قلمی نسوانی نام سے کئی نام و راویوں کو خطوط کے ذریعے رہماتے رہے۔

ذہنی کراچی میں غنیمت سے ترشی ہوئی بازو اور پھل پھول کے پودوں کے گرن والے دیدہ زیب بیگھے میں رہنے والے فکلیں صاحب زادہ اپنے قمیص چٹون والے لباس اور انداز و درخواست کی وجہ سے مغرب پٹ نسقیت پر وفیسر نظر آتے ہیں۔ یہ تاثر تب تک قائم رہتا ہے جب تک وہ اپنے جیب سے بیڑی نہیں نکال لیتے۔ پہل مرتبہ جب میں نے اُن کی بیڑی سلگانے کے لیے ماچس کی تیلی جلا کر انھیں آگ پیش کی تو وہ اپنے ہاتھ کو پیشانی تک لے گئے اور بولے "آداب!" میں اُن کی وضع داری سے متاثر ہوا۔ جب وہ بیسویں صدی کے اوائل کے لکھنوی ادیب نظر آ رہے تھے۔

سو بیڑی سلگا کر انھوں نے قصہ ہائے طولانی بیان کیے، اُن کی اپنی زبان میں سخن و سخنِ اک جہان داستان، نگار خانہ سب رنگ، ہنگی نگاہوں کے قصے، ادب کھلے درپچوں کے فسانے، ایک دل دار و دل جو کافسانہ زندگی، برائے دل براں، بہ نام عاشقان، نازنین ناز آفریں کے لیے فکلیں صاحب دل زادہ سر بلند و دل افروز کی حکایت دل پذیر۔

فکلیں صاحب نے میرے اذہد نالنے کے باوجود اصرار کیا کہ انھیں فکلیں بھائی کہا جائے سو یہ داستان بھی حقیقی اور خاص ہوگی جب اس میں محترم فکلیں صاحب کے پر تکلف خطابات کے بجائے فکلیں بھائی کا پیار سے چمکتا ہے تکلفانہ لفظ نحو حسب استعمال کیا جائے۔ اسے حقیقی تاظر میں دیکھنے کے لیے مختلف الفاظِ خطاب ترتیب وار استعمال کیے گئے ہیں۔ سو یہ فکلیں بھائی کی کہانی ہے، پاکستان میں فٹ پاتھ پر دوسری رات گزارنے والے، بالا خانوں و رہنما خانوں میں زندگی کوٹا چتے دیکھنے والے، رئیس امر و ہوی، جون ایلیا، کرشن چندر اور دوسرے ممتاز ادیبوں کے ساتھ بسر کرنے والے، ضیاء الحق سے چشم کشا ملاقات والے، اردو میں مقبولیت کی انتہا کو چھونے والے، کئی محبتیں کرنے والے اور ایک بھی نظرت نہ کرنے والے نقاش کی کہانی۔

کلیل بھائی یکم فروری 1938 کو دلی سے نوائے میل کے فاصلے پر مراد آباد میں ادیب اور شاعر عادل ادیب کے ہاں پیدا ہوئے۔

یہ وہی سال ہے جب جارج سائمن کی معرکہ الآراء، ہم جوئی اور اسرار پر مبنی پیش ہیں عنوان کی کتاب ”ٹریبون کی آمد و رفت دیکھنا آدی“ شائع ہو کر مقبول عام ہوئی۔ جارج کیا جانتا تھا کہ گزے کی دوسری جانب ایک ایسا بچہ جنم لے چکا تھا جس نے ٹریبون کے سفر کرنے تھے اور ان سفر کے حوالے سے یادگار داستانیں بنائیں۔ کئی یادگار کرداروں نے ریل کاروں میں سفر کرتے تھے خواہ وہ محفل ہو یا بازار مان خان۔ ان کے ابا، رئیس امر وہوی اور کوکب مراد آبادی دوستوں کی ایک مثلث تھی جن کی زندگی ادب سے مہارت تھی۔

اُس دور میں مراد آباد دولاکھ کی آبادی کا چھوٹا سا منفر و پتیل کا شہر تھا۔ ذرائع مواصلات ترقی یافتہ نہ تھے سو ہر شہر دوسرے سے منفر و تھا، ہر ایک کی شخصیت جدا گانہ تھی۔ مراد آباد اپنے پتیل کے برتنوں اور اُن پر قلم کاری، جسے سیاہ قلم کی نقاشی کہا جاتا تھا، میں پورے ہندوستان میں معروف تھا۔ ننھے کلیل کی اپنے ابا کے ساتھ خوب گزرتی۔ ابانی الہدیہ شعر گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔ کلیل بھائی کی اپنے ابا کے ساتھ گزرے دنوں کی یادوں میں ایک اُصول یاد دل شاد سینما میں ”شاہی فقیر“ نامی فلم کا اکٹھے دیکھنا ہے۔ کیا جادوئی کردار سینما سکرین پر بھاگے پھرتے تھے اور ننھا کلیل انھیں پوری آنکھیں کھولے حیرت سے دیکھتا تھا، کبھی انگلیاں دانتوں میں دب لیتا اور کبھی مسکراتا۔ مسکراتے تو ابا بھی تھے، اپنے بیٹے کو حیران و محظوظ ہوتے دیکھ کر۔

ان کے ابا نے کوکب صاحب کے ساتھ ایک رسالہ ”مسافر“ نکالا اور امر وہی رئیس صاحب کو صحافت میں لے کر آئے۔ دوسری عالمی جنگ میں کانڈ کی کمیابی کے باعث رسالہ بند کرنا پڑ گیا۔ اس صدمے سے کلیل بھائی کے والد کو انتوں کی وجہ ہو گئی اور جب ننھا کلیل چھ برس کا تھا تو وہ وفات پا گئے۔ خاندان میں تو جو کھرام چا سوچا، ان کے عزیز دوست کوکب مراد آبادی بھی انھیں دفنانے وقت فلک شکاف چیخ مار کر دماغی توازن کو بیٹھے۔ باپ کی نماز جنازہ پر ننھا کلیل مسجد اور ملحق مدرسے کی بالکونی میں کودتا پھرتا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس پر کیا سانحہ گزر چکا ہے۔

ابا کے انتقال کے بعد پہلی عید پر کلیل کو تیشی کا احساس ہوا۔ اس کے پیچھے لوگوں کا رحم آمیز رویہ تھا۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی مختلف قابلِ رحم بچہ ہے۔ چنانچہ بچے میں ضد پیدا ہو گئی۔ ایک بار عزیز واقارب کے ہاں دعوت تھی۔ وہاں صاحب محفل نے کلیل کو یتیم جان کر اُس کے آگے سالن کا ڈونگا بڑھا دیا اور بولے ”بیٹا کھانا کھاؤ“ کلیل کو احساس ہوا کہ یہ لطف و کرم کہیں اس کے یتیم ہونے کے سبب سے تو نہیں ہے، سو ضد آڑے آ گئی۔ کہہ دیا کہ وہ کھانا کھا کے آیا ہے۔ وہاں سارا وقت بھوکا بیٹھا رہا اور کھانے کو چھو اتک نہیں۔

کلیل بھائی کو اپنے ابا سے زیادہ نانا یاد آتے ہیں، یہاں تک کہ اپنی اماں سے بھی زیادہ۔ ان کو ایک گہرا دکھ ہے، جس کا اظہار مجھ سے تنہائی میں کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔ جب مالی طور پر خوش حال ہوئے اور اس قابل ہوئے کہ اپنے نانا کے لیے کچھ کر سکیں، تب نانا تنگ دستی میں وفات پا گئے۔

ابا کی وفات کے بعد نانا نے انھیں پالا۔ نانا کی خواہش انھیں حافظ قرآن بنانے کی تھی سو جامعہ قاسمیہ، مراد آباد میں داخل کرادیا گیا جہاں انھوں نے قرآن پاک حفظ کیا۔ جامعہ کے استاد بہت جابر تھے، جو بے وجہ طلبہ کی دھنائی کر دیا کرتے تھے۔

وہاں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے ادیب کلیل عادل زادہ کی پرداخت کی اور انھیں جہاں گردی کی لت ڈال دی۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ مدرسے آنے جانے والے راستے میں محلے کی ایک دس بارہ برس کی لڑکی سے اکثر آمناسا منا ہو جایا کرتا تھا۔ وہ کم سن کلیل کو بہت سن معنی لگتی۔ دن رات کلیل کے تصورات میں موجود رہ کر کچھ ایسا اپنا اسیر کیا کہ کسی پختہ کاری ہدایت پر عصر اور مغرب کے درمیان چالیس مرتبہ سورۃ منزل کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ اب توقع تھی کہ وہ دل پذیر لڑکی یقیناً ملتفت ہوگی۔ وہ تو اس کی جانب ملتفت نہ ہوئی



البتہ قبلہ حافظ صاحب متوجہ ہو گئے اور سستی نہ یاد ہونے کی کچھ ایسی مثالیں جس کی سزا دی کہ چلوں سے مٹ کر امانت کی وجہ سے یہ شہر چھوڑ کر بھاگنے کا ارادہ پاندھ بیٹھا۔

اس ارادے میں ایک رکاوٹ اس کی اپنے نانا سے شدید محبت تھی۔ نانا بھی نواسے سے خالص شغفانہ عشق کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے گھنے برگد کے درخت کی طرح تھے جس نے اپنے گہرے سائے میں سبھی اہل خانہ کو لے رکھا تھا۔ خوش فکریل پر نانا کا خوف کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنے فلموں کے شوق کو پورا کرنے کے لیے فلم کے ہاف ٹائم پر بقیہ ہاف فلم کا ٹکٹ بیچ آیا کرتا اور بقیہ فلم اگلے روز کسی سے ہاف ٹکٹ خرید لیا کرتا۔ یوں جلدی گھر چلے آنے پر کسی کو اس کے فلم دیکھنے پر شک نہ ہوتا۔ اپنے اخراجات کے لیے یہ والدہ، ماموں اور نانا سے جیب خرچ لیتا تھا۔ زیادہ ضرورت ہونے پر خاموشی سے نانا کی شیردانی سے پیسے اڑا لیا کرتا۔ یوں حافظ بچہ زندگی کے تجربات پر سے گزر رہا تھا اور زندگی کی ندی میں ڈکیاں بھی لگا رہا تھا کہ اُسے اس میں حیرنا سیکھنا تھا۔

ایک صبح جب ابھی مراد آباد کی سبزی منڈی میں پوریوں کے منہ کھل رہے تھے اور ان سے آلو پیاز نکال کر کھڑے سامان بجا رہے تھے، غیاری کی دکانوں والے پلاسٹک کے چھوٹے سامان اور والوں مسالوں کو ڈھیر یوں میں رکھ رہے تھے، ماشکی چھوٹے سے شہر میں گلوں، کھاریوں اور سڑکوں پر پانی چھڑک رہے تھے، سورج کی حدت آمیز سنہری کرنوں میں کیلا دوں کے روشن دان اور رنگین کھڑکیاں دیک رہی تھی اور مساجد کے پستل کے چاندی رنگے کلس سنہرے ہو رہے تھے کہ ایک پچھیزی سے ریوے اسٹیشن کی جانب جا رہا تھا۔ وہ تھا تھا۔ شاید وہ تنہا نہ تھا کہ اُس کے بدن پر نیل کے نشان، چھڑیوں کے دھم اور تلخ یادیں اُس کے ہم راہ تھے۔ وہ ساڑھے تین برس کی مدت میں قرآن پاک کو پہلی مرتبہ حفظ کر چکا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر وہ ٹرین کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ یہ اُس کا ریل کا پہلا سفر تھا۔

وہ شام کو چار بجے مراد آباد سے دلی جانے والی ٹرین میں بیٹھ گیا۔ رات دلی پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ اُس کے پاس کل تین آنے ہیں۔ اُس نے پروانہ کی اور سستی جانے والی ٹرین میں بغیر ٹکٹ سوار ہو گیا۔ رات کو ڈبے کے ایک کونے میں سٹے ٹکیل نے کسی اسٹیشن پر ایک آنے کے چنے لیے، صبح کو چائے کا ایک کپ پی لیا۔ جب ٹرین بھوپال پہنچی تو ٹکٹ چیکر نے پکڑ لیا۔ وہاں ٹکیل نے ایک کہانی گھڑی۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ ٹکیل نے اپنے ماموں کے ساتھ سفر کا آغاز کیا تھا، رستے میں ماموں چھڑ گئے۔ ٹکٹ اُنھی کے پاس تھے۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ ٹکٹ گئے بل کہ ماموں سے پچھڑنے کی وجہ سے وہ خود بھی تنہا ہو گیا۔ کہانی اتنی تفصیل اور جزئیات اتنی حقیقی تھیں کہ نہ صرف ٹکٹ چیکر نے اُسے جھوڑ دیا بل کہ مسافروں کی ہم وردیاں بھی اُس کے ساتھ ہو گئیں۔ انھوں نے اسے جگہ دی، کھانے کو، رہا پوچھا اور شفقت کا اظہار کیا۔ خدی ٹکیل بھوک سے بڑھال تھا مگر اُس نے سبھی پر ظاہر کیا کہ اُسے بھوک نہیں۔

ٹرین سیٹی بجاتی اپنی اگلی منزل کی جانب روانہ ہوئی۔ بڑووا اسٹیشن پر ریلوے پولیس نے چھاپہ، رکر بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کو حوالات میں بند کرنے کے لیے تھوپیل میں لے لیا۔ ٹرین کے سبھی مسافر ٹکیل کی حمایت میں ٹرین سے اتر آئے۔ کیا ہندو، کیا سکھ اور کیا مسلمان، سبھی ریوے پولیس سے الجھنے لگے۔ قصہ مختصر انھوں نے ٹکیل کو نہ صرف چھوڑ دیا بل کہ سفر جاری رکھنے کی اجازت بھی دے دی۔

یہ اُس دور کی بات ہے جب ریل گاڑی کو ہندوستان میں ایک رومانوی اور دور کے دیہات میں جادوئی سواری سمجھا جاتا تھا۔ برطانوی راج میں ایک ہندوستانی نواب کا سچا واقعہ ہے۔ نواب صاحب ریل کار کا طویل سفر کر کے ریوے اسٹیشن اترے۔ وہ اپنی دور افتادہ راج دھانی کا سبھی پر مزید سفر کا روح فرسا تصور کر کے ایک انگریز فسر سے بد لے۔

”کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ اسٹیشن میری راج دھانی میں بنایا جاتا۔“

اُس انگریز نے مخصوص برطانوی مزاح میں جواب دیا۔

”یقیناً نواب صاحب یہ بہت اچھا ہوتا۔ لیکن ہم نے سوچا کہ ریوے اسٹیشن آپ کی راج دھانی میں بنانے سے اُس جگہ ہانا زیادہ

بہتر ہوگا جہاں سے ریل کی بٹری گزرتی ہے۔“

ریل گاڑی کی ہند میں آمد سے جہاں اس سے وابستہ کئی پراسرار حکایات گردش میں رہیں، وہیں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور دیگر کئی ادیبوں نے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ کئی فلمیں ریلوے اسٹیشن کے دیننگ روموں سے پھوٹیں ”موسم سرما کی کہانی“ کے مصنف مارک ہیلپرین نے لکھا تھا کہ ریل کے سفر کے دوران اُسے درختوں سے یہ سوچ کر ہم دردی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنی جڑوں سمیت ایک ہی جگہ بچست ہیں اور آوارگی کے لطف سے نا آشنا!

تکلیف کی ریل گاڑی بمبئی کے دائرہ اسٹیشن میں داخل ہوئی اور ایک طویل ٹھکی لے کر وہاں کھڑی ہوئی۔ دائرہ ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ چیکر اور ریلوے پولیس کی یلغار دیکھ کے تکلیف نے پلیٹ فارم کے اٹنی سمت ریلوے لائن پر اترا نا محفوظ جانا اور پٹریوں پٹریوں چلتا ہوا دائرہ کے پلہ پہ چڑھ گیا اور یوں دیوبند کی شہر کے حکم میں داخل ہو گیا۔

سفید ٹرنا پا جامہ پہنے چلتے چلتے لڑکا ایک ایرانی ہوٹل کے سامنے بھوک اور فاقہ کے مارے چکرا کر گر گیا۔ لوگوں نے اٹھایا، پانی پلایا اور ناشتا کرایا۔ وہیں ایک صاحب نے اسے بھنڈی بازار کا ہاتھ سمجھایا، جہاں اس کے عزیز قیام پذیر تھے۔

ہوٹل میں اس کی دل گداز داستان سننے والوں نے آخر اُسے اس کے عزیزوں کے ہاں پہنچا دیا۔ یہاں اُس نے اپنی آوارہ گردی کی ایک نئی داستان تراشی۔ ماموں سے بچھڑنے کی کہانی وہاں نہ چلتی کہ وہ رشتے داروں سے واقف تھے۔ نئی داستان اخوا کاروں کے ایک گروہ کے گرد بنی گئی۔ عزیزوں نے تکلیف کی عدم موجودی میں اس کہانی پر شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ بچ جن کے باپ فوت ہو جاتے ہیں، ایسے ہی آوارہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے استاد کی سختی سے گھبرا کر چلے آئے تکلیف نے یہ گفت گو سن لی۔ اس کے دل میں گویا ایک تیزابی برچھی ترازو ہوئی اور تکلیف نے بمبئی میں آباد اپنی دادی کی بہن کے ہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دادی کی بہن نے اپنے پوتے کو چوم کر گلے لگایا اور اپنے ہاں ٹھیرا کر اُس کی ناز برداری کی۔

مبئی کا ہجوم اور شور دیکھ کے اُس کے خواب بکھرنے لگے۔ وہاں تو دنیا ہی مختلف تھی۔ ہر کسی کو بس اپنی فکر تھی۔ ہر کوئی جیسے بھاگا جا رہا تھا۔ تکلیف نے دادی سے مراد آباد واپس جانے کی ضد کی اور وہ دس روز بعد واپس مراد آباد لوٹ آیا۔ یوں اس کی پہلی مہم جوئی اختتام کو پہنچی۔ ابھی ایک مہم جوئی باقی تھی۔

تکلیف کو لکھنے پڑھنے کا اس حد تک شوق تھا کہ اُس نے ایک آنہ لاہوری کے سبھی ناول پڑھ ڈالے تھے۔ شہر کی لاہوریوں کو بھی کھنگال لیا تھا۔ نویں جماعت میں اس نے ناول لکھنا شروع کیا، ایک روز انگریزی کے استاد نے خالی صوفیہ میں اسے لکھتے دیکھا تو مسودہ پڑھا۔ پڑھ کر خوش ہوئے اور اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

اس کی خواہش تھی کہ لوگ اسے توجہ دیں۔ سو وہ اہم ادیبوں، شاعروں کو ایک لڑکی ’شکیلہ جمال‘ کے فرضی نام سے خط لکھتا۔ قدامت پسند ہندوستانی معاشرے میں کسی لڑکی کی جانب سے ادیب کو ملنے والا خط بہت اہمیت اختیار کر جاتا تھا۔ تکلیف کو لڑکیوں والے ناز و انداز اور طریقے سے خط لکھنے میں مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ جواباً خطوط کا تاننا بندھ گیا۔ پیش تر مخاطب ادیب شکیلہ جمال کے خطوط کے اسیر ہو گئے۔

نریش کمار شاد بیسویں صدی رسالے میں لکھا کرتے تھے۔ ان کے جوابی خطوط میں بے قراری اتنی بڑھی کہ شوق ملاقات پر منتج ہوئی۔ تکلیف نے ان کو ایک باپردہ مسلمان گھرانے کی لڑکی ہونے کے ناتے ناتے کی بہت کوشش کی۔ وہ نہ ملے اور شکیلہ جمال سے ملنے مراد آباد پہنچ گئے۔ یہ بہت دل چسپ واقعہ ہے۔ شاد نے گھر کے دروازے پر دستک دی تو تکلیف گھر پہ موجود نہ تھا۔ شاد نے شکیلہ جمال کا نام لیا تھا۔ تکلیف کی والدہ کو شکیلہ جمال کے نام سے مختلف ادیبوں اور شاعروں کو لکھے جانے والے خطوط کا کچھ علم تھا۔ انھوں نے شاد کو جواب دیا کہ شکیلہ جمال تو بریلی گئی ہوئی ہیں البتہ اُن کا بیٹا تکلیف شہر میں ہے۔ شاد نے تکلیف سے ملنے کی خواہش کی۔ تکلیف اس وقت گھر پہ موجود نہیں تھا۔ واپس آیا تو سارا

ماجرہ بنا۔ بہت پریشان ہوا کہ کس طرح شاد کا سر منا کرے گا۔ شاد نے اُس کی وادہ سے کہا تھا کہ وہ مراد آباد ریلوے اسٹیشن کے وینک دوم میں ٹکیل کے منتظر رہیں گے۔ ٹکیل نے بہر حال اسٹیشن کا رخ کیا۔ اس دوران شاد پھر ٹکیل کے گھر پہنچ گئے اور دو تین پارسیا ہی ہوا۔ ادھر ٹکیل اسٹیشن جاتا دھر شاد ان کے گھر آتے رہے۔ آخر مجھے کے ایک واقف کار شخص نے کئی بار گلی میں اجنبی شاد کو دیکھ کر صاف صاف بتا دیا کہ یہاں کوئی ٹکیلہ جمال نہیں رہتی۔ البتہ ایک ٹکیل نامی نہایت شرارتی لڑکا رہتا ہے جو ہندوستان کے دیہوں اور شاعروں کو لڑکی کے نام سے خط لکھ کے لطف لیتا رہتا ہے۔ ٹریش کہ رشاؤ نے کس دل سے یہ داستان سنی ہوگی اس کا اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ اُن کا مایوس لوٹ جانا ٹکیل کے دل پر اثر کر گیا۔

ٹکیل کے اسکول میں ہونے والے آل انڈیا شاعرے میں بہت سے شاعروں کے علاوہ بمبئی سے ٹکیل بدایونی بھی آئے تھے۔ سہ تو میں جماعت کے طالب علم ٹکیل کی شوق خدمت سے وہ ایسے متاثر ہوئے کہ دونوں میں خط کتابت شروع ہوگئی۔ ٹکیل نے انھیں ٹکیلہ جمال کی طرف سے لکھے جانے والے ہندوستان کے ادیبوں شاعروں کا تذکرہ ایک خط میں کیا تو ٹکیل بدایونی نے یہ خطوط دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ ٹکیل نے ان خطوط کا ڈھیر بمبئی بھیج دیا۔ ٹکیل بدایونی بہت مخطوط ہوئے۔ انھوں نے وہ خطوط مشہور موسیقار نو شاد صاحب کو بھی دکھائے۔ وہ بھی ایک اُن دیکھی نوجوان لڑکی کے لیے دیہوں شاعروں کے بے پناہ اضطراب اور جوش عشق پر بہت مخطوط ہوئے۔ البتہ انھوں نے ٹکیل کو یہ سلسلہ ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ ٹکیل نے کچھ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے اور کچھ ٹریش کہ رشاؤ والے واقع سے متاثر ہو کر یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ ٹکیل نے پھر دل جمعی سے تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ جب وہ انٹر میں پہنچا تو اس کے ایک رشتے دار آصف پاکستان سے مراد آباد آئے۔ یہ 1956 کا سال ہے اور گرمیوں کا موسم۔

ادھر ٹکیل کا خاندان ہندوستان میں آباد ہے اور پاکستان ہجرت کا کوئی ارادہ نہیں۔ قیام پاکستان کو نو برس بیت چکے ہیں۔ ادھر بین الاقوامی شطرنج کے مہرے کچھ اور چالیں چل رہے ہیں۔ مراکش فرانس سے آزادی لے چکا ہے اور مصر نے نہر سوئز پر تسلط حاصل کر لیا ہے۔ دنیائے ادب کی معروف ترین شادی ڈراما نگار آرتھر ملر اور دل فریب و جمال آگس اداکارہ مارلن مشرو کے درمیان انجام پاتی ہے اور البرٹ کامیو اپنا رحمان ساز ناول ”دی فال“ لے کر مظفر عام پر آتا ہے۔ ادھر آصف نے کراچی کی خوب صورتی اور رنگینی کا تذکرہ کچھ ایسے پرکشش انداز میں کیا کہ نوجوان ٹکیل کا جی کراچی کے لیے لپکا گیا۔ جہاں گردی کا چمکا اور نئی دنیا نئیں دیکھنے کا لپکا بڑے شباب ٹکیل کو بھی پڑ گیا تھا جب اُس نے کاروبار کے سلسلے میں پورے ہندوستان کا دورہ اپنے ماموں کے ہم راہ کیا تھا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ اُس کے نانا محمد شریف برتنوں کے کاروبار میں تھے۔ ان کا گھر نارواہی ہندوستانی مسلمان گھرانہ تھا۔ برتن کی صنعت سستی تھی۔ ظروف سازی، ظروف کی رسد و فراہمی اور ظروف کی ملکی غیر ملکی برآمد۔ نانا مراد آباد کے کاری گردوں اور نقاشوں سے پتیل کے اعلیٰ معیار برتن بنواتے اور پورے ملک میں فراہم کرتے۔

ماسوں نانا کی معاونت کرتے، پورے ملک کا دورہ کرتے، مطو بہ فرمائش لاتے اور ماس کی فراہمی کرتے۔ ایسے میں ٹکیل اُن کے ہم راہ قریباً سال بھر کے دورے پر نکلا۔ ماسوں بھانجے نے شہر شہر قریہ قریہ پھرتے جنوبی ہندوستان کو کھنگال ڈالا۔ حیدر آباد کن میں خاصا قیام کیا اور وہاں کی ہندو مسلم تہذیب کو قریب سے دیکھا۔

حیدر آباد کن میں ایک پر لطف معاملہ ہوا۔ گردوت کی فلم ”پیاسا“ کا بہت چرچا تھا۔ ریلیز کے موقع پر سارا ایونٹ حیدر آباد آیا ہوا تھا۔ فلم کے افتتاحی شو کے لیے ٹکٹ قبل از وقت بک چکے تھے۔ نوجوان ٹکیل عمدہ لباس میں اس اعتماد سے پلیس سینما میں داخل ہوا کہ نہ تو اسے روکا اور نہ ہی ٹوکا۔ وہ سیدھا اسٹیج پر گیا اور گردوت، گیت دت، وحیدہ رحمان، ٹکیلہ، جانی واکر اور ساحر لدھیانوی کے ساتھ اسٹیج پر مکمل مل گیا۔

سبھی نے اسے یونٹ کا فرد سمجھ کر کریم کی۔ جانی وا کرنے تو اپنی سگریٹ بھی پیش کی۔ اگلے روز کے اخبارات کی تصاویر میں کلکلیل سپر اسٹار کے ساتھ کھڑا تھا۔

ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جب ہم جو پر اعتماد اور نوخیز کلکلیل زندگی بہت رہا تھا اور زندگی اسے اپنی گود میں جھلا رہی تھی۔ ریل کے سفر، بسوں کی سواری، دکان داروں کے حربے، بازی گروں کے کمال، فقیروں کے روپ، مجذوبوں کی بے خودی، بازاروں کی ریل پیل، جھروکوں سے دید شہید، ہندو تہواروں کے رنگ، اسلامی تیوہاروں کا تقدس، مسکھی، سکھ، بدھ، پارسی زندگی کے متنوع روپ، بے خواروں کی مستیاں، جیب تراشوں کی مہارت، سرسبز کھیتوں کی تازہ مہک، صحراؤں کی دیرانی، کوهستانوں کی پڑ شکوہ کشش، قافلوں کی چال، اونٹوں کی گھنٹیاں، پھینسوں کی جگالی، گھوڑوں کی ہنہاٹ، پرندوں کی چچہاٹ، سبھی کچھ دیکھا، سونکھا، چکھا، سنا، چھوا اور اپنے اندر جذب کر لیا۔

انہی اجزائے بعد ازاں قصہ گو و داستان ساز کلکلیل عادل زادہ کی تشکیل ہوتا تھی۔ لفظوں کی، تصورات و قصہ گوئی کی بازی گری ہوتا تھی۔ ابتدائے جوانی تھی، جوانی چلتر اور سادگی دیکھی، جو کہ مکرنیاں اور مصححیں سمجھیں، ذہن ناہنہ پر ایسی نقش ہوئیں کہ یادداشت کا جزو بن گئیں۔

ہندوستان سے پاکستان آنے کا معاملہ بھی ایک قابل شہید داستان ہے۔

نانا کے گھر کے معاملات اور کچھ کر لینے کی جستجو نے جلد ہی عملی زندگی میں داخل ہونے پر آمادہ کیا۔ ماسوں کے ساتھ دوسرے پورے جنوبی ہند کی خاک تو چھان ہی لی تھی، ٹیوشنیں بھی پڑھائی تھیں، سو آصف صاحب کے پاکستان میں آگے بڑھنے کے مواقع کا رنگین نقشہ کھینچنے پر نوجوان کلکلیل کراچی آنے کو بے قرار ہو گیا۔ تب تک اُس نے کامرس میں ہندی میڈیم میں میٹرک کر لیا تھا اور انٹر میڈیٹ کے امتحانات میں چند ماہ تھے۔

اس نے چھپ کر ککسٹو سے پاسپورٹ بنوایا اور اماں سے بہانہ کر کے دلی چلا آیا۔ اماں تو اپنے بچے کو دور کے شہر بھیجنے پر بھی آمادہ نہ تھیں، پاکستان تو بہت بعید از قیاس معاملہ تھا۔

پاکستان جانے اور وہاں قیام کے لیے اخراجات ایک رکاوٹ تھی تو دوسری چھوٹی، بہن اور بھائی، اماں، ماسوں اور نانا سے جدائی تھی۔ اماں کی گل کائنات تو ان کے بچے تھے۔ انھوں نے تو مین جوانی میں بیوگی کا بوجھ اٹھائے اپنے لخت ہائے جگر کے لیے وقت گزار دیا تھا۔ پس اپنے اہل خانہ کی مدد اور کچھ کر گزرنے کی خواہش نے ایک عجیب حرکت کروائی۔

اُس نے اپنی اماں کی چپا کلی چرائی اور ایک پیسے کے پاس گروی رکھوا دی۔ رسید اپنے دوست کو دی اور تاکید کی کہ پاکستان پہنچ کر جب وہ پیسے بھجوائے تو دوست رقم ادا کر کے چپا کلی چھڑوا لے۔ اماں چپا کلی استعمال نہ کرتی تھیں سو انھیں اُس وقت اس کی گم شدگی کا پتا نہ چلا۔ اُس دور کے فریب اور بے سہارا ہندوستانی مسلمانوں کے لیے پاکستان گویا ایک فردوس پاک تھا جہاں مواقع کی بہتات اور آزادی کی جاں افزا فضا تھی۔ کلکلیل کے دوستوں نے مل کر اُس کی مدد کی اور اُسے مراد آباد سے امرت سر جانے والی پنجاب میل میں بٹھادیا۔

تمن واقعات ہیں جن کے تذکرے کے بنا داستان نامکمل رہے گی۔

جب کلکلیل ویزا لینے والی پہنچا تو وہاں ایک مسلمان نجوی لڑکا اس کا دوست بن گیا جو اسے ملی ماراں کے محلے میں اپنے گھر لے گیا۔ وہاں کلکلیل رات بھر کے لیے ٹھہرا۔ ویزا صبح لگتا تھا۔ رات کو میزبان نے اس کا ہاتھ دیکھا اور بتایا کہ وہ گھر سے بھاگ کر پاکستان جا رہا ہے۔ عین حقیقی بات بتانے پر کلکلیل کا اپنے میزبان نجوی لڑکے پر اعتماد بڑھ گیا۔ اس کے بعد اُس نے جو کچھ کہا وہ ہوش رہا تھا۔ اُس نے پیش گوئی کی کہ کلکلیل کو پاکستان جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، وہ انٹر نہ کر سکے گا زندگی ناکامیوں میں گزرے گی اور تیس برس کی عمر میں انتقال ہو جائے گا۔

نوخیز کلکلیل کی آنکھوں میں آنسو بھرائے اور اُس نے مصحوبیت سے پوچھا۔ ”کیا میں تیس سال کی عمر تک مر جاؤں گا؟“



وہ بخوبی راسخا ہوتا ہے کہنے لگا "ضروری نہیں فوت ہو جاؤ، اگر زندہ رہے تو مجلس کی حالت میں ہاتھ بھر جواب دے جائیں گے اور ہم معذور ہو جاؤ گے۔"

یہ سن کر ٹکیل کے تو ہوش اڑ گئے۔

دوسرا واقعہ، بہ یک وقت چٹم کشا حیرت انگیز ہے۔ ہر شہر کی طرح مراد آباد میں بھی ایک "بازار" تھا۔ اسے منج بازار کہتے تھے۔ یہاں بہت سے کوٹھے تھے جہاں رقص کے علاوہ جسم فروشی کا دھندا بھی ہوتا تھا۔ ٹکیل اور اس کا بڑی عمر کا صاحب حیثیت دوست عبدالقدوس سائل پر شہر بھر میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ایک روز رات کو جب دکانیں بند ہو چکی تھیں اور شہر میں دونوں منج بازار جا نکلے اور عبدالقدوس ٹکیل کا ہاتھ تھامے ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ وہاں تو عجب منظر تھا۔ ایک چوہا رے پر ایک عورت پردے کی اوٹ میں پلنگ پر لیٹی تھی۔ اگر گرد پردہ کھینچا ہوا تھا۔ مردوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ شوق نازوں پر تھا اور تجسس کھٹی میں، سودوں دوست آگے بڑھ کر دیکھنے لگے۔ قطار میں سے ایک مرد اندر پردے میں جاتا، تھوڑی دیر میں باہر آتا تو عورت بھی ساتھ میں چلی آتی۔ مرد باہر کا رخ کرتا اور عورت واش روم کا۔ کچھ دیر بعد عورت واپس آ کے دوبارہ اندر پردے میں چلی جاتی۔ ساتھ میں گلا مرد اندر چلا جاتا۔ دور پردے کی فیس مقرر تھی۔ عبدالقدوس اور ٹکیل بھی قطار میں بیٹھے تھے۔ عبدالقدوس نے پہل کی۔ اُس کا نمبر آیا تو پردے کے اندر چلا گیا اور کچھ وقت گزار کے باہر نکلا تو اب ٹکیل منظر تھا لیکن عبدالقدوس مضطرب و مشتاق ٹکیل کا ہاتھ پکڑ کے کھینچتا ہوا زینہ اترنے لگا۔

مسئلہ یہ تھا کہ ٹکیل کی جیب میں دھیلا نہیں تھا۔ ٹکیل کی باری کے دور پردے بھی عبدالقدوس کو ادا کرنے تھے۔ عبدالقدوس پیسے والے گھر کا نوجوان تھا۔ کوٹھے سے نیچے آ کے عبدالقدوس نے دس عدد ترانے کہ یار اندر بڑا گندہ ماحول تھا۔ عورت بھی بس دا جی قسم کی تھی۔ خواہ مخواہ پیسے ضائع ہوئے۔ شکر ہے کہ تم محفوظ رہے۔ ٹکیل کا حال بہت رنج و غم اور غصے کا تھا۔ عورت اور مرد کے تعلق جو احوال انھوں نے قصے کہانیوں میں سنا تھا، یہ اس کے مشاہدے اور تجربے کا بہترین موقع تھا۔ یقیناً اُس عمر میں عشق و شباب کی بھی فراوانی تھی۔ ٹکیل کو بہت جک محسوس ہوئی۔ چوں کہ ٹکیل کی جیب خالی تھی وہ ضبط کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ عبدالقدوس کے پاس پیسے تھے اور وہ فیصلہ کرنے کا مختار تھا، اُس دن کے بعد ٹکیل کو غربت و امارت کا امتیاز شدت سے محسوس ہوا۔ بعد کو اس طرح کے کچھ اور تلخ و تند تجربوں نے اُس کے اندر ابھرنے والے جذبے کو اور ہمیز کیا۔

اس سے پہلے بھی اُس نے ایک جرأت کی تھی۔ جیب میں کچھ پیسے ہوئے تو اُس نے ایک کوٹھے پر جانے کی ٹھانی۔ منج بازار میں صرف زنانہ بازی کے مکانات نہیں تھے، دیگر دکانیں بھی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ منج بازار میں تاجرانہ سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ ٹکیل ادھر ادھر دیکھتے ہوئے موقع ملنے پر جھٹ ایک کوٹھے کے زینے میں داخل ہو گیا۔ اوپر ایک چالیس پینتالیس سالہ فریبی ماٹل عورت نے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ ٹکیل نے کچھ کہے سنے بغیر جیب سے روپے نکال کے اُسے دکھائے۔ عورت اُسے لمحوں تک گھورتی رہی پھر اُس نے ٹکیل کو دھکا کر دیا۔ "چلو، واپس گھر جاؤ، پھر کبھی ادھر نہ آنا۔" مایوس ٹکیل سے کچھ کہتے نہ بنی۔ بیچانی عالم میں اُس نے زینے کا رخ کیا لیکن باہر نکلنے سے دُور سے اپنے باموں کو اتار دیکھ کے اُس کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ دوبارہ بیڑھیاں چڑھ گیا اور خاصے وقفے کے بعد دوبارہ نیچے اُترا۔

تیسرا واقعہ یہ ہوا کہ ٹرین پر پاکستان آتے ہوئے ایک لوبیا ہٹا لوبیا جوڑا ٹکیل کے ہم راہ سفر کر رہا تھا۔ وہ اجنبی اس سے جلد ہی اس درجہ گھل مل گئے کہ گویا یہ انھی کے خاندان کا فرد ہو۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے فن کیریئر سے کھانے میں شریک کیا اور اتاری کے رستے دامک پہنچ کر شوہر صاحبی حسین جمیل بیوی کو ٹکیل کے حوالے کر کے عزیزوں سے ملنے چلا گیا۔ شام کو وہ واپس لوٹا تو کراچی کا سفر شروع ہوا۔

اس سفر میں ٹکیل نے زندگی کا ایک اہم سبق سیکھا کہ بعض اوقات قریبی لوگ جن پر اعتبار ہوتا ہے، صین وقت پر ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ البتہ فیہ سے ایسے اجنبی اور نا آشنا دکو ہاتھ بڑھا دیتے ہیں جو قطعی غیر متوقع ہوتا ہے۔

زندگی کی کتاب کا ایک اہم سبق ابھی مراد آبادی نوجوان کو پڑھنا تھا۔

کراچی ایک سپر ایس رات دس بجے کراچی ٹی ایشیون پر لڑکی تو اُن جانے اندیشوں سے کلیل کا دل دھڑک رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ ایشیون پر مقامی روشنیوں میں مونگ پھلی اور چنے بھوننے والے آوازیں لگا رہے تھے۔ کراچی شہر میں پہلی رات تھی۔ اب تک پاکستان ایک دوسرا ملک تھا۔ کلیل نے سامان اٹھایا اور سائل رکشا لے کر اپنے عزیز آصف کے گھر بزنس روڈ کی جانب چل دیا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے کسی کے گھر دستک دینا نامناسب معلوم ہو رہا تھا۔ بہر حال مجبوری تھی سو دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی مرد کی بیزار آواز سنائی دی۔ کلیل نے اپنا اور اپنے خاندان کا تعارف کرایا تو اندر سے جواب دیا گیا کہ آصف گھر پر نہیں ہے۔ کلیل پہچان گیا کہ وہ آصف ہی کی آواز تھی۔ وہ چپ چاپ وہاں سے لوٹ آیا۔ مجبوراً اسے دوسرے دروازے کا رخ کرنا پڑا۔ وہ رات کلیل نے آصف کے سالے جمال نامی دوست کے چھوٹے سے فلیٹ پر گزاری۔ جمال کے مختصر فلیٹ میں گنجائش مشکل تھی۔ جمال نے اپنے بڑے بھائی سے درخواست کی۔ اتفاق سے ان کی بیوی ہندستان گئی ہوئی تھیں۔ اُن کا مکان خالی تھا۔ سو جمال، کلیل کو لے کر بڑے بھائی کے مکان پہنچا۔ مکان پر تالا لگا تھا۔ جمال کے بھائی گھر پر نہیں تھے۔ جمال زیادہ دیر وہاں ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ کلیل کو وہاں چھوڑ کے وہ واپس چلا گیا۔ اس کے بھائی کے انتظار میں کلیل اپنا مختصر سامان لیے فٹ پاتھ پر بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ رات گزر گئی۔ جمال کے بھائی گھر نہیں لوٹے۔ فٹ پاتھ پر سونے والے دوسرے لوگوں نے چادر بچھا دی۔ کلیل وہیں لیٹ گیا۔ فٹ پاتھوں نے خاصی نصیحتیں کیں۔ راتوں رات چپا کمانے کے کئی گرتے اور اپنے اپنے لحاف چھٹڑے لے کر سو گئے۔

دوسرے روز کلیل اپنے قریبی رشتے داروں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک رشتے دار تو اُسے دیکھتے ہی اتنے مہربان ہوئے کہ اُس کا سامان اٹھا کے اپنے گھر لے گئے۔ وہ صاحب شعر کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ خود بھی کہتے تھے اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اُس وقت شہر چاروں طرف اپنی حدود بڑھا رہا تھا مگر اتنی بھیر اور ایسی افراتفری، نفسا نفسی نہیں تھی۔ شور بھی کم تھا۔ ابھی شہری مرکز سے بیس بیس میل دور تک آبادیاں نہیں بسی تھیں۔ آمدورفت بڑی آسان تھی۔ ناظم آباد کے ابتدائی حصے میں واقع متوسط طبقے کی زیر تعمیر ادھوری کالونی میں نفی صاحب نے نیا نیا دو منزلہ گھر بنایا تھا۔ نفی صاحب کے ہاں ابھی چند دن ہوئے تھے کہ کلیل کے ایک قریبی رشتے دار نے اُس پر زور دیا کہ وہ اُس کے گھر منتقل ہو جائے۔ اُسے یقین تھا کہ نفی اپنی چھوٹی لڑکی سے کلیل کا رشتہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ جان کے کلیل کو نفی صاحب کے گھر بھی دل چسپی بڑھ گئی اور اُس نے لڑکی کو دیکھنے کے لیے تاک جما کر شروع کر دی۔ مشکل یہ تھی کہ کلیل کو خلی منزل میں ٹھہرایا گیا تھا اور نفی صاحب، اپنی بیگم اور لڑکی کے ساتھ اوپری منزل پر رہتے تھے مگر ایک دن کلیل نے لڑکی دیکھ لی۔ وہ خاصی حسین تھی اور اُس عمر میں دیوار پر کوسلے سے بنی ہوئی لڑکی کی تصویر دیکھ کر ہی خیال و خواب اُٹھنے لگتے تھے۔ ایک روز نفی صاحب نے کلیل سے اصرار کیا کہ کراچی میں روزگار کا تھوڑا بہت آسرا ہونا چاہیے۔ وہ اسے اپنے ایک شناسا، انڈین جنوئن کیمیکل کمپنی کے مالک کے پاس لے گئے اور نہایت خوشامد انداز میں کلیل کی سفارش کی۔ مالک نے انٹرویو میں کلیل کو انگریزی میں خط ڈرافٹ کرنے کا حکم دیا۔ کلیل کی خاصی شکستہ انگریزی تھی۔ اُس نے دانستہ ڈرافٹ میں غلطیاں بھی کیں کہ کہیں اسے قبول نہ کر لیا جائے۔ خط دیکھ کے مالک نے سراہا اور کلیل کو توقع کے خلاف اپنے ہاں ملازمت کا عندیہ دے کر ساتھ روپے ماہانہ تنخواہ کی پیش کش بھی کر دی۔ نفی صاحب بہت خوش تھے لیکن کلیل تو کچھ اور خواب لے کے پاکستان آیا تھا۔ اسی دوران اس کے دیگر قریبی رشتے دار جو اُسے نفی صاحب کے 'کنبے' سے اُسے نکالنا چاہتے تھے، ایک ہفتے اپنے ہاں قیام کے بھانے اسے نفی صاحب کے ہاں سے نکال لے آئے۔

کلیل کراچی آمد کے چند دن بعد اپنے والد کے دوست رئیس امر دھوی سے ملاقات کے لیے بزنس روڈ اور عید گاہ میدان کے سنگم پر واقع اخبار جنگ کے دفتر پہنچا۔ توقع کے مطابق رئیس امر دھوی اُسے دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ کسی ہرکارے کے ہم راہ اُسے اپنے گھر بھیجا۔ کھارادر کے ایک تنگ فلیٹ میں اُن کی سکونت تھی۔ ساتھ والے فلیٹ میں ان کے چھوٹے بھائی جنگ کے مدیر اور فلسفی سید محمد تقی رہتے

تھے۔ دن زدہ جون ایلیا بھی کھیل کی کراچی آمد کے کوئی دس دن پہلے امر ہے سے ہجرت کر کے یہاں آ کے بس گئے تھے۔ وہاں مگر بھرے پڑے تھے۔ رئیس صاحب کی بیگم اور پانچویں بیٹیوں نے والہانہ انداز میں کھیل کا استقبال کیا۔ بڑی دو بیٹیاں کھیل کے ساتھ مراد آباد میں کھلی کرتی تھیں اب وہ بڑی ہو چکی تھیں۔ چہرے بدل گئے تھے لیکن کھیل سے وہ اپنے گھر کے کسی فرد، دوستوں اور بھائیوں کی طرح بیٹھا نہیں۔ مگر تو اس گھر میں کھیل کا آنا جانا معمول ہو گیا۔

اُسے کراچی آئے کئی ہفتے ہو چکے تھے اور وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اس دوران اماں کے چنبڑائی خطوط نے کھیل کو گلو کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دوری ویسے بھی روان پیدا کر دیتی ہے۔ سوا س کے دل میں اپنے شہر مراد آباد اور لوگوں کے لیے محبت عود کر آئی۔

وہ عین ماہ کراچی گزر کر وہ مراد آباد لوٹ گیا۔

مراد آباد میں ابتدائی چند روز تو سرشاری میں گزرے۔ باآخرا حساس دیاں خزاں تر ہوا۔ سب محنت، بھاد اور کوشش رانگاں مٹی تھی۔ تھوڑے دنوں بعد نانائے پاس بلا کر مشورہ دیا کہ وہ اسے دکان کھول دیتے ہیں۔ ساتھ میں قلی دی کہ ہر بڑا کاروبار شروع میں چھوٹا ہوتا ہے۔ نانائے ان الفاظ سے کھیل کو نو جوان نجوی کی باتیں بھی لگنے لگیں۔ اُسے لگا کہ اُس کی زندگی کس پھری میں گزرے گی اور ایک دن گم نامی میں غربت کی موت مر جائے گا۔

اس دوران اُس کی زندگی میں ایک تبدیلی آئی۔

ماموں کو دوبارہ کاروباری دورے پر ڈیڑھ سال کے لیے جنوبی ہند نکلتا تھا۔ انھیں ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ کھیل ان کی معاونت کے لیے ساتھ ہولیا۔ اُس سفر نے اس میں ایک بٹاشت پیدا کر دی۔ نئے شہر دیکھے، حیدر آباد، ہنگور، مدراس وغیرہ دیکھے، آرڈر بھی خلاف توقع بہت ملے۔ حیدر آباد میں ابھی تک مسلمانوں کے دور کے اثرات باقی تھے، خاص قسم کی تہذیب پر اصرار تھا۔ پولیس ایکشن ہو چکا تھا لیکن نوابین کے آثار کسی قدر زندہ تھے، مخصوص عادات و اطوار، رسوم و رواج حیدر آباد کو ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے جدا کرتے تھے۔ پوری دنیا کے رواج کے برعکس وہاں باقاعدہ عین کھانے ہوتے ہیں اور ناشتے میں چاول کھائے جاتے ہیں۔ زیادہ قیام حیدر آباد کوکن میں رہا۔ وہاں ایک رات مجید نامی دوست بازار حسن محبوب کی منہدی میں لے گیا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔

پھولوں کی پیتاں اور ہار، گجرے، ٹوٹوں کی تھدیاں، پان کی دکانیں، رات کو دن کا سماں، چھل پہل، روشنیاں اور رنگین چہرے، تمباکو کا دھواں، نشے میں بھڑاک دوسرے پر گرتے جوان اور بوڑھے، ذوق برق کپڑوں میں لمبوس اشہرے کرتی لڑکیاں، مسکراتے گلے زبان و دال، حسن کے بوجھ سے جھکی کمان سی کمر کوئل دیتی قیمتی دوشیزائیں، نظروں سے ملتی نظریں اور اشاروں میں کئی مراحل ملے کر باقی آنکھیں، رہنے پٹنے قدم، پلٹی جوانیاں، ہر قدم پر ایک مختلف دنیا سامنے تھی۔

ایک تنگ و تاریک زینے کے رستے کمرے میں جا کر دیکھا کہ کھل رقص برپا تھی۔ کھیل اور مجید کا خالص کاروباری انداز میں استقبال کیا گیا۔ کھیل سٹ کر ایک کونے میں بیٹھا تو نانکے نے طنز کہا "فکر نہ کیجیے، آپ کو یہاں سے کوئی چرانہ لے جائے گا۔"

مجید نے تعارف کرایا "یہ پاکستان سے آئے ہیں۔"

اس سے محفل کا رنگ بدل گیا۔

یہ وہ دور تھا جب پاکستان نئے آنے والوں کو بے حد عزت سے دیکھا جاتا تھا اور انھیں خوش حال تصور کیا جاتا تھا۔

سوحسین رقاہہ بولی "تو ہے نصیب۔"

اُس رات کھیل کو شدت سے دوبارہ احساس ہوا کہ دنیا اسی کی ہے جس کے پاس مال و زر ہے۔ دوسرے یہ کہ اُسے پاکستان چھے

جانا چاہیے اور اپنی قسمت آزمائی چاہیے۔

بازار حسن کی اُس رات نے ٹکلیل کی زندگی کا حتمی رخ متعین کر دیا۔ جنوبی ہندوستان کے طویل سفر سے مراد آبادوالہیں آ کے وہ ایک بار پھر دہلی چلا گیا اور وہاں سے ویزا لگوا کر کسی کو بتائے بغیر پاکستان چلا آیا، وہ پاکستان جو اس کا وطن ٹھہرتا تھا، جہاں اُسے عزت و رزق ملتا تھا اور ان سب سے بڑھ کر محبت اور پیچان۔ وہ اپنے ساتھ چند خواب اور فقط چالیس روپے لایا تھا۔

اس مرتبہ اُس نے پہلے والی غلطی نہ کی اور سیدھا رئیس امر دہلی صاحب کے دفتر ”شیراز“ میں جا پہنچا۔

یہاں سے اُس کی زندگی نے نیا رخ لیا اور ایک سیدھی سیدھی شاہ راہ پر فراز کی جانب رواں ہو گئی۔ رئیس صاحب ایک مشہور آدمی تھے۔ ان کے دفتر میں شہر بلکہ پاکستان بھر کے ادیبوں شاعروں کا آنا جانا کثرت سے ہوتا تھا۔

ایک سہ پہر میں اور ٹکلیل بھائی کراچی کے شیرین ہوٹل کی لابی میں کافی پیتے ہوئے عصر کی شیفٹی روشنی میں شیشے کے اُس پار پانی سے لبالب بھرے نیلے سوئمنگ پول میں نہاتے اور تیراکی کرتے انگریز سیاحوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ میرے شفیق مربی ہونے کے علاوہ غم خوار و چارہ ساز بھی ہیں۔ سو اُس سہ پہر لابی میں مشہور، تیرا اور رفیع کے پرانے ہندوستانی گانے براہ راست ایک خوش گلوں کار سے سنتے ہوئے وہ ماضی میں کھو گئے۔

میں نے پوچھا کہ اُن کی زندگی کا پاکستان آنے کے علاوہ اہم ترین فیصلہ کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا ”ملازمت نہ کرنے کا فیصلہ۔ ملازمت بھلے کتنا ہی خوش حال کیوں نہ ہو جائے، رہتا کٹھن کا تیل اور دوسروں کا محتاج ہے۔ اس میں ایک حد سے بڑھنے کے مواقع نہیں ہوتے۔ اپنے کام میں خود مختاری ہوتی ہے، آدمی کسی کو جواب دہ بھی نہیں ہوتا اور ترقی کے لامحدود مواقع ہوتے ہیں۔ گویا انسان پیدا تو آزاد ہوتا ہے، مگر اپنے آپ کو خوشی سے ملازمت کی پابندیوں میں جکڑ دیتا ہے۔ اپنے کام میں آزادی ہوتی ہے، کھل کر سانس لیا جاسکتا ہے۔“

اس کے بعد وہ سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے ”میں نے زندگی میں ایک اور عملی سبق سیکھا۔ میں اُس اولاد کو نالائق اور نا اہل سمجھتا ہوں جو کہتی ہے کہ اگر ہمارے والدین نے ہماری پرورش محبت اور خیال سے کی تو کون سا احسان کیا، یہ اُن کا فرض تھا۔ اسی طرح چند ناکام لوگ یہ الزام بھی دھرتے ہیں کہ اُن کے والدین اُن کی زندگی کی مناسب نقشہ نویسی نہیں کی۔ ان میں بیش تر لوگ قابل رحم حد تک ذہنی بیمار، ناکام اور حقیقت سے فرار اختیار کرنے والے ہوتے ہیں۔“

ٹکلیل بھائی نے ایک طویل فہرست ان لوگوں کی گنوائی جنھوں نے عملی زندگی کا آغاز تیشی یا بے چارگی سے کیا، عروج حاصل کیا۔ بلکہ زیادہ تر عروج ایسے ہی لوگوں نے حاصل کیا۔ میں نے ان کی گفت گو کے دوران سامنے پرل کا ٹیبلٹل ہوٹل کی جانب اور دیگر کئی عمارات کو دیکھا اور سوچا کہ ان کے مالکان واقعی قطع طور پر خود پر داختہ ہیں۔

داستان پھر سے زندگی کی ہٹو ہٹو پر دوڑنے لگتی ہے۔

نوجوان ٹکلیل نے رئیس صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار ”روزنامہ“ ”شیراز“ کے دفتر میں قیام کر لیا۔ رئیس صاحب کے ذرائع آمدنی محدود تھے۔ ”جنگ“ سے کچھ پیسے مل جاتے، شادی کے سہرے اور قطعہ تاریخ وفات لکھوانے والے دس بیس روپے دے جاتے یا پھر شاعری میں اصلاح کروانے والے لوگ دو چار روپے نذر کر دیتے۔ ”شیراز“ تو مسلسل نقصان میں جا رہا تھا۔ چنانچہ کچھ مرتبہ ایسا ہوتا کہ دفتر میں چائے تک کے پیسے نہ ہوتے۔

”شیراز“ کو جو اشتہارات ملتے وہ درحقیقت رئیس صاحب کو ذاتی حیثیت میں ملتے۔ وہاں رئیس صاحب نے ”شیراز“ کے انتظامی اور ادارتی معاملات ٹکلیل کے سپرد کر دیے۔ ٹکلیل نے تعلیم جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی اور اردو کالج میں شام کو کلاس کی



کلاس میں لینا شروع کر دیں۔

اخراجات پورے کرنے کے لیے بند روڈ پر مراد آبادی برٹنوں کی دکان پر روزانہ دو کھٹے لکھ کتابت کی روزانہ اجرت پہلا دست

کر لی۔

وہاں دکان کا مالک عجیب و غریب مفات کا حامل تھا۔ روپہر کو کھانا کھا کر جو کھانا اپنے انتہائی شریف اور شمع مددگارین عظیم صاحب کو دے دیا کرتا جو اسے چکھتے بھی نہ تھے۔ عظیم صاحب کا دلی کے چاندنی چوک پر خاصا بڑا کاروبار تھا۔ اب ہجرت کے بعد انھیں کماپی میں نوکری کرنی پڑ رہی تھی۔ مکافات زمانہ ہے کہ عظیم صاحب کا بیٹا اقلیم عظیم میٹرک میں پورے کراچی میں اول آیا، بعد ازاں اس نے ”موت کے سردار“ بھی لکھی۔ جب کہ مالک کے بچے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔

کراچی میں تعلیم کے دوران ہندی میڈیم سے اردو میڈیم میں منتقل ہونے کی وجہ سے ٹکلیل انٹر میں ٹیل ہو گیا۔ دکان کی ملازمت نے ٹکلیل کے آئندہ ملازمت نہ کرنے کا ارادہ مزید پختہ کر دیا۔

ایک دن ٹکلیل کو ایک ایسا خیال آیا جس نے ”شیراز“، رئیس امر وہوی اور خود اس کی اپنی کاپی پلٹ دی۔ یہیں سے اس کی مالی

آسودگی کا سفر شروع ہوا۔

قصہ کچھ یوں ہے، ٹکلیل نے اندازہ لگایا کہ ”شیراز“ کے خسارے میں رہنے کی وجہ اس کی روزانہ اشاعت ہے۔ چنانچہ اس نے اسے ڈمی پر چاہتا دیا، گو یا اب وہ صرف اتوار کو باقاعدہ شائع ہوتا جب اس میں سارے اشتہارات بھی شائع کر دیے جاتے۔ یوں کاغذ، کتابت اور دیگر لوازمات کی مد میں خاصی بچت ہو جاتی۔ ”شیراز“ خسارے سے نکل کر تین سو روپے ماہانہ کے فائدے میں چلا گیا۔

ٹکلیل نے منافع میں سے مناسب حصہ اماں کو ملے آباد بھیجنا شروع کر دیا۔

مگر ایک واقعے نے رئیس صاحب اور ٹکلیل کے راستے جدا کر دیے۔

14 اگست یوم آزادی کے لیے حبیب گروپ آف انٹرنیٹ والے دو پورے صفحات کے اشتہارات اخبارات کو جاری کر رہے تھے۔ ”شیراز“ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ یہ اشتہارات حاصل کر سکے۔ رئیس صاحب نے اپنی سی کوشش کی اور ناکام ہو گئے۔ ٹکلیل نے انھیں ایک پیش کش کی کہ اگر وہ اشتہارات لے آئے تو اس کا انعام کیا ہوگا۔ ٹکلیل نے درخواست کی کہ وہ معاوضے کے نصف حصے کا مستحق ہوگا۔ رئیس صاحب نے نہ صرف فوراً ہامی بھری بلکہ اشتیاق کا بھی اظہار کیا۔

ٹکلیل بھرپور ارادے سے میدان میں اتر آئی، لوگوں کو بیچ میں ڈالا، اشتہارات والے صاحب کے دفتر کے باہر جا کر رات بھر بٹلے موٹی چراغ کی موم کی مانند جم گیا۔ نتیجتاً دونوں اشتہارات شیراز کو مل گئے۔ رئیس صاحب بے حد خوش ہوئے۔ ”بھئی کمال کر دیا۔“ وہ بولے۔

ٹکلیل نے حسب وعدہ انعام طلب کیا۔

”ہائیں! کیا انعام؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں۔“ رئیس امر وہوی کے کلمے سے جواب نے ٹکلیل کی سٹی گم کر دی۔ پس تبھی اس نے

”شیراز“ چھوڑ دیا۔

وہ روٹھا ضرور تھا، جھگڑا نہ کیا تھا۔ تعلق گمریلو نوعیت کا تھا، سو ہلکی ناراضی تک رہا۔

اب کہانی کے اندر جون اصغر داخل ہوتے ہیں، جو بعد میں جون ایلیا کے نام سے معروف ہوئے۔

محمد ٹکلیل نامی نو جوان اب ٹکلیل عادل زادہ کے نام سے ایک پختہ کار نکلے ہوئے ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

1957 کا سال تھا، آئی چندی گڑ، حسین شہید سہروردی کی جگہ وزیراعظم بنے، اور چھپن روز بعد فیروز خان نون نے ان کی جگہ

لے لی تھی۔ پاکستان سیاسی بیجان سے گزر رہا تھا۔ جون ایلیا پاکستان آچکے تھے۔ ان کے استحکام کے لیے ”انشا“ نامی پرچہ نکالا گیا۔ رئیس

امروہوی، سید محمد تقی اور جون ایلیا تینوں بھائی اپنا علیحدہ مقام رکھتے تھے سو وہ کمشنر کراچی الطاف گوہر سے ملے اور اسی ملاقات میں 'انٹا' کا ویکٹریشن لے کر لوٹے۔

جون ایلیا جو تب تک کھیل سے خاصے قریب ہو چکے تھے، نے انھیں شعبہ اشتہارات سنبھالنے کی درخواست کی۔ 'انٹا' میں کھیل نے "داستان شہر زرنگاری" کے عنوان سے کراچی کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں پر لکھنا شروع کیا۔ جون صاحب اردو، فارسی، عربی، عبرانی اور سنسکرت پر دسترس رکھتے تھے۔ گرامر اور منطق اُن کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ سو انھوں نے کھیل صاحب کی لسانی تربیت کی۔ جوانی کا زمانہ تھا، شوخی طبع نے آمادہ کیا کہ وہ طنز و مزاح سے آراستہ تحریریں لکھیں۔ انھوں نے یہ تحریریں بہت جلد لکھنا چھوڑ دیں۔ اس کی وجہ دو واقعات ہیں۔

پہلا واقعہ کچھ یوں ہے کہ کراچی کی ادبی سرگرمیوں کو رپورٹ اور ان پر تبصرہ کرتے وہ انجمن ترقی اردو کے مدارالمہام ثانی پر ایک کئیلا تبصرہ کر بیٹھے۔ وہ صاحب ایک مرتبہ مرنج شخص تھے۔ رنجیدہ ہو کر چپ ہو گئے اور کھیل سے باقاعدہ ناراض ہو گئے۔ یہ ناراضی بہت دیر تک چلی۔ وہ صاحب معروف مزاح و تبصرہ نگار مشفق خواجہ تھے۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ کھیل کے ایک بینکار واقع کار مسلم کمرشل بینک میں اٹنی عہدے پر تھے۔ وہ صاحب ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور لکھتے بھی تھے۔ تاہم تب تک اُن کی کوئی کتاب شائع نہ ہوئی تھی۔ کھیل صاحب ہر ماہ انٹا کا تازہ شمارہ لے کے اُن کے پاس جاتے تھے۔ کھیل صاحب کے پہلے بینک اکاؤنٹ پر بھی اُن صاحب نے بہ طور گواہ دست خط کیے تھے۔ اُس زمانے کی ایک صبح جب ابھی آئی آئی چندری گروڈ پر ہنگامہ خیز ٹریفک کا ازدحام نہ ہوتا تھا، اُن بینکار نے کھیل صاحب کے ساتھ چائے پیتے ہوئے ایک نصیحت کی۔

"میاں ایک بات گرہ سے باندھ لیں تو بہتر ہوگا، دل آزاری قلم کا شیوہ نہیں ہونا چاہیے۔"

کھیل صاحب نے وہ بات ایسی گرہ سے باندھی کہ آج بھی اُن کے پیش نظر ہے۔ اُن بینکار کا نام مشتاق احمد یوسفی تھا۔

"انٹا" میں کھیل نے کرٹل میڈاس ٹیلر کی کتاب "The confessions of a thug" کا ترجمہ "امیر علی ٹھگ کی سرگزشت" کے نام سے شروع کیا۔

ادھر کراچی میں کھیل نے ترجمہ سلسلہ وار تحریر کرنا شروع کیا، ادھر دُور پار کے ایک شہر میں ایک دلکش خاتون نے وہ ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔

وہ خاتون بمبئی کی معروف اداکارہ مینا کمار کی تھی۔

یوں اُن جانے میں تعلق کی کڑیاں ملنے لگیں۔ قدرت کو ان کی ملاقات منظور تھی، سورتہ ہم دار کرنا شروع کیا۔

سن 1960 تھا، دنیا بھر میں معاشرتی، ثقافتی اور ادبی تحریکیں نئے رنگ میں شروع ہو رہی تھیں۔ اس دہائی کو 'خلائی دہائی' کا نام دیا جاتا تھا، مغرب میں ہی اور انسانی آزادی کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں، فلمی دنیا نے زادیوں سے روشناس ہو رہی تھی اور پاکستان میں نواب حسن الملک کے نواسے، شعلہ بار، مقرر کیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل حسین ناصر کو شاہی قلعے میں ایذا نہیں دی جا رہی تھیں۔ وہ بے طبقات کا بے لوٹ رہ نما بن کر اپنے نوابی چورغ کو اتار پھینک چکا تھا۔ اُسے نومبر 1960 میں شدید تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا۔ عوامی غیظ و غضب سے بچنے کے لیے اُس کی لاش کو قبر سے نکال کر کہیں اور دفن دیا گیا تھا۔ غرضیکہ پورے کڑے پر ایک جوش و ولولے کا عالم تھا۔ ایسے میں تین افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا قافلہ پاکستان سے ہندوستان کی جانب رواں دواں تھا۔ اُس قافلے میں رئیس صاحب کی بیگم، باجی امی، بیٹی خضران (بیبا) اور اُن کے گمران کی حیثیت سے کھیل تھے۔ وہ ابھی بائیس برس اور چند ماہ کے تھے۔ مراد آباد سے ہو کر امر دہے اور پھر بمبئی جانا تھا۔ بمبئی میں ان سب کا قیام رئیس صاحب کے چچا زاد کمال امر وہوی کے ہاں تھا۔ کمال امر وہوی ہندوستانی سینما کی معروف شخصیت، فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔

سکندر، پکار اور اُس وقت دھوم مچانے والی فلم ”محل“ کی کامیابی کے بعد اُن کا شمار چوٹی کی فلمی شخصیات میں ہوتا تھا۔ کمال صاحب اپنی پہلی بیوی فردوس، بچوں، رخسار، شان دار اور تاج دار سے ہٹ کر دوسری بیوی، شہرہ آفاق اداکارہ مینا کمار کی ساتھ باعہدہ میں اوسط درجے کی کوٹھی کی بالائی منزل میں رہتے تھے۔

شکیل بھائی گھونٹ گھونٹ داستان سنا رہے تھے۔ وہ بات تو مجھ سے کر رہے تھے، دیکھ کہیں اور رہے تھے۔ ان آنکھوں میں وہی چمک تھی جو تیس بائیس برس کے لڑکے کی نظروں میں ہوتی ہے۔

گھر میں مکمل خاموشی تھی، ان کی بیوی بھی جل کر راکھ ہو چکی تھی اور کمرے میں اُن کی دھیمی آواز ہلکی گونج پیدا کر رہی تھی۔ ہم اپنی ملاقاتوں میں کمرے کی بتیاں بجھا کر صرف فلور لیسپ چلے رہے دیتے ہیں۔ یوں ایک پرسکون اور خواب آور ماحول میں ایک سوئی آ جاتی ہے۔ میں انہیں محبت سے دیکھتا ہوں اور وہ متانت سے بولتے ہیں، ماضی کی باتیں، آج کے حالات، مستقبل کے ارادے، ادب کی باتیں، ادیبوں کے قصے، زعمیل حیات سے واقعات اور باتیں یوں نکلتی چلی آتی ہیں جیسے جادوگر کی ٹوپی سے کوتر ہوتے۔

”مینا جی دل کش شکل و صورت اور نکھری سرمہ آمیز یادامی رنگت کی خاتون تھیں۔ جب میں نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو اُن کے چہرے پر مہنہ طبعی جاؤ بیت تھی، ایک تابانی اپنی جانب کھینچتی تھی۔ وہ جسم کے آر پار ہونے والی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ اکثر اُن کی آنکھیں مہری سوچ میں نظر آتیں۔ میں کل کالوٹا تھا اور وہ معروف ہیروئن سوا یک گیمبر بھی مجھے اُن کی شخصیت سے مسحور کرتا تھا۔“

”اُن کا گھر کیسا تھا؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”میں نے دیکھا ہے کہ بعض سادہ سے لوگ گھروں کی خوب زینت و زیبائش کرتے ہیں جب کہ خوب چمک دکھ والے لوگ گھروں کو سادہ رکھتے ہیں۔ ان کے گھر جا کر مجھے حیرت ہوئی، عام سا گھر اور سادہ سا سامان۔ مگر بھی خاص وسیع نہ تھا، بس چار کمرے اور وسط میں دیوان خانہ (انگریزی میں ڈرائنگ روم، ووڈ رائٹنگ روم (کوشہ خلوت) کا مخفف ہے) باورچی خانہ وغیرہ۔ ساز و سامان بھی سادہ اور عام سا تھا۔ اُس گھر میں کمال صاحب کے فلم سے وابستہ دونو جوان رشتے دار بھی رہتے تھے۔ مینا جی نے ہم سب کا بہت محبت سے استقبال کیا۔ اُن سے ہماری زیادہ ملاقات کھانے کے دوران ہوتی یا پھر ناشتے کے بعد ہمارے ساتھ کچھ وقت گزارتیں۔ میں ایک احتیاط خاص کرتا، اُن کے ساتھ فلموں پر کم سے کم بات کرتا۔ وگرنہ میری شیفٹنگی اُن پر گراں گزرتی اور وہ مجھے ایک رشتے دار سے ہٹ کر فلم بین کے طور پر دیکھ کر تکلف بچ میں لے آتیں۔ انہیں شاعری سے شغف تھا، نازِ خلص کرتی تھیں، سواپنی بساط کے مطابق میں زیادہ ادب و شاعری کی باتیں کیا کرتا۔ یہ باتیں انہیں خوب دل چسپ لگتیں اور وہ ان میں کھو جاتیں۔ ایک روز وہ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ مجھے ادب کا ایسا شوق کیوں کر ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اسے پیشے کے طور پر اختیار کر چکا ہوں تو وہ خاصی متاثر ہوئیں۔ جب میں نے انہیں امیر علی ٹھک کی انشا میں شائع ہونے والی آپ بیتی کا بتایا تو انہیں یقین نہ آیا۔ انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور زوردارہ پوچھا کہ کیا ایسی رواں تحریر میری ہی ترجمہ کی ہوئی ہے۔ وہ اُسے باقاعدگی سے پڑھتی تھیں۔ میرے اثبات پر، تکلف کی معمولی سی پردہ داری بھی ہٹ گئی۔ اب وہ خوب جم کر مجھ سے کپ لگانے لگیں۔“

”آپ نے اُن سے کبھی بھی فلمی زندگی کا نہیں پوچھا؟“ میں نے استفسار کیا تو بولے۔

”میں ان کی فلمی زندگی کا ذکر قطعی طور پر نہ کرتا، تو وہ سمجھتیں کہ میں جانتے بوجھتے ایسا کر رہا ہوں۔ سو میں نے ایک بار اُن سے پوچھا کہ انہیں فلمی دنیا کیسی لگتی ہے تو انہوں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا کہ شروع میں تو اچھی لگتی تھی، بعد میں قید کا احساس ہونے لگا۔ میں نے اُن سے ستائش بھرے لہجے میں کہا کہ اُن کے پاس عزت، دولت، شہرت سبھی کچھ ہے۔ یہ سن کر اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ گھر میں اداکاری نہیں کرتی تھیں، اُس روز انہوں نے اس میں کمالی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ طاری کر لی تھی۔“

”اُن کی زندگی کے ایسے گوشے جو کم ہی لوگوں کو معلوم ہوں، کیوں کہ آپ تو ان کے گھر دوہنتے کے لیے مہمان تھے؟“ میرے

سوال پر تکلیل بھائی نے کچھ دیر سوچا اور بتانے لگے۔

”ہاں، وہ روز قرآن پاک کا ایک پارہ ختم کرتی تھیں۔ میں نے تو نہ دیکھا، گھر یلو ملازم بتاتے تھے۔ دوسرے، ایک مورت دور ان کے بدن کی مالش کرنے آتی تھی۔ دو گھنٹے بعد وہ نہادھو کر کھلے بالوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آتیں تو بہت اجلی گھری ہلکی ہلکی نظر آتی تھیں۔ دو واقعات کا تذکرہ ان کی شخصیت کو اور کھول کر بیان کر دے گا۔“

”وہ کیا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”ایک روز ہم سب نے فلم پر جانے کا ارادہ کیا۔ کمال صاحب اور میناجی بھی ساتھ تھے۔ ہم نے دانستہ دیر سے جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اندھیرے میں انھیں کوئی پہچان نہ سکے۔ احتیاطاً میناجی نے برقع بھی اوڑھ لیا۔ فلم کے وقفے میں کمال صاحب کی وجہ سے لوگوں نے ہمیں پہچان لیا۔ وہ ہمارے ارد گرد منڈلانے لگے۔ کمال صاحب نے یہ دیکھ کر فلم ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ لوگ بھی تاک میں تھے۔ بس وہ ہلڑ بازی ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ لوگوں نے ایسے ایسے بے ہودہ جملے کہے، گالیاں دیں اور فحش اشارے کیے کہ میرے تو کانوں کی لودیوں سرخ ہو گئیں۔ ہم بھاگ کر گاڑیوں میں بیٹھے اور گھر کی راوی۔ گھر پہنچ کر تذلیل کے احساس سے میرا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میناجی یوں اطمینان سے بیٹھی تھیں جیسے انھیں اس کی عادت ہو۔“

”دوسرا واقعہ کچھ یوں ہے۔“ تکلیل بھائی نے مزے لیتے ہوئے سنانا شروع کیا۔

”ہماری کبھی رات کو، کبھی ناش کی بازی لگتی۔ ایک رات دو ٹیمیں بن گئیں۔ ایک ٹیم میں کمال صاحب اور میناجی، جب کہ دوسری میں میں اور کمال صاحب کے بھانجے بھائی شانے تھے۔ سب کو توقع تھی کہ میرے اناڑی پن کی وجہ سے ہماری ٹیم ہار جائے گی۔ کمال صاحب نے تجویز کیا کہ ہارنے والی ٹیم جیتنے والی ٹیم کے پیر پکڑ کر ندامت کا اظہار کرے گی۔ ہم نے احتجاج کیا لیکن کمال صاحب نہ مانے۔

بازی بڑھی تو حسب توقع ہم ہارنے لگے۔ آہستہ آہستہ مخالف ٹیم کی کچھ تھک کر اور کچھ بوریت سے دل چسپی گھٹنے لگی۔ میرے پاس بھی چند اچھے پنے آگئے اور ہاتھ رواں ہو گیا۔ بالآخر ہم جیت گئے۔ جب ہمارے پاؤں چھونے کی باری آئی تو ہم نے انھیں معاف کر دیا۔ انھوں نے معافی کی پیش کش رد کر دی اور حکم دیا کہ ہم اپنے پیر آگے بڑھائیں۔ جب میں نے اپنے پیر آگے بڑھائے تو میناجی نے میرے پیر چھوئے اور بولیں ”ہم ہار گئے بھی تم جیتے“ یہ کہہ کر وہ خلاف عادت، کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ اُن کے اور کمال صاحب کے درمیان ایک رکھی اور تکلف کا تعلق تھا۔ اُس روز ان کی ہنسی میں نے پہلی مرتبہ سنی تو یوں لگا جیسے گھنٹیاں بج اٹھیں ہوں اور مکان میں گھر کی فضا بن گئی ہو۔ اُن کی ہنسی میرے لیے سب سے بڑا انعام تھی۔“

”یوں آپ کے دن وہاں خوب گزرے“ میں نے وہاں کے قیام کو سیٹھتے ہوئے جملہ بولا تو تکلیل بھائی چونک گئے۔

”اصل بات تو ابھی رہتی ہے۔ ایک رات کمال صاحب اور گھر کے دیگر افراد کہیں مدعو تھے۔ میناجی اور میں گھر پر تھے۔ ہم نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا، چائے پی اور خوش گپیاں کیں اور میں باجی امی اور بیبا کے ساتھ کمرے میں آن لینا جو آتے ہی سو گئیں۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی سو رسالوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ کوئی گھنٹے بھر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اسے نیم داکیا گیا۔ میں نے دیکھا تو میناجی تھیں۔ یک دم میں اٹھا اور لپکا ”آئیے آئیے۔“

”سو تو نہیں گئے تھے، میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ انھوں نے آہستگی سے پوچھا۔

”نہیں نہیں میں تو جاگ رہا تھا اور دروازے پر ہڑھ رہا تھا“ میں نے جواب دیا۔

”وہ بولیں کہ انھیں نیند نہیں آرہی تھی، سو باتیں کرنے کو جی چاہا۔ میں اُن کے پیچھے چلا ہوا حسب معمول ڈرائنگ روم میں آ گیا۔



وہ ہاں رکی نہیں اور اپنے بیڈروم کی جانب بڑھ گئیں۔ اب تک تقریباً نصف ماہ میں میں نے ہر اگورد کچھ لیا تھا۔ ان کا کمر اندکھا تھا۔ وہ کمر اگھر بھر میں سب سے مریض تھا۔ قیمتی سامان، ریشمی پردے، ریشمی چادر، قیمتی صوف اور سنگھار میز کے بلب سے پھوٹی خواب آگیاں روشنی۔ میں نے ان کی طبیعت کا پوچھا تو وہ بولیں کہ اُن کا سر بھاری ہو رہا ہے۔ میں نے پیش کش کی کہ میں سرد ہاد دیتا ہوں۔

”مجھے سرد دباتے ہوئے آیتیں پڑھ کر درد کاٹنا آتا ہے۔“ میں نے یقین سے کہا تو میری بے ساختگی اور مصومیت پر وہ کھلکھلا

پڑیں۔

”وہ کیسے؟“ انھوں نے بننے ہوئے کہا۔ میں فوراً صوفے کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور اُن کی پیشانی پر انگلیاں رکھ کر انگوٹھے کن پنی سے لے ہوئے اُن سے ملا دیں۔ یوں میں اُن کا سر دبانے لگا۔ اُن کے سیاہ گنے بال کھلے تھے اور خوشبو اٹھ رہی تھی۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔ اُن کی جلد خاصی چست تھی۔ میں آیتیں بھی پڑھ کر پھونکنے لگا۔ اُن پر لطف و خمار طاری ہونے لگا۔ خاصی دیر تک سرد ہا کر میں بنا تو وہ نیم سرور میں بولیں۔

”سر سے ایک بوجھ ہٹا محسوس ہوتا ہے۔“

اس کے بعد ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں بمبئی رک کیوں نہیں جاتا۔ میں نے مختلف بہانے کیے۔ وہ ایک نہ مانیں اور کہنے لگیں کہ تعلیم اور روزگار کے مواقع تو بمبئی میں بھی خاصے میسر ہیں۔ جب بات آگے بڑھی تو میں نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا کہ مجھے فلمی دنیا اچھی لگتی ہے۔

وہ زہر خند لہجے میں بولیں۔ ”یہ دنیا! سارا فریب ہے، دکھا دے۔ یہاں کچھ نہیں رکھا۔“

جب میں نے بہانہ کیا کہ پاکستان میں میرے رہنے کا مناسب انتظام ہونے لگا ہے تو انھوں نے بات کاٹ دی۔

”یہاں بھی سارا انتظام ہو سکتا ہے۔ پھر میں بھی تو یہیں ہوں۔ اطمینان رکھو، تمہارا خیال رکھا جائے گا۔“

”آپ؟“ میں نے حیرت سے کہا تو وہ سادگی اور رازداری سے بولیں۔

”کوئی بوجھ نہ ہوگا اور کسی کو خیر بھی نہ ہوگی۔“

مجھے متذبذب دیکھ کر انھوں نے اضافہ کیا۔

”مجھے خوشی ہوگی اگر تم کسی قابل ہو جاؤ، جو چاہتے ہو وہ بن جاؤ۔“ اتنے میں گاڑی کے ہارن نے کمال صاحب کے آنے کی

اطلاع دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو کمال صاحب نے ہم دونوں کو جاگتے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

”ہم دونوں دنیا جہاں کی باتیں کر رہے تھے۔“ وہ بولیں۔

رات کو میں کم ہی سویایا۔

صبح ناشتے کے وقت مجھے باور چئی نے کہا کہ بیگم صاحبہ مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں ایسے خیالات کے ساتھ پچھلی بالکونی پر پہنچا تو وہ

سکرا رہی تھیں۔ انھوں نے نیلے رنگ کا ایک لفافہ مجھے تھمایا۔

”مجھے آج جلدی جانا ہے اور رات کو وہی میں دیر ہو سکتی ہے۔ تم یہ رکھ لو، یہ تمہارے لیے ہے۔“

جب میں نے انکار کیا تو انھوں نے زبردستی مجھے وہ لفافہ تھما دیا اور وہاں سے چلی گئیں۔

بعد میں میں نے اُس رات اور اگلی صبح وہ لفافہ انھیں لوٹانے کی خاصی کوشش کی لیکن تنہائی میسر نہ آئی۔

”اُس لفافے میں کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک ہزار روپے کی رقم۔ سو سو روپے کے دس نوٹ۔ یہ اُس زمانے میں خاصی بڑی رقم تھی۔“ نکلیں بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں انھیں باہر تک رخصت کرنے آیا تو ایک سوال میرے ہونٹوں پر پھل رہا تھا۔

”کیا آپ کا بعد میں مینا کماری سے رابطہ رہا؟“

”ہمیں رخصت کرتے وقت اُن کی آنکھیں نمی سے جھللا رہی تھیں۔ کراچی آنے کے بعد ہمارا چند خطوط کی حد تک رابطہ رہا، وہ بھی ٹوٹ گیا۔“

کلیل بھائی کو رخصت کر کے میں مینا کماری کا سوچتا رہا۔ وہی مینا کماری جو کمال امر دہوی سے علیحدگی کے بعد بسیار نوشی کے باعث جگر کے عارضے میں مبتلا ہو کر جوانی میں فوت ہو گئی تھیں۔ البتہ اُن کی شخصیت کا ایک معما میرے لیے ہنوز تھنہ تبخیر ہے۔ اُن کا ہمیشہ اپنے سے چھوٹی عمر کے جوان مردوں کی جانب رومانوی اور دیگر معاملات میں جھکاؤ رہا جن میں سے اداکار دھر میندر سے اُن کا رومانوی بگل زار سے محبت بھرا تعلق منظر عام پر آیا۔

کمال امر دہوی کی بھی اس معاملے میں ایک کہانی، ایک نقطہ نظر ہوگا۔

اُسے ستائے کو اُس رات کوئی موجود نہ تھا۔

کراچی واپسی پر کلیل، جون ایلیا کے ساتھ ”انشا“ پر کام میں جت گئے۔

جون صاحب اپنے حراج کے آدمی تھے، زیادہ تر الگ تھلگ نکلنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ایک اسماعیلی تحقیقی ادارے میں جزوقتی ملازمت بھی اختیار کر لی تھی۔ وہ لفظ کے معاملے میں بے حد محتاط اور حساس تھے۔ وہ اور کلیل صاحب ”شیراز“ کے دفتر ہی میں رہا کرتے تھے۔ شام میں وہاں خوب مجلسیں جتیں۔ جون صاحب کے دوستوں میں محمد علی صدیقی، بحر انصاری اور دیگر دوست آتے تو رئیس صاحب کے شاگردوں کی قطار لگی ہوتی۔ جون صاحب کڑھا کرتے کہ رئیس صاحب نے شاگرد پالے ہوئے ہیں ”یہ شاگرد تخلیقی آدمی کا وقت ضائع کرتے ہیں“ وہ اکثر کہتے۔

بہر حال انہی شاگردوں میں سے بعض نے بعد میں خاصا نام پیدا کیا اور جون صاحب کے قریبی رفقا میں شمار ہوئے۔

اگلے برس تک کلیل صاحب کا نام ”انشا“ پر مرتب کی حیثیت سے آنے لگا۔ ان کی دوستی جمیل صدیقی اور حسن ہاشمی سے ہوئی۔ اُسی دور میں جمیل صدیقی، باشرع ایسے کہ رمضان کے بعد بھی جیسے روزے رکھتے اور خوش خوراک ایسے کہ نہاری، گولا کباب، شیر مال، پائے، قورمہ، شب دیگ اور تافان کے عاشق۔

حسن ہاشمی بلا کے ذہین و نکتہ رس۔ ”بازی گز“ کی پہلی قسط بھی انھی نے لکھی تھی جسے کلیل صاحب نے دوبارہ لکھا۔

انشا کے دور میں ایک رومانوی واقعہ پیش آیا۔ کلیل بھائی آج تک اُس پر نادم ہیں۔

مراد آباد میں ان کے دور کے رشتے داروں میں ایک لڑکی نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اُس زمانے میں شاذ و نادر ہی مسلم خواتین اعلیٰ تعلیم حاصل کر پاتی تھیں۔ کلیل صاحب نے اُسے بچپن میں دیکھا تھا اور اُس سے قربت کی خواہش لیے پاکستان آگئے لیکن اُس کی ترقی کی خبریں انھیں لڑکی کے کراچی میں موجود رشتے داروں سے ملتی رہتی تھیں۔ تعلیم کے بعد وہ معلّم ہو گئی تھی اور شادی یوں نہیں ہو پائی کہ اس کے مرے کا لڑکا ملنا مشکل تھا۔ کچھ تھہرے رشتے دار لڑکی کی اعلیٰ تعلیم پر معترض تھے اور یقیناً انگلیاں بھی اٹھاتے تھے۔ بہر حال کلیل صاحب جانے کیوں اُسے سر کرنا چاہتے تھے۔ آخر انھیں ایک ترکیب سوچی ”انشا“ عالمی ڈائجسٹ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ انھوں نے پہلے عالمی ڈائجسٹ کے چند شمارے بذریعہ ڈاک روانہ کیے۔ شکریے کا خط موصول ہونے کے بعد انھیں جیسے راستہ مل گیا۔ انھوں نے اسے خط لکھا اور عالمی ڈائجسٹ میں لکھنے کی دعوت دی۔ خاصا عرصہ گزر گیا، کوئی جواب نہ آیا۔

بالآخر ایک روز اس کا خط آگیا۔ اُس نے پوچھا کہ وہ کیا لکھے۔ فکیل صاحب نے اس کے جمال خط کو سراہا۔ نتیجہً وہ کتابت بدل گئی۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ کثرت سے خطوط کا تبادلہ ہونے لگا۔

وہ لڑکی ذوق و شوق میں خوب آگے بڑھ گئی۔ بس اتنی دیر ہو گئی کہ فکیل صاحب شادی کی پیش کش کریں اور جواب لازماً مثبت ہی آئے۔ فکیل صاحب کو اُس سے جذباتی وابستگی ہو گئی تھی مگر یہ افلاطونی قسم کی کوئی بات نہ تھی۔ انھوں نے سنا تھا کہ وہ لڑکی اپنی دنیا میں گمن رہتی ہے۔ لوگوں سے کم ملتی جلتی ہے۔ ایک نخت اس میں بے پناہ ہے۔ ایک بار انھوں نے پوری کاپی بھر کے خط لکھا۔ وہ بھی لمبے لمبے خطوط لکھنے لگی تھی۔ فکیل صاحب نے اُسے پوری طرح اسیر کر لیا تھا۔ اس سے جذباتی وابستگی ہو گئی تھی مگر افلاطونی عشق نہ تھا۔

دو تین برس یہ معاملہ چلا۔ اس دوران 1965 کی جنگ ہوئی۔ ترسیل ڈاک میں قفل کی وجہ سے اکٹھے درجنوں خطوط ملتے۔ فکیل صاحب آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ یہاں تک کہ ترک تعلق ہو گیا۔ فکیل بھائی اُس لڑکی کے جذبات کو اس حد تک پڑھانے پر اب تک افسردہ ہیں۔ دس پندرہ سال بعد لڑکی کے انتقال کی خبر سے فکیل بھائی گہرے صدمے سے دوچار ہوئے۔ اس ذکر پر کوئی خلش اُن کے چہرے اور لہجے سے صاف عیاں تھی۔

’انشا‘ کی اشاعت تمام تر توجہ کے باوجود ساڑھے بارہ سو سے بڑھ نہیں پاری تھی۔ ایسے میں معروف ڈائجسٹ ’ریڈرز ڈائجسٹ‘ کے ساز کے مطابق پاکستان میں ’اردو ڈائجسٹ‘ نکالا گیا۔ جلد ہی اُس نے شہرت پائی۔ اس کی حیران کن کامیابی دیکھ کے ’انشا‘ کو ’انشا عالمی ڈائجسٹ‘ کے نام سے نکالا گیا۔ ادھر یہ نکلا اُدھر لاہور سے ’سیارہ ڈائجسٹ‘ نکلا۔ ان ڈائجسٹوں نے ایک ایسا معیار قارئین کو پیش کیا جو خاص وعام میں مقبول ہوا۔

ایسے میں دو بدل کر دینے والی ہمیں درپیش ہوئیں۔ پہلی تو یہ کہ ’انشا عالمی ڈائجسٹ‘ بننے سے اس کی اشاعت بڑھ کر چار ہزار ہو گئی مگر اس سے بڑھ نہیں پاری تھی۔ سبھی کوشش کر رہے تھے کہ کسی طور اس کی اشاعت بڑھے لیکن وہ ایک ہی جگہ تک گئی تھی۔ اردو ڈائجسٹ کی مقبولیت اور اشاعت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دوسری یہ کہ جون صاحب مزاج خالص ادیب اور شاعر تھے۔ وہ سخت بددعا اور بیزار ہو گئے۔ ان کی دل چسپی بھی کم ہو گئی۔ اس وقت ڈائجسٹوں کی اشاعت تو ماہ بہ ماہ بڑھ رہی تھی لیکن انھیں ادب کے فچھے خانے میں رکھا جاتا تھا۔ جون صاحب بھی ڈائجسٹوں کے بارے میں اس تاثر سے خود کو بری الذمہ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی دل چسپی بہ تدریج کم ہوتی گئی اور فکیل صاحب ہی پیش تر ادارتی کام کرنے لگے تھے۔

اب تک فکیل صاحب عمرانیات اور سیاسیات میں ایم اے کر چکے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کسی بات پر روٹھ کر چلے گئے، اور رئیس صاحب کے معذرت نامے کے باعث واپس آ گئے۔ آہستہ آہستہ عالمی ڈائجسٹ کی اشاعت بڑھنے لگی۔

ایک روز مشہور ناقد جون صاحب کے ہم وطن اور دوست مرحوم محمد علی صدیقی نے فکیل صاحب کو رات گئے کام میں مصروف دیکھ کر رسالے میں اپنے باقاعدہ حصے کی صلاح دی۔

فکیل اپنے آپ کو رئیس امر و ہوی گھرانے کا حصہ سمجھتے تھے۔ جب مشورہ دیا گیا کہ اس تصور کو کاغذی شکل بھی دے دی جائے تو گھر کے بڑوں نے ہامی بھری اور صدیقی صاحب کو اپنی جانب سے بات کرنے کا اختیار دے دیا۔

چند دنوں بعد صدیقی صاحب کی جانب سے واپس کن پیغام آیا کہ عالمی ڈائجسٹ میں تو رئیس صاحب تقی صاحب اور ان کی اولادوں کا بھی حصہ ہے۔ سو برابر کی بات ممکن نہیں۔

بس تبھی تکلیل صاحب نے اپنا رسالہ نکالنے کی ٹھان لی اور ایک نہایت مختصر خط کے ذریعے عالمی ڈائجسٹ سے علیحدگی کا بیانا دے دیا۔

تکلیل صاحب کے پاس ڈیڑھ ہزار روپے کا سرمایہ، اچھی سا کھ، چند دوست اور مضبوط ارادے تھے۔ چند دوستوں کو اکٹھا کیا اور سب رنگ پر کام شروع کر دیا۔

یہ جنوری 1970 کا واقعہ ہے کہ ”سب رنگ“ کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ شروع کے تین شمارے پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوئے، پہلے دو شمارے ساڑھے تین ہزاری شمارہ کی تعداد میں فروخت ہوئے۔ تیسرا شمارہ پورے کا پورا بک گیا۔

ان کے جانے کے بعد عالمی ڈائجسٹ میں زاہدہ حنانے کام سنبھال لیا۔ ان کی اور جون ایلیا کی شادی طے ہو چکی تھی۔

ادھر ”سب رنگ“ نے اپنا انداز بدلا اور ہنر اور لکھنوی کی طرز پر پڑا سرار کہانیوں کے سلسلے شروع کیے ”سونا گھاٹ کا پھاری“، ”اٹکا“ وغیرہ۔ ”عالمی ڈائجسٹ“ کے عمدہ لکھنے والوں کو دگنے معادنے کی پیش کش کی گئی۔ کچھ نئے لکھنے والے بھی تلاش کیے گئے۔ لے آؤٹ، ایکچر، طہاوت میں نفاست پر خاص توجہ دی گئی۔ یوں پہلے برس میں اس کی اشاعت میں ہزار کو چھو گئی جو ایک ریکارڈ تھا۔

”سب رنگ“ نے ایک خاص معیار مقرر کر دیا جس سے کم کی تحریر، بھلے اہم ادیب ہی کیوں نہ ہو، قبول نہ کی جاتی۔

ایک مرتبہ تو معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ کرشن چندر کی ایک تحریر بھی لوٹا دی گئی۔

”سب رنگ“ کے حوالے سے ایک بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ اسے گھر کے تمام افراد پڑھ سکیں۔ سنسنی خیزی، فحاشی اور جرائم سے حتی المقدور اجتناب کیا جاتا۔ لکشن میں بھی ایک خاص بین الاقوامی معیار کو مدنظر رکھا جاتا۔ چناں چہ اسے معیار کی علامت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس میں سلسلے دار کہانیاں بھی بے حد مقبول ہو گئیں۔ انہی دنوں حسن ہاشمی نے ”بازی گر“ کی پہلی قسط جو سولہ سترہ صفحات پر مشتمل تھی لکھی۔ تکلیل صاحب نے اسے دوبارہ تحریر کیا اور اس سلسلے کو بہت دل جمعی سے آگے بڑھاتے رہے۔ انوار صدیقی کے ساتھ نئی قسط کی مینے کی تیرہ تاریخ کو منصوبہ بندی کی جاتی۔ ایک دفعہ تو تکلیل صاحب بائیس تیس روز تک شب و روز کام کرتے رہے، دفتر ہی میں سو جائے، گھر تک نہ گئے۔

انہوں نے ایک نیا نسخہ آزمایا۔ کرشن چندر کے چند افسانے شائع کیے تھے، ان کا معاوضہ دینی کے ایک دوست کی وساطت سے انہیں بھجوایا۔ وہ بہت بڑ مسرت حیرت میں مبتلا ہوئے۔ یوں کرشن چندر سے ایک ذاتی تعلق کی داغ بیل ڈلی۔

بعد ازاں کرشن چندر کی بیوہ سلمیٰ نے تکلیل صاحب کو وہ قلم بھی تحفہ دیا جس سے وہ اپنے فن پارے تحریر کیا کرتے تھے۔ وہ قلم تکلیل

صاحب کو بہت عزیز رہا۔

ہندستان کے ایک دورے میں انہوں نے عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قراۃ العین حیدر سے ”سب رنگ“ میں لکھنے کی درخواست کی۔ پاکستان میں وہ شوکت صدیقی، اسد محمد خان کو تو سب رنگ کی جانب لے آئے، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد اور دوسرے نام در لکھنے والوں کو بھی اس جانب راغب کیا۔ چناں چہ سب رنگ ایک لحاظ سے ہندوستان کا، ادب کا اعلیٰ ترین ترجمان رسالہ بن گیا۔ جنہیں ”ڈائجسٹ“ کے لفظ سے کدھی، ان لوگوں نے اس رسالے کو تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے دیکھ کر اگلیاں دانتوں میں داب لیں۔

تکلیل صاحب نے جاسوسی دنیا کے بے تاج بادشاہ ابن صفی اور تاریخی ناولوں کے مانے ہوئے لکھاری نسیم حجازی کو بھی اپنے لیے لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ ابن صفی کو وہ برصغیر کا اعلیٰ ترین جاسوسی ناول نگار سمجھتے ہیں۔ ”اردو میں جاسوسی کہانی کا دور انہی سے شروع ہوا اور انہی پر ختم بھی ہو گیا۔ مجھے گولی مار چورنگی کے ساتھ دھول میں سے نظر آتی وہ دکان خوب یاد ہے جس کے سامنے چک کا پردہ گرا رہتا تھا اور اندر ابن صفی اپنی



دوسری بیوی کے ساتھ قیام پذیر، ناول لکھتے رہتے تھے۔

ہادی مر

وہ ادب عالی کو حوام کے وسیع حلقے تک لے آئے۔ وہ ادب کے کیریئر پیکر بن گئے۔ وہی السالوی آسٹریلی میڈیا ٹائی کون کیری پیکر جس نے دنیائے کرکٹ کے اہم ترین کھلاڑیوں برٹالوی ٹونی کریک، ویسٹ انڈین کلائیڈ، آسٹریلیا کے کریک پیبل، پاکستانی عمران خان وغیرہ کو شامل کر کے ایک ٹیم بنائی اور ”ورلڈ سیریز کرکٹ“ کی داغ بیل ڈالی، جدیدوں ڈے کرکٹ کو صحیح معنوں میں مقبول عام کیا۔ اس میں ٹیسٹ میچز، ٹیلیوین یونی فارم، بیچ پر مائیکروفون کا استعمال، مختلف ڈاویوں کے لیے کئی کیمروں کی تکنیک اور فلڈ لائٹوں کا استعمال قابل ذکر تھا۔ سب رنگ کو مقبول بنانے کے علاوہ اس وقت تک اردو ادب کے اہم برج لاہور کے اردو ڈائجسٹ کے علاوہ کراچی میں ڈائجسٹ کے حوالے سے ایک دوسرا اہم برج وجود میں آیا۔ گوکراچی اپنے شعراء، ناقدین اور ادیبوں کے حوالے سے اہم شہر تو تھا ہی، مگر لاہور کو ایک کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ وہ ادیب جو فقط شہرت اور توصیف پر سبک رہے تھے، انھیں اپنے نپن پاروں کا مناسب معاوضہ بھی ملنے لگا۔ ”جانگوس“ کا شوکت صدیقی صاحب کو ستر کی دہائی میں اڑھائی لاکھ روپیہ دیا گیا جو اپنے وقت میں ایک ریکارڈ تھا۔

”بازی گر“ ایک انتہائی دل چسپ کہانی ہے۔ یہ قارئین میں اس درجہ مقبول ہوئی کہ اس پر فلم اور ٹی وی ڈراما بنانے کے کئی منصوبے بنائے گئے۔ اس کے وسیع لینڈ سکیپ، ثقافتی تنوع کی چٹکی کاری اور بے شمار رنگ کرداروں کی وجہ سے لاگت کا تخمینہ بڑھ جاتا رہا۔ یہ شہر ”گیا“ کے ایک نوجوان بابر زماں خاں کی کہانی ہے۔ اس میں دودھ میں عرق ملا کر لی رنگت والی لڑکی کورا ہے جو بابر کو بدھ گیا کے میلے میں نظر آئی۔ اُن میں ایک پاکیزہ محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ کورا تبت کے ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی ہے۔ مخالفین رستے سے ہٹانے کے لیے اُس کا بیچھا کر رہے ہیں۔ وہ ٹرین میں فرار ہوتے ہیں۔ رستے میں ایک مہربان شخص مولوی عمر شفیق سزگر رہے ہیں جو ان کے خیر خواہ بن جاتے ہیں۔ ٹکٹے پینچنے کے چند ہی روز بعد چند جرائم پیشہ افرادوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ چاقو زنی میں قتل ہو جاتا ہے جس پر بابر کو سات سال جیل ہو جاتی ہے۔ وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ وہیں ٹھیل اُسے ملتا ہے۔ بابر عجب ٹھیل کو مقامی گروہوں کا استاد مانا جاتا ہے۔ اُسے بابر کی معصومیت بھا جاتی ہے اور وہ اُس کا سر پرست بن جاتا ہے۔ سات سال جیل میں گزارنے اور ایم اے کرنے کے بعد بابر، کورا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یوں ہندوستان کے شہروں، قصبات، دیہات کی معاشرت اور تہذیب چاندنی کے درقوں کی طرح داستان کے صفحات پر دمک اٹھتی ہے۔ کہانی روٹی سے آگے بڑھتی ہے۔

اس داستان کے بابر زماں خاں کی زندگی میں فکیل صاحب کی اپنی زندگی بے آواز آسانی بجلی کی طرح لٹکا مار جاتی ہے۔ اس میں ہندوستان کے وہی شہر، وہی ریل کار، وہی ماحول نظر آتا ہے جہاں جہاں انھوں نے آوارگی کی۔ مراد آباد سے لے کر ٹکٹہ، ناچ گھروں میں ناچتی لڑکیاں، دیہات میں اٹھتی وھول میں چارے اور گوبر کے ذرات، محبت آمیز اجنبی اور دھوکا دینے والے، سبھی کچھ، ٹھیکس صاحب کی کہانی ہی تو ہے۔ البتہ اس میں ٹھیل کون ہے، یہ معاملہ تھنہ تعبیر ہے۔ کورا تو وہ لڑکی ہے، فکیل بھائی آج بھی جسے تلاش کر رہے ہیں۔ ہر مرد کے اندر ایک حسین، ذہین، مخلص اور بے لوث کورا کی خواہش اور ہر عورت محبت بھرے بابر اور فولادی ٹھیل کی اجتماعی خوبیوں والے مضبوط مرد کی تلاش ہوتی ہے۔

چند جملے کہانی میں معاشرتی فلسفے کے ٹک جڑ دیتے ہیں۔

”شراب ایک تھکی ہے، لوری ہے، کھلونا ہے، جھنجھٹا ہے، شراب ایک آغوش ہے، شراب ایک طوائف ہے، کھلی ہوئی آنکھوں کی

نیند ہے“

”عورت کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے۔ مرد کی ہر بھوک پہچان لیتی ہے۔“

”جہاں نے آگے میری داڑھی موٹھیں صاف کر دیں۔ غسل کے لیے گرم پانی تیار کیا گیا اور ایک سفید کڑھا ہوا مگر تار پاجامہ

فراہم کر دیا۔ جب میں نہادھو کے اور کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو بھٹل اچھل کر کھڑا ہو گیا اور میری صورت بھٹکارہ گیا۔ اس نے آواز میں دے دے کے اپنے لوگوں کو بلایا اور مستانہ انداز میں کہنے لگا ”لو دیکھو، لاڈلے کا حسن دیکھو۔ یہ ہے لاڈلا۔ دیکھا تم نے کیسا چمک کے آیا ہے۔ اسے یہ کیا گھور گھور کے دیکھتے ہو۔ نظر لگ جائے گی سالو ا ہے کوئی کلکتہ شہر میں ایسا جوان؟ اگر کوئی ہو تو اُسے ڈھونڈ کے میرے سامنے لاؤ، میں اُسے گولی مار دوں گا۔“ (بھٹل)

”لحوں کا یقین ایک فریب ہے اور آدمی اس فریب میں زندگی گزار دیتا ہے۔“

ایک مرتبہ بازی گر کے کرداروں کے حقیقی ہونے پر بات چل نکلی اور بھٹل کا ذکر آیا تو کہنے لگے ”ایسا شخص جو محلے بھر کا حافظ اور باپ کی حیثیت رکھتا تھا، ہم نے خوب دیکھا ہے۔ پہلے وقتوں میں ایسے لوگ جو عزت اور دوستی کی خاطر جان تک قربان کر دیتے تھے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔“

”بازی گر“ تحریر کرنے سے قریباً ایک دہائی قبل رئیس امر دھوی صاحب کو فضل احمد کریم فضلی صاحب نے اپنے ہاں اپنی دوسری قلم کی تیاری کے سلسلے میں بلایا۔ ٹکلیل بھائی بھی رئیس صاحب کے ساتھ تھے۔ وہاں آغا حشر کی نسبت سے معروف مختار بیگم اپنی بیٹی رانی کے ساتھ موجود تھیں۔ رانی کے حسن کی تابانی قابل دید تھی۔ رانی نے اُس روز ٹرائل کے لیے اپنے رقص سے گویا ماحول میں جادو پھونک دیا۔

فضلی صاحب ”جراغ جلتا رہا“ نامی ہٹ فلم بنا چکے تھے۔ فضلی صاحب نے انھیں ایک پرانے پڑھے ناول کا تقسیم سنایا اور اس موضوع پر فلم لکھنے کی درخواست کی۔ دونوں بنیادی خیال سن کر لوٹ آئے۔ ٹکلیل صاحب تب تک سیکڑوں فلمیں دیکھ چکے تھے۔ سوانحوں نے قلم اٹھایا اور دن رات ایک کر کے ہفتے بھر میں کہانی لکھ ڈالی۔

رئیس صاحب کو وہ تحریر اتنی پسند آئی کہ انھوں نے اس کا پیش تر حصہ اسی طور لکھ کر فضلی صاحب کو پیش کر دیا۔ فضلی صاحب نے چند روز بعد بتایا کہ انھیں وہ تحریر اس حد تک اچھی لگی کہ انھوں نے اس میں قطع برید مناسب نہیں سمجھی۔ چونکہ بنیادی خیال فضلی صاحب کا تھا سو ”ایسا بھی ہوتا ہے“ نامی ہٹ فلم پر رئیس صاحب کا فقط نام آیا، معاوضہ نہ ملا۔ ٹکلیل صاحب کے لیے اپنی تحریر کی پذیرائی کی خوشی ہی کافی ٹھیری۔ بعد ازاں انھوں نے ایک اور فلم بھی لکھی جس میں 1965 کی جنگ کی وجہ سے فضلی صاحب بہت تبدیلیاں کیں اور وہ کام یاب نہ ہو سکی۔

”بازی گر“ شروع کرنے کے قریباً دہائی بھر بعد ٹکلیل صاحب کی اُس وقت کے حکم ران جنرل ضیاء الحق سے ایک ایسی ملاقات ہوئی جس میں چھپا ایک بھید انھیں آج بھی متحس رکھتا ہے۔

زوداد کچھ یوں ہے کہ سی پی این ای کا اسلام آباد میں ایک اجلاس ہوا۔ وہاں ٹکلیل بھائی کو بھی مدعو کیا گیا۔ کرسی صدارت پر جنرل ضیاء الحق تھے۔ ابتدا میں شرکا کا صدر سے تعارف کروایا گیا۔ جنرل صاحب سب سے مصافحہ کرتے ہوئے ٹکلیل صاحب تک آئے، ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گئے۔ بڑھ کر وہاں لوٹے اور مسکرا کر دوبارہ مصافحہ کرتے ہوئے بولے ”آپ ہی سب رنگ لگاتے ہیں۔ آپ سے مل کے خوشی ہوئی۔“

جنرل ضیاء کا پلٹنا اور دوبارہ ملنا ایک معما تھا۔

تقریب معمول کے مطابق اختتام پذیر ہوئی۔

اگلے روز ٹکلیل صاحب نے سیکریٹری جنرل سی پی این ای انور ظلیل صاحب سے درخواست کی کہ وہ ضیاء الحق سے اپنی طے شدہ

ملاقات میں ان کے مجوزہ خواتین کے ڈائجسٹ کے ڈیکلریشن کی بھی بات کریں۔

اُسی سہ پہر ٹکلیل صاحب کو فون آگیا کہ صدر صاحب ان سے ملنے کے متمنی ہیں اور شام چھ بجے ملاقات کا وقت طے کیا گیا ہے۔

فکیل صاحب یہ سوچ کر شاداں ہو گئے کہ جنرل صاحب بھی ”سب رنگ“ کے قاری تھے۔

سو شیروانی پہن کر ”سب رنگ“ کا تازہ شمارہ لے کر، صدر کی اقامت گاہ پر پہنچے۔ وہاں پر سٹل سیکریٹری کے کمرے میں امیر خانجہ کے دو اہم لوگ شاہ نواز اور آغا شامی بھی موجود تھے۔

ان کے بیچ اردو ادب پر بات چل نکلی۔ شاہ نواز صاحب نے اعتراف کیا کہ ان کا اردو ادب کا مطالعہ بچپن تک محدود ہے۔ آغا شامی اردو ادب کے معاملے میں مکمل ناواقف تھے۔ ابھی گفت گو جاری تھی کہ صدیق سالک تشریف لائے اور فکیل صاحب کو ملاقات کے لیے بلا دیا۔ فکیل صاحب ایک سادہ لیکن خوش ذوق سے آراستہ کمرے میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں صدر صاحب تشریف لائے، روایتی معافہ کر کے خوش اخلاقی سے بیٹھ کر ان کے خواتین سے متعلق رسالے کے ڈسکریپشن کے مسائل کا پوچھا۔ اس کے بعد ”سب رنگ“ کی وسیع اشاعت پر تعریفی کلمات ادا کر کے فرمائش کی کہ وہ رسالے کے ذریعے اسلام کی بھی خدمت کریں۔ فکیل صاحب نے بتایا کہ اس میں اولیائے کرام پر سوانحی تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ ضیا صاحب نے کہا کہ اس میں تصوف سے بڑھ کر شریعت پر بھی شائع کیا جائے۔ فکیل صاحب نے اس ضمن میں پورا خیال کرنے کی بات کر کے گویا موضوع بدل دیا۔ صدر صاحب نے رسالے کی مقبولیت کی وجہ پوچھی۔ فکیل صاحب نے انفرادیت، معیار، دیانت، صحت زبان اور محنت کو اہم وجوہ کے طور پر بیان کیا۔ جب ضیا صاحب نے تازہ شمارہ دیکھا تو پوچھا۔

”کیا سرورق پر عورت کی تصویر ضروری ہے؟ پھول، قدرتی مناظر وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں؟“

فکیل صاحب نے وضاحت کی کہ اردو زبان کے کلچر کا محرک نسوانی نزاکت و حسن رہا ہے۔ مردوں کے علاوہ خواتین بھی اسے

سراہتی ہیں۔

ابھی یہ گفت گو جاری تھی کہ ضیا صاحب کی چھوٹی بیٹی زین کمرے میں آ گئی۔ یوں بات بدل گئی۔

فکیل صاحب نے درخواست کی کہ شتیلق خط کی کتابت کے باعث اردو زبان ابھی تک طباعت کے پرانے دور میں یہ طور گھریلو دست کاری زدہ ہے۔ اگر ایران کے مانند تمام رسائل و اخبارات پر خط نسخ کی پابندی عاید کر دی جائے تو اردو جدید دور کی پرنٹنگ میں شامل ہو جائے گی۔

ضیا صاحب کی ہدایت پر صدیق سالک صاحب نے یہ تجویز نوٹ کر لی۔ اب تک ضیا صاحب کی متانت اور نرمی نے فکیل صاحب کو خاصا پراعتماد کر دیا تھا۔

یاد رہے کہ ضیا الحق پاکستان کی موجودہ تاریخ کا واحد حکم ران گزرا ہے جس کی تربیت اردو میں ہوئی تھی اور جو اردو مطبوعات و اخبارات کا باقاعدہ قاری تھا۔ گویا وہی زبان پڑھتا اور سمجھتا تھا جو کروڑوں پاکستانیوں کی زبان ہے۔

فکیل صاحب دس منٹ کے لیے آئے تھے، انھیں باہر منتظر خارجہ امور کے اہم عہدے داروں کا بھی خیال تھا۔ اب تک قریباً آدھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ سوانحوں نے اجازت چاہی تو ضیا صاحب نے انھیں روک دیا اور پوچھا۔

”بے تکلفی سے بتائیے کہ ملک کے سیاسی حالات پر عوام کی کیا رائے ہے؟“

فکیل صاحب نے نپے ٹکے محتاط الفاظ میں شہریتگی سے گول مول بات کی۔ صدر صاحب نے پوری توجہ سے ان کی بات سنی۔ باہر رخصت کرتے وقت وہ فکیل صاحب کو لے جانے والی گاڑی تک آئے، خود گاڑی کا دروازہ کھولا، گلے ملے، گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور انھیں یاد دلایا کہ وہ ”سب رنگ“ کے گزشتہ شمارے ضرور بھجوائیں۔

بعد ازاں انھیں وزارت اطلاعات سے فون آنے لگے کہ وہ ”سب رنگ“ کے پچھلے شمارے بھجوائیں۔ جب سرورق پر خواتین کی

تصادف سے مزین پرانے شمارے بھجوائے گئے تو خواتین کے ڈائجسٹ کا ڈائریکشن تو ایک طرف رہا "سب رنگ" کے اشتہارات اور کاغذ بند کر دیا گیا۔

ایک غیر مصدقہ خبر یہ بھی تھی کہ یہ سب ضیا صاحب کے حکم پر کیا گیا تھا۔

بہر حال، خاص جدوجہد خاصے عرصے بعد کے بعد ان کی بحالی ممکن ہوئی۔ حیران کن امر یہ ہے کہ یہ بحالی ضیا صاحب کے دور ہی میں ہو گئی۔

ستر کی دہائی کے اوائل میں حسن پرست، جو ہر شناس اور قلمون مزاج، فکیل عادل زادہ کی ذاتی زندگی میں اہم ترین واقعہ (بہ قول ان کے ساتھ) رُو نما ہو چکا تھا۔ ان کی شادی ہو چکی تھی۔ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ فکیل صاحب شادی کے معاملے کو تین وجوہات کی بنا پر دالنے آئے تھے۔

اول وہ سراپا "سب رنگ" تھے، سو خواہش تھی کہ جب تک اشاعت نصف لاکھ تک نہ ہو جائے وہ چین سے نہ بیٹھیں گے۔

دوم مالی استحکام ان کے لیے بہت اہم تھا، اس معاملے میں وہ یقین رکھتے تھے کہ جب تک انسان آسودگی سے خاندان کی کفالت نہ کر سکے تب تک شادی اپنے اور شریک خانہ کے ساتھ زیادتی ہے۔

سوم ان کی لڑکیوں کے حوالے سے پسند بدلتی رہتی تھی، کبھی گوری نازک تو کبھی سانولی چھیلی اچھی لگتی۔ ایک لڑکی کے ساتھ زندگی کو محدود کر لینا جھوٹ معلوم ہوتا تھا، اپنے آپ سے اور بیوی سے جھوٹ۔ تنوع کی خواہش ختم کرنا محال تھا۔

بہر حال ان کی اماں مراد آباد سے آئی ہوئی تھیں، سب رنگ کی اشاعت پچاس ہزار کی حد عبور کر چکی تھی، مالی آسائشیں حاصل ہو چکی تھیں اور عمر پینتیس برس کے قریب ہو چکی تھی۔ سو والدہ کے اصرار پر شادی طے ہو گئی اور شادی کے کارڈ تقسیم ہو گئے۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کارڈوں میں دعوت خود ڈلہا کی جانب سے دی گئی تھی۔ بہر حال فردری 1972 میں شادی ہو گئی اور فکیل صاحب کی بے قراری کو قرار آئی گیا۔ قرار آیا یا بے قراری بڑھ گئی، ایک الگ معاملہ ہے۔

ضیا صاحب سے ملاقات کے بعد سب رنگ کی اشاعت ایک قابل ستائش ہم وار سطح پر رواں رہی۔ زندگی کے معاملات طے ہوتے رہے، نشیب بھی آئے اور فراز بھی۔

ملک بھی سیاسی نشیب و فراز سے گزر رہا تھا۔

دور ہائیاں گزر گئیں۔

فکیل صاحب "سب رنگ" کی کہانیوں کے تمہیدی نوٹ، سلسلے اور ابتدائی صفحات تحریر کرنے کے ساتھ انتظامی امور، اشتہارات، ادیبوں کے ساتھ مسلسل رابطے اور دیگر بے شمار وجوہ کی بنا پر رسالے کو باقاعدہ نہ کر پا رہے تھے۔ اکیلے آدمی تھے، وہ ذمے داری جو بیس برس کی عمر میں اٹھائی تھی ساٹھ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے گراں محسوس ہونے لگی تھی۔

اب تک "سب رنگ" کی زبان کو سند، اس میں شائع ہونے کو قبولیت عام، بین الاقوامی اور اردو کے شاہ کاروں کے انتخاب کو شہرت و اہم حاصل ہو چکی تھی۔

فکیل صاحب کا منصوبہ ساز ذہن ایک اور تہذیب پر سوچ رہا تھا۔ ان کی دو بیٹیوں میں سے ایک بیٹی جاپان تھی، دوسری زیر تعلیم تھی اور بیٹا شرجیل بھی تعلیمی مراحل کی تکمیل کر رہا تھا۔

ایک سو بیس صدی کے اوائل کی ایک شام اعلیٰ ہوٹل میں ہونے والی ایک تقریب میں ان کی ملاقات ایک تیس بیس سالہ نوجوان سے ہوئی۔ وہ نوجوان ان کا مداح نکلا۔ سو گفت گو اور دو ادب پر چل نکل۔ بات گپ شپ سے جذباتی تعلق اور دلی تعلق سے بڑھ کر غم گساری و دل جوئی



تک چلی گئی۔ وہ نوجوان اب نوجوان نہیں رہا، لیکن کھیل بھائی آج بھی نوجوان ہیں۔

ردائیں دل پیر بر تابو  
(شاہ نامہ فردوسی)

کھیل بھائی کو جب میں اُس تقریب میں ملا تو وہ میری توقع سے مختلف ایک بوٹے قد، کشادہ پیشانی اور مسکراتی آنکھوں والے ہنستے کھیلنے والے تھے جو اپنے بیٹے شرجیل (نعمت) کے ہم راہ تھے۔ پردہ اسرار بھی انسان کو تصور میں کیسی ہالائے عقل شے بنا دیتا ہے۔ انسان وہی ہے جو اُس کے اسی نوے کلو وزن کے جسم میں قریباً تین سو گرام وزن فی دل اور ڈیڑھ کلو وزن فی دماغ ہے۔ گویا ایک عمومی انسانی جسم میں اصل انسان صرف دو فی صد کی حد تک چھپا بیٹھا ہے۔ یہی دو فی صد ٹیکسپیئر بناتا ہے، غالب کی تشکیل کرتا ہے، حافظ ورومی، اقبال و نیگور کی پرداخت کرتا ہے۔ یہی ایک عام گورے یہودی سے آئن سٹائن کو منفرد کرتا ہے اور مرثک چھاپ سیاح قام سے میلکم ایکس اور باراک حسین اوباما کو!

یہی عام ادیب سے بڑے ادبا کو ممتاز کرتا ہے، ایک ناظر اور مصور میں تفریق پیدا کرتا ہے۔ مے خوار و پیر مغاں کا فرق کرتا ہے اور عامی کو ہم دی گرد بازی شناس کھیل عادل زادہ سے جدا کرتا ہے۔

مجھے ایک شناسا نے سنایا تھا کہ کھیل بھائی ”سب رنگ“ کے ذاتی صفحے کو درجنوں بار لکھ کر پھاڑ ڈالتے ہیں۔ جب میں نے اس بارے میں پوچھا تو بولے ”خود پھاڑ دینا بہتر ہے، بجائے اس کے کہ قاری پھاڑے۔“ میں نے سادگی سے پوچھا کہ ”بازی گر“ لکھتے ہوئے اس کے کرداروں سے جذباتی وابستگی تو ہوگئی ہوگی۔ بے اختیار بول اٹھے ”تیس برس اسے پال پوس کر جوان کیا ہے، محبت کیوں کرنے ہوگی۔“

میری کھیل بھائی سے پچھلے بارہ برس سے ہر دوسرے تیسرے ہفتے بلا ناغہ کبھی چائے، کبھی کھانے، کبھی اُن کے دفتر، کسی ریستوران، شہر شہر، کراچی، لاہور، اسلام آباد، ملاقات ہو جاتی ہے اور فون پر تو قریباً روز ہی بات ہوتی ہے۔ یہ اُن کی محبت اور کشادہ ظرفی ہے کہ مجھ ناچیز کو درخورِ رواقتنا جان رکھا ہے۔

احوالِ حیات، کچھ سنا، کچھ جمالِ احسانی کے ”رازِ در“ سے اور زیادہ تر ملاقاتوں سے کشید کیا، بیان ہو چکا، پس اب بے ترتیب کلکے ہیں جن سے دنیا کے لیے کھیل عادل زادہ، قارئین کے کھیل عادل زادہ عفی عنہ اور میرے کھیل بھائی کی شخصیت کی پچی کاری ہو سکے گی۔ میری جن غیر معمولی لوگوں سے ملاقاتیں رہیں اُن میں عموماً چند اوصاف مشترک پائے۔ غیر معمولی اور ہمہ وقت زندہ رہنے والا متحرک جذبہ، اچھی یادداشت، اور نئے خیالات کی پذیرائی اور ان کو اپنانے پر آمادگی۔

کھیل بھائی داستان بننے اور ہر خاص و عام قاری کو اُس سے وابستہ رکھنے کے فن میں یرِ طولی رکھتے ہیں، سو اُن کی اس خوبی پر ایک رات کھانے کے دوران بات ہوئی تو بتانے لگے ”میں اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیتا ہوں، اُسے تصور کے بے کنار جہاں میں پرواز کرنے دیتا ہوں۔ سو وہ کوئی یہ خیال، نئی دنیا یا دنیا کو دور یافت کراہی لیتا ہے۔“

اُن کے ساتھ گفتگوں ادب پر بات ہوئی ہے۔ بلا کا حافظ ہے۔ ادھر میں ایک ادیب کا نام لیتا ہوں اُدھر وہ اُس کی ”سب رنگ“ میں شائع شدہ تمام تحریریں تعداد، عنوانات اور جزئیات کے ساتھ ڈھرا نا شروع ہو جاتے ہیں۔ انھیں ”سب رنگ“ سے عشق ہے سو اس کی ہر سطر اُن کی یادداشت پر اس طرح نقش ہے جس طرح محبوب کے بدن کے تمام بچ و خم، ہر تپل۔

اُن کے گھر میں اقبال مہدی، ذاکر اور دیگر مصوروں کے فن پارے خوش سیلنگی سے سجے ہوئے ہیں۔ جب کبھی کسی کا ذکر ہو جائے تو کئی دہائی پرانی روداد حرف بہ حرف سنا دیتے ہیں، بعض غیر معمولی تخیل کے مالک ادیبوں کی طرح ہر مرتبہ اس میں اضافہ نہیں کرتے، تاؤ فیکر وہ ایک نئی داستان بن جائے۔

ایک واقعہ ہے۔ ایک روز میں فکیل بھائی اور آصف فرخی صاحب بیٹھے گفت گو کر رہے تھے۔ بات انسانی یادداشت پر چل رہی تھی اور یہ موضوع زیر بحث تھا کہ انسان اپنی یادداشت کو کوشش اور مختلف تکنیک سے بہتر بنا سکتا ہے۔ ایسے میں اس دل چسپ پہلو پر بھی بات ہوئی کہ بڑھاپے میں انسان کیسے ماضی بعید کی باتیں یاد رکھتا ہے اور ابھی کل کی بات بھول جاتا ہے۔ آصف صاحب نے اپنے بزرگ والد، دانش ور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر اسلم فرخی کا تازہ واقعہ سنایا کہ ایک روز وہ نماز کی ادائی کے دوران چند آیات بھول گئے۔ انھوں نے بہت کوشش کی لیکن نماز یاد نہ آئی۔

اب وہ اس پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں وہ یادداشت نہ کھو بیٹھے ہوں چنانچہ سٹ پنا کر انھوں نے نماز سے ہٹ کر بھی چند چیزیں یاد کرنے کی کوشش کی۔ ذہن خالی خالی محسوس ہوا۔ یک دم کہیں سے ایک خیال وارد ہوا۔ وہ غالب کے عاشق صادق اور حافظ ہیں، سر غالب کی ایک غزل یاد کرنے کی کوشش کی۔ غزل پہلے حرف سے آخری حرف تک مکمل طور پر حافظے میں تازہ ہو گئی۔ سو انھوں نے اطمینان کا سانس بھرا، نماز میں غزل دہرائی اور بقیہ نماز مکمل کر لی۔

فکیل بھائی عام زندگی میں قطعی طور پر کوئی فلسفہ بگھارنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر کوئی اجنبی ان کے ساتھ چند گھنٹے گزار لے تو وہ ان کی خوش طبعی اور زندہ دلی کا محترف تو ہو جائے گا مگر شاید یہ نہ جان پائے کہ وہ اس اعلیٰ پائے کے ادیب ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ہر طرح کے لوگوں میں مکمل مل جاتے ہیں۔

ایک روز اچھے، اوسط درجے اور کم تر معیار کے ادب پر بات ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ”سب رنگ“ کے تیسری منزل پر واقع دفتر میں بیٹھے تھے۔ ان کا دفتر آئی آئی چندری گروڈ پر ادارہ ”جنگ“ کے ساتھ والی ایک پرانی عمارت میں موجود ہے۔ ”سب رنگ“ دفاتر ایک پوری منزل کے آدھے حصے پر واقع ہیں۔ ان کے مرکزی دفتر کی کھڑکی سے کراچی کی اہم، نئی، پرانی، بلند و پست عمارات، نیلا آسمان اور ان پر تیرتی بدلیاں نظر آتی ہیں اور نیچے شہر کے مصروف ترین سواحی مرکز کی ٹریفک رواں دواں ہوتی ہے۔ پورا منظر زندگی کی چہل پہل سے بھر پور ہوتا ہے۔ عصر کے دو دھیانارنجی شفق کو دیکھتے اپنے مخصوص پنگ پر ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ اسی پنگ کی پٹی سے ٹیک لگا کر امتحانی صفا گھنٹوں پر رکھے انھوں نے شاہ کار فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ آس پاس لغات، رسائل، کتب اور حوالہ جاتی مطبوعات ایک ترتیب سے پڑی تھیں۔ بغل کا کرا تو پورا کتاب خانہ ہے، جہاں پرانے جرائد اور کتب گرد سے آئی پڑی ہیں۔ بتانے لگے۔

”سب رنگ کی کہانیاں منتخب کرنے کے لیے ایک ٹیم بنائی گئی تھی۔ گنی جنی کہانیاں علیحدہ کر کے تمام ارکان کو پڑھنے کے لیے دی جاتیں جو اپنے طور پر ان کو نمبر دیتے۔ جو کہانی زیادہ نمبر لے جاتی، اشاعت کے لیے منتخب کر لی جاتی۔“

”اس ٹیم کے ممبران کون ہوتے تھے؟“ میرے پوچھنے پر حیران کن بات بتائی۔

”اس میں میرے اور میرے معاونین سے لے کر چہرہ اسی شامل ہوتے تھے۔ حتیٰ انتخاب میں میرے معاون کے بھی اتنے ہی نمبر ہوتے تھے جتنے کہ چہرہ اسی کے۔ کسی بھی رسالے کے قارئین میں دانشوروں سے لے کر عام مزدور شامل ہوتے ہیں۔ خیال رکھا جاتا تھا کہ ایسی تحریریں منتخب کی جائیں جن کی پسندیدگی کی اوسط زیادہ ہو۔“

”کبھی آپ نے ویٹو کا حق استعمال کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت ہی کم۔ نہ ہونے کے برابر۔“

سلسلہ دار کہانیوں کے ناقدان کے معیار پر معترض اور اسے منجیدہ ادب میں شامل کرنے سے گریزاں رہے ہیں۔ ایسے معترضین کا نام سلسلہ دار تحریروں کی شان دار روایات سے یا تو ناواقف ہیں یا ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

دنیا کے ادب کے عمدہ ترین شاہ پاروں کا تذکرہ آئے تو چارلس ڈکنز کے ہفتہ وار چھپنے والے ناول ”داپک وک بیچرز“، لیمڈ طور ڈیوہاکا ”تھری مسکی ٹیچرز“، فلائیٹر کا ”مادام بوارے“ اور آرتھر کانن ڈائل کی شرلاک ہومز سیریز، تمام ہفتہ وار یا ماہ وار رسالوں میں قسط وار شائع ہوتے رہے ہیں۔

تاریخ کا اہم ترین ناول لیونالسنائی کا ”اینا کارینا“ چار برس قسط وار (1873 سے 1877) شائع ہوتا رہا، اور دستودسکی کا عظیم ناول ”برادرز کرامازوف“ بھی۔ دستودسکی کے اس فن پارے کے مذاخوں میں آئن سٹائن، سنگنڈ فرانتز اور کاٹکا شامل رہے۔ کسی نے اسے ناول کے طور پر پڑھا تو کسی نے انسانی نفسیات کے ادبی بھینے کے طور پر۔ جیمز جاکس تو بول اٹھا ”اس نادر نے مجھے بے حد متاثر کیا، (دستودسکی) نے باقاعدگی سے موش مناظر تخلیق کیے، ایسی شان دار چیزیں کوئی مجھوں ہی سوچ اور لکھ سکتا ہے، اسی پائل میں اس کا چھٹس تھا۔“

”برادرز کرامازوف“ رشین میجر کے لیے 1879 سے 1880 تک سلسلہ دار لکھا جانے والا تھا۔

البتہ ناقدین کا ایک اعتراض قابل ذکر ہے، وہ ان سلسلوں میں غیر مرئی حوالے کا تذکرہ یا پھر ناقابل یقین حد تک غیر حقیقی اتفاقات کا درود ہے۔ اس بارے میں ایک مختلف نظریہ وجود رکھتا ہے اور خاصا مقبول ہے۔ امریکن دانش ور پیٹر سزاب اپنی کتاب ”ایڈگر ایلن پوسے کے موجودہ پاپولر ادب“ میں لکھتا ہے ”ہر ثقافت سے تعلق رکھنے والا انسان کہانیوں کی تلاش میں رہتا ہے، سرد ہواؤں اور طبعی لکڑی کے دھوکے کی آمیزش سے مہکتی کہانیاں۔ یہ کہانیاں ہمارے اندر ایک مخصوص جس کو چھیڑتی ہیں۔ تصورات، انھیں مرتکز کرنے، ان میں مخصوص متواتر نعوش معلوم کرنے، واقعاتی تسلسل تخلیق کرنے اور خیالی خاکہ ایجاد کرنے کی جس کو صرف فکشن کے ذریعے بیان کیا جاسکتا ہے۔ کہانیاں تخلیق کرنا انسان کی سرشت ہے اور بے مثال خوبی بھی جو صرف انسان کو دی گئی ہے۔“

فرانز روٹن سائز مزید فلسفیانہ رنگ میں بیان کرتا ہے۔ ”فلسفائی ادب انسانی تاریخ کے ان ادوار میں زیادہ مقبول رہا ہے جب معاشرہ غریب کے عمل سے گزر رہا تھا، جب پرانی اقدار منہدم کر کے نئی اقدار جگہ بنا رہی تھیں۔ یہ ادب علامات کو اپنے اندر چھپائے ہوتا ہے۔ یہ قائم دلیل کو رد کرتا ہے، یا تو تبدیلی لے کر آتا ہے یا اس کی خبر لاتا ہے۔“

اس معاملے میں داستان امیر حمزہ تحقیق کی مستقاضی ہے۔

ایک معاملہ جہاں تکلیل بھائی کی خوش مزاجی جواب دے جاتی ہے ”محتو زبان“ ہے۔ ادھر کوئی غلط لفظ بولا، لکھا گیا، ادھر تکلیل بھائی نے بیچ چوراہے دھر لیا۔ اب تو یہ عالم ہے کہ میں غسل خانے میں منگنائے ہوئے بھی نادانگیں میں محتو زبان کا خیاب رکھنے کی کوشش کرتا ہوں مبادا کوئی غلط لفظ تکلیل بھائی کے کان میں پڑ جائے۔

وہ بیچ چیلے کے مجھے ٹوک دیتے ہیں۔ ادھر وہ کوئی شخص غلط زبان بولے گا، ادھر تکلیل بھائی استغفار اور لا حول و لا قوۃ گا اور شروع کر دیں گے۔

میرے بیکورڈ الفاظ انھوں نے درست کیے، محتو زبان اور فہم ادب پر وہ میرے استاد ہیں۔ میرے بے شمار مسودوں کی زبان انھوں نے درست کی ہے۔ ہر لمحے ان کا فون بجاتا رہتا ہے۔ لوگ درست زبان پوچھتے رہتے ہیں۔ زبان کی ”درنگی“ کی جگہ ”درستی“ ہو، ”منہج“ کی جگہ ”منہجہ“ کے ساتھ ”منہج“ ہو یا بے شمار دیگر الفاظ ہوں وہ اس معاملے میں بے حد منجیدہ ہیں۔ سناتے ہیں۔

”میرا اردو کی جانب رجحان نہیں امر وہی کے گھر عربی، فارسی کے عام چلن کی وجہ سے ہوا۔ جون ایلیا میری زبان درست کہتے رہتے تھے۔ وہ اردو پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ عربی، فارسی کے الفاظ کی ماہیت پر غور کریں تو بہت سامنے آ جاتی ہے۔ یہ زبانیں عموماً

اردو کا میں سے ہمیں فی صد حصہ ہیں۔ میں ہندوستان سے آیا تو ”معیار“ کہتا تھا۔ یہاں پتا چلا یہ ”معیار“ ہے۔ زبان کے بارے میں ہمیں جیسا پہلیوں کے بارے میں ہوتا ہے، اس کے علم میں معاون ہوتا ہے۔ جون ایلیا کے والد علامہ شفیق حسن ایلیا مرہٹے، قاری کے عالم تھے۔ جون صاحب کے بھائی رئیس امرہوی قطعہ نگاری میں اکبر الہ آبادی سے بہتر تھے اور بھائی محمد تقی فلسفے کے آدمی تھے۔ انھوں نے کارل مارکس کی ”داس کیپٹل“ کے کچھ حصے کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان سارے شفیق بزرگوں کی محبت اور سرپرستی میں زبان، ادب اور فلسفے کا شوق اور ذوق مہر ہوا۔ جب میں نے ”سب رنگ“ شروع کیا تو خوف تھا کہ یہ زبان و بیان میں ”عالمی ڈائجسٹ“ سے پیچھے نہ رہ جائے۔ جون ایلیا شعر کے آدمی تھے، میں کہانی کا طالب علم۔ چنانچہ کہانی میں محنت کی، زبان کے معاملے میں انور شعور نے بہت ساتھ دیا، ہر وقت سند کے لیے لغت ساتھ رکھتا تھا۔ یہ معمول آج بھی باقی ہے۔ چند بنیادی ٹپس ہیں۔ ہندی لفظ عموماً ”ہ“ پر ختم نہیں ہوگا، ٹھیک، دھوک، دھاک، ہندی کے الفاظ ہیں۔ ان کی درست املا ”ٹھیکا“، ”دھوکا“، ”دھاکا“ ہے۔ البتہ گنتی کے الفاظ گیارہ، بارہ، تیرہ وغیرہ ہندی میں بھی ”ہ“ پر ختم ہوتے ہیں۔ یہ ’پرشبہ‘ ہے کہ پہلے نہیں ہوتے تھے۔“

اسی طرح انھوں نے تربیت کرتے ہوئے بتایا کہ ”ہ“ سے ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں ”گی“ آنا درست ہے جیسے خستہ ”خسگی“، شکستہ ”شکستگی“ وغیرہ۔ البتہ الفاظ دیگر میں ”ی“ آنا چاہیے۔ حیران ”حیرانی“، رومان ”رومانی“ اور ناراض ”ناراضی“ وغیرہ۔ چند استثنیات ہیں جیسے خفا سے ”خفگی“۔ ”خفا“ ”ہ“ پر ختم ہوتا تھا، اسے غالب نے بھی چند جگہ ”ہ“ پر ختم کیا ہے، البتہ اس کا الف پر ختم ہونا رائج العام ہو چکا ہے۔

یہ بات بھی نکلیل بھائی نے سمجھائی کہ ”خط وخال“ مرد کے ہوتے ہیں، خط بہ معنی داڑھی، اور ”خند وخال“ عورت کے بہ معنی ”رخسار اور نقوش“۔ وہ ابتدا میں ”کئی سالوں بعد“ لکھتے تھے۔ درست کروایا گیا تو ”کئی برسوں بعد“ لکھنے لگے۔

اپنی بیگم کو ”بیوہ“ کہتے ہیں۔ گو اس کا صحت زبان سے کوئی تعلق نہیں۔ ابتدا یہ لفظ مجھے خاصا عجیب لگا۔ ایک روز وضاحت کرنے لگے ”جس خاتون کا شوہر میں ہوا، وہ بیوہ ہی ہوتی۔“ اب اس لفظ کی ایسی عادت ہو گئی ہے کہ منہ سے نکلتے نکلتے رہ جاتا ہے ”نکیل بھائی بیوہ (بھابی) خیریت سے ہیں۔ میرا سلام کہیے گا۔“

ایک روز میں نے پوچھا کہ جون ایلیا رات کو اکثر سیاہ چشمہ کیوں لگاتے تھے تو کہنے لگے۔

”امردہ ہمارے شہر سے اٹھارہ بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ گویا وہاں سا نکل پر جایا جاسکتا تھا۔ امرہ کے حضرات ڈراما خوب کرتے تھے۔ انھی لوگوں میں صادقین صاحب بھی شامل تھے۔ وہ کسی محفل سے اٹھتے تو دانستہ طور پر جوتوں کے بغیر چل دیتے۔ لوگ پیچھے اُن کے جوتے اٹھائے چلے آتے کہ وہ عالم استغراق میں جوتے بھول آتے ہیں۔ جون صاحب بھی ایسے ڈرامے کرتے رہتے تھے۔ جب وہ کسی بھی سڑک کو نکلتے تو آہ بھر کے کہتے ”ہم تو چلتے ہیں۔ نہ جانے اب ملیں نہ ملیں۔“ ایک روز میں نے شک آکر پوچھ لیا کہ وہ ایسے جملے کیوں بولتے ہیں تو کہنے لگے ”اس طرح کے جملے بول دینے چاہئیں۔ نامعلوم کب کوئی حادثہ ہو جائے اور ہم فوت ہو جائیں۔ بعد میں لوگ ہماری ولایت کی گواہی دینے رہیں گے کہ ”مرحوم دلی اللہ“ تھے۔“ اسی طرح 1991 میں سوویت یونین میں کیونز م کے خاتمے کا آغاز ہوا۔ ایک رات بارہ بجے کے قریب انیق احمد صاحب نے انھیں فون کیا۔ وہ سوئے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے فون اٹھایا اور نیند میرے لہجے میں ”ہلو“ کہا تو انیق نے انھیں بتایا کہ روسی فوج لینن کا مجسمہ گھسیٹ رہی ہے۔ جون صاحب کو یقین نہ آیا۔ وہ کپکپ سوشلٹ تھے۔ بالآخر جب انھیں یقین آ ہی گیا تو انھوں نے صدر کے کیفیت میں لمبی سانس لیتے ہوئے کہا ”یہ بات تو طے ہو گئی۔ فوج کسی بھی ملک کی ہو، ہوتی پنجابی ہے۔“

میں نے نکلیل بھائی کو اپنے ایک دوست کا واقعہ سنایا۔ ایبٹ آباد میں ایک مشاعرہ تھا۔ جون ایلیا اُس میں مہمان خصوصی تھے۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو میرے ایک دوست، جو جون صاحب کے شدید قسم کے عاشق تھے، ان کی قدم پوسی کے لیے اسٹیج کے پاس گئے۔ جب تک



ایچ غالی ہو چکا تھا۔ جون صاحب اسٹیج کی ایک جانب سے قلابازی کھاتے ہوئے لوٹیاں لگاتے آتے اور دوسرے کنارے پر ہاتھیں۔ جب وہ قلابازوں کا ایک چکر مکمل کر کے میرے دوست والی جانب آ کر کڑکے اور پڑے جھڑتے کھڑے ہوئے تاکہ قلابازوں کا اگلا چکر شروع کر سکیں تو میرے دوست نے اُن کے ہاتھ تھام لیے اور انتہائی عقیدت سے ہاتھ چومتے ہوئے بتایا کہ وہ جون صاحب کی پرستش کرتے ہیں۔ جون صاحب ہناچکے یہ سب سنتے رہے۔ جب دوست نے بات مکمل کی تو کہنے لگے ”اگر آپ میرے اتنے ہی چاہنے والے ہیں تو آئیے میرے ساتھ قلابازیوں میں شامل ہو جائیے۔“ یہ کہہ کر جون صاحب نے اگلی قلابازی لگادی اور میرے دوست بے بسی سے انہیں دیکھنے رہ گئے۔ جب میں نے یہ بات سنائی تو ٹھیکل بھائی ہنسنے لگے۔ میں نے ایک سوال کیا۔

”ناہے کہ وہ بعض مرتباً چمک کر اپنے مخاطب کے کندھوں پر اپنے منحنی بدن کے ساتھ سوار ہو جاتے تھے۔“  
ٹھیکل بھائی ہنسنے ہوئے کہنے لگے ”وہ اس طرح کے خاصے ذرائعے کر لیتے تھے۔“

اسی روز میں نے ریخس امردہوی کی وفات کے بارے میں استفسار کیا۔ ریخس صاحب کے حادثاتی طور پر فوت ہو جانے کے بارے میں طرح طرح کی چیمگونیوں ملک بھر میں بھینسانی تھیں۔ وہ ماورائی اور روحانی معاملات پر بھی خاصی دسترس رکھتے تھے اور ان کے خاصی تعداد میں شاگرد بھی تھے۔ کچھ لوگ اس وفات میں سانی، چند لوگ معاشی معاملات اور کئی ضعیف العقیدہ لوگ جنات اور موکلوں کی ہارستانی قرار دیتے تھے۔ ٹھیکل بھائی نے اس ملک گیر شہرت پانے والے حادثے کی وجوہات سے پہلی مرتبہ روشناسی کی۔

”ریخس صاحب رات گئے دیر تک فکر خن کرتے رہتے تھے۔ اُن کا قیام ایک عیحدہ کمرے میں تھا جو کہ باقی گھر سے دور تھا۔ ایک رات کو دیر تک گھٹنے پڑھتے رہے۔ ہوا یوں کہ انہیں ایک معاملے میں حوالے کے لیے ایک کتاب کی ضرورت پڑی۔ اُن کے کمرے میں ہر طرف الماریوں میں کتابیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ متعلقہ کتاب ایک الماری کے اوپر پڑی تھی۔ سو ریخس صاحب کرسی کے اوپر کھڑے ہو کر کتاب نکالنے لگے تو عالم سرد میں انہیں قریب میں چلتے چکے کا پتہ نہ چلا۔ اُس چمکے کا پتہ ان کے سر میں کچھ یوں لگا کہ وہ چکر اکر بیچے گئے اور گرتے میں اُن کا سر کہیں زور سے ٹکرایا۔ بس یہ حادثہ اتنا جان لیوا ثابت ہوا کہ موت وحیات کی کشمکش میں وہ کردہ رانی اجل ہوئے۔“  
اس راز سے پردہ کشائی کرتے ہوئے ٹھیکل بھائی کی آواز میں گہرا دکھ تھا۔

ریخس امردہوی اور جون ایلیا کے ساتھ زندگی چاکر ٹھیکل بھائی کی زبان نکل میں دھل چکی تھی۔  
ایک مرتبہ ساحل سمندر پر کلفٹن سی دیو کے ساتھ ساتھ داک کرتے ہوئے جب میں نے ایک سوال پوچھا تو مجھے توقع تھی کہ وہ ریخس یا جون صاحب کا نام لے دیں گے۔ صبح سویرے نیلے سمندر کی تیز ٹمکن ہوا اور لہروں کی سفید جھاگ دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا کہ انہیں قیام پاکستان کے بعد کون سا شاعر، شاعری کا اہم ترین ستون لگتا ہے تو بے اختیار بول اُٹھے۔

”جوش ملیح آبادی! کیا نوابی شخصیت تھی، گورے چنے، سرخ و سپید، کیا لُحْن تھا، کیا مَظَن تھا۔ الفاظ تو گویا اُن کی زبان پر نازل ہوتے تھے اور خیال ان کے دل پر۔ میں اُن خوش نصیبوں میں شامل ہوں جنہوں نے اُن کو اس طرح اپنی ہی قلم ”یہ جوانی ہے جوانی ہے جوانی ہائے ہائے“ پر جھوم کر اپنی کوٹھی کے لان میں رقص کرتے دیکھا ہے کہ انہوں نے صرف گرتا ہی نہیں رکھ تھا۔“

”میں نے تو سن رکھا ہے کہ وہ خاصی مالی مشکلات کا شکار رہے“ میں نے کرید اتو بولے۔  
”قطعاً نہیں۔ ان کی یہاں کراچی میں ابھی خاصی کوٹھی تھی۔“

زبان کی صحت کے حوالے سے رفیق احمد نقشب کو بہت یاد کرتے ہیں جو ادیب عمری میں فوت ہو گئے۔ وہ دودھائی سناں ”سب رنگ“ میں ان کی معاونت کرتے رہے۔

اس طرح مزدور شاعر احسان دانش کو صحتِ زبان کے حوالے سے مستند و قابلِ تقلید سمجھتے ہیں۔

ان کی مجھ پر لاتعداد مہربانیاں اور ان گنت احسانات ہیں۔ ایک احسان کے بارگراں کے نیچے ڈھٹا جاتا ہوں۔

ایک شام کہنے لگے کہ انھوں نے ایک تحفہ میرے لیے سنبھال رکھا ہے۔

اگلی ملاقات میں انھوں نے وہ تحفہ بہت اشتیاق سے مجھے دیا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہاں موجود انگریزی ادیب ایچ ایم نقوی بھی جذباتی ہو گیا۔ وہ تحفہ کرشن چندر کے اُس قلم کا تھا جس سے اُس نے یادگار تحریریں لکھی تھیں اور فکیل بھائی کو کرشن چندر کی بیگم نے اُن کی وفات کے بعد تحفہ پیش کیا تھا۔ کئی انٹرویوز میں فکیل بھائی بہت فخر سے اس قلم کا تذکرہ کر چکے تھے۔ انھوں نے وہ قلم مجھے دے دیا تھا۔ میرا جذباتی ہو جانا عین قدرتی تھا۔

بعد ازاں جاتے ہوئے مجھے ایک کونے میں لے گئے اور کہنے لگے۔

”عرفان بھائی یاد رکھیے آج آپ کی سال گرہ ہے۔“

میں حیران رہ گیا۔ میری سال گرہ کو ابھی کئی ماہ باقی تھے۔

”میں بیوہ سے بہانہ کر آیا ہوں کہ آج عرفان صاحب کی سال گرہ ہے اس لیے اُن کے لیے بہ طور تحفہ کرشن چندر کا قلم لے کر

جار ہا ہوں۔“

ایک روز لمبی سانس بھر کر کہنے لگے۔

”وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں جو پیدا نہیں ہوئے۔ نہ پیدا ہوئے نہ اُن کی شادی ہوئی۔“

ایک مرتبہ فون پر گفت گو کرتے ہوئے میں نے ایک مشترکہ شناسا کا بتایا کہ اُس کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہو گئی ہے۔ یہ سن کر فون کی

دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد اُن کی حسرت بھری آواز سنائی دی ”واہ واہ کیا کہنے، ایسے اچھے نصیب ہمارے کہاں۔“

ایک روز شادی کے حوالے سے کہنے لگے ”شادیاں تو ہوتی ہی علیحدگی کے لیے ہیں۔“

ایک دنیا جانتی ہے کہ وہ انتہائی فرماں بردار، خدمت گار شوہر اور شفیق والد ہیں۔ پس ایک دکھی شوہر کا دکھاوا بنا رکھا ہے۔ ایک روز

میں نے کہا۔ ”فکیل بھائی مجھے یقین ہے کہ آپ بھابی سے عشق کرتے ہیں اسی لیے فراغت ملتے ہی فوراً گھر کو جاتے ہیں۔“

انھوں نے میری بات بیچ میں کاٹ دی ”قطعاً نہیں۔ خدا جانتا ہے یہ محبت نہیں، خوف ہے۔ بیوہ کا خوف۔“

ایک شام ہم خوب مرغن کھانا کھا کر واپس لوٹے۔ بھنا گوشت اور نہاری کچھ زیادہ ہی مسالے دار تھے۔ میں اُن کو گھر چھوڑ کر چلا

آیا۔ اگلی صبح اُن کا فون آ گیا۔ کہنے لگے۔

”میں ساری رات جاگتا رہا۔ آدھی رات کو خاموشی سے اٹھا، دبے قدموں لان میں چلا گیا اور گھٹنا بھر چہل قدمی کرتا رہا۔ تب

کہیں کھانا ہضم ہوا اور طبیعت سنبھلی۔“

جب میں نے کہا کہ بھابی کو اٹھا دیئے تو انھوں نے فون کی دوسری جانب سے لمبی آہ بھری۔

”خوف کی وجہ سے بیوہ کو نہیں اٹھایا۔“

عبداللہ حسین کا انٹرویو چھپا جس میں انھوں نے شادی کو عمر قید قرار دیا تھا۔ اُس دن سے عبداللہ حسین صاحب کی دانائی کے

معتقد ہیں۔

حقیقت اُس کے برعکس ہے۔ ان کی زندگی میں جو لقمہ، گھر میں سلیقہ، بچوں کی اعلیٰ تعلیم اور سعادت مندی اور اخراجات میں اعتدال

ہے وہ ان کی بیگم صاحبہ کی وجہ سے ہے۔

ایک روز اُن کے شاگرد میرا براہیم (میر فکیل الرحمان، جنگ، جیو والے کے برخوردار) نے اُن سے پوچھا کہ بہترین جوڑے کون

ہے ہو سکتے ہیں تو بے اختیار بولے "اگر شرع اور معاشرتی روایات اجازت دیتیں تو بہن بھائی، کیوں کہ دونوں آپس میں حقیقت بہت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ نہیں دے سکتے۔"

انسانی ذہن کے مشاہدے کے دوران بہت سے دل چسپ حقائق سامنے آئے۔ ایک امر ابتدا میں انہیں حیران کرتا تھا، بعد میں اسے انسانی فطرت کرشمہ سازی کے طور پر سمجھ گئے۔

ایسے کئی واقعات ہیں جہاں نیک اور راست والدین کی اولاد حد درجہ عیاش اور بعض صورتوں میں جرائم کی دنیا کی ہاسی نکلی۔ اس سے برعکس ایسے قصوں کی بھی کمی نہیں جہاں اخلاقی کج روی کا شکار والدین کی اولاد درگم میں یا دیگر عموال کی بنیاد پر فرماں بردار اور نیک نکلی۔ اسی لیے یہ کہادت اعتبار حاصل کر جاتی ہے کہ اور ماؤں زماں میں بھی ہے اور سہارا بھی۔ بہترین ماحول میں سے بھی خراب اولاد برآمد ہو جاتی ہے اور دیکھ بھال کر شادی کرنے سے بھی خلاف مزاج شریک حیات مل جاتا ہے۔

اُن کا کہنا ہے کہ دنیا میں ہر جوڑا غلط بنا ہے۔ ایک روز میں نے عطا الطاف میں اختلاف کیا اور کئی ایسے لوگوں کی مثال دی، یہ شامل معروف ادیبوں کے، جو کامیاب اور خوش گوار شادی شدہ زندگی گزار رہے ہیں۔ مہری بات سن کر انہوں نے فوراً جواب دیا۔

"انسانوں میں بھی گدھے ہوتے ہیں۔ جن کی آپ مثال دے رہے ہیں یہ سب گدھے ہیں۔ گدھا پن ایک مزاج اور ذہنی کیفیت کا نام ہے۔"

ایک روز ہم ایک جاپانی ریستوران میں سوٹی کھانے کے ارادے سے بیٹھے تھے۔ جاپانی ریستورانوں کا کراچی میں خاصا کامیاب کاروبار ہے۔ اس میں کھانے کے لوازم بہت مختلف اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ ہمارا آرڈر آنے میں وقت تھا۔ بلندی پر واقع ریستوران کی بیٹھے کی دیوار گیر کھڑکی سے کراچی کا خوب صورت منظر دل موہ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اوپر سے یا دور سے مناظر کتنے خوب صورت لگتے ہیں، اصل حقیقت تو قریب جانے یا اندر اترنے پر پتا چلتی ہے۔ اسی دوران تکلیل بھائی نے کھنگھار کر مجھے سامنے کی جانب متوجہ کیا۔ سامنے ایک جاپانی جوڑا بوتل سے سرخ انگوری شراب (ریڈ وائن) کا گچ کے مخصوص گلاسوں میں ڈل رہا تھا۔ میں نے اسے معمول کی بات جان کر تکلیل بھائی کی جانب دیکھ تو انہوں نے حسرت سے اپنے ایک پرانے دوست کو یاد کرتے ہوئے کہا "کیا کیا لوگ تھے جو ہم میں سے اُٹھ گئے۔ وہ دوسرے لوگ تھے۔ ہمارے ایک دوست ہو کر تھے، بلا کے وضع دار تھے، کمال کا تعلق مزاج پایا تھا۔ کراچی بھی ایک دور میں کیا شن دار شہر تھا۔ کھلی شاہ راہیں اور بڑے سکون ماحول، تمیز دار اور خوش ذوق لوگ اور بچھل پھولتا کاروبار۔ کوئی کسی کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ یوں بھی یہاں ہندو، عیسائی، پارسی اور ایرانی خاصی تعداد میں آباد تھے جو شہر کو کثیر الثقافتی رنگوں سے رنگین کر دیتے تھے۔ بات کچھ یوں ہے کہ ہمارے دوست نے اب فرماں بردار بیٹا پایا تھا جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ ہمارے دوست کراچی کے ساحل سے ہر وقت چلنے والی نرم ہوا میں شام کو ہالکونی یا ٹیرس پر بیٹھے سورج کے غروب ہونے کا نیلا نارنجی منظر دیکھتے ہوئے وائن کے گھونٹ بھرتے رہتے۔ ان کے مشروبات گھری میں تھے خانے میں تیار ہوتے تھے۔ ان کا فرماں بردار بیٹا دل جمعی سے اپنے والد کے لیے شراب کشید کیا کرتا تھا۔ سوسارا انتظام گھری میں تھا، باہر خوار ہونے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔"

ایسے وضع دار والد اور تابع فرمان بیٹے کی مثال، میں نے پہلے نہ سنی تھی۔

ایک روز ایک صاحب ان کے دفتر میں صبح کے وقت ملنے لگے۔

"میں کل رات گئے خوار کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا کہ پولیس کے سپاہیوں نے روک لیا۔ میرا منہ سوکھ کر کہنے لگے کہ جرم اور گناہ دونوں کمر ہے ہو۔ تمہیں حوالات میں بند کر دیا جائے۔ ایسے میں میرے ذہن میں فلاں فلاں آیات مبارکہ آئیں جن میں حرمت خمر کا تذکرہ ہے۔ میں نے انہیں وہ آیات سن کر بحث میں ایسا الجھا لیا کہ وہ شش و پنج میں پڑ گئے۔ میں نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور نکل آیا۔"

یہ سن کر کلیل بھائی نے بیزارى سے کہا۔

”اُن نالائقوں کو آپ کوئی سی آیات مبارکہ سنا دیجئے فرق کیا پڑتا تھا۔“

ایک مرتبہ کلیل بھائی کو پولیس نے زیرِ اکرانگ سے آگے گاڑی کھڑی کرنے پر روک لیا۔ پولیس والے نے ان کے پیٹھے کا پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ”جیو“ جیل کے لیے کام کرتا ہوں۔ پولیس والے نے درستی سے پوچھا کہ ”سا“ جیل میں کام کیوں نہیں کرتے۔ کلیل بھائی نے پوچھا۔ ”سامیں کیوں؟“ پولیس والا یہ سن کر گہری سوچ میں پڑ گیا اور پھر بے اختیار بولا ”واقعی، کیوں؟“ اتنی دیر میں کلیل بھائی یہ کہہ کر ”جیو“ سے میری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں اور احترام کا رشتہ الگ ہے“ وہاں سے اُسے سوچتا چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔

ادب، عمدہ پکوان کے علاوہ انھیں کلیل سے بے حد دل چسپی ہے۔ اچھے بیچ کے لیے کوئی بھی مصروفیت چھوڑ سکتے ہیں۔ کرکٹ کے علاوہ فٹ بال اور ہاکی، بھی بے حد پسند ہیں۔ ایسا بہت مرتبہ ہوا کہ میں نے فون کیا تو رسی علیک سلیک کے بعد کہنے لگے ”ٹی وی پر بیچ چل رہا ہے، آپ بھی دیکھیے۔“ میں اشارہ سمجھ جاتا ہوں۔ اچھی محفل ہو، کوئی ہوٹل ہو یا گھر انھیں بیچ کی فکر رہتی ہے۔ یا تو کسی سے اسکو پوچھیں گے یا کسی ٹی وی پر چلتا بیچ دیکھ کر وہیں رک جائیں گے۔

ایک عادت ان کے مزاج کا مستقل حصہ بن چکی ہے۔ وہ ہے ان کا دوپہر کھانے کے بعد کا ”قیلولہ“۔ غالباً اس کی وجہ ان کا ماضی میں رات گئے تک جاگ کر کھانا پڑھنا اور دوپہر میں نیند پوری کرنا ہے۔ یہ عادت اس حد تک راسخ ہے کہ گرم و مرطوب علاقوں سے ہٹ کر برطانیہ ایسے ٹھنڈے ملک میں بھی وہ قیلولہ کرتے رہے ہیں۔ دوپہر سے لے کر دیر سہ پہر تک وہ فون نہیں اٹھاتے، اپنے دفتر کے بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیتے ہیں اور گھنٹے دو گھنٹے میں نیند پوری کر کے تروتازہ ہو جاتے ہیں۔ یہی عادت میں نے بہت سے دوسرے صحت مند طویل عمر پانے والے افراد میں دیکھی ہے۔ دوپہر کی نیند کے بعد گویا انسان ایک نئے دن کا پوری بٹاشٹ سے آغاز کرتا ہے۔

بادلِ نخواستہ کبھی قیلولہ نہ کر پائیں تو شام بھر طبیعت مکدر اور بوجھل رہتی ہے۔ اگر احباب کا ریش ہو تو بھی ایک کونے میں نیم دراز ہو جاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔

یہ عادت لیبیا سے لے کر اسپین تک عرب ممالک سے لے کر ہندوستان تک ایک باقاعدہ روایت رہی ہے۔ برطانوی راج میں دوپہر کے آرام کے لیے دفاتر سے ملحقہ آرام کرے بنائے جاتے تھے۔

ان پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب دوپہر کا آرام تو ایک جانب، رات کی نیندیں اُن سے دور ہو گئی تھیں۔ ہر دم کھلکھلانے والے وضع دار ادیب خاموش سے ہو گئے تھے انھیں ”چپ“ ہو گئی تھی۔

یہ اُس دور کی بات ہے جب اُن کا پال پوس کر جوان کیا ”سب رنگ“ اُن سے جدا کر دیا گیا تھا، اُن کی اولاد ”بازیگر“ کو مختلف احباب کے کچے انداز میں لکھنے لگے تھے۔ تب انھیں میں نے حد درجہ بے چین دیکھا۔ البتہ اُن کی زبان سے سخت کلمات تب بھی نہ سنے۔ یہ ایک دل گیر ورنجور کر دینے والی داستان ہے۔

ملک محمد اسلم، کلیل بھائی کے قریبی دوست تھے۔ اُن کی دینی میں کتب اور اخبارات کی خاصی بڑی الجھنی تھی۔ دونوں کا ابتدائی تعلق کاروبار کے حوالے سے تھا جو بڑھ کر گہری دوستی میں بدل گیا۔ دونوں میں جہاں گردی کا شوق مشترک تھا، سو غیر ممالک کے بہت سے سفر اکٹھے کیے۔ ملک محمد اسلم کو اپنا بھائی، دوست، محسن کہتے ہیں۔ اُن کے انتقال پر وہ بہت روئے۔ ان کے گھر میں ایک کمرہ ملک صاحب کے نام سے موسوم تھا۔ ملک صاحب جب بھی کراچی آتے ہفتوں، مہینوں کلیل بھائی کے ہاں قیام کرتے۔ کلیل بھائی کہتے ہیں کہ ان جیسا فیاض، درود مند آدمی انھوں نے پہلے نہیں دیکھا۔ انھی ملک صاحب کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے محمد راشد ملک کو کراچی سے رسالے اور اخبار کی اشاعت کا شوق چرایا۔ ان دنوں سب رنگ کی عدم تواتری سے کلیل بھائی مالی طور پر شکستہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے ایک معاہدے کے تحت سب



رنگ راشد ملک کے حوالے کر دیا۔ بچے کا فذ پر معاہدہ ہوا۔ اس کے تحت ایک سال بعد سب رنگ کو ہاتھ دگی سے شائع کرنا تھا۔ عدم تواتر میں بے شک خاصی کمی ہوئی لیکن ہزار کوششوں کے بعد ٹکیل بھائی ماہ بہ ماہ کرنے میں ناکام رہے۔ وجہ وہی معیار تھی۔ وقت پر نکالنے کے چکر میں سب رنگ کے معیار پر آج آنے کا اندیشہ تھا۔ ٹکیل بھائی کو ناگوار انہیں تھا۔ معاہدے کو دوسرا سال گزر گیا۔ نئے مالک کا اصرار تھا کہ پہلا جیسا جیسا ہی ریگولر ہونا چاہیے۔

ٹکیل بھائی نے آزاد ماحول میں کام کیا تھا۔ یہ یاد ان سے برداشت نہیں ہوا۔ انہوں نے راشد ملک سے کہا کہ مالک تو اب آپ ہی ہیں۔ میں الگ ہو جاتا ہوں۔ آپ نکال بیجیے۔ معاہدے کی رو سے ٹکیل بھائی کو دس لاکھ روپے ادا نہیں کیے گئے۔ حالاں کہ معاہدے میں طے ہو چکا تھا کہ دس لاکھ روپے پیشگی دیے جائیں گے۔ باقی دس لاکھ ڈیفکریٹیشن کی تبدیلی پر۔ یہ تبدیلی دو ماہ بعد ہو گئی تھی۔ دو سال تک ٹکیل بھائی منتظر رہے کہ یہ رقم انھیں مل جائے۔ الگ ہو جانے کے بعد کئی بار تقاضا کیا۔ انکار کبھی نہیں کیا گیا لیکن ادائی آج تک نہ ہوئی۔ معاہدے کی قانونی دستاویز ٹکیل بھائی کے پاس موجود ہے۔ بہت سے احباب نے کارروائی کے لیے اُکسایا لیکن ٹکیل بھائی نے اپنے دوست محمد اسلم ملک کے لحاظ میں اُن کے بیٹے سے ایسی کسی تلخ قسم کی صورت حال سے اجتناب کیا اور بات آسانوں پر چھوڑ دی۔

سب رنگ کے مینسٹ آپ سے ٹکیل بھائی کا تعلق کوئی سو دو سال رہا۔ اُن کے علیحدہ ہو جانے کے بعد رسالہ جاری رکھا گیا اور تسلسل قائم رکھنے کی بھی کوشش کی گئی لیکن اب یہ رسالہ ایسی ریل گاڑی کی طرح تھا جو انجن کے بغیر تھا۔ بازی گریک مسئلہ تھی۔ جو سلسلہ 1975 سے ٹکیل بھائی لکھ رہے تھے اور قریباً پانچ ہزار صفحات لکھ چکے تھے۔ ظلم یہ کیا گیا کہ اُس پر کراچی کے محرموں سے طبع آزمائی کرائی گئی۔ قانونی طور پر بھی یہ ایک غلط اقدام تھا اور ٹکیل بھائی آسانی سے منصفوں کو اپنے قانونی حق پر قائل کر دینے میں کامیاب ہو جاتے لیکن وہ اپنے مرحوم دوست سے خاص قسم کے بلکہ دلی تعلق کی وجہ سے یہ تمنا شاد کیٹے رہے۔ بازی گری جاری رکھنے کے لیے کئی ادیب آزمائے گئے، قارئین نے واضح طور پر تبدیلی محسوس کر لی۔ ڈگری سے پتا سب رنگ لکھتا رہا، سب رنگ گرتا رہا، آخر اُسے بند کر دینے پر مجبور ہونا پڑا۔

اپنی آنکھوں کے سامنے ٹکیل بھائی نے سب رنگ کا دوال دیکھا۔ ان دنوں جب میری ٹکیل بھائی سے ملاقات ہوتی تو میں انھیں بے طرح مضطرب پاتا۔ اُن کو کسی پہلو چین نہ آتا تھا۔ اپنی فطری برداشت اور وضع داری کی وجہ سے وہ اس کا اظہار کم ہی کرتے البتہ ان کی ظاہری بے چینی سب کچھ عیاں کر دیتی۔

ایک شام ہم کھانے پر اکٹھے ہوئے۔ دل کے بہلانے کو بے شمار باتیں جوئیں۔ دنیا جہاں کے قصے کہانیاں بیان ہوئے، تازہ لطائف کا جادو ہوا۔ اس دوران ایک لطیفے پر جتنے جتنے ٹکیل بھائی یک دم خاموش ہو گئے۔ توقف کے بعد گلو کیر لہجے میں بولے۔  
 ”آہ، ہائے۔ سنا ہے ان لوگوں نے اس مرتبہ ٹھٹھل کو بوری میں بند کر دیا۔ ٹھٹھل کی روح تڑپتی ہوگی۔“  
 ایک تذکرہ مشہور و معروف مصور اقبال مہدی کا بھی۔

اقبال مہدی کے باریکی، محنت اور عرق ریزی سے بنائے گئے پورٹریٹ اور تصاویر پاکستان کے فائوٹار ہوٹلوں کے علاوہ مصوری کے شائق متولی لوگوں کے ہاں بھی ایک جلس ناباب کے طور پر سچے ہوتے ہیں۔ اقبال مہدی روشنائی اور قلم سے تفصیلی جزئیات نگاری کے ساتھ مصوری کرتے تھے کہ دوشیزہ کی پلکوں کے سائے تک اُس کے رخساروں پر نمایاں ہو جاتے تھے۔ وہ مشرقی حیا سے سخی لڑکیوں کے پورٹریٹ بنانے کی وجہ سے مشہور ہوئے مگر نہ اس کے علاوہ بھی ان کا خاصا کام موجود ہے۔

مصوری سے دل چسپی ہونے کے باعث مجھے اقبال مہدی کا ذاتی اور ایسا ذخیرہ جو برائے فرد محنت نہ ہو دیکھنے کی خواہش تھی۔ ٹکیل بھائی مجھے اقبال مہدی کے گھر لے گئے۔ وہاں مرحوم کی بیوہ اور بیٹی انھیں انتہائی تپاک سے ملے۔ اُن کی نوعمر بیٹی کو تو میں نے اپنے باپ کی یاد میں بے طرح بے چین و غم گین دیکھا۔

اقبال مہدی کا احوال جاذب توجہ ہے۔ فطری و پیدائشی مصورا اقبال مہدی رئیس امر و ہوی کے عزیز اور غیر معروف فن کار تھے۔ ان کی فکیل بھائی کے ساتھ دوستی تھی۔ جب ”سب رنگ“ شروع ہوا تو انھوں نے چند اسکیچ بنانے شروع کیے۔ آہستہ آہستہ کہانیوں کے علاوہ رسالے کے تمام اسکیچ وہی بنانے لگے۔ اس دوران ان کا ہاتھ بھی رواں ہو گیا اور تصاویر میں زندگی کی رو بھی دوڑنے لگی۔ وہ افسانے، تراجم، ناول پڑھتے، اُن کے کرداروں، ماحول، جزئیات کو اپنے تخلیقی جوہر کے حوالے کر دیتے جو اُسے پال پوس کر پختہ شکل میں اسکیچ اور آئل پینٹنگ کی صورت میں سامنے لے آتا۔

جوں جوں ”سب رنگ“ ترقی کرتا گیا، اقبال مہدی کا شرہ بھی ملک بھر میں پھیلنے لگا۔ اب اُن کی تصاویر کی مانگ ”سب رنگ“ سے ہٹ کر بھی ہونے لگی۔ اقبال مہدی، فکیل بھائی کے ساتھ، ان کے گھر ہی میں رہتے تھے۔ 1972 میں فکیل بھائی کی شادی ہوئی تو اقبال مہدی اپنی شادی کے لیے اصرار کرنے لگے۔ لڑکی کی تلاش تھی اور ایک روز ایسا ہوا کہ اقبال مہدی کو ایک لڑکی پسند آگئی۔ دو منزلہ مکان کی بالائی منزل پر فکیل بھائی رہتے تھے۔ نرشی منزل پر فلمی دنیا کے مشہور ہدایت کار، ہندستان میں جاگرتی، پاکستان میں بیداری کے کام سے یادگار فلمیں بنانے والے رفیق رضوی کا قیام تھا۔ ان کی بچی اپنے چچا کے ہاں چند روز کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اُس روز وہ گھر کے آنگن میں بنی ہوئی یا ہو دیا میں برتن دھو رہی تھی کہ اقبال مہدی نے بالائی منزل سے اُسے دیکھ لیا اور ایسے فریفتہ ہوئے کہ اُسی لڑکی سے شادی کے لیے اڑ گئے۔ مشکل یہ تھی کہ رفیق رضوی کی بیگم تو شیعہ تھیں لیکن ان کے سسرال والوں کا سارا گھرانہ سنّی العقیدہ تھا۔ اقبال مہدی نے پہلے تو بیگم رفیق کی منت سماجت کی۔ انھوں نے اقبال مہدی کی بے قراری دیکھ کے بات پیش قدمی تو بہر حال کی لیکن لڑکی کے گھر والے شدید قسم کے مذہبی لوگ تھے۔ بات بن نہ سکی تو اقبال مہدی نے حیرت آمیز جرأت کی۔ بذات خود لڑکی کے گھر پہنچ گئے اور یقین دلانے کا ہر جتن آزما یا کہ وہ یقیناً شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں لیکن اصل میں نہ وہ سنّی ہیں نہ شیعہ۔ وہ تو انسان دوست ہیں اور انسانیت ہی ان کا عقیدہ ہے۔

اقبال مہدی ایک غیر جانب دار نو جوان تھے، دوسرے ان کا مستقبل تاب ناک تھا۔ لڑکی والے رام ہو گئے۔ اب اقبال مہدی کو شادی کی جلدی ہوئی۔ بیس پچیس روز میں شادی کے ملبوسات تیار ہوئے۔ زیور خریدے گئے۔ ان سارے کاموں میں فکیل بھائی کی بیگم روز و شب مصروف رہیں۔

رمضان کے آخری ہفتے میں اچھی خاصی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ اور دلہن کے لیے فکیل بھائی کے گھر کا ایک کمر مخصوص کر دیا گیا۔ دونوں جوڑوں نے ایک ساتھ ملک کے بالائی علاقوں کا سفر کیا۔

دنیا کی روایت رہی ہے کہ ساتھ رہنے کی کئی وجوہ رہتے جدا کرنے کا باعث بھی بن جاتی ہیں۔ سوان کے رہنے بھی الگ ہو گئے۔ بعد میں اقبال مہدی نے اپنی منفرد مصوری سے بہت نام پیدا کیا۔ وہ بڑے فطری قسم کے مصور تھے۔ بڑے متلون مزاج، سرکش عاقبت نا اعلیش۔ آخر انھیں کثرتِ بادہ نوشی لے بیٹھی۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کی تصاویر کروڑوں روپوں میں فروخت ہوئیں۔ کاش وہ اپنی رخصت عمر کو لگام دے لیتے۔

اقبال مہدی کے بارے میں ایک چونکا دینے والی حقیقت شاید اُن کے قریبی ترین رفقا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اُن کی شرماتی، لجاتی، ادائیں دکھائی دو شیرازوں کا بنیادی خیال وہ امریکی رسالے ”پلے بوائے“ کے وسطی خصوصی صفحات کی عریاں لڑکیوں سے لیتے تھے۔ گویا وہ ان کی ”نیوڈز“ ٹھہرتی تھیں جنھیں وہ لباس پہنا کر فن کارانہ مہارت سے حسبِ خواہش تاثرات دے دیا کرتے تھے۔ ”پلے بوائے“ ایک ایسا رسالہ تھا جو بے لباس خواتین کی تصاویر شائع کرنے کے حوالے سے رسوا و معروف ہوا۔ اُس کے پہلے ہی شمارے میں امریکی اداکارہ مارلن منرو کی تصاویر تھیں۔ یہ وہی مارلن منرو ہے جس سے بعد ازاں امریکی صدر جان ایف کینیڈی کا معاشرت بھی چھا۔ ”پلے بوائے“ کو سنجیدگی سے سب لیا جانے لگا جب اُس میں اہم ادیبوں کی تحریریں شائع ہونی شروع ہوئیں۔ اُس کے لیے لکھنے والوں میں



نورپروف (لولیٹا کے مصنف)، پی جی ڈاؤ ہاؤس (برحالی مزاج نگار)، ہاروی موراکامی (جاپانی غزلیہ نگار) اور مارگریٹ ایٹ وڈ (کینیڈین خاتون ادیبہ) ایسے اہم ادیب شامل تھے۔ حیران کن امر ہے کہ 1970 میں اس کا بریل ایڈیشن شائع ہوا شروع ہوا۔ گویا دنیا لوگ بھی انگلیوں کی پوروں کے رستے اس کے قارئین میں شامل ہو گئے۔

انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کے حوالے سے ایک مرتبہ ہمارے کچ مختلف موضوعات پر بات چل نکل۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ بہت سے انسان ایسے راز قبر میں لے کر جاتے ہیں جو وہ کسی سے بیان نہیں کر سکتے۔ اس پر انھوں نے گہرے لگائی "ایسے راز جو وہ خود سے بھی بیان نہیں کر سکتے۔"

انسانی ذہن کے حوالے سے اپنے ایک دوست اور کراچی کے ایک مشہور و معروف انگریزی زبان کے صحافی کا واقعہ بیان کیا۔ وہ صحافی ان کے قریبی دوست تھے۔ سڑکی دہائی کا واقعہ ہے کہ وہ کراچی کے ایک بڑے ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک جانب سے کسی لڑکی کی چیخ و پکار کی آواز سنائی دی۔ قدرے سبھی اُس جانب متوجہ ہو گئے۔ جب معاملہ کھلا تو عجیب بات سامنے آئی۔ اُس لڑکی کو اُس کی ایک عزیزہ بہانے سے ہوٹل لائی تھی۔ ہوٹل کے ایک کمرے میں اُس نے لڑکی کو ایک مرد سے متعارف کروا کر زبردستی کرنے کی کوشش کی تو فطرتاً شریف لڑکی نیچے لابی کی جانب بھاگی۔ یہیں وہ صحافی کھانا کھا رہے تھے۔ معاملے کی نزاکت کو کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ کچ میں کود پڑے اور لنگاراکہ کوئی اُس لڑکی کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ اُس لڑکی کے کردار کی پچنگی سے وہ صحافی اتنا متاثر ہوئے کہ بعد ازاں اُس سے شادی چاہی۔۔۔ شادی کے بعد اُس لڑکی نے ایک مکمل وفا شعار اور گھریلو بیوی کا کردار ادا کیا۔ اس حد تک کہ صحافی کی تحریروں کے لیے وہ مواد اکٹھا کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی۔ یہ علیحدہ واقعہ ہے کہ وہی صحافی بعد ازاں راست راہ سے بھٹک کر کج رو ہو گئے۔

ایک مرتبہ میں نے فکیل بھائی کو کھانے پر مدعو کیا۔ میرے اہل خانہ سلائے تعطیلات کے حوالے سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ جب میں نے فکیل بھائی کو بتایا کہ میرا گھریلو ملازم کھانا تیار کرے گا تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اُن کی بات ملازم سے کرواؤں۔ میں نے فون ملازم کو تھما دیا۔

ملازم خاصی دیر فون سن کر "ہوں ہاں" کرتا رہا۔

جب میں نے فون بند ہونے کے بعد اس کی بابت پوچھا تو بولا۔ "صاحب کہہ رہے تھے کہ میں پیاز کتر کر رکھ دوں، لیسن کا لمبہ تیار کر دوں، گرم سالے الگ کر کے رکھ دوں، فلاں فلاں مسال اگر گھر میں نہیں تو بازار سے لے آؤں، بکھ اور دتی کا گوشت تیار کر رکھوں اور آلو خاص طریقے سے کاٹ لوں۔ چو سے پرکھ نہ چڑھاؤں۔"

میں حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔

فکیل بھائی تشریف لائے تو کھانے میں کچھ بھی تیار نہ تھا۔

آتے ہی وہ باورچی خانے میں چلے گئے اور مجھے حکم صادر کر دیا کہ میں اندر نہ آؤں۔

جب وہ باہر نکلے تو آلو اور مسالا بھونے جانے کی مہک باہر تک پھیل کر بھوک بڑھا رہی تھی۔

وہ آکر بیٹھے اور بیٹھے ہی دوبارہ اٹھ کر باورچی خانے کی جانب یہ کہتے ہوئے چل دیے "ہم اس ناماقتی پر قطعی طور پر بھروسہ نہیں

کر سکتے۔"

خاصی دیر بعد وہ باہر آئے تو خوشی ان کے چہرے سے مترشح تھی۔ جب کھانا لگا تو بکرے کے بچے گوشت سے دہائی کھانے کی مہک

اٹھ رہی تھی، آلو مسالے کی قاب ساتھ میں رکھی تھی اور رائیہ بھی مخصوص انداز میں تیار تھا۔

گوشت خست، نرم گھلتا ہوا لیکن ٹوٹا نہ ہوا، مہک آور لذیذ تھا! ایسا عمدہ ذائقہ دار سالن میں نے پہلے نہ کھایا تھا۔ ساتھ میں آلو مسالہ



اور راسخہ گویا کسی اور دنیا کے کھانے تھے، کہیں اور تیار ہوئے تھے۔

کھانے کے بعد ٹھنڈی ربڑی کھاتے ہوئے کہنے لگے ”بیوہ کو چنانہ چلے کہ میں نے آپ کے ہاں یہ کام شروع کر دیا ہے۔“  
یہ عمل کئی ایک مرتبہ ہرایا گیا، شکر ہے آج بھی بھابی اس سے بے خبر ہیں۔

ایک اور ایسی ضیافت میں، جو میرے ہاں منعقد تھی لیکن گویا اُن کی جانب سے تھی کہ کبھی کبھار اُن کا تیار کردہ تھا، ایک مشترکہ دوست میرے کان میں کہنے لگے ”یہ کتنی بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہم دورِ حاضر کے اہم ترین مدبر و ادیب کے ہاتھ کا پناہ ہوا عمدہ کھانا کھا رہے ہیں۔“  
میں نے تائید کرتے ہوئے فقط اتنا کہا۔ ”یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اُن کے ہاتھ کی تحریر زیادہ ہا کمال ہے یا پکوان!“  
ایک بار لاہور سے آتے ہوئے میں نے پوچھا کہ کچھ لینا آؤں تو کہنے لگے۔ ”آپ وہاں کی نسبت روڈ کے ہریسے کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ لیتے آئے گا۔“

اگلی ملاقات میں ہریسہ کھاتے ہوئے مایوس لہجے میں بولے۔ ”حیدر آباد کن میں ہریس ہوتا تھا۔ یہ وہ تو نہیں۔“  
ایک موسمِ بہار میں ہم لاہور میں اکٹھے تھے۔ انھوں نے ایک معروف جگہ کا کھانا کھانے کی فرمائش کی۔ جب میں نے جب گزارش کی کہ وہاں بیٹھنے کا اچھا انتظام نہیں تو کہنے لگے۔

”تازہ گرم کھانے کا اصل لطف چولھے سے اُترتے ہی آتا ہے۔ دوبارہ گرم کیا ہوا کھانا اپنی لذت کھو بیٹھتا ہے۔“  
وہاں بربلہ سڑک کھانا کھاتے ہوئے بہت خوش ہوئے اور لذیذ کھانے کے نوالے لیتے ہوئے دل چسپی سے گاہکوں اور راہ گیزوں کی حرکات و سکنات دیکھتے رہے۔

بریبانی کی بہ نسبت پلاؤ پسند کرتے ہیں۔ شروع میں جب میں نے کہا، پلاؤ کراچی میں زیادہ شوق سے نہیں کھایا جاتا بلکہ پنجاب میں پسند کیا جاتا ہے تو بے ساختہ بولے۔ ”مراؤ آباد پنجاب کے ساتھ ہی تو ہے۔ میں بھی تو پنجاب ہی سے ہوں۔“  
پھل پسند نہیں کرتے۔ شروع میں خاصی معاشی آزمائش میں وقت گزارا سو پھل ایسے منہ کے شوق کی عادت ہی نہ پڑی۔ یہ عادت آج تک قائم ہے۔

ایک مرتبہ ہم معروف مصور تصدق سہیل صاحب کے ہاں گئے۔ وہ ٹکلیل بھائی سے مل کر کھل اُٹھے۔ تصدق صاحب ستاسی برس کی عمر سے بڑھ کر ہیں۔ خوب حسن پرست اور عاشقِ زندہ دل ہیں۔ سو اپنی داستانِ ہائے عشق بیان کیں۔ جب وہ یہ سب سنا رہے تھے تو ٹکلیل بھائی انھیں رشک سے دیکھ رہے تھے۔ ملاقات کے بعد مجھ سے کہنے لگے ”میں نے آج تک اتنا جوان بڑھا نہیں دیکھا۔ ان سے پوچھیے گا کہ اس عمر میں بھی اتنی توانائی کہاں سے پائی؟“

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ آہ بھر کر بولے۔ ”شادی جو نہیں کی۔ یہی ان کی زندہ دلی اور جوانی کا راز ہوگا۔“  
بلاشبہ شادی کے حوالے سے مذاق کرتے رہتے ہیں لیکن اُن کی عملی زندگی ان کی بیگم سے محبت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ خود جی جان سے محنت کی تاکہ بیوی بچوں کو زندگی کی ہر سہولت فراہم کر سکیں۔ بیگم تو بیگم، اپنے سرال کی اس حد تک عزت کرتے اور ان کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کے چورانوے سال کے عمر رسیدہ سرسبز بچہ پڑ جائیں تو فوری ان کی تیمارداری کو چلے جاتے ہیں۔ سرال کے دور پار کے عزیزوں کی مداخلت میں اپنی پریشانیاں بھول جاتے ہیں۔ اگر ان سے یہ سب بیان کیا جائے تو جھینپ جاتے ہیں اور بات کو بدلنے کے لیے عادتاً کہہ دیتے ہیں ”بیوہ کا خوف ہے جو یہ سب کر داتا ہے۔“

اپنے تینوں بچوں کو اعلیٰ ترین تعلیم دلائی ہے۔ بیٹا برطانیہ سے تعلیم حاصل کر کے بینکاری کے شعبے میں اہم عہدے پر فائز ہے۔ بڑی بیٹی نے امتیاز سے ایم ایس کیا۔ اس کے شوہر ملکی سطح کے معیشت دان اور بینکاری میں معتبر نام رکھتے ہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی

تکلیف بھائی نے اولاد کی تعلیم و تربیت اور اسے روزگار کے وسائل فراہم کرنے کے لیے پس انداز کی مٹی آمدنی سے خریدی مٹی جائیداد کا بڑا حصہ فروخت کیا ہے۔

میں نے انھیں ”سب رنگ“ چھن جانے کے بعد سب سے زیادہ اداس اکلوتے بیٹے شرجیل کے بہ سلسلہ روزگار کنیڈا چلے جانے پر پایا۔ جب ادا سی حد سے گزر جاتی ہے تو اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں ”وہاں چلے جانا انھی کے لیے بہتر تھا۔ یہاں ترقی کے مواقع محدود ہیں۔“

اب تو یہ عالم ہے کہ بیٹے سے زیادہ پوتے کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

ایک دوسرا مسئلہ یہ بھی آن کھڑا ہوا ہے کہ گھر کے معمولی پلہر، مستری کے کاموں کے لیے، گاڑی ٹھیک کروانے کے لیے، سودا سلف لانے کے لیے خود ہی بھاگ دوڑ کرتے رہتے ہیں۔ کوئی مردانہ بہار اور ساتھ میسر نہیں سو گھر کے سارے کام اپنے کندھوں پر لے رکھے ہیں۔ جب کبھی میں دل جوئی اور ہاتھ بٹانے کی کوشش کروں تو مسکرا کر کہتے ہیں ”کاموں سے دل نگار ہوتا ہے۔“

بیٹے کے لیے بھی ”ٹھو کہتا ہے“ کی جگہ ”ٹھو کہتے ہیں“ استعمال کرتے ہیں۔

اُن کے ساتھ تعلق خاطر کے باعث اور اُن کی وضع داری اور شائستگی کی وجہ سے میرے مزاج میں ایک تبدیلی پچھلے برسوں میں غیر محسوس انداز میں ڈرائی ہے جو اس معاشرے میں ناموزوں ہے۔ اب اونچی، ناشائستہ بات یا اونچی حرکت طبیعت پر غیر ضروری بوجھ ڈالتی ہے۔

کبھی کبھار دل گرفتہ تو ہوتے ہیں مگر جلد اپنا مزاج بحال کر کے مسکرانے لگتے ہیں۔ چند پرانی محبتیں یاد کرتے ہیں اور سیدہ کے منصوبے باندھنے لگتے ہیں۔

تکلیف بھائی نے خود محبتیں کم کی ہیں، ان سے عشق زیادہ کیے گئے۔ بلکہ یہ مناسب ہوگا کہ ان کی تحریروں کے باعث بہت سی خواتین ان کی جانب مائل ہوتی رہیں۔

ایک شام ساحل سمندر پر اُن کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے کئی رومانوی جوڑے اپنے آپ میں مگن بیٹھے نظر آئے۔ میں نے تکلیف بھائی سے پوچھا کہ انھیں کس عمر میں زیادہ متاثر کرتا رہا ہے۔ میری بات سن کر مسکرائے اور کہنے لگے ”مجھ پر عمر طاری نہیں ہوئی۔ میں تو آج بھی اپنے آپ کو کل کا لونڈا سمجھتا ہوں۔ لگتا ہی نہیں، اتنے برس گزر گئے۔ مجھے تو آج بھی ہوا میں لہراتی گھنی زلفیں اور چاند چہرے اسی طرح متاثر کرتے ہیں جیسے تب کرتے تھے جب میں نے ایک لڑکی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مدرسے میں سورۃ منزل کا ورد کیا تھا اور استاد سے مار کھائی تھی۔“

تکلیف بھائی کی چاہت میں جہاں کالج ہوشلوں کی لڑکیاں مشترک محبت نامے لکھتی تھیں، ان کی تصاویر پر پاپ اسٹار کے نشان ثبت کر کے بھیج دیتی تھیں، شادی شدہ خواتین بھی مائل ہو جاتی تھیں وہیں اُن کا ”سب رنگ“ سے عشق سب پر بازی لے گیا۔

”اتفاقاً ہی نہ تھا۔ نہ ہی توجہ کہیں اور بھٹکتی تھی کہ عشق کرتا۔ میرا سبھی کچھ ادب تک محدود رہا ہے۔ ایک جنون تھا یہ سودا جو سر میں سلا یا تھا۔ ضد میرے مزاج کے اجزاء میں اہم جز رہی ہے۔ جب کوئی ارادہ کر لوں تو اسے پورا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ لڑکپن میں صنف مخالف کی جسانی کشش رومان پر ضرور غالب آ جاتی رہی ہے پر عموماً میں ایک منطقی سوچ کا مالک رہا ہوں۔ فیصلے ذہن سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ وقتی جذبات میں بہا ضرور ہوں پر زیادہ دور تک نہیں گیا۔ وہ ہمارے دوست جون بھائی کیا خوب کہہ گئے تھے۔ ہائے جون بھائی!

کیے تھے عہد جب لکھوں میں ہم نے

تو ساری عمر ایسا کیوں کریں ہم

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ شعر و ادب پر بات چل رہی ہے۔ ذرا خاموشی آئے تو گھلیل بھائی کے منہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے ”آہ،  
!جون بھائی۔“

کچھ عرصہ پہلے ایک روز پیٹ میں درد کی شکایت کی۔ درد بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں کو دکھایا گیا۔ خون کے اور دیگر ٹیسٹ کروائے گئے۔  
آخر میں روح فرسا خبر ملی کہ بڑی آنت کا کینسر ہے۔ اس کا واحد حل یہ تھا کہ بڑی آنت کا سرطان زدہ حصہ کاٹ دیا جائے۔  
اعزاد اقارب میں تشویش فزوں تر ہو گئی۔ بالآخر آپریشن کر کے آنت کاٹنے کا فیصلہ ہوا۔ جب میں عیادت کے لیے گیا تو بھی ہوئی مسکراہٹ  
سے لے۔

میرا دل کٹ گیا۔

لمحے دنوں میں کئے اور دن برسوں میں۔

آخر آپریشن کا وقت آ گیا۔

میں اُن کی حوصلہ افزائی اور مزاج بُری کے لیے اسپتال گیا۔ ان کے گرد اعزاد اقارب بیٹھے ہمت بندھا رہے تھے۔ وہ سچ میں لینے  
آپریشن کا لباس پہنے پھمکی مسکراہٹ مسکرا رہے تھے۔

ڈاکٹروں نے وقت مقررہ کے بعد سب سے رخصت ہونے کی درخواست کی اور آپریشن کا سامان تیار کر کے اُن کو آپریشن تھمیز  
لے جانے لگے۔

کبھی تیار دار جانے لگے۔ آخر میں نہیں نے اُن کے ہاتھ تمام کمر سادگی میں ہم دردی سے پوچھا۔

”کسی شے کی خواہش ہو رہی ہو، کچھ چاہیے؟“

میری بات سن کر اُن کے چہرے پر مخصوص زندہ شرارتی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ آہستہ سے بولے۔

”کسی حسین خاتون کے قُرب کی خواہش ہو رہی ہے۔“

وہ حسبِ توقع اور معمول کے مطابق، آپریشن سے پہلے ہی بھرپور صحت مند رنگین زندگی کی جانب لوٹ آئے تھے۔

# نانگا پربت

تصدق سہیل





پھنسی کے روز، خاموش، سنان دو پہر کا وقت تھا، انکا دکھارہ گیر سڑکوں پر درختوں کے سایوں کی پناہ میں چلے نظر آتے تھے۔ میں نے پھنسی بجائی، کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی اور فلیٹ کا دروازہ نیم وا ہوا۔ اندر سے ایک بوڑھے صاحب نے باہر جھانکا، مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر تذبذب ابھر آیا جو کسی اجنبی کو دیکھ کر آ جاتا ہے، پھر انھوں نے میرے ہم راہی کو دیکھا اور کھل اٹھے اور دروازہ پورا کھول دیا۔ ہم فلیٹ میں داخل ہوئے تو ایک مخصوص بسانہ نے ہمارا استقبال کیا۔ سامنے بیچروں میں مختلف قسم کے پرندے طرح طرح کا شور کر رہے تھے، پلٹ کر بوڑھے میزبان کو دیکھا تو وہ ایک تہ بند نما کپڑے کو زیریں بدن پر لپیٹے کھڑے تھے۔ چہرے پر کھلتی مسکراہٹ تھی جس سے ان کا پورا سراپا روشن ہو گیا تھا۔ پیٹ سے اوپر جسم نکلا تھا، ہاتھوں پر پینٹ کے تازہ کیلے نشان تھے، گول مٹول گورے چہرے پر شریر مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہمیں اپنے اسٹوڈیو کی جانب لے چلے تو ایک بلی کہیں سے آئی اور ان کے پیروں سے لپٹنے لگی۔ "شرارتی! یا زآجا۔" یہ کہہ کر انھوں نے بلی کو پیار سے ششکارا۔ اس دوران چستکبری، سرمئی، سیاہ، خاکی اور دیگر رنگوں کی بلیاں فلیٹ میں گھومتی نظر آئیں۔ بلیاں، ہنرطلوں، سفید کبوتر، رنگین چڑیوں اور رنگارنگ پرندوں کے ساتھ حیران کن طور پر بقائے باہمی کے تحت ایک چھت تلے زندگی بسر کرتی نظر آ رہی تھیں۔

اندر اسٹوڈیو سورج کی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ اس کی کھڑکی باہر ایک خاک اڑاتے خالی پلاٹ میں کھلتی تھی۔ ساتھ میں ایک بیڈ روم تھا جس میں ٹھنڈا اندھیرا تھا۔ اسٹوڈیو میں مختلف پینٹنگز مکمل اور نامکمل حالت میں پڑی خشک ہو رہی تھیں۔ جنگل کے بھیکے مناظر، قمری توتے، سفید میتائیں، نیلے مور، سیاہ کوئے، کاسنی چونچوں والے انگوری پرندے، عریاں جل پریاں اور واڑھیوں والے مرد گھوڑوں پر سوار سیالائی شگفتگی میں نمایاں تھے۔ چند ہیو لے تھے اور کچھ جتنے فن کارانہ کج شکلی میں عیاں تھے۔ سب کچھ نیم عریاں یا مکمل عریاں تھا۔ مجھے قرین حقیقت گمان ہوا کہ فن کاروں کو تخلیق میں خود بھی حالت برہنگی میں نقاشی کرتا ہوگا۔ یہ گمان کچھ بے جا نہ تھا۔ وکٹر ہوگو کا سا بے مثل فن کار جس نے "لامرہ ہلز اور بیچ بیک آف نورٹھ ایم" جیسے بڑے ناول تخلیق کیے جب کبھی تخلیقی قبض کا شکار ہوتا تو ہر شے سے بے نیاز ہو جاتا یہاں تک کہ بے لباس ہو کر اپنے آپ کو اشیاء سے آزاد کر لیتا۔ ہینکے نے کئی شاہ کار غریباں کھڑے ہو کر ٹائپ کیے۔ ڈی ایچ لارنس نے "لیڈی ہینری لورڈ" ایسی رومانوی تحریر کچھ اس طور لکھی کہ وہ لباس سے آزاد، شہوت کے درخت پر چڑھ جاتا اور چند لمحوں بعد اتر کر ناقابل فراموش ناول تحریر کرنے لگتا۔ فہرست طویل ہے، انسانی فطرت کی بے انت کج ادائیگوں کی طرح۔

آصف فرخی جب پہلی مرتبہ مجھے لیے تصدق سہیل کے ہاں گئے تو شاید ان کے گمان میں بھی نہ ہوگا کہ یہ خاک سارا اس نقاش کے صنم خانے کا کچھ ایسا حصہ بنے گا کہ سن سن کر مزید تشنہ ہوگا، دیکھ دیکھ کر حیراں ہوگا۔ یہ وہی رنگ محل ہے جہاں بعد میں یہ خطا کار، ٹکٹل عادل زادہ اور دیگر مردان ادب و فن کو لے گیا اور یہ وہی سے کدہ ہے جہاں بے شمار خوش جمال، خوش ادا اور خوش اندام دوشیزاؤں کو دیکھا۔

زمانہ پلٹتا ہے۔ پرندوں اور جانوروں سے محبت کرنے والے تصدق کی چوٹی یا پانچویں جماعت کا واقعہ ہے جب ننھے تصدق سہیل کو اس کے استاد نے اقبال کا ایک شعر پڑھایا۔

اے طاہر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی  
جس رزق سے آتی ہو پرداز میں کوتاہی

تصدق کو طاہر لاہوتی کے معنی معلوم نہ تھے چنانچہ ابھی اس کا مطلب معلوم کیا ہی چاہتا تھا کہ استاد نے تشریح کر دی۔ "اقبال نے پرندے کو مخاطب ہو کر کہا ہے کہ اے پرندے اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آزادی جاتی رہتی ہے۔" چنانچہ وہ سوال بحث جواب ہی رہ گیا۔ وقت گزرنے لگا۔ تصدق سہیل کے افسانے معیاری ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ تصدق کے ذہن میں کئی بار آیا کہ اس ترکیب یا پرندے کے بارے میں کسی سے پوچھ لے مگر اپنی کم علمی ظاہر ہو جانے کے خوف نے اس کی زبان پر لگام ڈالے رکھی۔ تصدق برطانیہ چلا گیا، کئی دہائیاں گزر گئیں، معصومی میں اس نے خاصا نام کمایا۔ نصف صدی بعد وہ واپس ہوا تو لاہور میں زاہد ڈار سے پاک ٹی ہاؤس

تاکا پرست بہ معنی عریاں پہاڑ

میں دوستی ہوگئی۔ چنانچہ ایک روز زاہد ڈار کو اعتماد میں لے کر اس پرندے کے بارے میں پوچھ ڈالا۔ زاہد ڈار نے بے یقینی سے تصدق کی جاہب دیکھا اور پوچھا۔ ”تمہاری عمر کتنی ہے؟“

”ساتھ برس سے کچھ اوپر۔“ تصدق نے جواب دیا۔

”اگر ساتھ برس یہ جانے بغیر گزر گئے تو اب جان کر کیا کرو گے۔“ زاہد ڈار نے استہزائیہ لہجے میں جواب دیا۔

دل میں کھد بد کچھ ایسی بڑھی کہ اسی سہ پہر اُس نے انارکلی کا رخ کیا اور پرندوں کی ایک دکان پر جا کھڑے ہوئے۔ دکان دار نے تذبذب میں کھڑے دیکھ کر پوچھا۔ ”باؤجی کیسہ چاہیدالے؟“ (باؤجی کیا چاہیے؟)

”طائر لاہوتی۔“ تصدق صاحب نے بے یقینی سے کہا۔

دکان دار نے شیدے کو آواز دی۔ ”شیدے باہر آؤ کچھ ایہہ باؤجی کیسہ چاہے منگدے نہیں؟“ (شیدے باہر آؤ کچھ یہ صاحب کیا مانگ رہے ہیں؟)

شیدہ باہر آیا۔ پرندے کا نام سن کر سر کھچایا اور پوچھا۔ ”تارا ہوتی؟“

”اوتارا ہوتی دیا پتر اندروں پٹھلاں دا پنجر اچک لیا، باؤجی آپے ای لہہ لین گے۔“ (اوتارا ہوتی کے بچے اندر سے پٹھلوں کا پنجر اٹھاؤ، صاحب خود ہی ڈھونڈ لیں گے۔)

”بکلی نہیں، مجھے لاہوتی چاہیے۔“ تصدق صاحب نے تصحیح کی۔

یہ سن کر شیدہ بول اٹھا۔ ”اوہو اسازے کول دول ہوتیاں، یکیا سُن، اوسویرے دک مکیاں نیں۔ پرسوں ہور لاہوتیاں آجاؤں گیاں۔“ (اوہو! ہمارے پاس دول لاہوتیاں تھیں جو آج صبح پک گئی ہیں، پرسوں تک اور آجائیں گی۔)

یہ سن کر تصدق صاحب خوشی سے کھل اٹھے اور اشتیاق سے پوچھا۔ ”یہ پرندہ دیکھنے میں کیسا ہوتا ہے؟“

شیدہ بولا۔ ”توتے نالوں تھوڑا مہ ہوندالے جی۔“ (توتے سے ذرا لمبا ہوتا ہے)

یہ سن کر تصدق صاحب کا حوصلہ بندھا اور ایک اور پرندے بیچنے والے بزرگ کے پاس جا کر اس کا پوچھا تو اُس نے بتایا کہ یہ پرندہ علامہ اقبال کے دور میں ہوتا تھا اور اب نایاب ہے۔ اقبال اسے یورپ سے لائے تھے اور یہ فرانسیسی پرندہ ہے جسے فرانسیسی میں Huttie کہتے ہیں۔ اس بزرگ دکان دار نے بتایا کہ اب یہ پرندہ پاک وہند میں نہیں ملتا۔ تصدق صاحب مایوس لیکن اُس دکان دار کی علمیت سے مرعوب ہو کر خالی ہاتھ لوٹ آئے۔

برسوں بعد میں نے تصدق صاحب سے اس واقعے کی تصدیق چاہی تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے اور بولے۔ ”یہاں کراچی میں میرے گھر میں کبوتر، چڑیا، توتے، جینا ہر طرح کا پرندہ ہے۔ طائر لاہوتی بہت ڈھونڈا مگر نہیں ملا۔ اگر آپ کو بٹلے تو میرے لیے ضرور لے آئیے گا۔ انارکلی کے ایک حکیم نے بتایا تھا کہ یہ آدمیوں کے لیے بہت مفید ہوتا ہے گو مجھے اس مقصد کے لیے قطعی ضرورت نہیں۔“

چند روز بعد میں نے اس پرندے کے بارے میں اپنے استاد اور محترم دوست فکیل عابد زردہ صاحب سے پوچھا تو وہ مسکرا اٹھے۔ انھوں نے بتایا کہ چار عالم ہیں لاہوت، جبروت، ملکوت اور نصوت۔ لاہوت انسان کا مقام تخلیق ہے اور انسان کو وہیں لوٹنا ہے۔ چنانچہ طائر لاہوتی ایک ایسی علامتی ترکیب ہے جو اقبال نے استعمال کی اور غالباً بعد کی شاعری میں دہرائی نہ گئی۔ البتہ انھوں نے بھی طائر لاہوتی کی تاثیر دیگر سے لاعلمی ظاہر کی اور اس موضوع پر اپنے محتاط لیکن بے شوق تجسس کا اظہار کیا۔

تصدق ایک اچھوتا کردار ہے۔ یہ شام سات بجے گھری نیند سوچتا ہے جو اس عمر میں کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ صبح فجر سے بہت پہلے تین بجے اٹھتا، فریج سے گوشت نکال کر اسے چھوٹے چھوٹے پارچوں میں بہت احتیاط سے کاٹتا اور ایک بڑے تھال میں ڈال کر

اپنے ارد گرد کی سڑکوں پر نکل جاتا جہاں کو سے، چلیں اور دیگر پرندے اس کے منتظر ہوتے۔ یہ بہت محبت سے انھیں گوشت کھاتا اور لالہ لالوں کے وقت لوٹ آتا۔ اب بھی یہی روٹین ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اب یہ پرندوں کو گوشت اپنے نلیٹ کی ہالکونی سے کھاتا ہے۔ میں نے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے پر اتنا وقت صرف کرنے کی وجہ پوچھی تو شفیق مسکراہٹ سے بولے۔ ”پرندوں کے طلق مہولے ہوتے ہیں۔ ابتدا میں نہیں بڑے ٹکڑے ڈالتا تو دیکھتا کہ دل اُن میں سے کچھ کے طلق میں حرارت سے بھول کر پھنس جاتے اور دم گھٹنے سے وہ ہتھری طرح زمین پر آ کر گرے۔ معصوم پرندوں کو اس طرح مرتے دیکھ کر مجھے بے انتہا دکھ ہوا چناں چہ اب میں گوشت کے اتنے چھوٹے ٹکڑے کرتا ہوں کہ وہ با آسانی نگل کر ہضم کر لیتے ہیں۔“

1930ء میں جالندھر میں پیدا ہونے والے تصدق سکیل نے کبھی معذور بننے کا سوچا بھی نہ تھا۔ آج بھی وہ جالندھر ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی سینماؤں سے بھری سڑک، جمنڈیوں والے پیر کی قبر، بھیرویں بازار، جرنیلی سڑک، تانگوں کے اڈے، امام صاحب کے مزار، چٹکا باغ، کپنی باغ کو اسی طرح یاد کرتے ہیں اور وہاں کے ناک میں بولتے حکیم پھنگے، تانگے کے مخصوص گھوڑوں اور گرمیوں کی دوپہروں میں ٹیبل کے ٹھنڈے سایے یاد کر کے اُداس ہو جاتے ہیں جیسے اے حیدر امت مر، خوش و نت سنگھ خوشاب میں ہڈا لی اور گل زار دینا کو یاد کر کے آب دیدہ ہو جاتے رہے ہیں۔ ان کی والدہ یتیمی تھیں کہ نہ تصدق ہاتھ میں آئی کھانے کی ہر شے منڈیر پر پیٹھے کیڑوں کی جانب پھینک دیتا تھا اور دن بھر انھیں ’آجا آجا‘ کہہ کر بلاتا رہتا تھا۔ یہ پکار آج بھی اُس کے اندر زندہ ہے۔ زندہ تو وہ خود بھی رہا جب تقسیم کے حوادث سے گزر کر اُس کا خاندان ہجرت کر کے لاہور آیا اور وہیں اس نے اپنا لڑکپن گزارا۔ تعلیم میں خاص دل چسپی نہ رکھنے والے تصدق کو پیسہ کمانے کا شوق چرایا تو اپنے ماموں کے ساتھ مل کر لاہور کی سڑکیوں میں سرکہ بنانے کا کاروبار شروع کیا۔ سستی ادنیٰ معیار کی شکر قندی اور ٹٹو پانی سے بھری کڑا ہی میں ڈال کر پکایا اور اس میں خوردنی تیزاب ڈال کر شراب کی خالی بوتلیں بھریں اور لندن کی ایک کپنی کا لیبل چسپاں کر کے پورے شہر کے عہدہ ہونٹوں کو سپلائی دے دی۔ اسی طرح ٹٹو کچپ کی بوتلیں اہلی کے گاڑھے پانی میں رنگ ڈال کر تیار کیں۔ ٹٹو خاصے منگے تھے چناں چہ ماموں بھانجے کی ذریعہ کاروباری جس کے موافق نہ ٹھہرے۔ کاروبار خوب چل نکلا۔ اعلیٰ برطانوی سرکہ اور کچپ جب خاصی سستی قیمت پر وافر تعداد میں میسر ہوئے تو صارفین میں خوشی کی لہر دو گئی۔ ماموں بھانجے پر پیسوں کی برسات ہو گئی۔ گرمیاں آئیں تو دھوپ ان ٹیبلوں میں بھی بوتلوں پر پڑی۔ اندر پلبلے بنے، گیس اٹھی اور بوتلوں کے کارک زوردار دھماکوں سے ایسے اڑے کہ شیشے ٹوٹ گئے اور دکان دار لندن کے سر کے میں لت پت ہو گئے۔ ماموں بھانجے کی تلاش شروع ہوئی۔ تب تک ماموں شاہدہ کی بس پکڑ چکے تھے اور چست بھانجا شینو پورہ چاہنچا تھا۔

قصہ مختصر، درخیز دماغ بیٹے کی کارروائیوں سے تنگ والد نے بیٹے کو لاہور سے زور شہر کراچی میں دوسرے ماموں کے ہاں بھیج دیا۔ کراچی تصدق کو بہت پسند آیا۔ گھٹی گھٹی سڑکیں، صاف ماحول، بڑے فٹ پاتھ جن پر شاموں کو جوڑے چہل قدمی کرتے، ہر وقت سمندر کی اور سے بہتی ہوا، کافی ہاؤس، ریسٹوران، بار، موسیقی کے کنسرٹ اور غزلیں بھری شامیں، مسلمان، عیسائی، پارسی، اینگلو انڈین، ہندو لوگ اور یورپین سیاح، بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے جہازوں کے بھانت بھانت کے ملاج، عملہ اور دفتروں سے لوتی چٹیل عیسائی لڑکیاں۔ اُس کے ماموں نے طوبہ کر ہا اسے قبول تو کر لیا لیکن ممانی نے اُس کے معمولات میں بے جا مداخلت شروع کر دی۔

یہاں تصدق سکیل افسانہ نگار نے جنم لیا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ممانی، تصدق کے نام آنے والے خطوط اور ڈاک کو اس کی غیر موجودی میں کھول کر پڑھتی رہتی۔ ایک روز تصدق کو ایک خیال سوجھا۔ اس نے ایک افسانہ تحریر کیا، اپنا پہلا افسانہ جس کے صفحہ پانچ پر ایک دوست کے نام خط تھا اور اس میں اپنی ممانی کی بے تہمتی اور چھو بڑی کا خاص تذکرہ تھا۔ تصدق نے وہ صفحہ وائسٹ اپنے کمرے میں چھوڑ دیا اور گھونٹنے لکل گیا۔ شام کو وہ گھر لوٹا تو حسب توقع ماموں اور ممانی کو بیخ پاپایا۔ ماموں نے وہ صفحہ تصدق کے سامنے پٹخ دیا۔ تصدق نے افسانے کے باقی صفحات اُن کے سامنے رکھ دیے۔ ماموں



کا حصہ ٹھنڈا تو نہ ہوا مگر تصدق سہیل اسی نے لگا کر لے لیا۔

آہستہ آہستہ تصدق کراچی کے ادبی حلقوں میں بیٹھنے لگا۔ وہ تعلیم حاصل کرنا، جزوقتی ملازمت کرنا اور شاموں میں ملاقات اور سہیل کی بھی جاتا۔ وہیں اس کی دوستی حمید کاظمیری سے ہوئی جس نے تصدق کی دیکھا رکھی اپنا پہلا افسانہ لکھا۔ صیب جالب سے بھی وہیں شناسائی ہوئی۔ ان دنوں کراچی میں زمین کافی ہاؤس ادیبوں، شاعروں اور آرٹسٹوں کے اجتماع کا مقام ہوتا تھا۔ تصدق شام میں وہاں بیٹھا اور دوپہر کو ناروج یونین انشورنس کمپنی میں ٹائپنگ انچارج کی ملازمت کرتا۔ اس کے ہاتھوں میں دو لڑکے اور سات لڑکیاں تھیں۔ تصدق ان لڑکیوں کے بہت قریب ہو گیا۔ قدرتی طور پر اس کے مزاج میں وہ جھجک نہ تھی جو کسی لڑکی کے قریب آنے میں مانع ہوتی۔ شخصیت بھی خوش گوشت تھی۔ چنانچہ بہت جلد کام کرتی اینگلو انڈین اور کرچھن لڑکیوں کے ساتھ بے تکلف ہو جاتا۔

اسی دوران دن کو کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہاں داخلے کے پس منظر میں سب سے بڑی وجہ وہاں پروفیسر محمد حسن عسکری کا بکھرنا تھا۔ حسن عسکری صاحب تصدق کے عین الاقوامی، رب کے مطالعے سے بہت متاثر ہوئے اور اسے جماعت کا مانیٹر مقرر کر دیا۔ تصدق جذباتی طور پر بھی ان کے بہت قریب ہو گیا اور ایک طرح کا ان کا بکھر بھی بن گیا۔ فلاں جگہ فلاں صاحب نے عسکری صاحب کے بارے میں کیا کہا۔ یہ سب خبریں وہ عسکری صاحب کو لاکر دیتا اور وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔ اس دوران تصدق کے افسانے اعلیٰ ادبی رسالوں میں جگہ پا کر تحسین حاصل کرنے لگے۔ اپنے فعال ادبی کردار کی وجہ سے تصدق حلقہ ادیبانہ ذوق کا جوائنٹ سیکریٹری ہو گیا۔ جب ان م۔ راشد اس کے صدر تھے۔

تصدق کا واسطہ طرح طرح کے لوگوں سے پڑا جن میں ایک ایسا ڈاکیا بھی تھا جو رات میں لوگوں کے خندکھوں کو پڑھا کرتا تھا۔ یہ انھی دنوں کا واقعہ ہے کہ تصدق کو ایک حسین شادی شدہ اینگلو انڈین عورت سے محبت ہو گئی۔ وہ بھی تصدق کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ جب ایک آدمی مرتبہ اس کے شوہر کو اس تعلق پر شک ہوا تو اُس عورت نے بہت اعتماد سے شوہر کو تھڑک دیا کہ وہ ”ایک بچے“ پر تو شک نہ کرے۔ یہاں سے تصدق کے عورت اور مرد کی نفسیات اور آپس کے تعلق کی بے شمار جہتوں کے مشاہدے کا آغاز ہوا۔

اُس دور میں برطانیہ جانا خاصا آسان تھا۔ تصدق کو محبت میں دل شکستگی کا سامنا تھا اور فسانوں کے نئے موضوعات کی تلاش بھی، چنانچہ وہ لندن پہنچ گیا، ٹریفالگر اسکوائر پر داناؤ نکا پھٹے کپوتروں کی طرح انوکھی کہانیاں اور چنچل وول کش لڑکیاں چلنے۔ مصوری ابھی منظر میں داخل نہ ہوئی تھی۔

لندن کے ابتدائی دن کھرے اور بارش میں لپٹے اور پیچھے ہوئے مایوس کن تھے، دوست تھے اور نہ ہی معاشی آسودگی۔ کوئی رفیق حال نہ تھی۔ البتہ تصدق اپنے دوستوں کو بغل میں لڑکیاں لیے پھرتے دیکھتا۔ اُس نے پہلا سبق یہ سیکھا کہ عورت کی ہر خواہش اور ضرورت کو پورا کرنے والے مردوں سے عورتیں محبت نہیں کرتیں۔ پیسہ خرچ کرنے والوں کو لڑکیاں کھانی کر چھوڑ جاتی تھیں البتہ جو لڑکیاں سنجوس یا نکال لڑکوں کے پیچھے آتی تھیں، وہ حقیقی چاہت میں آتیں، پیسے کی ہوس میں نہیں آتی تھیں۔

ایک روز تصدق نے چیئرنگ کراس پر ایک گوتھک عمارت کے سامنے لڑکیوں کی ایک طویل قطار دیکھی جس میں اکاؤنٹانٹ کے بھی کھڑے تھے۔ انتظار کیا تو پتا چلا کہ سینٹ مارٹن اسکول آف آرٹ میں مصوری کی کلاسوں میں داخلہ ہوا ہے۔ تصدق نے نظر بھر کر گتھی کے لڑکوں کو دیکھا اور سوچا کہ یہ تو چند چنگیوں کی مار ہیں اور قطار میں شامل ہو گیا۔

اگلے روز امتحانی کمرے میں ایک برہنہ ماڈل آن کراس سامنے بیٹھ گئی۔ سب اُمیدوار اُس کی تصویر بنانے میں مصروف ہو گئے۔ اس سے پہلے تصدق نے شوقیہ اسکچ وغیرہ تو بنائے تھے مگر کبھی باقاعدہ مصوری نہ کی تھی۔ امتحان میں بیٹھنے کے لیے اس نے ظاہر کیا تھا کہ اس نے مصوری سیکھ رکھی ہے۔ اب جب اُفتادہ سر پر سن پڑی تو تصدق تصویر بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب اُس نے کن انکلیوں سے ساتھ والے طلبہ کو



دیکھا تو اُس کے ہوش اڑ گئے۔ ایک سے بڑھ کر ایک عمدہ تصویر کشی کر رہے تھے۔ وقت ختم ہونے کا اعلان ہوا تو تصدق نے اپنی ہائی تصویر مایوسی سے دیکھی اور سامان پیک کرنے لگا۔ دشمن باری باری سب اُمیدواروں کی تصویریں اُچھلتی نگاہ سے دیکھ کر گزرنے لگی۔ تصدق کی بینک پر وہ کچھ دیر کی اور آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہال میں آواز گونجی۔ ”مسٹر سہیل! یہاں رکے گا۔“ یہ سن کر تصدق تذبذب میں پڑ گیا۔ ”آپ اصل آرٹسٹ ہیں۔ باقی سب کا پی مٹینس ہیں۔ آپ نے شاید اپنے آپ کو دریافت نہ کیا ہو لیکن میرا تجربہ آپ کے اندر چھپا پن کا رد کچھ سکھا ہے۔“ ذریعہ اور تجربہ کار استانی کے ان چند جملوں نے تصدق کی راہ متعین کر دی۔ اُس کے عشقوں میں ایک اور عشق کا اضافہ ہو گیا۔ جان دروں سے پدرانہ محبت، نازنینوں کی پرستش اور مصوری سے مجنونانہ لگاؤ۔

یہی عشق آنے والے دنوں میں تصدق کا سرمایہ حیات ٹھہرے۔

وہ چمکتی صبحوں میں ماربل آرچ کے سامنے ہانڈ پارک کے ایک کونے میں ایزل اور مصوری کا سامان لے کر بیٹھ جاتا اور کسی مناسب لڑکی کی تلاش میں رہتا۔ ایسی ٹورسٹ لڑکیاں جو لندن کی کشش میں تنہا، کم وسائل کے ساتھ چلی آتی تھیں اچھے دوست، مناسب سکونت اور ایڈ ونچر کی تلاش میں جلد ہی تصدق کے ساتھ گھل مل جاتیں۔ تصدق اُن کی تصویر بنانے کی پیش کش اور خوش گوار مسکراہٹ سے ان کی جانب بڑھتا۔ ان میں سے کئی اُس کے بڑے ہاتھ کو تمام لیتیں۔ بھٹے ان میں واٹن کی شوقین جوئیل ہو جس کی جون دو گلاس ریڈ واٹن کے بعد بدل جاتی یا موسم بہار میں جب بڑے بڑے درختوں کی سیاحی مائل بادامی شاخوں پر ٹھکونے پھونکنے والے دنوں میں ملنے والی ڈالز جتھ ایسی معصوم لڑکی ہو۔ الزبتھ نے بہت عرصے ساتھ بھایا، مٹلون مزاج جاری ہو، پہلی ہی ملاقات میں وارفتہ ہونے والی روڈاں کے تراشے خوب صورت جیسے ایسے جسم کی مالک شیری ہو جو اپنا نیوڈ ہوانے کے بہانے تصدق کے قریب آئی تھی، پرنگالی واٹن اور گانوں کی رسیا بیلیوٹ ہو، تا تجربہ کار، کم عمر اور کچھ حد تک بے وقوف لیون کے اسکول کی طالبہ لوسیئل ہو جو اظہار عشق کے ابتدائی لمحات میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی، کسی بے وفا کے باعث حمل ٹھہر جانے والی ادنا ہو جسے تصدق میں حمل گرانے والا سمجھا لیا گیا تھا، ناشپاتی، آلو بخارے، سیب اور چیری کے درختوں میں پھدکتی گھبریلوں والے باغ کے بیچ پر ملنے والی یوگوسلاوین ملینا ہو، جو تا تجربہ کار تھی اور مٹلون مزاج بھی۔ وہ جب تصدق کے کمرے میں پہلی مرتبہ آئی، اُس کمرے میں جس کی بڑی کھڑکی ناشپاتیوں اور سیبوں کے درختوں سے بھرے باغ میں کھلتی تھی، اُس نے وہاں بلز بلڈز (سائڈ کالہو) واٹن پی جو اُسے اس لیے پسند تھی کہ ایک جنگ میں دشمنوں کی فوج نے جب یوگوسلاویہ کی فوج کو یہ سرخ واٹن پیتے دیکھا تھا تو وہ یہ سمجھ کر بھاگ نکلے تھے کہ فوج سائڈ کا خون پی رہی ہے۔ پھلوں کی یہ شراب پی کر اُس نے اپنے آپ کو دوشیزگی ترک کرنے پر تیار کیا تھا اور تصدق کی محبت میں گرفتار موسم بہار کی صاف سیاہ آسمان اور چمکتے ٹٹھماتے ستاروں والی رات کو اپنے ارمان پورے کیے تھے۔ اس کی تجربہ کار سیکلی ملینا کے اطوار ہی سب سے جدا گانہ تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے تصدق کو جھرجھری آگئی۔ وہ تو گویا مردوں سے کوئی انتقام لیتی تھی۔ اس کے سامنے مرد بے بس ہو جاتا اور ناچار خود کو اس کے رحم و کرم کے سپرد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ اوزوہ انگریز، اس کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ بہت یاد آتی۔ تصدق نے ان سب کو دل و جان سے، غلو صول سے اور عقیدت سے چاہا۔ وہ جب کئی کے ساتھ ہوتا تو تن من دھن کے ساتھ اُس کے ساتھ ہوتا۔ اُس نے عورت کو ہر اُس روپ میں دیکھا جس میں کوئی فن کار دیکھنے کی خواہش کر سکے۔

تصدق زندگی کے لیے کسی ساتھی کی تلاش میں تھے۔ بہت سے چہرے، بہت سے بدن رنگ بدل بدل کے ان کے سامنے آتے رہے یا پیش ہوتے رہے لیکن وہ ایک ہم روح انھیں کہیں نظر نہیں آئی جس کے لیے وہ بڑی طرح مضطرب تھے یا پھر یوں کہیے کہ وہ ایک ازلی بے قرار فن کار، ایک جگہ کچھ مدت قیام کے بعد کسی اور گھستاں کسی اور منظر کی جستجو میں بھٹکتے والا جہاں گرد، وہ ایک بے پناہ منفرد، مختلف ان جانی جستجو میں سرگرداں آوارہ نقش گر ہے۔

اپنے اسٹوڈیو میں انگریز شروب پیتے اور بس منظر میں تحلیل ہوتی رومانوی موسیقی سنتے ہوئے تصدق صاحب نے مجھ سے اپنی

بچوں کے رنگ رنگ شریقی قصوں، عمومی انسانی نفسیات بالخصوص نسوانی نفسیات کے ادب میں کوششوں پر گھٹو سے لے کر جہاں رنگ و رو کے بے شمار موضوعات پر بلا جھجک بات کی۔ وہ باتیں جو لوگ اپنے آپ سے بھی نہیں دہراتے، وہ باتیں میرے سامنے بے محرک کہہ دیں۔

نسوانی نفسیات کے راز و اداں مصور نے کیا کیا قصے بیان کیے۔ تصدق کے حلقہ عشق میں اسکی شادی شدہ خواتین بھی آئیں جو اس کی تصویریں دیکھنے کے بہانے اُس کے کمرے میں چلی آئیں۔ ایک ہوا فاسطیق شادی شدہ عورت سے کچھ ایسی شینگلی کا اعجاز کیا کہ وہ ہانسیوں میں چلی آئی اور بعد ازاں عداوت کے آلسوؤں میں بار بار اُسے موردِ اِذاً مِثیراتی رہی۔ جب جانے لگی اور تصدق نے دوبارہ ملاقات پر اصرار کیا تو وہ پھٹ پڑی۔ دروازہ کھول کر جاتے ہوئے تصدق نے اُس سے اگلے مقام ملاقات کا پوچھا تو وہ واپس مڑی اور بولی۔ ”اسی کافی ہاؤس میں“ اور روتی ہوئی چلی گئی۔

اسی طرح ایک باوقار خاتون کے ساتھ قربت کے لمحات گزار کر اگلے روز جب اخبارات کے صفحہ اوّل پر اُس کی تصاویر دیکھیں اور ہکشاف ہوا کہ وہ بین الاقوامی شہرت کی حامل ایوارڈ یافتہ بہر فن ہے تو یہ ہکا بکا رہ گیا۔ نگلی ملاقات میں باادب شکوہ کیا کہ اُس نے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا تھا، وہ ہنس پڑی ”بھرا ایک بے نام مصور کے ساتھ ایڈیڈ پچر کرنے کا پڑ لطف تجربہ کس طرح حاصل ہوتا۔“

وقت ایک لمبا پلٹا کھاتا ہے۔

تصدق کے لڑکپن کا لاہور ہے۔ ایک دوست کے بہکاوے میں آکر وہ بازارِ حسن چلا جاتا ہے جہاں اسے ایک خاندانی دلال ایک تنگ گلی کے پرانے بوسیدہ مکان کی لمبی سیڑھیوں کے راستے دوسری منزل تک لے جاتا ہے۔ وہاں ایک داہجی شکل و صورت کی خنجر لڑکی بیٹھی ہوتی ہے۔ تصدق کی ناگوں میں اُن جانے خوف کے باعث لرزش ہے۔ وہ واپس لوٹنے کا سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ وہ شخص اس کے ہاتھوں سے پیسے اُچک کر اسے کمرے میں دھکیل دیتا ہے۔ اندر لڑکی بے نامل لباس کی اسیری سے خود کو آزاد کرتی ہے اور پنجابی میں چلتی ہے۔ ”جلدی کرو، میرے پاس تمہارے لیے تمام دن نہیں ہے۔ اللہ جانے کہاں سے جتاور پکڑا تا ہے۔“

تصدق کے ہاتھ کاٹنے لگتے ہیں اور جسم پسے پسے ہو جاتا ہے۔

لڑکی اُسے طنزیہ نظروں سے اُسے جسم چراتے ہوئے دیکھتی ہے اور قہقہہ لگا کر طعنہ دیتی ہے۔ ”تم تو نامرد ہو۔ جیسا کیوں برباد کرتے ہو۔“ واپسی پر تصدق کو لگتا ہے جیسے سڑک پر تمام لوگ اُسے دیکھ کر طنز اُٹھ رہے ہیں۔

یہ کیفیت اُس لمحے تک محدود نہیں رہتی، کئی دہائیوں تک پھیل جاتی ہے۔ ایسا کئی مرتبہ ہوتا ہے کہ کسی حسین یورپی لڑکی کے قرب میں اُسے وہ ہر بلا قہقہہ سنائی دیتا ہے، طعنہ بر جھکی کی طرح سینے پر تر از ہو جاتا ہے اور وہ نڈھال ہو کر بے دم ہو جاتا ہے۔

”میں نو جوانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ بچپن کی بے راہ روی کے اثرات ناحیات ساتھ چلتے ہیں“ ایک روز تصدق صاحب نے ہنس بے کہا۔ بات مکمل کر کے یک دم مکمل کھلا اُٹھے۔ لندن کے موسم کی طرح ان کا مزاج بھی لمحہ بھر میں بدل جاتا ہے۔

”لندن میں میرا ایک انڈین دوست تھا۔ اُسے میں اپنا ٹرو بھی کہتا تھا۔ نسوانی نفسیات کو اس سے بہتر جانتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ سڑکی دہائی میں یورپی لڑکیاں عموماً ہندوستانی اور پاکستانی لڑکوں کو شاہینگی سے زد کروا کر تھیں۔ چنانچہ میرے گزرنے مجھے اھیست کی کہ میں اپنا تعلق کسی پاکستان سے نہ بتاؤں۔ جب میں نے اُس سے راہ نمائی مانگی کہ کس خطے سے متعلق اپنا تعارف کرواؤں تو اُس نے ”پنجابی“۔“ اس کا مشورہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میں، میرا گڑ اور کوئی بھی لڑکی فنی کی ثقافت تو کچھ اس کے محل وقوع سے بھی واقف نہ تھے۔“

تصدق صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے بات مکمل کی۔

ایک سہ پہر میں اُن کے پاس بیٹھ تھا۔ وہ حسبِ معمول اپنی بے تکلفانہ گفتگو سے ماحول برقرار ہے تھے۔ دو منزل نیچے سڑک پر

اکاڈ کا گاڑیوں کے ہارن اور سالنکوں کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ سامنے بجلی کے تار پردو کوے مستیاں کر رہے تھے۔ میں نے ایک سوال کر دیا۔ سن کر وہ چپ ہو گئے اور گہری سوچوں میں گم ہو گئے۔ چند لمحوں بعد انھوں نے انار رنگ شربت کا آخری گلوٹ بھرا اور کچھ بولنے ہوئے ٹک گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، بولے۔ ”انگریز!“ میں نے ان کی زندگی کی ہیکچر گیلری میں آویزاں بے شمار لڑکیوں کی پورٹریٹس میں سے کسی ایک کے بارے میں پوچھا تھا جو ان کی صحیح معنوں میں Soulmate (ہم روح) تھی۔ انھوں نے انگریز کا ذکر کیا اور سارا دل کو جھینر دیا۔ نغمہ طولانی ہے۔ الفاظ کو سمیٹا جائے تو بات کچھ یوں ہے۔

ایک روز تصدق صاحب لندن میں دن کے گیارہ بجے پارک میں چپوترے پر واقع ریسٹوران میں کافی اور باہر شاداب گھاس کے میدان میں بکھری ہلکی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ یوندا باندی شروع ہو گئی۔ سب لوگ بھاگ کر ریسٹوران کے اندر آ گئے۔ سامنے ایک ٹیلی آنکھوں والی گلی لڑکی سفیدے کے درخت کے نیچے بیٹھی درخت کی تصویر بنا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں یوندا باندی تھم گئی۔ یہ تجسس کے ہاتھوں مجبور اس لڑکی کی بنائی تصویر دیکھنے وہاں چلے گئے۔ انھوں نے طالبہ سے اس کی تصویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جو اس نے خوش دلی سے قبول کر لی۔ ”تھم تو مجھ سے بہت بہتر مصور ہو۔“ تصدق صاحب نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ اب لڑکی نے تجسس ہو کر پوچھا کہ کیا یہ بھی مصور ہیں۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے ان کی کوئی تصویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے اپنی نظر میں بہترین تصویر، ایک پہاڑی منظر کی عکاسی، اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے تصویر دیکھی اور مایوسی میں سر ہلا دیا۔ ”اور دکھاؤ۔“ انھوں نے بے دلی سے میڑھے میڑھے بڑھنگے چہروں والی پینٹنگ سامنے رکھ دی۔ تصویر دیکھ کر وہ اچھل پڑی۔ ”یہ تو بہت خوب صورت ہے۔“

”انھیں کون پسند کرے گا اور خریدے گا؟“ تصدق مایوسی سے بولے۔

”تمہیں پینٹنگ بناتے وقت خریدار کو نہیں صرف اپنے آپ کو سامنے رکھنا ہے۔“ انگریز کے ان جملوں نے ان کے درمیان ایک لازوال دوستی کا آغاز کیا۔ وہ چند روز کے لیے آسٹریلیا سے آئی ہوئی تھی، ریخس باپ کی بیٹی تھی اور ہفتے کے دن اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے ہانڈ پارک جایا کرتی تھی۔ اس روز اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں جو وہ اپنے ضرورت مند بوائے فرینڈ کو دیتی تھی۔ تصدق نے مردانہ فطرت کا نباض ہونے کے ناتے اسے سمجھایا کہ پیار کرنے والے مرد عورت کے پیسے نہیں کھاتے۔ انگریز نے معصومیت سے جواب دیا کہ وہ لڑکا واقعی ضرورت مند ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ تصدق نے اسے سختی سے منع کرتے ہوئے ہدایت کی کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کو فون کر دے کہ اس مرتبہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اگر اس کے باوجود بوائے فرینڈ ملنے کے لیے خواہش کا اظہار کرے تو وہ مخلص ہے۔

تھوڑی دیر بعد انگریز آئی تو زار و قظار رد رہی تھی۔ بوائے فرینڈ نے اس سے ملنے سے انکار کا کوئی بہانہ کر دیا تھا۔ تصدق سے رہانہ گیا اور اس نے انگریز کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا، در اس کی آنکھیں چوم لیں۔

اس رات وہ تصدق کے پاس ٹھیر گئی۔ یہ محبت اور عشق کی داستان کی ابتدا تھی۔

بعد ازاں وہ دن رات اکٹھے رہتے۔ تصدق کو شروع میں احساس جرم ستاتا کہ اس کے دوست کیا سوچیں گے کہ وہ اتنی چھوٹی عمر کی لڑکی کے ساتھ ڈیٹ کرتا ہے۔ انگریز کی ذہنی پختگی اور سمجھ داری نے یہ احساس بہت جلد ختم کر دیا۔

”اس نے مجھے صحیح معنوں میں پینٹنگ کرنا سکھایا۔ میں کئی دہائیوں تک سینٹ مارٹن اسکول آف آرٹ کی شام کی کلاسوں کا باقاعدہ طالب علم رہا ہوں مگر انگریز نے جس خلوص اور دانش مندی سے مجھے آرٹ کا سلیقہ سکھایا، وہ برسوں کی نصیباتی تعلیم نہ سکھاسکی۔“

تصدق صاحب کی آنکھوں میں آسو ہا قاعدہ جھملا رہے تھے۔

”ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ اچھی پینٹنگ اور بڑی تصویر میں کس طرح تمیز کی جاسکتی ہے تو وہ بولی۔ ”بھلے خوب صورت ترین تصویر ہو لیکن وہ آپ کو ہر بار کچھ نیا سوچنے پر مجبور نہ کرے، تو وہ فقط وال پیپر کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس اچھی پینٹنگ، کمال کا فن

بارہ ہر مرتبہ انسان کو پچھلی مرتبہ سے مختلف نظر آتا ہے، وہ دیکھنے والے پر بھی وہ ماورائی کیفیت طاری کر دیتا ہے جس سے فن کار اے تخلیق کرنے وقت گزرا تھا۔ وہ صبح آرت کی کلاسیں پڑھتی اور رات کو میر سے بازو پر سر رکھ کر ساری روداد سنا دیتی۔ انگریز کی وجہ سے آج آرت کی دنیا میں ایک مجھے جانتے ہیں۔“

میں نے حیرت سے پوچھا ”وہ کیسے؟“

”میں ہر طرح کی پینٹنگ بنایا کرتا تھا، پہاڑوں، جنگلوں، جھیلوں، دیگر قدرتی مناظر، پورٹریٹ، میزے میزے انسانی اور حیوانی کردار، خود تخلیق کردہ مخلوقات۔ اُس نے مجھے سمجھایا کہ مجھے ان میں سے ایک طرز تخلیق اپنانا چاہیے جو میرا اپنا اسٹائل کہلائے۔ اسی نے مجھے مشورہ دیا کہ قدرتی مناظر وغیرہ کے مجھ سے بہت بہتر آرٹسٹ بیٹھے ہیں۔ یہ بگڑے میزے میزے انسانی اور دیگر اجسام کی ماورائی اور خواب آلود تصاویر ہی میری شناخت بنیں گی۔ ان کے نیچے مجھے اپنا نام بھی نہ لکھنا پڑے گا، لوگ پینٹنگ دیکھ کر ہی پکارا نہیں یہ تصدیق سبیل کے بنائی تصویر ہے، چناں چہ میں نے اس جانب بہت محنت کی، کئی دن گزر جاتے اور مجھے اپنا ہوش تک نہ رہتا۔“

میرا تجسس ہنوز باقی تھا۔ ”انگریز کے ساتھ معاملہ کیا ہوا؟“

”وہ چند ہفتے گزرا کر آسٹریلیا واپس چلی گئی۔ لڑکیوں سے قربت کے فن میں حاق، مجھے فنی کا باشندہ بنانے والے ہندو استاد نے دھوکا سے کہا۔ اُسے بھول جا، اے لونڈیا فرانس سے واپس نہیں آتی، یہ ٹھنکو، امیر باپ کی لڑکی تیرے لیے آسٹریلیا سے آنے کی نہیں۔“ اُس کی بات سن کر میں ڈکھی ہو جاتا۔ ایک روز میں ہانڈ پارک کے درمیان بنی جمیل سر پینٹائن جس کے گرد لوگ قسمل آفتابی کرتے ہیں اور آسٹریلیا سے آئی بھنوں، ہندوستان، روس اور پاکستان سے گرمیاں گزرنے اور بچے دینے آئی مرغابیوں کو دیکھتے ہیں، کے پاس تنہا بیٹھا انگریز کے بارے میں سوچتا واپس اپنے کمرے میں آیا تو وہاں اُس کا خطر رکھا تھا۔ میں نے معطر بانہ وہ خط لیا اور پارک جاتی بس میں بیٹھ گیا۔ خط میں اُس نے میرے ماعداد بوسوں کا، آنکھوں کے رستے دل میں اتر جانے کا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات کا تذکرہ کیا تھا۔ اُس نے یہ خوش خبری بھی سنائی تھی کہ وہ لندن کے ایک کالج میں داخلہ لے کر میرے پاس آ رہی ہے۔ میں خط بار بار پڑھ رہا تھا۔ بس میں میرے ساتھ بیٹھی لڑکی کسمائی تو مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔“

”اُس کے بعد۔“ میرا استفسار بیچ سے تصدیق صاحب نے اُچک لیا۔

”وہ واپس آئی، ہم پھر سے اس طرح اکٹھے ہو گئے جیسے چھڑے ہی نہ تھے۔ اس طرح کئی ماہ گزر گئے۔ ایک روز مجھے اطلاع ملی کہ اُس کا سنگین حادثہ ہو گیا ہے۔“

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا ”محبت کا ایسا الم ناک انجام۔“

”نہیں۔ میں اسپتال کی جانب لپکا۔ وہ زندہ تھی اور بے ہوش تھی۔ مجھے ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ بے ہوشی میں میرا نام پکارتی رہی تھی۔“

تصدیق صاحب کی آنکھوں میں دیر سے اکٹھے ہوئے آنسو قطرہ قطرہ بہہ نکلے۔ زندہ دل بوڑھے فن کار کو روتے دیکھنا کرب ناک تجربہ تھا۔ اسٹوڈیو کی خامشی آپہن بھرتی اور سسکیاں بیتی رہی۔ کچھ دیر کے لیے کھڑکی کے باہر کھری دھوپ بھی دھندلا کر یہ قاتل زدہ نظر آنے لگی۔

”وہ تن درست ہو گئی۔ میں نے اُس کا بہت خیال رکھا۔ وہ بچوں کی طرح مجھ سے لاڈ کرتی اور میں اُس کے نخرے اٹھاتا۔ ایک مرتبہ تو وہ اس بڑی طرح روٹھ گئی کہ منانا مشکل ہو گیا۔ دراصل میں نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ میں اُس سے عمر میں خاصا بڑا ہوں، وہ اپنا ہم سن لڑکا تلاش کر لے۔ یہ سن کر وہ بہت ناراض ہوئی۔“



”پھر یہ کہ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ وہ اپنے کالج میں میں معروف راتوں اور میں پینٹنگ کے علاوہ Camberland ایسے بڑے ہوٹل کے مارننگ شیف کی جزوقتی ملازمت کرتا رہا۔ محبت کا دیا سلگتا رہا۔ اس میں تیل گھٹتا رہا۔ محبت کی نشاۃ انگیز رات ختم ہوئی، فٹ پاتھ پر سوئے نعشی کے صبح کے متعفن دہن کی لڑکی طرح کا ناگوار دن چڑھا اور دیا بجھ گیا۔ وہ جو میں کہتا ہوں کہ محبت کی ایک عمر ہوتی ہے اور آرٹسٹ کے لیے کئی محبتیں کرنا ضروری ہوتا ہے چنانچہ انگریز مجھ سے کچھ اس طرح دھیرے دھیرے ڈور ہوئی کہ محسوس ہی نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اُسے اپنے جوڑ کا ہم عمر لڑکا مل گیا۔ عمروں کا فرق پانا نہیں جاسکتا۔“

ایک کم عمر بیوی بھی بڑی عمر کے شوہر سے کچھ عرصے ہم دردانہ محبت تو کر سکتی ہے مگر عشق جنوں خیز کی اُس سے توقع مٹ ہے۔ وہ پختہ عمر لوگ جو کم عمر لڑکیوں سے تاحیات تازہ جوش اور مستقل محبت کی توقع رکھتے ہیں جس طرح وہ اپنے جوڑ کے لڑکوں کو چاہیں، سادہ دل اور خوش گمان ہوتے ہیں۔ اپنے جوڑ کے جوڑے ہی نظر اور دل کو بھاتے ہیں۔ ایسے بے جوڑ تعلقات میں جذبات کی عمر کم ہوتی ہے۔ البتہ چند استثنیات موجود ہیں جیسے سجاد باقر رضوی کی اپنے سے خاصی کم عمر طالبہ سے بلا خیز محبت اور بالآخر شادی میں جذبات کی آٹھ دم آخر تک رہی اور اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کی بیگم کے منہ سے اُن کا تذکرہ ہلکی آٹھ پر رکھی ہنڈیا کی بھاپ کی طرح آہ کی صورت نکلتا ہے۔

”میں نے آج تک کوئی ایسی حسین عورت نہیں دیکھی جو اپنی تعریف سے خوش نہ ہو۔ تو صیف میں بڑکاری ضروری ہے۔ عموماً خوب صورت خواتین خوش مزاج، باتونی اور رحم دل ہوتی ہیں۔ واجبی اور کم رو خواتین کو احساس کمتری نے کچھ ایسا کڑوا ہٹا دیا ہوتا ہے کہ اُن کی تعریف کو یا بھروں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہے۔“

اسی طرح لندن کا ایک واقعہ سنایا۔

”وہاں میں ایک گھر میں پے ایک گیسٹ کے طور پر رہتا تھا۔ مالک مکان میاں بیوی میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ میاں ایک تک سک انگریز اور بیوی لٹل کھلائی گوری تھی۔ ایک روز وہ کسی میوزیم میں گئے۔ واپسی پر اُنھوں نے باہر نکلتے وقت ایک آرٹ گیلری کی جانب تیر کا نشان بنا دیکھا جس کے اوپر میرا نام لکھا تھا۔ اس معروف آرٹ گیلری میں میری تصویروں کی نمائش جاری تھی۔ میاں بیوی وہاں میری تصاویر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اُنھیں میرے آرٹسٹ ہونے کا اندازہ تو تھا مگر یہ علم نہ تھا کہ میرا وہاں کے مصوری کے حلقوں میں خاصا نام بن چکا ہے۔ چنانچہ وہ خاصے متاثر ہوئے اور واپس آ کر شکوہ کیا کہ میں نے کبھی اس بات کا اُن سے تذکرہ کیوں نہ کیا۔ چند روز گزرے تو بیوی نے شوہر سے فرمائش کی کہ وہ میری تازہ پینٹنگ چند روز کے لیے سہاوت کی خاطر لے لے۔ شوہر نے جھپکتے ہوئے مجھ سے تسلطی انداز میں درخواست کی تو میں نے فوری ایک پینٹنگ اُس کے حوالے کر دی۔ اگلے روز اُس کی غیر موجودگی میں اُس کی بیوی نے میرے فن کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میری تصاویر دیکھ کر اُسے ان کے گہرائی اور دائمی تاثر کا پہلے سے کچھ اندازہ تھا۔ میں نے عاریتاً دی گئی پینٹنگ اُسے تحفہ بلا قیمت دے دی۔ یہ دیکھ کر وہ اتنی خوش ہوئی کہ مسرت میں مجھ سے لپٹ گئی۔“

”پلٹنا تو وہاں عام سی بات ہے۔“ میں نے تبصرہ کیا۔

”یہ عام بات بعد میں خاص بھی ہوئی۔“ اُنھوں نے بات جاری رکھی۔ ”شادی شدہ عورت کو کوئی بھی مجبور نہیں کر سکتا۔ میرے شادی شدہ خواتین کے ساتھ بیش تر تجربات میں آمادگی اور پیش قدمی اُنھی کی جانب سے ہوئی۔ میں نے عورت کو کبھی بُری نگاہ سے نہیں دیکھا، میں نے اُسے مرد سے بہتر انسان پایا ہے۔ یقیناً زیادہ ہم درد، قابل اعتماد و محبت ہوتی ہے۔ عورت سے محبت، میں عبادت سمجھ کر کرتا ہوں، میں اس کی پرستش کرتا ہوں۔ یہ ہے ہی قابل پرستش۔ محبت اور جنس انسانی خیر میں گندھے ہوئے ہیں۔ یہ مرد اور عورت کی بنیادی ضرورت ہیں۔ چنانچہ انھیں معروضی معاشرتی اخلاقیات کے تناظر میں جانچنا فطرت کے آفاقی اصولوں کے خلاف ہے۔“

ایک روز خلاف معمول خا سے فیسے میں تھے، کہنے لگے۔ ”عورت خدا کا شاہکار ہے۔ اس سے خوب صودہ اور قابل حاصل کوئی ہے نہیں۔ وہ تنگ نظر اور متعصب مرد جو اسے سات پردوں اور گھر کی دیواروں میں چھپانا چاہتے ہیں اس سے صدمہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی صدیوں پرانی بالادستی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔“

اس کے بعد کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

”یہ لوگ امریکا کے خلاف نعرہ لگاتے ہیں ”گوامریکا گو“ اور ساتھ ہی اپنی اولاد کو کہتے ہیں ”گوامریکا گو“ اور انھیں وہاں گرین کارڈ کے لیے بھیج کر مسکینوں کے بچوں کو قتل میں جھونک دیتے ہیں۔ ان میں سے کتنے اپنے بچوں کو اس طور میں جھونکتے ہیں؟“

میں نے اُس روز اُن کی ناراضی کی وجہ پوچھی تو بولے۔ ”ایک جگہ کہا گیا ہے کہ میں جنس زدہ ہوں۔ ہاں میں جنس سے محبت کرتا ہوں۔ یہ تو بہت اطمینان بخش، قدرتی اور خوب صورت عمل ہے۔ دُنیا کی سب سے بڑی سچائی اور تخلیق کا اہم ترین سرچشمہ ہے۔“

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”کچھ نفسیاتی ماہرین کہتے ہیں کہ جنس کا غیر ضروری تذکرہ جنس طور پر کم زور انسان کی علامت ہے۔ جیسا کہ شنید ہے کہ ایک معروف افسانہ نگار کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے عارضہ جگر کے باعث غالباً جنسی طور پر فعال نہیں رہا تھا، اُس کے ہاں جنس کا تذکرہ بہت ہے۔“

”واقعی وہ بکواس کرتے ہیں۔ میں ستاسی برس کی عمر میں خود کفیل ہوں۔ ہاں اُبتِ نشاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے اپنے اطمینان سے زیادہ اپنی دوست لڑکیوں کے اطمینان سے خوشی محسوس ہوتی ہو۔ مجھے غوب معلوم ہے کہ اُن کے سارے بدن کی کون سی تار سے سرت آگئیں موسیقی جنم لے گی۔ پاکستانی مرد تو اس معاملے میں بالکل ہی بیٹھے ہیں۔ جو لڑکیاں اور عورتیں مجھ سے محبت کے ایسے سبق لینے آچکی ہیں، میں اُن کے نام مرتے دم تک نہ لوں گا ورنہ قیامت آجائے“ انھوں نے پر عزم لہجے میں کہا۔

ایسے بے شمار مواقع ہیں۔ ہم بیٹھے گپ شپ کر رہے ہیں، گھنٹی بجتی ہے، وہ حیرت سے کھڑکی سے باہر چھپ دکھلاتی زلف بھال کی سی شام کو دیکھتے ہیں، اور خود دکھائی کرتے ہیں۔ ”یہ وقت تو نہیں تھا، یہ کیسے آگئی۔“ دروازہ کھولتے ہیں تو بھر پور بدن کی فیشن سیل باکس چوبیس سالہ حینہ دھوپ کا چشمہ لگائے اندر داخل ہوتی ہے، ان سے گلے ملتی ہے اور یہاں سے فرج میں سے ایک ٹھنڈا اچھاگ اڑاتے مشروب کاٹن دے کر ملحقہ پراسرار اندھیرے کمرے میں دشما کر آجاتے ہیں اور میرے سامنے بے چینی سے پہلو بدلتے لگتے ہیں۔

ایسا اتنی مرتبہ ہوا کہ ادھر گھنٹی بجتی ہے اور ادھر میں اجازت طلب کرتا ہوں۔ اُن کے گھر کو مجھ سمیت کم ہی مردوں کے قدموں نے چھوا۔ ایک روز میں نے اُن سے فرمائش کی کہ میں ایک معروف انگریزی رسالے کے لیے ان کا خاکہ لکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے آموگی ظاہر کی۔ عجب منظر تھا جب ہمارے بے تکلفانہ تعلق کے ریٹھی قالین میں رکی سوال جواب کے پٹ سن کا پیر عریضہ جانے لگا۔ ابھی گفتگو میں تھی کہ گھنٹی بجی، ایک لمبی جھلکتی مچلتی بھر پور پنجابی لڑکی اٹھلاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہی پرانی روایت دہرائی گئی۔ وہ کمرے میں بے چینی سے واپس ہوئے تو میں نے اُن سے درخواست کی کہ اُن کی ذات کے حوالے سے گفتگو یک زبانی رہی ہے، کیا ہے اچھا ہوا اگر اس میں اُن کی ماؤں کے خیالات بھی شامل کر لیے جائیں تاکہ یہ زیادہ rich (مفخوم) ہو جائے۔ یہ سن کر انھوں نے غور سے میری طرف دیکھا، بڑا سا منہ بنایا اور بولے۔ ”پورا اظہار دوسری بعد میں کریں گے“ اور باہر کی جانب میرے آگے چل دیے۔

شریف خاندانی خواتین کے سامنے وہ انتہائی شرمیلے اور شریف انسان ہیں، ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں۔ خواہ وہ آرٹسٹ ہوں، گھریلو خواتین یا عام آرٹ کی شائق عورتیں، ان سے بات کرتے وقت ان کی زبان میں لکنت آجاتی ہے۔

ایک سہ پہر میں بلا اطلاع ملنے گیا تو انھوں نے گفتگو سے باز رہا اور مجھے سامنے پا کر مروتا اندر نکال دیا۔ مزے میں تھے۔ اُن کی ایک ماڈل ملاقات کے لیے آ رہی تھی۔ اُس روز اُبتِ نشاط، حُبوبِ بحالی، محبتِ مہیزی (ملتی نام دیا گرا) کے استعمال پر پرمغز گفتگو

کرتے رہے کہ اسے استعمال کر لے گا بہترین طریقہ کیا ہے اور یہ کس خوراک کے ساتھ سب سے زیادہ فعال ہوتی ہے۔  
 اگلی صبح اُن کا فون آگیا۔ بتانے لگے کہ وہ شب اُن کی کرب انگیز رات تھی۔ وہ شام بھر دو انگل کر بیٹھے، انتظار کرتے رہے اور اُن کی 'ماؤل' نے دعا کی۔ نہ صرف ملاقات کے لیے نہ آئی بلکہ موبائل بھی بند کر دیا۔ اس کے بعد بتایا کہ اگر تو ناکی کی بحالی کی اس کرشماتی دوا کا مذکورہ استعمال نہ ہو پائے تو بعد کا رقت مایوسی اور ڈپریشن میں گزرتا ہے۔

وہ بہت سی ایسی خواتین کا سہارا بنے ہیں جن سے ان کے قطعی افلاطونی تعلقات تھے، ایسے ان چھوٹے تعلق میں انھوں نے خواتین کے گھریلو اخراجات کا ذمہ اٹھایا۔ ایک ایسی ہی شایستہ پڑھی لکھی بیوہ سے اُن کا رابطہ ہوا تو اس کے گھریلو اخراجات اور بچوں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کیے۔ جب بھی اُس خاتون سے ملاقات ہوئی، نظریں جھکا کر ادب سے بات کی۔ آج اُس عورت کے بیٹے باعزت ملازمین کر رہے ہیں۔ تصدیق اور اس خاتون کے معاشی تعلق کی کبھی کسی کو بھٹک تک نہ پڑی۔

ایک بینک جس کے اکاؤنٹ میں یہ پیسے جمع کراتے تھے، کی خوش اخلاق اسسٹنٹ منیجر انھیں نام وراثت ہونے کے ناتے بہت عزت دیتی تھی۔ یہ بھی اندھا اعتماد کرتے ہوئے اُسے پیسے تمہا کر سید لے آتے تھے۔ کبھی پیسے کا جوڑ توڑ کرنا آیا نہیں چناں چہ بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ خاتون بینکاران کی رقم میں وسیع خورد و کا باعث بنی۔ ان کی جمع پونجی کی ایک کثیر رقم وہ عورت لے لڑی۔ ان کو اس بات کا عرصے تک رنج رہا۔

خواتین سے ایسے ناخوش کو اور واقعات کے باوجود میں نے انھیں عورتوں کے خلاف کبھی کڑواہوتے نہیں دیکھا۔

اس مصور کی زندگی میں عورت سے بڑھ کر ایک اور عشق ہے، مصوری۔ لیکن اس سے پہلے کچھ تذکرہ ادب اور ادیبوں کا۔

تصدیق صاحب 1955ء سے فروری 1961ء تک کراچی میں رہے۔ اس دوران کی ادبی سرگرمیوں میں خاصے فعال رہے۔ انھی دنوں انھوں نے "فسانہ" "باشلیا" لکھا جو بعد کو احمد ندیم قاسمی صاحب کے مستند ادبی رسالے "فنون" میں چھپا۔ دیوندر ستیا رتھی کی زردنویسی کے حوالے سے سناتے ہیں کہ اُس کی عادت تھی، دوستوں کے حلقے میں گپ شپ چل رہی ہوتی اور ایک کان ادھر لگائے اُس کا قلم کاغذ پر دوڑ رہا ہوتا۔ احباب بے جواز مباحث میں الجھ جاتے تو وہ 'ٹھکرا' ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور یک سوئی سے لکھنے لگتا۔ سب خپل کرتے کہ بک بک لکھ رہا ہے۔ مگر جب اٹھتا تو مناسب معیار کے دس بارہ صفحات لکھ چکا ہوتا۔ وہ ایک رات میں بیٹھ کر طویل افسانہ مکمل کر لیتا۔

اپنی ادبی تربیت کا تمام تر سہرا اپنے استاد حسن عسکری صاحب کے سر باندھتے ہیں اور اُن کی ہلا کی یادداشت اور ذہانت سے آج بھی متاثر و مرعوب ہیں۔

"وہ صفحات کے صفحات کمپیوٹر کی طرح سکین کر جاتے تھے۔ بہت بڑے آدمی تھے۔ بعد میں ایسا قد آدمی نہ دیکھا۔ ایک مرتبہ میں نے اُن کے سامنے ڈراما کیا۔ میں چند روز سے ہال ذاک کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اُس روز کلاس سے نکلنے ہوئے میں نے تصدا وہ صفحات اُن کے سامنے گرا دیے۔ انھوں نے دل چسپی سے پوچھا کہ ان صفحات میں کیا ہے۔ میں نے سادگی سے کہہ دیا 'بس کچھ فضول سی باتیں ہیں۔' انھوں نے صفحات دیکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے صفحات اُن کے سامنے رکھ دیے۔ وہ میرے روال ترجمے سے خاصے متاثر نظر آئے لگے۔ میں نے سوچا کہ خوب ستائش ہوگی۔ میری ترجمہ شدہ تحریر پڑھ کر انھوں نے میری جانب غور سے دیکھا اور بولے 'خوب ترجمہ کیا ہے۔ یہ سن کر میں خوش ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد بولے 'کبھی ترجمے میں مت پڑو۔ اتنی محنت اپنی تحریر پر کرو۔ جو لکھو، دورِ حمل لکھو، وہ کم بولتے تھے۔ جو بھی بولتے اُس میں دانش ہوتی اور وزن ہوتا تھا۔ چناں چہ اُس روز کے بعد میں نے کبھی ترجمہ نہیں کیا۔

برطانیہ میں ان کے دو قریب ترین دوست شاعر ساقی فاروقی اور نابغہ روزگار ناول نگار عبداللہ حسین تھے۔ ساقی فاروقی جلد ہی ایک برطانوی خاتون سے شادی کر کے گھر بسا بیٹھے اور بہ قول تصدیق صاحب کے "اپنے ٹیلنٹ کا بیڑا غرق کر لیا۔" البتہ عبداللہ حسین سے ان کی



بہت بھی۔ ان کی علیت، شخصی وقار، مطالعے، قدرت تحریر اور نظر کی گہرائی کے بہت معترف نظر آئے۔ ”مہدائے حسین اپنی سادہ کن شخصیت اور خوب صورت گفتگو کے باعث خوانین میں خاصا مقبول اور کامیاب تھا۔ ساقی ناروتی مہا لکڑیادہ کرتا ہے۔“

اپنے ایک دوست کا دل چسپ اور سبق آموز قصہ سنانے لگے۔ اس دوست کی خواہش ایک عظیم ناول لکھنے کی تھی۔ ایسے بڑے کام کے لیے وہ ساری جوانی معاشی آسودگی اور مناسب وقت کی تنگ و دو میں لگا رہا۔ خوش حال ہو گیا اور اس نے اپنا ناول لکھنے کے لیے خاصا وقت پس انداز کر لیا تو ایک قلیٹ کرائے پر لیا، اس میں کئی ماہ کی خوراک ذخیرہ کی اور ناول لکھنے بیٹھ گیا۔ چند روز بعد اس بدبودار قلیٹ کا دروازہ کھلا گیا تو اندر سے اس کی کئی روز پرانی لاش ملی۔ اس کی موت برین ہیمرج سے ہوئی تھی۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ برسوں سے اکٹھا ہوتا قلیتی دباؤ برداشت نہ کر پایا اور مشق سخن نہ ہونے کے باعث تسلی بخش تخلیقی کام اس انداز سے نہ کر پایا جس کا اس نے خواب دیکھا تھا چنانچہ مدد سے اس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ ”وہ وٹانوتان اپنے ناول کے حصے زبان ہی بھجے بنایا کرتا تھا۔ اس کے خیالات واقعی سادہ کن تھے۔ آج اس کا عظیم ناول اس کی لاش کے ساتھ کسی گم نام قبر میں دفن ہے۔“ کچھ توقف کیا اور بات جاری کی۔ ”کسی بھی کام کو شروع کرنے کا بہترین دن آج کا دن اور بہترین وقت ابھی ہوتا ہے۔ کسی مناسب وقت اور موقع کی کوشش اور انتظار ملا جھیتوں کو زندگی کی طرح کھا جاتا ہے۔ اس لیے بھلے چھوٹے اور چھوڑے کام سے شروع کرو مگر آج اور ابھی کرو۔ اس سے مشق بھی ہوتی ہے اور تخلیق میں نکھار بھی آ جاتا ہے۔“

ان کا ایک افسانوی مجموعہ ”تہال کا سفر“ کے عنوان سے منظر عام پر آچکا ہے جس کا انتساب ”ان تمام حسین عورتوں کے نام ہے جنہوں نے زندگی کے دشوار سفر کو طے کرنے میں ان کا ساتھ دیا۔ ان کی یادیں میری تصویروں کے شوخ اور دلکش رنگوں میں بیٹھ چک رگاتی رہیں گی۔“ اس کتاب میں انھوں نے لکھا کہ تمام کہانیاں لندن کے حقیقی واقعات پر مبنی ہیں۔ فقط دو میں ترمیم کی گئی ہے۔ جب میں نے اس بات کی حقیقت پوچھی تو اس بیان کی بڑ زورتائیدی اور بتایا کہ اس کے علاوہ اور بھی واقعات ہیں جو فکشن سے زیادہ دل چسپ اور حیران کن ہیں۔ ان افسانوں کی خوبی ان کا قلمی کمال نہیں بلکہ حقیقی اچھوتے اور دل چسپ واقعات کا سادہ اسلوب میں بیان ہے۔ ان کے ایک افسانے کا انگریزی ترجمہ جدید اور ثقہ مترجم محمد عمر میمن نے بھی کیا جو بعد ازاں پاکستانی افسانوں کے ایک انتخاب میں شائع ہوا۔ ”تہال کا سفر“ کی ترکیب شاید اتنی قرین حقیقت نہیں کیوں کہ بے شمار فنی ہائے زندگی اس طولانی سفر میں شریک نہ رہے۔

تھاق صاحب کی حیران کن نثری تخلیق ان کی خود نوشت سوانح ہے جس کا عنوان غالب کے مصرع ”یکھے ہیں نہ رُخوں کے لیے ہم مصوری“ سے ”نہ رُخوں کے لیے“ لیا گیا ہے۔ یہ سوانح عمری ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے محبت، مذہب، ثقافت، نفسیات، معاشرت، اعتراضات، معاصرین اور مصوری کے حوالے سے انوکھے، غیر روایتی لیکن انتہائی دل چسپ واقعات اور بے راگ تبصرے اسے ایک روایت پرست اور بے چلک معاشرے میں شائع ہونے سے روکتے ہیں۔ تھاق سہیل ایک بے ضرر آدمی ہے۔ اپنی حقیقت اور خیالات معصومانہ سچائی سے اس کا رانہ معاشرے میں بیان کرنا چاہتا ہے۔

مختلف گفتگو اور بعض اوقات ہلکی پھلکی کپ شپ کرنے والا مصور بے وجہ معروف و کامیاب فن کار نہیں۔ اس کا فلسفہ، تھیالوجی، ادب، مصوری اور فنون لطیفہ پر نہ صرف گہرا مطالعہ ہے بلکہ ہر موضوع پر اپنی مخصوص خالص رائے بھی ہے۔ چون کہ اس کے دن کا بیش تر حصہ مصوری اور غور و فکر میں گزرتا ہے چنانچہ اپنی روزمرہ کی سنجیدگی کے بھاری لحاف سے چہرہ نکال کر تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے چٹکوں اور خوش گوار گفتگو سے غافلین کو کم اور اپنے آپ کو شاید زیادہ پہلاتا ہے۔ چند لمحے اپنے خول سے باہر گزرا کر وہ پس منٹ جاتا ہے۔

اور خوش گوار گفتگو سے غافلین کو کم اور اپنے آپ کو شاید زیادہ پہلاتا ہے۔ چند لمحے اپنے خول سے باہر گزرا کر وہ پس منٹ جاتا ہے۔

”مجھے افسانے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ میری تمام تصاویر میں کوئی کہانی ہوتی ہے جو مختلف زاویوں سے دیکھیں تو رنگ بدلتی ہے۔“ انھوں نے مجھے سمجھایا۔

تھاق کیوں کوئی خانوں میں تقسیم کر کے چھوٹے چھوٹے بلاکوں میں مختلف تصویریں پیش کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ان کا آپس میں



کوئی ربط نہیں ہوتا۔ یہ تصاویر سب سے زیادہ اہم مانی جاتی ہیں اور مہنگی فروخت ہوتی ہیں۔

ابتدا میں مالی تنگ دستی میں وقت گزارنے والے تصدیق کی پیشنگز بعد ازاں لندن کے معروف ”بوفو“ اور ”نی“ کے ”شلم“ نامی بین الاقوامی آرکشن ہاؤسز میں لاکھوں روپے میں فروخت ہوئیں۔ کراچی میں ان کی تمام تصویریں ایک نمائش شروع ہونے سے پہلے ہی فروخت ہو گئیں۔ ان کی قیمت چند لاکھ سے شروع ہو کر دسیوں لاکھ تک چلی جاتی ہے۔

”ان تصاویر کو غور سے دیکھنا پڑتا ہے۔ ان کو دیکھنے کے لیے خاص نظر چاہیے بہ ظاہر ان میں شعوری سطح پر ربط نہیں لیکن شعور کی ذریعہ سطح پر یہ باہم منسلک ہیں۔ کہانیوں کی یہ بچی کاری داستان کو مکمل کرتی ہے۔ گویا دیکھنے والا ایک طویل حکایت، ضخیم ناول یا مشورہ کرداروں اور رنگوں کی داستان دیکھ رہا ہے۔ ان میں کرداروں کے ظاہر سے زیادہ ان کا باطن نظر آتا ہے۔“ جس نظر کا تذکرہ صدیق صاحب نے کیا، اُس کا مکمل انجیلو نے صدیوں پہلے کیا تھا جب وہ وفور جذبات میں بول اٹھا تھا۔ ”میں نے سبکدوشی میں فرشتے کو دیکھا سو اس بھڑکے تراشا اور فرشتے کو آزاد کر دیا۔“ پکا سو بھی کیا فطرت کا عجب شہاوت تھا جو پکارا اٹھا تھا۔ ”ہر بچہ فن کار ہوتا ہے۔ مسئلہ اصل بچپن کے بعد اُس کی کارکردگہ رکھنا ہوتا ہے۔“ اُس نے پہلا لفظ ”ہاں“ نہیں بلکہ ہسپانوی ”پڑ“ بولا تھا جس کے معنی ”قلم“ کے ہیں۔ قلندرانہ فن کاروں کی اُس لڑائی کا سرخیل وان گوف تھا جس نے عالم بے خودی میں اپنا کان کاٹ ڈالا تھا اور دس برسوں میں اُس کی ہائی ٹی سو پوٹنگوں اور گیارہ سو سیٹھوں میں سے صرف ایک ”سرخ باغیچہ“ فروخت ہوئی۔ یہ وہی مردوروں میں تھا جسے جب ذہنی شفا خانے سے آزاد کیا گیا اور اُس دور کے عمدہ پھر نفسیات ڈاکٹر گچٹ کے پاس بغرض علاج بھیجا گیا تو اُس نے اپنے بھائی تھیو کو لکھا۔ ”یہ ڈاکٹر تو دماغی طور پر مجھ سے بھی زیادہ بیمار ہے“ لیکن پھر چند روز بعد، بہن کو لکھا ”ڈاکٹر گچٹ میں مجھے بھائیوں سے بڑھ کر دوست مل گیا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔“ یہاں سے ڈاکٹر اور مرلی کی لازوال دوستی کا آغاز ہوا۔ جب شہرت کے دیونے وان گوف کی کٹیا کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ قبر میں اتر چکا تھا۔ وہ تو مر گیا مگر دیانے فن کو لازوال فن پارے دے گیا۔

”میں اپنے تخیل کو آزاد اور بے لگام چھوڑ دیتا ہوں۔ وہ اس کائنات اور ماورائے اس سفر کرتا ہے۔ وہ ان روایات اور نئی روایات سے آزاد ہو جاتا ہے۔ میں تو مولود کی طرح دنیا کو دیکھتا ہوں جیسے یہ تازہ تخلیق ہوئی ہو۔ اس میں حیرت کا سامان ہوتا ہے۔ میں اُس کیفیت میں چلا جاتا ہوں جہاں میں اپنے شعور سے آزاد ہو جاتا ہوں۔ یہ تصویریں اسی تازہ نظری نے میرے تحت اشعور سے تخلیق کروائی ہیں۔ میں انسان، جانوروں اور پرندوں کے اجسام کے اندر دیکھتا ہوں۔ میں بالباس شخص کو بے لباس تصور کرتا ہوں اور اُس کے چہرے کے اندر اتر جاتا ہوں۔ میں خواب کم دیکھتا ہوں مگر جب دیکھتا ہوں تو اُن میں میرے ارد گرد پرندے اور جانور ہوتے ہیں، پریاں ہوتی ہیں، چل پریاں، ایک ترن اور دیگر ماورائی مخلوقات ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ میرے اندر سے نکلتے ہیں، کچھ میرے بیرون پر بکھر جاتے ہیں۔ زیادہ تر، بھی میرے اندر قید ہیں۔ میں انہیں آزاد کرنا چاہتا ہوں۔“

ارسطو نے ایسے نانی الفن فن کاروں کے بارے میں کہا تھا۔ ”فن کار کا مطلع نظر ظاہر کو بیان کرنا نہیں بلکہ باطن کو ظاہر کرنا ہوتا ہے“ ایک روز بہت خوش تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو پیشنگ بنانا چھوڑ کر سامنے اسٹول پر بیٹھ گئے اور بولے۔ ”میں نے ایک خبر پڑھی تھی کہ سائنس دانوں نے ایک مصنوعی سیارہ خلا میں بھیجا تھا۔ وہ تیس سال کا سفر طے کر کے بھٹک کر ایک کہکشاں میں پہنچ گیا ہے اور وہاں کی سیارے پر اتر گیا ہے۔ میں اس خبر کے بارے میں سوچتا رہا۔ رات خواب میں، میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں اُس مصنوعی سیارے پر سوار ہوں اور ایک سیارے پر اتر گیا ہوں۔ وہاں زندگی موجود تھی اور عجیب و غریب مخلوقات، سیرا کرتی تھیں، حیران کن ماحول تھا اور وہ کچھ تھا جو بیان نہیں کیا جاسکتا، فقط پینٹ کیا جاسکتا ہے۔“

”آپ کے ذہن کی اڑان اب سیاروں تک پہنچے گی ہے۔“ میں نے سکر اتے ہوئے کہا۔

کہنے لگے۔ "میں تو ذہنی طور پر اس خوب صورت دور میں رہتا ہوں جب انسان نے اس شان و درز میں کو پا بل نہ کیا تھا۔ یہاں جمعے جنگل، کنوارے چشمے، معدوم ہو چکے مکمل بھول اور مخلوقات اور تازگی تھی۔"

تقدیرق صاحب کا اشارہ اس دور کی جانب تھا جب سب چہرہ پر نڈا آدھ تھے، انسان بھی آزاد تھے۔ ابھی موافق استدلال ہوا ہے اور اشیاء کا اپنی خول سر پر چڑھایا نہ تھا۔ دوسروں کی خواہشات کا قیدی نہ تھا۔ آزاد تھا اسی لیے زندہ تھا۔ ابھی انسان کی موت واقع نہ ہوئی تھی۔

ان کی پیشنگذ میں قمر مزی مچھلیں، نیلی ڈوموں والے ہنز تو تے، سفید نہناتے گھوڑے، طلائی مور، رو پہلی دکتے ماورائی پرندے، بڑی چھاتیوں اور بھرے کولھوں والی برہنہ عورتیں اور واڑھیوں والے مرد ہیں۔

"یہ واڑھی والے مرد کیوں ہیں؟" ایک مرتبہ میں نے پوچھا۔ یہ سن کر گہری سوچ میں گم ہو گئے اور آنکھیں نیم موند لیں۔ سادگی سے بڑبڑائے "یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔"

"کہیں معاشرے میں مذہبی انتہا پسندی کی علامت تو نہیں؟" میں نے ایک اشارہ دیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ یہ تو میں لندن میں بھی بنا تھا۔" انھوں نے صاف گوئی سے وضاحت کی۔

"آپ بھی سوچیے، بھلا میں واڑھیوں والے مرد میں کیوں بنا ہوں؟" انھوں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

تھوڑی دیر میں ایک خیال میرے ذہن میں کوندا اور میں چٹکی بجا کر بولا۔ "آپ یقیناً واڑھیوں والے مرد اس لیے بناتے ہیں کہ ہر شے کو اس کی اصل حالت میں پینٹ کرتے ہیں۔ مرد شروع سے واڑھی میں ہے۔ شیو تو سکند برا عظیم کی ایجاد ہے۔ اصل مرد تو واڑھی والا مرد ہے۔"

یہ سن کر تقدیرق صاحب نے آنکھیں کھولیں اور مخصوص انداز میں تہہ نگا کر بولے۔ "واہو، آپ میرا ذہن کتنا سمجھتے ہیں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ آئندہ کسی کو اس کا یہی مطلب بتائیے گا۔ میں بھی یہی بتاؤں گا۔"

یقیناً سادہ دل مصور کے تحت اشتور میں بھی خیال کا رفر تھا جس کی وہ تفہیم نہ کر پاتا تھا۔

بین الاقوامی مصوروں میں انھیں پکاسو نے بہت متاثر کیا جسے "غیر معمولی جھنڈیں" سمجھتے ہیں۔ "وہ ایک رائن کو سیر پر لے جاتا تھا۔ اتنا اطمینان قابل یقین ہے۔" اسی طرح دان گونف کو استادوں کا استاد تصور کرتے ہیں۔ میری ذاتی رائے میں ان کے فن پر شگال کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ شگال تھا جو جدید مصوری کا سرخیل ٹھہرا اور اس کے بارے میں پکاسو بول اٹھا۔ "مٹکسی کی موت کے بعد شگال واحد مصور رہ جائے گا جو رنگوں کی زبان سمجھتا ہے۔" شگال رنگوں سے شرعی کرتا تھا اور رنگ اس سے محبت۔

پاکستانی مصوروں میں انھیں استاد اللہ بخش بہت پسند ہے۔ اسے کلاسیکل انداز کا ایسا مصور سمجھتے ہیں جسے اپنے فن پر بھرپور قدرت حاصل تھی۔ ایسا مولکا کے فن پاروں کے بارے میں ان کا خیال ہے۔ "اپنے تخیل کو اپنے والے نیوڈز گویا ابھی جاگ اٹھیں، آپ کا جی انھیں جھنڈوں دیکھ کر بھی نہ بھرے، صرف ایسا مولکا ہی بنا سکتی تھی۔" کولن ڈیوڈ سے بھی خاصے متاثر ہیں۔ امرتا شیرگل کو پیدائشی مصورہ مانتے ہیں۔ صادقین کو ایک شان دار مصور سمجھتے ہیں۔ "کام کی کثرت اور سیاہ رنگ کے غیر ضروری استعمال نے اس کا معیار گہرا دیا۔ مجھے اس کی نظم قائم اور مستان میں موعے زیر ناف خاصی مختلف لگی۔"

میں نے ایک معاصر معروف مصور کا نام لیا۔ نام سن کر ان کی آنکھوں میں شائستگی کی چمک آگئی مگر ناکام اداکاری کرتے ہوئے

منہ پایا۔

"یہ کون ہے؟ میں نہیں جانتا۔ پہلی مرتبہ نام سنا ہے۔"

معاصرین کے تذکرے پر سادگی سے سر ہلادیا۔ ”ان کے مقام کا فیصلہ ان کی موت کرے گی۔“

معاصر فن کار اور ناقد ان کے فن کے معترف ہیں۔ قدوس مرزا نے ان کے ہاں جادو، اساطیر اور تاریخ کے علم کو سراہا ہے مہر افروز کا بیان ہے ”ان کے ہاں ایک مکمل دنیا آباد ہے۔ وہ ایسی روانی سے پینٹنگ تخلیق کرتے ہیں جو کوئی استاد ہی کر سکتا ہے۔ ان کا عالمیاتی تخیل آزاد، اسٹروکس پر اعتماد اور انداز جداگانہ ہے۔ ان کے ہاں ہر رنگ موجود بھی ہے اور اپنی علیحدہ شناخت بھی کر داتا ہے۔ چوں کہ وہ معاشرتی روایات کے اسیر نہیں چٹاں چٹان کے فن میں آزادی کے خوش شمار کیے ہیں۔“ آرا ایم فیم کہتے ہیں ”بے ساختگی، ہماری معاشرتی شکل اور مخصوص انوکھا پن کیونٹس سے اہل پڑتا ہے۔ ان کی تصویر دیکھنا، ایک خوب صورت کتاب پڑھنا ہے۔“

ان کے ناقدین ان کی تصویروں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ دماغ کو نہیں بلکہ صرف دل اور نظر کو متاثر کرتی ہیں۔ وہ ان کی باتاقدہ نصیابی و گری نہ ہونے پر بھی معترض ہوتے ہیں۔

”سینٹ مارٹن اسکول آف آرٹ میں میں نے دہائیاں شام کی کلاسوں میں گزاریں۔ وہ شام کے طلبہ کو ڈگری نہیں دیتے لیکن ان کی موجودی کا رد رکھتے ہیں جو میرا بھی موجود ہے۔ ویسے استاد اللہ بخش، صادقین اور دیگر بڑے مصوروں کے پاس کون سی ڈگریاں تھیں۔ جہاں تک دماغ کو متاثر نہ کرنے کی بات ہے اور دل و نظر پر اثر کرنے کا تعلق ہے تو اس سے عمدہ فن پارہ اور کیا ہو سکتا ہے۔“ انھوں نے اطمینان سے مسکرا کر اعتراض ہی میں جواب تلاش کر لیا۔

تصدق صاحب کی تصویریں لاکھوں روپوں میں بکتی ہیں۔ قلندرانہ مزاج ہے، چٹاں چٹائیوں کی محنت سے تیار کی گئی تصاویر دوستوں کو تحفہ بھی دے دیتے ہیں۔ مجھے اپنی چند ایک تصاویر وقتاً فوقتاً تحفہ تصادمیں، کہنے لگے۔ ”میں آپ کے پاس اپنی پینٹنگز کا مکمل سیٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ایسا سخی مزاج، دوست نواز شخص ایک نایاب اور بیش بہا معدوم ہوتی بامرؤت نسل کا نمائندہ ہے۔ ایک تجربے سے تو میں بارہا گزرا ہوں۔ ان کے اسٹوڈیو میں کوئی بہت متاثر کن تصویر دھری ہے۔ میں تعریف کرتا ہوں تو کہتے ہیں۔ ”ابھی اس پر کام ہوتا باقی ہے۔“ جب میں کچھ عرصے بعد دوبارہ جاتا ہوں تو تصویر ویسی ہی رکھی ہے، غور سے دیکھنے پر کسی جانب ایک معمولی اسٹروک کا اضافہ نظر آتا ہے۔ جب میں اس کے بارے میں پوچھتا ہوں تو غیر مطمئن انداز میں سر ہلادیتے ہیں۔ ”ہاں تصویر کچھ متوازن تو ہو گئی ہے مگر اب بھی اس پر کام ہونا باقی ہے۔“ وہ اپنی کسی تصویر سے مطمئن نہیں ہوتے۔ ایسے ہی نقاشوں کے بارے میں پال ویلری نے کہا تھا۔ ”ایک سچا فن کار کبھی اپنا کام مکمل نہیں کرتا، فقط اسے بیچ میں چھوڑ دیتا ہے۔“

ایک مرتبہ میں ان کو ملنے گیا تو ایک بڑی پینٹنگ اختتامی مراحل میں تھی۔ اس میں دیگر مناظر کے علاوہ وسط میں ایک لڑکی کی پشت بنی تھی جس پر ایک بزرگ بٹھا تھا۔ مجھے بتانے لگے کہ ایک بڑا صنعت کار ان کو ایک موٹی رقم پیشگی دے گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ اس کے لاؤنج کے لیے تصویر بنائیں۔

”مجھے ایک تیر سے دو نشانے لگانے کا خیال آیا۔ ایک تو اچھا معاوضہ مل گیا اور دوسرے اس لڑکی کی پشت پر بزرگ بٹھا کر میں نے نقش فریادی \* کو پیغام دیا ہے کہ کبوتر کے علاوہ کوئی اور پرندہ بھی بنایا جاسکتا ہے اور اسے کندھے کے علاوہ جسم کے دیگر حصوں پر بھی بٹھایا جاسکتا ہے۔“ جب وہ تہہ لگا کر مجھے اپنی واردات سنارہے تھے تو میں چشم تصور میں پینٹنگ وصول کرتے وقت اس صنعت کار کا تصویر دیکھ کر دھچکے سے غم گین ہوتا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔

جب پہلی مرتبہ مجھے تحفہ ایک تصویر دینے کی نوید سنائی تو اشتیاق مجھ پر حاوی ہو گیا۔ آخر ملاقات کا وقت ہوا، انھوں نے آہستہ آہستہ کیونٹس پلٹا تو سامنے ایک حیدر کی پڑکار پشت تمام جزئیات کے ساتھ موجود تھی۔ جب میرے اترتے چہرے کو دیکھا تو فخر سے بولے۔ ”یہ

نقش فریادی۔ فرض نام

بہت سنی سالوں سے میرے خیالوں میں آرہی تھی۔ میں اب بتانے میں کامیاب ہوا ہوں۔ آپ کے ڈرائنگ روم میں خوب ہے۔  
ایک مرتبہ ایک شاعر نے انھیں اپنے شعری مجموعے میں دو نیم (دو گلوں میں ہٹا سورج) کا سرورق بتانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے شرارتا ہائی بھری۔ جب اُن شاعر کو تصویر پیش کی تو اُس نے اشتیاق سے اسے دیکھا، سامنے دو نیم کے درختوں کے بیچ سورج دکھا دیا۔ یہ دیکھ کر وہ باقاعدہ ناراض ہو گیا۔ یہ واقعہ تعذر صاحب مجھے کئی مرتبہ بتاتے ہوئے سنا چکے ہیں۔

ایک روز اعتراف کے موڈ میں تھے تو بتانے لگے کہ انھیں زندگی میں دو چیزوں نے بہت پریشان کیا۔ ایک تو لاہور کی اس بازاری عورت کے ساتھ تلخ تجربے نے انھیں بدلتوں غیر فعال رکھا۔

دوسرے یہ نوجوانی میں گنجے ہو گئے تھے۔ اس گنجے پن نے انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ ان کی نوجوانی کا خاصا عرصہ یہ احساس کھا گیا۔

”میں نے زندگی کی ابتدا میں چند فیصلے کر لیے تھے جن پر آج بھی قائم ہوں۔ ایک تو یہ فیصلہ کہ کبھی باقاعدہ فنل ٹائم نوکری نہیں کرنی بیٹل اس کے لیے چھوٹے موٹے کام کرنے پڑیں۔ اس خود عہدی کو پورا کرنے کے لیے یلز مین سے لے کر شیف تک رہا مگر اپنی زندگی کو زیادہ وقت دیا، دوسروں کی زندگی کو نہیں۔ دوسرے کسی کام کو حقیر نہیں جانتا چنانچہ ہر پیشے کی دل سے عزت کرتا ہوں۔“

ایک سہ پہر خوش مزاجی سے گفتگو کر رہے تھے تو میں نے پوچھ ہی ڈالا کہ لاہور میں ابتدائی زندگی گزارنے کے باوجود انھوں نے کراچی میں مستقل سکونت کیوں اختیار کی۔

یہ سوال سن کر دیکھی لہجے میں بولے۔ ”آج کالا ہو رہا شہر نہیں جسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میرا پہلے والا شہر لاہور کشادہ نظر اور تخلیقی طور پر بڑے بلکہ عظیم لوگوں کا شہر تھا۔ میری غیر موجودگی میں وہ شہر پھیلاؤ میں تو بڑھ گیا ہے مگر سورج میں سمٹ گیا ہے۔ وہ بھی، قصباتی تنگ نظری جب سے ہجرت کر کے اس میں آباد ہوئی ہے، وہ ایک عام شہر ہو گیا ہے۔ وہیں شاہراہوں کے میوزیم کو جلا دیا گیا، کولن ڈیوڈ کے گھر پر حملہ کیا گیا، شیر علی دادا کے آرٹ ہاؤس میں توڑ پھوڑ کی گئی اور صادقین کی انگلیاں توڑ دی گئیں جس کے بعد اُس نے ننوڈ (برہنہ جسم) بنانا چھوڑ دیے۔ اس دور میں جب وہاں انارکلی میں گیلریس پہن کر نکلتا ہوں تو لوگ مذاق اڑاتے ہیں یہ بابا لندن میں چارون گزار آیا ہے تو کاٹھا انگریز بننے کی کوشش کر رہا ہے جب کہ یہاں کراچی میں سو خطرات سہی، میں اپنی مرضی کی زندگی تو گزار سکتا ہوں۔ میں نے تو اپنی زیادہ زندگی لندن جیسے شہر میں گزاری ہے جہاں اگر آکسفورڈ اسٹریٹ پر بے لباس لڑکی بھاگتی چلی جا رہی ہو تو کوئی اُسے گھورتا تو کچا، مزکرہ دیکھتا بھی نہیں۔ ہر کسی کو اپنی زندگی سے غرض ہے، دوسروں کی ذاتی زندگی میں دل چسپی نہیں۔“

ایک ملاقات میں فکیل عادل زادہ صاحب کو دیکھ کر کھیل اٹھے اور خوب دِل کھول کر باتیں کیں۔ فکیل صاحب نے ان کی اس طویل عمر میں تازگی برقرار رہنے کے حوالے سے پوچھا تو بتایا۔

”میں جوان لوگوں میں رہتا ہوں اس لیے جوان ہوں۔ انسان کی طبعی عمر سو برس ہے۔ اگر کوئی اس سے پہلے طبعی موت مر جائے تو میں اسے بے وقوف سمجھتا ہوں۔ ہاں حادثات اور بیماریاں انسان کے اختیار میں نہیں۔ میرا ایک عزیز اسپتال میں داخل ہوا۔ ڈاکٹروں نے اس کا آپریشن کیا اور اس کے چلنے پھرنے پر سختی سے پابندی لگا دی۔ وہ ظالم تازہ ٹاکوں کے ساتھ آنکھ بچا کر کشتے میں بیٹھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ رستے میں سڑک ٹوٹی پھوٹی اور زیر تعمیر تھی چنانچہ جھکے ٹکنے سے اس کے زخم کھل گئے اور وہ باہر گر گیا۔ وہیں اس کی موت واقع ہو گئی۔ میں اُس کے جنازے میں شریک نہ ہوا۔ جب شکوہ کیا گیا تو میں نے صاف کہہ دیا میں کسی بے وقوف کے جنازے میں شریک نہیں ہوا کرتا۔ میں ۸۷ برس کا ہوں، لوگ سمجھتے ہیں کہ میں جلد مر جاؤں گا اسی لیے دھڑا دھڑ میری تصویریں خریدتے ہیں تاکہ بعد میں انھیں مہنگے داموں فروخت کر دیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“



جب ہماری آدھ گھنٹے کی طے شدہ نشست تین گھنٹے میں تشہ چھوڑ کر میں اور کلکیل صاحب باہر سڑک پر نکلے تو وہ بولے۔ ”میں نے اتنا جوان بڑھا آج تک نہیں دیکھا۔ ان کی تو ہر بات و کارڈ کر کے محفوظ کرنے والی ہے۔ یہ تو کھرے آدمی ہیں، سچے ہیں۔ یہ سچ کہہ رہے تھے، ابھی واقعی ان کا مرے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا۔“

ایک ملاقات میں ان تبدیلیوں کا تذکرہ ہوا جو ان کے بعد پاکستان میں وقوع پذیر ہوئیں تو مثبت رخ کا حوالہ دے کر کہنے لگے کہ اب عورتیں زیادہ آزاد اور معاشی طور پر خود کفیل ہیں۔ پہلے صرف کرپشن اور اینگلو انڈین لڑکیاں ملازمتیں کرتی تھیں جب کہ اب عام گھروں کی لڑکیاں بھی معاشی طور پر اپنے پیروں پر کھڑی ہیں اور پہلے کی نسبت ذہنی طور پر بھی خاصی ترقی کر گئی ہیں۔

منفی حوالے سے بتانے لگے کہ پہلے کراچی ایک صاف ستھرا شہر تھا۔ یہاں ہر قومیت اور مذہب کا شخص اطمینان سے زندگی بسر کرتا تھا۔ آج کے کراچی میں عمارتیں بے شکلی اور جمالیاتی حسن سے محروم، سڑکیں گندگی اور کھرے سے لب ریز، زندگی قطعی غیر محفوظ، فرانسیسپورٹ ٹوٹی پھوٹی اور بے قاعدہ، لوگ غیر مہذب ہو چکے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اس تمام تنزل کے باوجود وہ واپس پاکستان کیوں لوٹے تو خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد گلوگیر لہجے میں بولے۔ ”پرندے پورا دن سیر کر کے شام کو اپنے گونسلوں ہی کو لوندتے ہیں۔ میرے پاس آخر میں سوائے گھر واپس آنے کے کوئی اور رستہ نہ تھا اور نہ ہی ہو سکتا تھا۔ پورا دن آوارہ گردی کر کے آخر میں تو انسان کو گھر ہی واپس آنا ہوتا ہے۔“

ان کے گھر واپسی کے بعد کے حالات کچھ آسان نہیں رہے۔

ان کے ساتھ کچھ ایسے حادثات بیت چکے ہیں جنہوں نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ چوں کہ تنہا رہتے ہیں، کھانے کے لیے ہونٹوں کو فون پر آرڈر کرویتے ہیں، چند مرتبہ سفاک مجرموں نے فن کار کے ساتھ ظلم کی انتہا کر دی۔ سادہ منٹھ مصوٰر ابتدا میں اپنی رقم بستر کے نیچے اور الماریوں میں رکھتا تھا۔ کسی واقعہ حال نے مجرموں کو ان کے ہاں بھیجا، جنہوں نے خریداروں کے روپ میں گھنٹی بجائی اور اندر آن کر سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ان کی تصویروں کا سودا کرانے والے ایک ایجنٹ، نے ان کی غیر موجودگی میں گھر خالی کر دیا۔ ایک روز گھنٹی بجی جتنا مصوٰر نے دروازہ نیم داکیا تو ایک شخص پستول دکھا کر اندر داخل ہوا، ان کو پرے دھکیلا، یہ دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہو گئے اور وہ ڈراتا دھمکتا پیسے لوٹ کر چلنا بنا۔ تنگ آ کر بینک میں رقم جمع کروانا شروع کی تو خاتون بینکار فراڈ کر گئی۔ ایسے حادثات نے ذہنی طور پر انہیں بہت نقصان پہنچایا۔ ”اس ملک میں آدمی کا تنہا رہنا بہت مشکل کام ہے۔“ مجھ سے زخمی لہجے میں حال دل بیان کیا۔

ابھی یہ سانحات اُن پر گزر رہے ہی تھے کہ ایک ایسی آفتا دسر پر آن پڑی جس نے انہیں ناقابلِ خلائی جذباتی صدمے سے دوچار

کیا۔

سناتے ہیں کہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک آرٹ ایجنٹ نے ان سے رابطہ کر کے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ سدا کے فن کار ٹھہرے، سو جہاں دیدہ رابطہ کار کی ضرورت رہی جو آرٹ کے شائقین اور ان کے درمیان ٹیل بین سکے۔ اسے اپنا نمائندہ مقرر کر دیا۔ وہ شخص وقت گزرنے کے ساتھ حاکمانہ طبیعت کا شخص ثابت ہوا جس نے انہیں گویا اپنے چنگل میں پھنسا لیا اور تین برس تک ان سے دن رات ”مزدوری“ کروانا رہا۔ جب ان کو رقم کی ضرورت ہوتی چند ہزار روپے دیتا اور کہہ دیتا کہ بقیہ وہ جمع کر رہا ہے۔

ایک روز یہ اُس کے ساتھ بینک گئے اور اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروا آئے۔ ایک دو روز بعد چیک بک آئی تو وہ ان کے پاس بیٹھا تھا۔ ان کی طبیعت نا ساز تھی۔ نمائندے نے چیک بک وصول کی اور کسی بہانے تعذر صاحب سے رسید پر دست خط لے لیے۔ انہوں نے بھی سادہ لوحی سے دست خط کر دیے۔

چند ماہ بعد ان کو رقم کی ضرورت پڑی تو یہ بغیر چیک بک سا دگی سے چیک چلے گئے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ ان کا اکاؤنٹ خالی ہے۔

وہ شخص ان کے دست چلا کر کے رقم لے جا چکا تھا۔

اسی شام اتفاقاً میں نے فون کیا تو انھوں نے یہ پتہ سنائی۔ میں فوراً ان کے ہاں پہنچا تو نلیٹ میں تھوڑے سا صدمہ ہوا مگر آٹھنوں کے بچہ غم کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ میں نے دل جوئی کی اپنی سی کوشش کر ڈالی۔ میری گفتگو ختم ہوئی تو مصیبت سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ”میری رقم مل جائے گی؟“

”یقیناً“ میں نے بے معزم لہجے میں کہا۔

دہیں بیٹھے ایک اور آرٹسٹ نے انکشاف کیا کہ اُس ایجنٹ کے قبضے میں ان کی ڈیڑھ دو سو تصاویر ہیں جن کی مالیت کروڑوں روپے بنتی ہے۔ ان تصاویر میں ان کے کئی سال کی محنت شامل ہے۔

یہ انکشاف چونکا دینے والا تھا۔

”اب جب کوئی ثالث یا حکومتی کارندہ آپ کے پاس آئے تو بھرپور اور بڑا زور انداز میں اصرار کیجیے گا کہ آپ کو رقم فوری چاہیے۔ ایسے معاملات طویل پکڑ جائیں تو برسوں تک چلے جاتے ہیں۔“ میں نے عاجزانہ تاکید کی۔

”چلو، پیسے بے شک رکھ لے، بس میری جان چھوڑ دے۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا کہ اُس نے مجھے یہ غلام بنایا ہوا تھا۔“

تھوڑے صاحب نے سہمے لہجے میں کہا۔

میں نے اپنا سر تمام لیا۔

بار آخر ہم سب کی بارہا تسلی کے بعد انھوں نے حوصلہ پکڑا۔ میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑے صاحب آپ بھی بغیر کسی جانچ پڑتال کے لوگوں پر اعتماد کر لیتے ہیں۔“

تھوڑے صاحب نے عادیانہ سر ہل دیا۔

ایک دم مجھے ایک خیال سوچھا۔ ”میں پچھنے دس برس سے آپ کے ہاں نہ صرف آرہا ہوں بلکہ دیگر جگہوں پر بھی ہماری ملاقات رہی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں میں کون ہوں، کہاں رہتا ہوں اور کیا کرتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر مخصوص انداز میں سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔ ”واقعی! آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟“ سب ہنس پڑے۔

سب کو ہنسا دیکھ کر خود بھی ہنس پڑے اور روایتی خوش مزاجی سے بولے۔ ”میرا ایک بہت پرانا دوست تھا۔ انگلینڈ سے کبھی کبھار اہم آتا تو اُس سے ملاقات ہو جاتی۔ اب جو میں مستقل طور پر اُدھر آ گیا تو ملاقاتیں بڑھ گئیں۔ ایک شام میں نے ڈرائیور منگوا لیا اور اُس کے ہنگے پر حسب معمول ملاقات کے لیے چلا گیا۔ وہاں میرے ڈرائیور اور اُس کے چوکی دار کی جھگی کپ شپ ہو گئی۔ میرے ڈرائیور نے کہیں چوکی دار کو کہہ دیا۔ ”میرا صاحب بہت امیر ہے۔ ڈیفنس میں اس کا فلیٹ ہے۔“ اس پر چوکی دار بولا۔ ”تمہارا صاحب ٹھیکہ میرے۔ جہاں اس کا فلیٹ ہے وہاں کے نہ صرف قریباً تمام فلیٹوں بلکہ دس بارہ دکانوں کی ملکیت بھی میرے صاحب کے پاس ہے۔“ وہ اسی پر ڈرائیور نے ساری زور دواؤں مجھے سنا ڈالی۔ چنانچہ کچھ ملاقات پر میں نے دوست سے کہا۔ ”میں نے تو تم سے اتنے برسوں میں کبھی پوچھا ہی نہ تھا کہ تم کیا کرتے ہو۔ یہ تو مجھے اب معلوم ہوا کہ تم اتنے امیر آدمی ہو۔“ میری بات سن کر دوست پریشان ہو گیا اور پوچھا کہ مجھے یہ ساری بات کس بد بخت نے بتائی تو میں نے اپنے ڈرائیور اور اُس کے چوکی دار کا مکالمہ اُسے سنا دیا۔ یہ سن کر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جب میں دوبارہ ملا تو دوست نے بتایا کہ اُس نے اگلے روز ہی چوکی دار کو نوکری سے یہ کہتے ہوئے فرغ کر دیا۔ ”ظالم تو نہ صرف اپنی بے وقوفی سے ہمارے گھر ڈاکا ڈھائے گا، بلکہ ہم دونوں میاں بیوی کو قتل بھی کر دے گا۔“

تصدق صاحب نے چمکتے ہوئے یہ واقعہ سنایا تو سبھی ہنس پڑے۔ ہمیں ہنسا دیکھ کر وہ اپنی ترنگ اور جون میں داپس آگئے اور بولے۔ ”میرا ایک ہنسا کتا جوان واقف کار صحافی اور ناقد مجھے جب بھی ملنے آتا تو کہتا ”کیہ حال اے بزرگو؟“ (کیہ حال ہے بزرگو؟) ہمیں لفظ ”بزرگو“ مجھے بچھو کی طرح ڈنک مارتا اور میں سوچتا کہ کیا میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ان ملاقاتوں کا نفسیاتی طور پر مجھے بہت نقصان پہنچا تھا۔ میں ہر ملاقات کے بعد اپنے آپ کو کئی برس مزید بوڑھا محسوس کرنے لگتا۔

”آج کل وہ کہاں ہوتا ہے اور کیا اب بھی آتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اُن کو گویا کچھ یاد آگیا۔

”ہاں یہی بات تو میں نے بتائی تھی۔ وہ بے وقوف جوانی ہی میں فوت ہو گیا اور میں ”بزرگو“ ابھی تک زندہ ہوں۔“

آخر ہم نے اجازت چاہی۔ سب چلے گئے تو ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے لمبی سانس بھری اور نیم مردہ انداز میں مسکرا دیے۔ میں یہ سوچتا ہوا نکلا کہ یہ رات اس مصور پر بہت بھاری گزری ہوگی جس کی جمع پونجی آج کے دن نقدی اور قیمتی تصویروں کی شکل میں لٹ گئی۔

اُن کے فلیٹ سے اُتر کر میں سامنے ایک شور پر شہنشاہی بونل پینے ٹک گیا۔ دکان میں دکان دار کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ میں نے اس سے سرسری انداز میں پوچھا۔

”سامنے فلیٹ والے صاحب کو آپ جانتے ہیں؟“

وہ بولا ”یہ کئی سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔ سنا ہے، بہت بڑے مصور ہیں۔ بہت سادہ آدمی ہیں، کوئی درویش یا فقیر۔ آدمی رات کو اٹھ کر گوشت اُبال کر اپنے ہاتھوں سے کھڑے کرتے ہیں اور پرندوں، جانوروں کو کھلاتے ہیں۔“

”سنا تو میں نے بھی ہے“ میں نے تائید کی۔

”آپ نے تو سنا ہے۔ میں یہیں قریب رہتا ہوں۔ روزانہ منہ اندھیرے، سویرا ہونے سے پہلے، ایک وقت پر باقاعدگی سے اس سڑک پر سب پرندے اور جانور یہاں آتے ہیں۔“

”سامراؤں یہ بالکونی میں باجرا اور والے ڈالتے رہتے ہیں اور مٹی کے پیالوں میں پانی بھرتے رہتے ہیں۔ چٹاں چر دن بھر کبوتروں، چڑیوں اور دوسرے چھوٹے پرندوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔“

میں نے دکان دار کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے خلوص اور سچائی نظر آئی۔ ”فقیر آدمی ہیں فقیر“ اُس نے دہرایا۔

رات گہری ہو رہی تھی اور ہوا میں اُسی گھل گھل رعبی تھی۔ دکان دار نے بات ختم کی اور میں باہر نکلا تو میری نظر تصدق صاحب کے فلیٹ پر جا پڑی۔

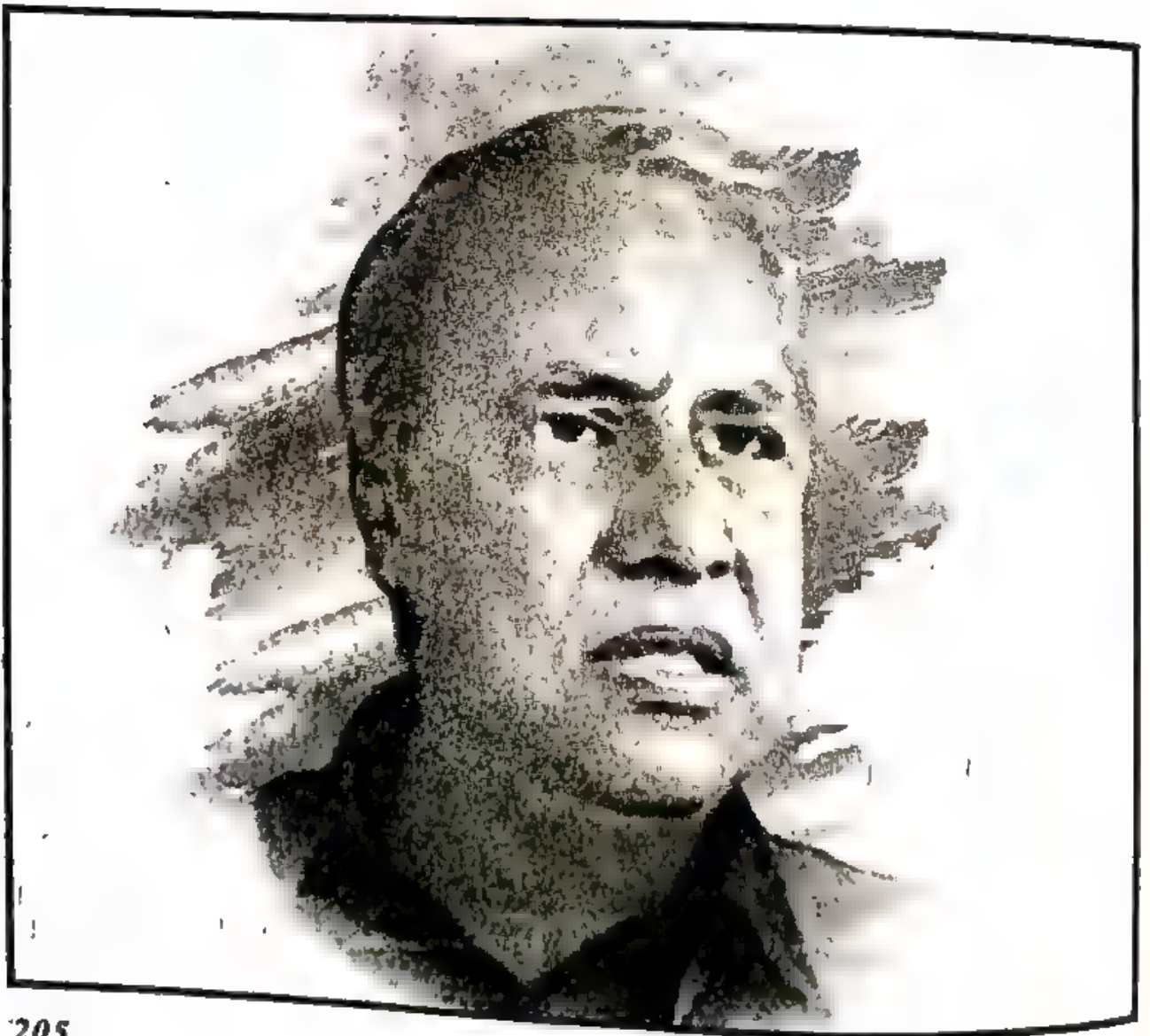
اندرونیکیاں گھل ہو رہی تھیں۔ مجھے اُن کا جملہ یاد آگیا۔

”بالآخر انسان کو گمراہی آتا ہی ہوتا ہے۔“

بوڑھا فن کار ایک اعصاب شکن دن کے بعد یقیناً سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ دوسرے نئے دن تمام تر تازگی اور شادابی سے طوفا ہونے اور نئے نئے خیال و خواب نقش کرنے کے لیے۔

# ٹلا جوگیاں کا مصّلی

نصیر کوئی





شاعر کے انکشاف نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔

کرڈوں لوگ کئی برسوں سے ٹرمان کے جس ٹیلے میں قید تھے، اس اعتراف نے سوئی کی نوک کی طرح اُسے پھوڑ ڈالا۔

شیر شاہ سوری کی تعمیر کردہ گرینڈ ٹریک روڈ (جی ٹی روڈ یا شاہ راہ عظیم یا جرنیلی سڑک) پٹوہار کی بھر پوری اور پتھر لی سرخ پہاڑیوں کے بیچ سے سانپ کی طرح بیل کھاتی، ہندوؤں کی قدیم عبادت گاہوں کے مرکز بننا جو گیاں کے برابر سے گزرتی، سندھ ساگر دو آب کے سرسبز قطعات کو چھو کر برصغیر کے سب سے وسیع اور زرخیز میدانی علاقے پنجاب میں اتر جاتی ہے۔ یہ علاقہ اتصال زیادہ تر بخر اور بے آباد ویرانی ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ کہیں کہیں پانی کے چھوٹے تالاب اور برساتی ندی نالے اپنے اندر نمک اور سرخ مٹی کو ہلاتے گدے لے پانیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

جہلم شہر سے کچھ پہلے سڑک کے دونوں اطراف میں سبز، نیلی اور پیلی ٹرمانی آداس ٹوب لائنوں اور چمک دار ٹانگوں سے مزین بے ڈھنگے شادی گھر ناگ پھنی کے پودوں کی طرح بے ترتیبی سے اُگ آئے ہیں۔ علاقے کے جغرافیائی مزاج سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث یہ عمارتیں تعمیراتی حُسن لطیف سے محروم اور نظروں پر گراں گزرتی ہیں۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر میں نے اپنی گاڑی سڑک سے اتار کر ایک شادی گھر کے سامنے پارکنگ میں جا کھڑی کی۔ چند ملازم چھڑکاؤ کے اینٹوں سے بنے داخلی رستے کی حدت گھنارہ ہے تھے۔

سڑک اور داخلی رستے کے سنگم پر ٹین سے بنا ایک چھوٹا سا نیلے رنگ کا کھوکھا برائے نام اشیائے خورد و نوش سجائے اپنے عارضی وجود کا احساس دلا رہا تھا۔ اُس کھوکھے میں چند چپس، بسکٹ اور ٹینکو کے پکٹ شیشے کے چھوٹے سے شیلف کے پیچھے دھرے تھے اور ایک کونے میں ٹھنڈی بوتلیں فریج میں بھی تھیں۔ کھوکھے کی پیشانی پر ”اللہ رزق دیتا ہے۔“ لکھا تھا۔ اندر ایک لڑکا بیڑی سے بیٹھا زنانے سے گزرتی ٹریفک دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے مخاطب کیا اور شاعر کا پوچھا۔ شاعر سے میری ملاقات ٹیلی فون پر طے ہو چکی تھی۔ لڑکے نے بتایا کہ شاعر اُس کا والد ہے اور تھوڑی ہی دیر پہلے اُٹھ کر شہر کی جانب گیا ہے۔ اُسے ہماری طے شدہ ملاقات کا معلوم تھا۔ چنانچہ اُس نے میری راہ نمائی کرتے ہوئے بتایا کہ میں شہر کے داخلی رستے کے قریب پہنچ کر اُس کے والد کو موبائل پر فون کر لوں۔ وہ خود ہی کسی متعین مقام پر پہنچ جائے گا۔

جب میں شہر کے داخلی رستے پر پہنچا تو غلاط سے بھری ایک نالی کے پار جھنمناکی کھیلوں سے ڈھکی مٹائی کی چھوٹی سی دکان کے سامنے میلے نیلے رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس ایک ادیب خُص جسٹس بھری نظروں سے سڑک کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میری جھمکی جس نے بتایا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی تلاش میں میں اسلام آباد سے آیا تھا۔

وہاں گاڑی روک کر میں نے اُس شخص سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ کھل اٹھا اور آگے بڑھ کر بھرپور معافیت کیا۔ اُس کے انداز سے مترشح تھا کہ یہ بات اُس کے لیے بہت اہم تھی کہ کوئی اُس سے ملنے دُور سے آیا تھا۔ اُس شاعر کے کھوکھے کے سامنے سڑک پار ایک ریسٹوران میں سوپ پیتے ہوئے اُس سرفروش نے اپنی حکایت جنوں سنائی شروع کی۔ یہ حکایت دو یوگلی اُس ریسٹوران کے نیم تارک چمک کرے سے شروع ہو کر کئی ملاقاتوں پر محیط ہوئی۔

اُس سادہ شخص کے حلیے اور کھوکھے کو دیکھ کر ٹرمان بھی نہ کیا جاسکتا تھا کہ اس جسم کے اندر قوی جذبے دیکھتے اور آنکھوں کے پیچھے رومانی خواب چمکتے ہیں۔ اُس کے منہ سے نکلنے والے اشعار مجمع میں آگ لگا دیتے ہیں اور اُسے تنویدی کیفیت میں لے آتے ہیں۔ وہ ایک شعر پڑھتا ہے اور ہزاروں کا مجمع دوسرا شعر یک زبان پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ اُسی پہلی ملاقات کی بات ہے کہ میں نے فرمائش کی کہ وہ اپنی مشہور نظم سنائے۔ میری درخواست سن کر شاعر کی آنکھوں میں چمک سی جھللا گئی، یہ دل گرنگی کا اظہار تھا یا جذبے کی حدت،

یہ وہی شاعر جانتا تھا یا پھر اس لمحے میں ایک اور شخص جانتا تھا۔ غریب شاعر نے اپنی آنکھیں نوٹ لیں، گو ایک لمحہ کو اپنے سامنے تصور کر لیا اور نظم پڑھنی شروع کی۔

تم ڈاکو چور لیرے بھی مگرانی کرنے آئے ہو  
تم بھوکے ٹنگوں کے خوں کی ارزانی کرنے آئے ہو  
تم آمر کے پروردہ ہو جمہور کے معنی کیا جانو؟  
تم فتویٰ گر ہو شاہوں کے، منصور کے معنی کیا جانو؟  
ہم بھٹو کے دیوانے ہیں یہ جان امانت بھٹو کی  
ہم آن پہ مرنے والے ہیں یہ آن امانت بھٹو کی  
کیوں اتنا بوجھ اٹھاتے ہو؟ کل کیسے قرض اُتارو گے  
یہ بازی جان کی بازی ہے اور تم یہ بازی ہارو گے

تم خلق خدا کے ٹھکرائے سلاطین کرنے آئے ہو  
تم ٹیکوں، توپوں کے بل پر من مانی کرنے آئے ہو  
تم قاتل ہو دستوروں کے دستور کے معنی کیا جانو؟  
تم تاریکی کے پالے ہو تم نور کے معنی کیا جانو؟  
بی بی پہ کرنے آئے ہیں قربان امانت بھٹو کی  
جس شان سے قتل میں آئے وہ شان امانت بھٹو کی  
تم اپنی جاں بخشی کے لیے پھر ہم سے عرض گزارو گے  
ہر گھر سے بھٹو لٹے گا تم کتنے بھٹو مارو گے

جب نصیر کوئی نے اپنی یہ نظم ختم کی اور آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا تو میں اب تک اس نظم کے پیچھے کارفرما جذبے کے بحر میں گرفتار تھا۔ ارد گرد نظر دوڑائی، خالی ریسٹوران کے پیرے ہماری میز کے گرد خاموشی سے کھڑے، یہ نظم سننے کے بعد بکھر رہے تھے۔  
نصیر کوئی نے 'ہوکا' (لمبی سانس) بھرا اور بولا خواب دیکھنا تو ہر غریب کا حق ہے۔

اُس پہلی ملاقات کے بعد اگلی ملاقات نصیر کوئی کے گھر پر ہوئی۔ جہلم کے اندر نیم شہری نیم قصبائی خاموشی اور سکون میں سستا ایک تنگ گلی میں پھول کی بیلوں سے ڈھکا چھوٹا سا مکان اہل خانہ کی خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا۔ جالی دار دروازے کے اندر سادہ بیٹھک، نفاس اور قرینے سے سجی ہوئی تھی۔ صاف ستھرے صوفوں پر بیٹھ کر نصیر کوئی نے گھنٹوں مجھ سے اپنی اور اپنے خوابوں کی باتیں کیں۔ وہ شخص جس کی شاعری جلسوں میں پڑھ کر سیاسی راہ نما اقتدار کی غلام گردشوں سے گزر کر مسند تک پہنچتے تھے، مجھے بہت تنہا محسوس ہوا۔ ایک بے دوالا چارگی تھی، حسرت تھی یا نا اُمیدی جو اس شاعر کے اندر سرایت کر گئی تھی۔ میں کئی مرتبہ سوچتا کہ کیا کھوکھے پہ ٹھنڈی بوتلیں بیچنے والے شخص کی سیاسی اور سماجی فراست اہم دانش وروں سے بڑھ کر ہو سکتی ہے۔ میرا فہم مجھے سمجھاتا کہ فراست کسی کی وراثت نہیں اور معاشیات کی غلام نہیں۔ جہاں مجھے اُس شاعر سے ہم دردانہ اُنسیت ہو گئی تھی، وہیں ہم دونوں میں ایک جذبہ مشترک تھا جو ہمیں ایک اُن دیکھی دانستگی میں بانڈھتا تھا اور وہ تھا، اضطراب۔ دیکھی گفتگو کے دوران پہلو بدلنا، خاموش ہو جانا، موضوع سے ہٹ کر کوئی اور بات شروع کر دینا، جذباتی ہو جانا اور مطلقاً مزاحی شاعر کی شخصیت کے لازمی اجزاء تھے۔

اکتوبر 1947ء کو جہلم کے ایک سفید پوش گھرانے میں جنم لینے والا نصیر صرف دسویں جماعت تک نصابی تعلیم حاصل کر پایا۔ مگر کے دیگر گروں ہوتے معاشی حالات نے اُسے تعلیم چھوڑ کر ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا۔ تربیلا کے مقام پر دنیا کا سب سے بڑا ڈیم تعمیر ہو رہا تھا۔ اُس کے لیے بڑی تعداد میں افرادی قوت کی ضرورت تھی چنانچہ نصیر کوئی نے وہاں بہ طور ترکھان ملازمت اختیار کر لی۔ وسیع پیمانے پر آبادی کا انظار ہو رہا تھا۔ ایک بڑے قطعہ زمین کو زیر آب آ جانا تھا۔ دن رات کام جاری تھا۔ انہی مزدوروں اور ترکھانوں میں نصیر نامی ایک لڑکا بھی کام میں لگنا ہوا تھا۔ اُس کی آمدنی سے گھر کے اخراجات چلتے۔ شاموں میں نصیر باقی کاری گروں سے پیچھے بیٹھ کر شاعری پڑھا کرتا اور تاریخی کتابیں چاٹتا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ساتھ کام کرتے محنت کشوں کے ڈکھوں اور بے چارگی پر گودھا کرتا۔

"ایک مزدور اور غمخیز کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں جاں تو زحمت کرتے اور دونوں بے زبان تھے" ایک سہ پہر نصیر کوئی نے بندہ مزدور کے اوقات تلخ پر بات کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں مجھ سے کہا۔

”میں نے تبھی سوچا تھا کہ اپنے بچوں کو مکمل تعلیم دوں گا اور عزت دار انسان بناؤں گا۔ الحمد للہ! میری بیٹیاں پیشہ دارانہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں البتہ اکلوتے بیٹے کے حوالے سے خاصی پریشانی رہتی ہے۔“ جب نصیر کوئی نے یہ بات کہی تو کمریلہ خوش ذوقی میں نسوانی نزاکت کا رنگ ابھر کے سامنے آ گیا۔ جب تربیلا ڈیم پر کام مکمل ہوا تو نصیر کوئی کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی اور وہ چار برس کے لیے وہاں چلا گیا۔ وہاں پر کام کرتے محنت کشوں کے حوالے سے مقامی لوگوں کے رویے کے حوالے سے اُس کی یادیں زیادہ خوش گوار نہ تھیں۔

”میری عادت رہی ہے کہ جو بھی کام کیا ہے، پوری نیک نیتی اور خلوص سے کیا ہے۔ ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ ہر مزدور، ترکھان اور روغن گر میں ایک فن کار چھپا ہوتا ہے۔ شاعر اپنے فن کا اظہار شعر میں کرتا ہے تو ترکھان لکڑی کے ایک ٹکڑے میں۔“

سعودی عرب میں جہاں غسل محنت کے چار برس گزار کر نصیر کی جہلم واپسی ہوئی۔ نصیر کے ساتھ بے شمار لحاظ چٹا کر اُس کی شخصیت کے جو پہلو زیادہ نمایاں ہوئے اُن میں اپنی مٹی سے پیار، تاریخ کا شعور، ماں بولی سے عشق، محنت کش کے لیے درد بلکہ تڑپ اور بے ساختہ اُبلتی ہوئی شاعری تھی۔ نصیر کوئی کی پہچان اُردو شاعری بنی جب کہ اُس سودائی کو اصل مان اپنی پنجابی شاعری پر تھا۔

گنج شکر نے لوکاں دے نال جیہڑی بولی بولی	ناک ہو راں آشلوکاں وچ اوہدی شکر گھولی
بھر بھر پیو پیالے ایہدے ایہدے امرت ننڈ وٹھو	ماں بولی وچ لکھو پڑھو تے ماں بولی وچ بولو
یکھے شاہ نے ایہدے وچ ای ویسی الف سچائی	دارت شاہ نے ایہدے راہیں عین دی شکل دکھائی
ایس کتاب دے اک اک کر کے سارے ورقے پھولو	ماں بولی وچ لکھو پڑھو تے ماں بولی وچ بولو
(گنج شکر نے لوگوں سے جو بولی بھی بولی	ناک نے آشلوکوں میں اُسی کی شکر گھولی
بھر بھر پیو پیالے اس کے، یہ امرت نہ بہاؤ	ماں بولی میں لکھو پڑھو، ماں بولی میں بولو
یکھے شاہ نے اس میں ہی سمجھائی سب سچائی	دارت شاہ نے اس رستے ہی عین کی شکل دکھائی
اسی کتاب کے ایک ایک کر کے سارے ورق کھنگالو	ماں بولی میں لکھو پڑھو، ماں بولی میں بولو

کبھی میں شاعر سے درخواست کرتا اور کبھی وہ از خود اپنے اشعار ترنگ میں پڑھنے لگتا۔ پنجابی اشعار لوک روایت کے شیرے میں رچے بے اور دھیمی درد میں سنلگتے ہوتے۔ جہلم کے گرد و نواح میں بکھرا افلاس اُس محنت کش کوئی کو بے چین رکھتا۔ وہ شعر پڑھتا اور میں اُنھیں لکھتے لکھتے ان کے جذبہ و آہنگ کے زیر اثر قلم روک کر سانسیں تھامے اُنھیں سننے لگتا۔ وہ اس قبیل اور نسل کے آخری لوگوں میں سے تھا جو اپنے دین سے عشق کرتے اور دوسروں کے مذاہب اور ان کے اوتاروں کی بھی عزت کرتے تھے۔ وہ ہندومت، بدھ مذہب، سکھ گرنٹھ صاحب، مسیحی پاپائیت کا دل سے احترام کرتا اور اپنے اشعار میں ان کے نقوش اور ہستیوں کے تذکرے اس طرح جڑ دیتا جیسے کوئی فن کار جو ہری زمرہ، ہیرے، موتی، نیلم اور دیگر بیش بہا قیمتی دیکتے جواہرات سونے کے جڑاؤ ہار میں جڑ دے۔

”ہم محنت کش چھوٹے لوگ نہیں۔ ہم خدا کے مقرب اور پیغمبر کے وارث ہیں۔“ ایک روز یہ کہہ کر اپنے اشعار سناتے شروع کر دیے۔

ایس ڈنگے دا نگ کمان دے	(ہم غم دار کماں کی صورت)
ایس سدھے دا مگر تیر	ہم سیدھے، جیسے تیر
اک جتھ وچ رہتا داتری	ایک اُتھ میں گھر پار داتری

اک اتھ وچ ہے شمشیر  
سانوں خواجہ خضر دا تھا پڑا  
ساڈی کنڈتے پچھے پور  
اک وار دے نال سواروں  
سنے گھوڑے دیساں چور  
اسیں لوہا موسم بنا دندے  
ساڈے اتھ گئی داناہ  
پانی نوں سنگل مارے  
ساڈے قابو وچ ہوا  
لہراں نال لڑنا جانڈے  
اسیں ہاں در پائی لوک  
اس وار زمانہ دیکھسی  
اس ہڑھتے لاساں روک  
ساڈے سرتے لڑا جو گیاں  
بیراں وچ دیت دے  
مکھ چمکے دیک سورپ  
من چند جوت چکے  
اک اتھ شمشیر  
ہمیں خوبہ عسکر کی جگی  
اور پشت پہ پانچوں پور  
ہم ایسا وار کریں دشمن پر  
دیں سنگ گھوڑے چور  
ہم لوہا موسم بنا دندے  
ہم اتھ میں رکھیں ہاگ  
ہم قابو کریں ہوائیں  
پانی کی پکڑیں ہاگ  
لہروں سے لڑنا جانڈے  
ہم در پائی لوک  
اس بار زمانہ دیکھے گا  
سیلاب کولیں گے روک  
مالک سر پہ لڑا جو گیاں  
بیراں میں دیت دے  
چہرہ ہے سورج دیوتا  
اور من میں چاند چکے

جب میں نے پوچھا کہ معاش کے گھوڑے کی سوں تلے بڑے بڑے باقی کچلے گئے اور ان کا جوش رزق حالات ہوا تو اس کے اندر مزاحمت کا شعلہ کیسے بھڑکتا رہا۔ یہ سن کر شاعر مسکرایا اور بولا:

”میری مٹی، جہلم کی زمین، ہمیشہ سے جنگ جووں کو جنم دیتی رہی ہے، راجا پورس سے لے کر آج تک ہم لوگوں نے ایک ہاتھ میں پیچھے اور دوسرے میں تلووار اٹھا کے رکھی ہے۔ بے شک ہم عسکر کی لوگ ہیں۔ لیکن مت بھولے ہم کن پنے جوگی بھی ہیں۔“

اس گفتگو میں نصیر کوئی کا تاریخی شعور اور علاقائی فہم یوں ابھرتا تھا جیسے کبھی لڑا جو گیاں کی پھاڑیوں کی چوٹیوں پر ایسا تہ عبادت کدوں پر ایک کھڑا دیں پہنارا، انھا ہیر ہیر کرتا جلوہ گر ہوا تھا۔ شاید اس فقیر نے ہیر میں خدا کو دیکھا تھا کہ خدا تو اپنی جھلک چاہے کسی بھی شاہ پارے میں دکھلا دے۔

راجا پورس لڑا جو گیاں، خانقاہیں۔ محقق المیرونی، جنونی را، انھا، آزادی کا جری سکھ بھائی متی داس اور بے چارہ کوئی۔ نصیر کوئی

آج بھی وہاں کے نقش لا زوال ہیں۔ اس زمیں سے کیا پرندے اڑے اور ڈور ڈالیوں پر جا بیٹھے، دینے کا گلزار، چھوٹا لے کا شیل دت، جہلم کا

اندر کمار گجراں اور من موہن سنگھ چمکتے ہوں یا ضمیر جعفری زبرد میں کھٹکھٹاتا ہوں۔

مند، گرے، مسجد دے بیراں نوں دھو کے لکھدا سنیں  
من موہنہ پھیر کے نکار ہنا ایں تیریاں راہواں نلاں کھے  
تک تیرے گجراں آجے تک ہور کسے دل تکیا ای نہیں

گردوارے متا لیکن لئی کھلو کے لکھدا سنیں  
جہلم تیرے پانیاں اندر پہلے جیہاں گلاں کھے  
سن تیرا گلزار دی تیریاں گلاں کر کر تھکما ای نہیں



جہلم تیرے پائیاں اندر پہلے جیساں گلاں مجھے  
 ماقا چکنے گرد و دارے کی سمت سے ہو کر پہنچے تھے  
 جہلم تیرے پانیوں میں ، اب پہلی سی بات کہاں  
 سن تیرا گلزار ابھی تیری باتیں کر کر تھا نہیں  
 جہلم تیرے پانیوں میں ، اب پہلی سی بات کہاں

دل دل درد خیزے تیرے ماریاں جا جائیں گے  
 (تم مندر، گرہے اور مسجد کے پاؤں دھو کر پہنچے تھے  
 اب منہ پھیر کے سوئے ہو، اب تم سے ملاقات کہاں  
 دیکھ ترے گہراں نے تیرے بعد کسی کو ٹکا نہیں  
 ہر دل میں تیرا درد بھرا ، اب تم سے ملاقات کہاں

نصیر کوئی کا اپنی دھرتی سے ایسا جذباتی رومان تھا جس میں تاریخی شعور کے پکوان پر مبالغے کا تذکار ضرور آتا۔ اُس کی نظر میں اُس کے لوگوں جیسے لوگ دنیا میں نایاب تھے۔ گویا اُس کا وطن محو تھا کر ارض کا۔ کچھ عجیب نہیں کہ البیرونی نے اسی نئے کو نقطہ حوالہ بنا کر دنیا کا قطر دریافت کیا تھا۔ نصیر کا مرکز ثقل بھی پوٹھوہار، جہلم اور اس کے پانی تھے۔

ہماری گفت گو میں کبھی کبھار راجا پورس کا حوالہ آتا تو کبھی راجھا بھی آ جاتا۔ راجھے کا ذکر ہو اور پٹلا جو گیاں نہ آئے، یہ کیسے ممکن ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ مہا بھارت کا ذکر ہو اور پاٹھوؤں کا تذکرہ نہ ہو۔ ان میں سے بہت سے تذکرے تو کوئی کی شاعری میں بھی ابھر آئے، پٹلا جو گیاں اور چند ایک اُس سے ہٹ کے، جیسے دراوڑ۔

ذکر جہلم کا ہو، بات ہو دینے کی چاند بکھراج کا، رات چمپینے کی (گلزار)

مہا بھارت کی رزمیہ داستان میں پانچ پاٹھو بھائی اسی علاقے میں دیس تیاگی ہوئے تھے۔

یہ وہی مٹی ہے جہاں جہلم اور چناب کے بیچ کے علاقے شاہ کوٹ کے مہاراجا پورس کو سکندر یونانی نے اپنی اطاعت قبول کرنے کا پیغام بھیجا تھا۔ پورس نے جنگ جو یا نہ لٹکار سے جواب دیا تھا۔ ”میری نکو اور میرا سینہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ سکندر نے دیوتاؤں کے حضور بھیٹ چڑھا کر یونانی سوراوؤں کو تیل گاڑیوں پر کشتیاں لا کر پورس کی راج دھانی کی جانب یلغار کا حکم دیا تھا۔ دریائے جہلم کے پانی طغیانی پر تھے، چناب چہ سکندر نے پھرے پانیوں کو دیکھ کر اعلان کیا کہ دریا برسات کے بعد پار کیا جائے گا۔ شاطر جنگ جو، فاتح عالم سکندر اعظم کی یہ چال موثر ثابت ہوئی۔ یونانی سوراوؤں کے دستے دریا کے ساتھ حرکت میں رہے۔ کبھی وہ کشتیوں میں دریا بھی پار کر جاتے۔ اُن پر نظر رکھے پورس کے فوجی دستے بھی حرکت میں آ جاتے۔ یہ آنکھ بھولی جاری رہی۔ مہاراجا پورس کھوہار کے مقام پر فوج کی کمان سنبھالے جو کس شیر کی طرح ہوشیار بیٹھا تھا۔ ادھر کئی روز کی یونانی چھاپا مار کارروائیوں سے پورس نے تصور کر لیا کہ سکندر کی فوج دریا عبور نہ کر پائے گی۔ ادھر سکندر اپنی فوج کو پڑاؤ سے کئی کوس نیچے ایسے مقام پر لے گیا جہاں مجھے جنگلات تھے اور دریا ٹم کھا کر پہنچنے کی وجہ سے تنگ ہو گیا تھا۔

اسی ٹم میں ایک جزیرہ بن گیا تھا۔ سکندر نے اپنی فوج کے منتخب دستے رازداری سے اس جگہ پہنچا دیے۔ گر جتے برستے بادلوں اور طوفانی ہواؤں میں سکندر اپنے نائین کے ساتھ رات کے اندھیرے میں دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ پورس کے بیٹے راج کمار نے اُسے دیکھ لیا اور اپنے دو ہزار جاں نثاروں اور ساٹھ رتھوں کے ساتھ اُس کی جانب جھپٹا۔ قلیل تعداد میں ہونے کی وجہ سے یہ ہراؤل دستہ کام آیا اور راج کمار پیوند خاک ہوا۔ اس کے بعد گھمسان کارن پڑا۔ پورس کی طاقت اُس کے گراں ذیل ہاتھی تھے۔

سکندر نے اپنی فوج کو ہاتھیوں کی سوطیں کاٹنے کا حکم دیا۔ یونانی فوجیوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھیوں کی سوطیں کاٹنی شروع کیں تو زخمی ہاتھی پیچھے کی جانب بھاگے اور اپنی ہی فوج کی صفیں کھٹا اور اُلٹنا شروع کر دیں۔ ہارش کی وجہ سے کچھ اور پھسلن بڑھ چکی تھی چناب چہ پورس کی فوج پس پانی اختیار کرنے لگی۔ اُس کی فوج کے پچیس ہزار جنگ جو ہلاک ہو گئے لیکن پورس ڈنار ہا اور اپنے دستوں کو آگے بڑھا تا رہا۔ اس دوران وہ خود بھی بڑی طرح زخمی ہو چکا تھا۔ زیادہ لمبو بہہ جانے کی وجہ سے اُس پر غنودگی طاری ہونے لگی تو قتل

ہاں نے ہاتھی کا رخ میدان سے باہر موڑ دیا۔ یہ دیکھتے ہوئے سکندر نے راجا اسمی چند کے بھائی کو اس کے پاس جھپٹا کر لے کر بیجا۔ پیغام سن کر پورس نے اپنی بندہ ہوتی آنکھیں کھولیں اور مردانگی سے بھرپور قوت سے اُس کی جانب اُچھال دیا۔ یہ دیکھ کر بھائی فوج نے آخری ہلا بولا اور شدید زخمی پورس کو گرفتار کر کے سکندر کے سامنے پیش کیا۔ سکندر نے پورس کی بہادری سے متاثر ہو کر پوچھا۔ ”تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

پورس نے وہ جواب دیا جو تاریخ میں امر ہو چکا۔ نہ سکندر وہاں پورس لیکن اُس کے چند الفاظ تاریخ کے سینے پر کندہ ہیں ”جیسا سلوک ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے۔“

سکندر اعظم نے یہ الفاظ سن کر کمال و سخاوت سے پورس کی راج دعائی اُسے لوٹا دی۔ جاتے ہوئے اُس نے یہاں اپنے گھوڑے کے نام پر ایک شہر آباد کیا جسے آج ”پھالیا“ کہتے ہیں۔

نصیر کوئی کی گفت گو میں جہاں پورس کی دلیری کا ذکر آتا، وہیں اُسی سانس میں راجا بھی بیٹھے رومانوی سُروں میں ٹوکتا۔

جاٹے کن پڑواندے رہے  
اسیں ہیریں دل چوں کڈھیاں نہیں  
اسیں شاہ حسین تے بکھے ہاں  
(جا جاٹیلے گن چھدوانے  
ناں ہیرے نانا توڑ سکے  
ہم شاہ حسین اور بکھے ہیں  
رنگ پور وچ آکھ جگاندے رہے  
اسیں منگیاں کدے وی بھڈیاں نہیں  
اسیں ساندل بارے ڈلتے ہاں  
رنگ پور میں آکھ جگانے  
ہم اپنی مانگ نہ چھوڑ سکے  
ہم ساندل بارے ڈلتے ہیں)

وہ شخص ایک لمحے میں ماضی بعید اور حاضر میں سانس لیتا تھا۔ حال کو سانسوں کے رستے کھینچتا اور ماضی دھونکتا۔

دل چسپ امر یہ ہے کہ ہاری گفت گو میں ذاتی زندگی کے حوالے کم ہی آتے۔ جب میں نصیر کوئی کے چھوٹے سے صاف سترے مکان کے مہمان خانے میں بیٹھتا تو پردوں کے پیچھے سے اہل خانہ کی سرسراہٹ اور چائے کے انتظامات کی سرگوشیاں سنائی دیتیں۔ میرے ذہن میں اُس کی معاشی تنگ دستی کا بوجھ ہوتا چٹاں چہ میں بے حد اصرار کرتا کہ وہ چائے کا تکلف نہ کرے لیکن چائے کے ساتھ خست نمکین سمو سے پکڑے آہی جاتے۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ اپنے کھوکھے پر مجھے مل لے لیکن وہ سر راہ ملاقات کو آراہہ شائستگی کے متانی سمجھتا۔

وہ ابتدا سے کھوکھے کا مالک نہ تھا بلکہ مناسب حد تک خوش حال تھا۔ یہ کھوکھے تک کا ڈھلانی سفر کیسے ہوا، دل چسپ اور عبرت انگیز کٹھا ہے۔ اس کٹھا سے پہلے اُس کی عمومی گفتگو کے موضوعات۔۔۔ ذاتی زندگی کے حوالے سے وہ ہمیشہ اپنے اکلوتے بیٹے کے مستقبل کے لیے پدرانہ تشویش کا شکار رہتا۔ علاوہ ازیں شاید وہ خشک ہوتے دریائے جہلم، ماں بولی پنجابی کی زبوں حالی، صدیوں سے دیوں میں زندہ صوفی شعرا کی آہستہ آہستہ عوامی حافظے سے معدومیت پر جذباتی حد تک غم گین تھا۔

بڑا جوگیاں قدیم ہند کا خاندانی مرکز تھا جہاں زائرین، درویش، سادھو اور طلبہ دور افتادہ علاقوں، تبت، نیپال، سیلون، برما، وسطی جنوبی شامی ہند، بنگالہ و قراقرم اور افغانستان سے چلے آتے۔ یہ خاندانوں کا وہ وسیع اور زندہ دھڑکتا متناسق قطعہ مرتفع تھا جو تیاگیروں کا آتش کدہ تھا، جدھر وہ خواہشات کو نذر آتش کرتے اور جوگ سنبھالتے۔ گرد گرد کھاتھ کن پئے (چھدے کان) جوگی سلسلے کے بانی اور ادھر کے پہلے معروف پربھت تھے۔ یہ وہی گرد گرد کھاتھ تھے جن کے پاس اجین کے مہاراجا دکر مادیہ کے بڑے بھائی پورن بھگت، تخت و حکومت چھوٹے بھائی کے حوالے کر کے پدھرے اور ان کے مرید ہوئے۔ اس مقام کی شہرت ایسی عالم گیر تھی کہ اکبر بادشاہ بہ نفس نفیس خود و مرتبہ یہاں آیا اور

راجھا بھی سیال (جھنگ) سے ادھر آیا اور زعفرانی لبادہ اوڑھے، بیروں میں لکڑی کی کھڑادیں پہنے، کان چھدوائے بٹے سے مشق کا منتر جاپا اتر اور تاریخ کے اوراق پر نقش ہو گیا۔ کون نقش ہوتا ہے اور کون نہیں، یہ بھی نصیب کی باتیں ہیں، آنے والی سطوں کے نصیب کی۔ ورنہ شاہ فیصل کے نام پر فیصل آباد ہے، اُس کی بلا سے، لایل پور نام کا اعزاز سر جیمز لایل کے لیے بعد از موت بے معنی!

نصیر کوئی کی طولانی حیات کا قصہ مختصر کچھ یوں ہے۔ فکر روزگار میں غلطاں نصیر پاکستان کے سیاسی و سماجی مدوجزر سے لاقلم سر جھکائے کولہو کے تل کی طرح گول دائرے میں گھوم رہا تھا۔ کچھ کھار سس تھا تو شاعری میں۔

سعودی عرب سے واپسی پر پس انداز کردہ سرمائے سے نصیر نے جہلم میں ایک مناسب ہوٹل کھول لیا۔ اب جیسا کہ طور معاشرت ہے، وطن عزیز کے اُن ہوٹلوں میں جہاں "سیاست اور مذہب پر گفتگو منع" ہوتی ہے صرف انہی دو موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ روایت نصیر کے ہوٹل میں بھی دہرائی جانے لگی۔ گاہکوں، مہمانوں، علاقائی دانش ورؤں اور اخبارات کے مقامی نمائندوں کے سیاسی مباحث نے نصیر کے خوابیدہ سیاسی شعور کو کچھ ایسا جھنجھوڑا کہ وہ نہ صرف بیدار ہوا بلکہ آمادہ پیکار بھی ہوا۔

"یہ ایم آر ڈی تحریک کے دنوں کی بات ہے کہ میں سیاسی طور پر متحرک ہوا۔ اس سے پہلے بھٹو صاحب کو پھانسی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ کچھ غلط ہوا ہے مگر جھنجھوڑے جانے کی کیفیت نہ ہوئی تھی۔ اس تحریک کے آغاز تک میری زندگی کا سب سے الم ناک واقعہ سانحہ مشرقی پاکستان تھا۔ میں اس سانحے کے بعد کئی راتیں اٹھ اٹھ کر روتا رہا تھا۔"

یہ حقیقت تو نصیر نے پہلی ملاقات میں سوپ پیتے ہوئے ہی مجھ پر آشکار کر دی تھی۔

البتہ سیاست میں متحرک کردار ادا کرنے کے حوالے سے بتایا کہ اُس کی زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ ہوٹل میں دن بھر گاہکوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا۔ سیاسی اور ادبی گفتگو کرنے والے زیادہ تر لوگ چائے کی ایک پیالی پر پورا دن گزار دیتے۔ دل چسپ امر تو یہ تھا کہ وہ پیالی چائے کی بھی زیادہ تر اُدھار ہوتی۔ اسی دوران ایم آر ڈی کی تحریک شروع ہو گئی۔ ہائیں بازو کے نظریاتی کارکنوں اور پیپلز پارٹی کے جیالوں نے اس میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ گو تب سندھ میں وہ تحریک زیادہ موثر تھی، البتہ پنجاب میں بھی اس میں جان پڑنے لگی۔

"اس دوران ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ بے زبان فخر جسے محنت کش کہا جاتا ہے، اُسے ملکی تاریخ میں کسی نے زبان دی تھی اور خواب دیکھنے کا حق دار بنایا تھا، وہ بھٹو تھا۔ جب تک میری بھٹو سے جذباتی وابستگی اس لیے بھی نہ تھی کہ اس کے آخری برسوں میں میں نہیں بیرون ملک تھا۔ چنانچہ اب مجھے احساس ہوا کہ اُس شخص کا اس طرح ستم شعاروں کے ہاتھوں قتل ایک بھیانک واقعہ تھا۔"

تحریک زور پکڑ رہی تھی اور ساتھ میں نصیر کا جذبہ حریت ہوا پکڑ رہا تھا۔ چنانچہ نصیر نے اپنا ہوٹل ان سیاسی جاں بازوں کی نذر کر دیا۔ وہاں خفیہ اجلاس اور منصوبہ بندی ہونے لگی۔ نصیر کو اُمید بندی کہ غریب دہقان اور مزدور حالات کے بہادر پر ابھر کے اوپر آئے گا۔ چنانچہ اس کے لیے یہ تحریک آزادی محنت کش کا استعارہ بن گئی اور بھٹو اس جذبے کا چہرہ۔

نصیر کے ہوٹل پر چھاپے پڑنے لگے۔ لیکن مینی شروع ہوئی، آنکھ پھولی کا کھیل کھیلا جانے لگا۔ محافل میں سے چند ایک ہم در قیل از کار روئی اطلاع دے دیتے چنانچہ حریت پسند بروقت فرار ہو جاتے۔ بالآخر ہوٹل سیل کر دیا گیا اور نصیر زیر زمین چلا گیا۔

چند ہفتوں میں تحریک دم توڑنے لگی۔ محافل کی سختی نرم پڑنے لگی۔ نصیر کی آمدنی کے سوتے خشک ہو چکے تھے اور پس انداز کی مٹی رقم ماہ و سال عمر کے مانند خرچ ہوتے ہوتے ہلال عید ہوئی۔ بیش تر حصہ خرچ ہو چکا تھا اور قلیل رقم رہ گئی تھی۔ کاروبار کو نئے سرے سے

پہلے وہاں پہنچیں

چلانے کے لیے سرمایہ چاہیے تھا۔ ہوٹل کا کام از سر نو شروع کرنے کی کوشش میں وہ رقم بھی خرچ ہوئی۔ جب ملٹی کمپنی میں سوارش تھا۔ پس بات یہاں آن کر ٹھہری کہ نصیر کوئی مقروض اور چھوٹے موٹے کام کرنے پر مجبور ہوا۔

”لوگ پارٹی رکنیت تب حاصل کرتے ہیں جب وہ پارٹی عروج کی جانب گامزن ہوتی ہے۔ میں نے ہینلز پارٹی کی رکنیت تب حاصل کی جب قد آور لوگ اسے چھوڑ رہے تھے۔ لوگ ڈوبتی کشتی سے چھلانگیں لگاتے ہیں اور میں تب اس میں سوار ہوا۔“

”کیوں؟“ میں نے استفسار کیا۔

”میرے اندر سے آواز اٹھی کہ یہی درست وقت ہے جب پورے قد کے ساتھ کھڑے ہو کر راست گزریں میں شمار ہوا جائے۔ میرا ضمیر گوارا نہ کرتا تھا کہ جو وقت آواز بلند کرنے کا ہے تب دونوں ہاتھ بلند کر کے ہتھیرا ڈالنے کا اعلان کیا جائے۔“

”آپ کے پیش نظر کیا تھا؟“

”مجھے اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی۔“

”پھر؟“

”پھر اندھیرا چھٹا، روشنی چھٹی اور ہم اقتدار میں آ گئے۔“

میں نے مسکرا کر ہم دردی سے نصیر کو دیکھا، اُس کا قلیل سالانہ حیات دیکھا، اُس کے لڑکے کو کوکان پر ٹھنڈی بوتلیں پیچھے چھپا کر تصور سے دیکھا اور ہمت کر کے سوال کیا۔

”مجھے تو آپ اقتدار میں نظر نہیں آتے؟“

یہ سوال نصیر کو سن کر گیا۔ بلا تکان بولنے والا شاعر خاموش ہو گیا۔ اُس سے کوئی بات نہ بین پائی تو سادگی سے ہوا۔ ”ہمارے ابتدائی دن انتہائی خوشی کے تھے۔ ایک جنون تھا جو سب پر طاری تھا۔ سبھی گویا ایک حالتِ جشَن میں تھے۔ ہماری بی بی اقتدار میں آ گئی تھی۔ وہ ہم سے اور ہم اُس سے وابستہ تھے۔ ہمارے درمیان ایک جذباتی تعلق تھا۔“

”بی بی نے آپ کے لیے کیا کیا؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

شاعر کی آواز لڑکھرائی گویا وہ کوئی جواب تراش رہا ہو۔ ”وہ بہت اچھی لیڈر تھی۔ بس اُسے اچھے اور مخلص ساتھی نہ ملے۔“ شاعر کی آواز میں افسوس تھا۔

”لیڈر کی سب سے بنیادی خوبی تو اپنی ٹیم کا انتخاب ہوتا ہے۔“ میں نے بات بڑھائی۔

”اب ایسی بات بھی نہیں، ہماری لیڈر کو کام نہیں کرنے دیا گیا۔“ نصیر نے وضاحت کی۔

”بی بی نے اپنی پارٹی کے لیے کیا کیا، غریبوں کے لیے کیا منصوبے بنائے جو پروان نہ چڑھ سکے؟“ میں نے ہم دردانہ

استفسار کیا۔

نصیر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

”بی بی نے ایک مرتبہ مجھے اپنے ساتھ کھانے پر بلایا تھا۔ وہاں ہم ساتھیوں نے بی بی کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھایا تھا“ نصیر نے

کھوکھلی آواز میں جواب دیا۔

میں نے سامنے دیکھا۔ نصیر کی پلیٹ خالی تھی۔

یہ وہی ملاقات تھی جس میں نصیر کوئی نے وہ انکشاف کیا جس نے مجھے چونکا دیا اور ایک معروف لیکن غلط العام تصور باطل کیا۔

نصیر نے بتایا کہ اُس کی وہ نظم جس کا شعر



یہ بازی جان کی بازی ہے اور تم یہ بازی ہارو گے ہر گھر سے بھٹو نکلے گا تم کتنے بھٹو ہارو گے  
 پہنچا پارٹی کے ہر جلسے کا منترا اور جلوس کا سلوگن بن چکا تھا، بھٹو کی پھانسی کے بعد کسی وقت میں نہ لکھی گئی تھی بلکہ اس سانحے کے  
 بارہ پندرہ برس بعد لکھی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی رات میں معرض وجود میں آئی تھی جب نصیر کو بھٹو کی یاد نے بہت ستایا تھا اور اُسے اپنے لیڈر کی کی کا  
 شدت سے احساس ہوا تھا۔ وہ نظم بی بی کے دوسرے دور حکومت کے بعد لکھی گئی تھی اور اس کے درود کا بھٹو کی پھانسی کے لمحہ رنگین سے قلمی کوئی  
 تعلق نہ تھا۔

اس مکالمے کے بعد بھی ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ شاعر سیاست دان نہ تھا، دور اندیش سیاسی کارکن بھی نہ تھا، فقط خواب  
 دیکھنے والا ایسا معصوم، جذباتی اور درویش شاعر تھا جو اُمید اور نا اُمیدی کے سچ جھولا جھولتا رہتا تھا۔ میں نے اُس کے منہ سے کبھی اپنی پارٹی کے  
 خلاف ایک لفظ بھی نہ سنا۔ وہ اپنے نظریے سے اس طرح چپٹا ہوا تھا جیسے اگلے وقتوں میں کو فیصل سے چپک کر دیوار پھلانگنے والوں کے لیے  
 دوسری جانب کودنے میں معاون ثابت ہوتی تھی۔

البتہ اُس کی شاعری میں اُمید کے ساتھ دکھ کی آمیزش بڑھنے لگی تھی۔ وہ جو جذبے سے اشعار گاتا تھا اب گویا خود کلامی میں اپنی  
 شاعری میں سے افسردہ کر دینے والے اشعار بڑا جاتا تھا۔

نکلکھ وچ پردہ داری کا ہدی	چادر چادر دیواری کا ہدی
میرے گھر دیاں کندھاں وی نہیں	یو ما کا ہدا ہاری کا ہدی
(بھوک میں پردہ داری کیسی؟)	چادر چادر دیواری کیسی؟
میرے گھر دیوار نہیں ہے	دُر کیسا اور باری کیسی؟
جیڑے لکھ کر ڈر دے رہتا	میری رت فچوڑے رہتا
مینوں ساری دنیا جھڑ گئی	دُکھ نہیں مینوں چھوڑ دے رہتا
بندیاں اگے جھکتا پیڑا	نہ توں اینی تھو ہڑ دے رہتا
(جو چیں لاکھ کر ڈر کے رہتا)	میرا لہو فچوڑے رہتا!
دنیا ساری چھوڑ گئی ہے	دُکھ نہ مجھے چھوڑے رہتا!
مخلوق جھکے مخلوق کے آگے	نہ اتنی تُو تھوڑ دے رہتا!

کیدساں میں یہ روا اپنے آجڑے گھر کا حال	میرے دیہڑے آوندے رہندے روزای نوں بھچال
(کیا تلاقوں یا رو، اپنے آجڑے گھر کا حال)	میرے گھر میں آتے ہیں روز نئے بھونچال

آخری ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات میں نصیر کوئی نے ایک لفافہ میری جانب بڑھایا۔ میں نے پوچھا کہ اس میں کیا  
 ہے۔ اس پر وہ خود دار شخص آنکھیں چرائے لگا۔ پھر ہکلاتے ہوئے بتایا کہ اس لفافے میں اس کے بیٹے کے کاغذات ہیں۔ "پیارے  
 دُکان دھندا کرتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اسے کہیں نوکری مل جائے۔ بھلے چھوٹی نوکری ہو کم از کم تن خواہ تو ملے گی اور ایک تحفظ کا  
 احساس رہے گا۔"

میں نے اپنے سامنے ایک بوڑھے شخص کو پایا۔ "میری زندگی کا کیا پتا۔ اس کا کچھ بن جائے تو مجھے سکون آجائے گا۔"  
 سڑدی جائے گلہ دی جائے  
 موم حیاتی ہلدی جائے  
 جھٹلا رلا مار کردی  
 سادہ وی آری چلدی جائے

موم حیاتی جلتی جائے  
سلس کی آری جلتی جائے

(جلتی جائے، گلتی جائے  
جسم کو ریزہ ریزہ کرتی)

میرے سامنے وہ بہ ظاہر محنت مند مگر اندر سے ٹیف شخص کھڑا تھا جس نے خواب میں روشنی دیکھی تھی، نیند میں خوشبو نے اسے مہکایا تھا اور امید کے کوئل ہاتھوں نے سہلایا تھا۔  
یہ وہی شخص تھا جس نے کبھی لاکا راتھا۔

دراز قد یہ بھی لازم ہے اپنے قد میں رہے بہتم شعار سے کہہ دو کہ اپنی حد میں رہے  
شاید اس کی آنکھ کھل چکی تھی جو ہماری آخری ملاقاتوں میں تو اسے پڑھتا تھا۔

میں ویلے دے بھٹھے اُنے  
میں کھنگر بیا  
وقت کے بجنے پر  
میں کھنگر بیا  
میں ہر اوکڑا جھلی  
میرے پیو دانیال درواز  
میرا نام مُصلیٰ  
میرا باب درواز  
میرا نام مُصلیٰ

میں نے وہ کاغذات کا لفافہ تھا اور اسلام آباد میں ایک ہارسو رخ سیاسی شخص کے حوالے کیا جس سے ہوتا ہوا وہ پارٹی کی اعلیٰ کمان تک پہنچ گیا۔ بی بی ایک الم ناک حادثے کا شکار ہو چکی تھی لیکن اس کی پارٹی اقتدار میں تھی۔ چناں چہ میں مطمئن ہو گیا۔  
چند مہینوں بعد مجھے اسلام آباد چھوڑ کر کراچی جا بسنا پڑا۔ بیچ میں ایک آدھ مرتبہ مختصر بات ہوئی۔ اس کا بیٹا تب تک بے روزگار تھا اور اس کی ملازمت کا معاملہ کھٹائی میں نظر آتا تھا۔ اس کی ذاتی خواہش ہنوز تک تکمیل تھی۔ بڑے شہر کی مصروفیات نے میرے شب و روز نگل لیے۔ مینے گزر گئے۔ میرا رابطہ شاعر سے مکمل کٹ چکا تھا۔ سوچتا تھا کہ اسلام آباد جانا ہوا تو جہلم جا کے مل لوں گا۔  
طویل وقفے کے بعد اسلام آباد جانا ہوا۔ میں حسب معمول نئی کتب کی تلاش میں جناح سہر میں واقع کتابوں کے شوروم سعید بک بینک کی بالائی منزل میں کتابیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر شاعری کی ایک کتاب پر پڑی۔ ”ساڈے جتھ اگنی داتا“ شاعر کا نام نصیر کوئی تھا۔ مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ ہماری آخری ملاقات تک نصیر کا شعری سرمایہ کتابی صورت میں نہ آیا تھا۔ میں نے اشتیاق سے کتاب اٹھائی تو اندر سے ایک کارڈ گر پڑا۔ اس پر لکھا تھا۔  
”ایک اہم گزارش۔“

آپ جانتے ہیں کہ صاحب کتاب جناب نصیر کوئی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہیں اور شوکت خانم ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ ان کے علاج پر بے تحاشا اخراجات کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کی پہلی کتاب کا ان کے دست خطوں سے جاری شدہ یہ ”خصوصی ایڈیشن“ تمام احباب اور مداحین نصیر کوئی اصل قیمت کے بجائے ایک ہزار روپے میں خریدیں گے۔ تاکہ حاصل شدہ رقم ہمارے محبوب شاعر کے علاج معالجے پر خرچ کی جاسکے۔

تمام احباب سے اس مہم میں نصیر کوئی کی صحت یابی کی دعا کے ساتھ شمولیت کی درخواست ہے۔

من جانب

حبیب کوئی

میرے لیے ایک اندوہ ناک خبر تھی۔ میں نے بے چین ہو کر نصیر کوئی کا نمبر ملایا تو وہ بند ملا۔ چناں چہ ایک مشترکہ شناسا سے رابطہ

کیا۔ وہ تفصیل بتانے لگا۔ چند جیلے سن کر میرا دماغ ماؤف ہو گیا اور میں نے فون بند کر دیا۔ میری چشم تصور میں ایک ہنستا مسکراتا ہڈ ہڈی شاعر  
آنکھیں موندے مخصوص لے میں اپنے اشعار پڑ رہا تھا اور کیف و جذب میں جھوم رہا تھا۔

حقیقت کچھ اور تھی

نصیر کوئی ہسپتال کے ایک کمرے میں گم نامی، غربت اور بے چارگی کی موت مر چکا تھا اور اُس کا تیشہ اُسی کے سینے میں گڑ چکا  
تھا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

# دوسرا آدمی

جاوید چودھری





جاوید چودھری نے کہا "میں بے بس نالائق اور لاچار تھا۔ میرے پاس صرف دو ہتھیار تھے۔ اللہ کا کرم اور ان تھک محنت۔" پھر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی، اسلام آباد بھگینے لگا، مارگلہ روڈ کے درختوں، سیلوں، پودوں اور گھاس کا رنگ حریہ بنز ہو گیا، مارگلہ کی پہاڑیاں ہمارے سروں پر جھکی تھیں، تاحہ نظر دھند تھی، بارش تھی اور شام تھی، میں مارگلہ کی پہاڑیوں، مارگلہ روڈ کے فٹ پاتھوں اور ایف سیون اور ایف ایٹ کے بوڑھے درختوں اور ایف سکس کے سبزہ زاروں اور ان سبزہ زاروں کی گیلی سبز گھاس کا عاشق ہوں، یہ چاروں مل جائیں تو یہ مجھے دور لے جاتی ہیں۔ دور اس جگہ جہاں سے جنت کی سرحد شروع ہوتی ہے، وہ دن بھی میری زندگی کا نایاب دن تھا۔ اسلام آباد تھا، بارش تھی، شام تھی، مارگلہ کی پہاڑیاں تھیں۔ دھند میں لپٹی ہوئی سڑک تھی اور ہم دونوں تھے۔ ہم آہستہ آہستہ ایف سکس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ "میرے پاس صرف دو ہتھیار تھے، اللہ کا کرم اور ان تھک محنت کا جذبہ، میرے پاس آج بھی محنت اور اللہ کے کرم کے سوا کچھ نہیں۔" جاوید کی آواز میں معمول سے زیادہ اداسی تھی، مجھے اس کی اداسی نے جکڑ لیا، میں نے فوراً اس کی طرف دیکھا، بارش صرف باہر نہیں تھی، بارش اس کے اندر بھی تھی۔ آس پاس کی پلکوں کے کونوں سے نکل کر بارش کے قطرے مل رہے تھے، یہ دونوں ملتے تھے، اس کی ٹھوڑی تک پہنچتے تھے اور پھر اس کے سینے، اس کی گیلی قمیص پر گر جاتے تھے، میں نے اسے زندگی میں دوسری بار روک دیکھا، پہلی بار اس کی آواز میں خج تھی جب کہ دوسری بار وہ آہستہ آہستہ رو رہا تھا، پھلتی ہوئی موسمِ باری کی طرح نرم اور مسلسل۔ وہ پہلی بار کب روایا، یہ بعد کی بات ہے۔ "میری زندگی کے دو دور ہیں، پہلا دور 1990ء تک تھا اور دوسرا 1990ء سے اب تک۔" وہ گویا ہوا، "میں 1990ء تک عام لوگوں سے بہت پیچھے تھا، مجھ میں زبان سیکھنے کی اہلیت نہیں تھی۔ میں ایک وقت میں صرف ایک زبان لکھ اور بول سکتا ہوں۔ تم نے محسوس کیا ہوگا میں جب بھی اردو بولتے ہوئے انگریزی کا لفظ بولتا ہوں تو اس کی آواز غلط ہوتی ہے۔ میں پھر رکتا ہوں، وہ لفظ درست کرتا ہوں اور پھر بولتا ہوں۔ یہ فطری نقص ہے، گاؤں میں پیدا ہوا، سکول جانے والا خاندان کا پہلا بچہ تھا، خاندان سکول اور تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتا تھا، ہم لوگ کلچرلی اچھے تھے، میرے والد نے میرے بچپن میں گاؤں چھوڑ دیا۔ ہم شہر آ گئے، والد نے کاروبار کیا اور بے تحاشا پیسہ کمایا لیکن ہمارا رہن سہن، طرز گفتگو اور کلچر دیہاتی رہا۔ میرے والد دوستوں کے خلاف تھے، وہ سمجھتے تھے دوست انسان کو برباد کر دیتے ہیں چنانچہ والد کا کوئی دوست تھا اور نہ ہی انھوں نے ہمیں کوئی دوست بنانے دیا۔ ہمارے گھر میں ڈرائنگ روم بھی نہیں تھا، والد نے بنایا ہی نہیں تھا، وہ سمجھتے تھے گھر میں بیٹھنے کی جگہ ہوگی تو ان کے بیٹے دوستوں کو گھر بلائیں گے اور یوں یہ بری صحبت کا شکار ہو جائیں گے۔ میرے والد دنیا کے ہر شخص کے خلاف تھے، یہ آج بھی اپنی ذات کے علاوہ سب کے خلاف ہیں، یہ سخت بھی تھے، ہلکی بھی تھے اور منفی بھی تھے لیکن اس کے باوجود یہ میرے آئیڈیل تھے، کیوں تھے؟ اس کی وجہ ان کی خوبیاں تھیں۔ میں نے زندگی میں ان سے زیادہ رسک لینے والا شخص نہیں دیکھا۔ یہ آگے بڑھتے تھے اور بڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔ یہ اپنے محدود دائرے میں اچھے خاصے انقلابی تھے۔ یہ ایسے نہ ہوتے تو شاید ہم لوگ کبھی گاؤں سے باہر نہ آتے، اگر ہم آ جاتے تو شاید ہم لالہ موسیٰ سے نہ نکل پاتے۔ ہم اسلام آباد تک نہ پہنچتے، یہ سب ان کی مہربانی اور آگے بڑھنے کی لگن تھی جس کے باعث ہمارا خاندان لالہ موسیٰ کے چھوٹے سے گاؤں شاہ سرمست سے اسلام آباد آیا اور ہم نے خوش حالی اور اطمینان کے ذائقے چکھے۔" بارش تیز ہونے لگی سردی میں بھی اضافہ ہو گیا لیکن میں جاوید کے تسلسل کو نہیں توڑنا چاہتا تھا لہذا میں چپ چاپ اس کے قدم سے قدم ملاتا رہا، وہ گویا ہوا "میرا پورا بچپن احساس کتری، حساسیت اور محرومی میں گزرا۔ میں چپ رہتا تھا، جسمانی طور پر کمزور تھا لہذا بزدل بھی تھا۔ بولتے ہوئے زبان لڑکھاتی تھی اور لوگوں کے سامنے کھڑے ہونے وقت ناگئیں کا ہنسی تھیں۔ میں پڑھائی میں بھی کمزور تھا، بیک بنچر تھا، استادوں سے روز مار کھاتا تھا، استادوں کی مار نے میرا ہاسبا اعتماد بھی توڑ دیا، میں احساس کتری سے شدید احساس کتری میں چلا گیا۔ میں آج بھی جب کسی ٹیچر کو دیکھتا ہوں یا کوئی صاحب استاد کی حیثیت سے اپنا تعارف کراتے ہیں تو خوف سے میری گردن میرے سینے اور میری بغلوں میں پسینہ آ جاتا ہے۔ میں اکثر لوگوں کے انٹرویو دیکھتا یا پڑھتا ہوں اور جب وہ بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں میں آج جس مقام پر ہوں یہ میرے اساتذہ کی محنت اور شفقت کا نتیجہ ہے تو مجھے ان پر بہت رشک آتا ہے کیوں کہ میری زندگی میں کوئی ایسا استاد نہیں تھا جس نے



اور کمرے میں لیٹ کر پڑھتے رہنا، میں لوگوں کے مذاق کی وجہ سے کلاس میں بھی نہیں جاتا تھا۔ میں اکثر ادات پورے شہر کا پیدل چکر لگاتا تھا۔ یہ سلسلہ 1990ء تک جاری رہا۔ میرا اس دوران ایک بزرگ خاتون استاد کے ساتھ جعلی سیکنڈل بھی بن گیا، یہ سیکنڈل 'میں سال طویل نفرت کا بوجھ اور نہ ختم ہونے والی اذیت یہ تمام چیزیں مجھے وہاں لے گئیں جہاں انسان بنجیدگی سے خودکشی کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ میں روزانہ خود کو ہلاک کرنے کے بارے میں سوچنے لگا لیکن بزدلی آڑے آ جاتی۔ میں نے ایک دن کوشش بھی کی۔ میں نیند کی گولیاں کھا گیا۔ میرے روم میٹ مجھے ہسپتال لے گئے، میرا حیدرہ صاف ہوا، میں نے آنکھ کھولی تو وہاں سے میری زندگی کا نیا دور شروع ہو گیا، وہ خاموش ہو گیا، مارگلہ رو تھی، شام تھی، ہلکی ہلکی بارش تھی اور جاوید تھا۔ ایک دوسرا جاوید چودھری جس سے دنیا واقف نہیں تھی۔ میں حیرت سے اس دوسرے جاوید چودھری کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا "میں نے اس دن پرانے جاوید چودھری کو قتل کیا اور بہادر پور میں دفن کر دیا۔ میں اٹھا، بہادر پور سے لاہور آیا، پنجاب یونیورسٹی کے ایک دوست سے اس کا کمرالیا، جرنلزم ڈیپارٹمنٹ گیا، صحافت کی کتابیں نکلوائیں اور نوٹس بنانا شروع کر دیے۔ پنجاب یونیورسٹی کے جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں ایک استاد ہوتے تھے شفیق جالندھری۔ میں ایک دن 25 صفحے لکھ کر ان کے پاس چلا گیا، میں نے انہیں وہ 25 صفحے دکھائے اور ان سے پوچھا "اگر آپ کے پاس یہ سوال چیکنگ کیلئے آئے تو آپ کتنے نمبر دیں گے"۔ شفیق جالندھری نے کاغذ دیکھے اور بولے "میں 20 میں سے 19 نمبر دوں گا لیکن کوئی شخص آدھ گھنٹے میں 25 صفحے لکھ نہیں سکتا"۔ یہ ایک فقرہ میری نئی زندگی کی بنیاد بن گیا۔ میرے ہاتھ نہ سٹو آ گیا، میں سمجھ گیا میں اگر 30 منٹ میں 25 صفحے لکھتا سیکھ لوں تو میں 20 میں سے 19 نمبر لے سکتا ہوں۔ میں نے اس کے بعد اپنے تمام مضامین کے نوٹس بنائے، نوٹس کو رٹا لگایا اور پھر تیزی سے لکھنے کی پریکٹس شروع کر دی۔ میں چوبیس گھنٹے میں سے 18 گھنٹے پریکٹس کرتا تھا، رٹا لگاتا تھا اور لکھتا تھا یہاں تک کہ میں 30 منٹ میں 35 صفحے لکھنے لگا۔ امتحان کا وقت آیا تو میں واپس بہادر پور آ گیا۔ میں نے پیپر زدے اور یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کر لی۔ یہ حیران کن واقعہ تھا۔ کلاس کے تالائق ترین طالب علم نے پہلی پوزیشن حاصل کر لی، کوئی یقین کرنے کیلئے تیار نہیں تھا لیکن میں نے زندگی کا سٹو کیا جان لیا تھا، میں نے معلوم کر لیا تھا آپ اگر روزانہ 18 سے 20 گھنٹے کام کریں اور آپ کے کام میں تسلسل ہو تو آپ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا کام یابی، دو لفظوں کا مجموعہ ہے کام اور یابی۔ آپ اگر یاب ہونا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو کام کرنا پڑے گا، میں نے اگلے سال بھی "کام کیا اور اس سال بھی "یاب" ہو گیا، میں نے دوسرے سال بھی پہلی پوزیشن حاصل کر لی، یہ میری زندگی کا اہم موڑ تھا۔ میں نے اس کے بعد اللہ کے شکر اور محنت کو اپنا اوڑھنا بچھوٹا بنالیا۔ اُس کے بعد کا قصہ انگریزی محاورے کے مطابق تاریخ ہے۔

وہ ایک خود پرداز خد فن کار ہے۔ کام یاب لوگوں کو قدرت چند ملاحتیں دیگر لوگوں سے بڑھ کر عطا کرتی ہے۔ اُس کی یادداشت بے پناہ اور بروقت ہے اور لوگوں کی پہچان بہت اچھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم کسی ایسے شخص سے ملے جو سکلے میں گرفتار تھا۔ اُس کی روداد اُس کی بے گناہی کی دلالت کرتی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد جاوید نے محتاط انداز میں اُس کی بے گناہی، دو غلطے پن یا ملوث ہونے کے بارے میں اپنی مدلل رائے دی۔ بعد ازاں وہ رائے، اُس کہانی اور کردار کے انداز و اطوار کے برعکس، درست ثابت ہوئی۔ واقعات کی عمومی پیش بینی بھی اُسے قدرت کا تحفہ ہے۔ یادداشت تو اُس کی حیران کن حد تک غیر معمولی ہے۔

تعلیمی طور پر یک دم کام یابی حاصل کر لینے کا معاملہ اور بعد ازاں محنت کو کو طرہ بنالینے کی روایت انوکھی نہیں۔ عام زندگی میں ایسے طالب علم بھی نظر آتے ہیں جو آٹھویں نویں درجے یا پھر کالج میں تعلیمی طور پر یک دم کام یاب ہو گئے، باعزت کام یابی کو ایک جست میں حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ مکمل طور پر بدلی جاتے ہیں۔ محنتی، ذہین اور کام یاب طالب علم ثابت ہوتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک جھٹکا یا کام یابی کا ایک معمولی انجکشن اُن کا اعتماد بحال کر کے انہیں فنی طور پر بڑا اعتماد اور توانا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس ابتدائی طور پر کام یاب طالب علم سٹائش اور غیر معمولی اعتماد کے بوجھ تلے دب کر بعد کے امداد میں ناکام ہو کر ایسا اعتماد کھوٹے ہیں کہ پھر اٹھ نہیں پاتے۔



اولین معاملے میں اعتماد بحال ہونے کے علاوہ کامیاب ہونے کی بے پناہ تڑپ اور جذبہ بھی اہم ہوتے ہیں۔ نہ بچنے والی پیاس اور مسلسل کوشش۔ اس کے علاوہ ہمارے طویل تعلق میں میں نے جاوید کو حد درجہ حساس، صاف گو اور منکسر الخواج انسان پایا ہے۔ اسے میں نے حقیقی طور پر لوگوں کی پریشانیوں پر ڈکھی ہوتے دیکھا ہے اور ملکی حالات پر رنجیدہ۔ وہ ترقی یافتہ ممالک سے واپسی پر پورے غلوں سے وہاں کی غریبوں کو یہاں پر عملی شکل میں دیکھنے کی تڑپ رکھتا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے ماں کا دل رکھتا ہے اور بھائیوں کے لیے باپ کا۔ اپنی بیوی کا ہم درد اور بے لوث ساتھی ہے۔ البتہ کسی کی زیادتی ایک حد تک برداشت کرتا ہے، اگر حد سے بڑھ جائے تو ناراضی صورت میں اظہار کر کے دل صاف کر لیتا ہے۔ یہ اسی زرخیز نرم دل کی خوبی ہے کہ اس میں خیال کے قح خوب صورت کوئلوں کی شکل میں سر نکالتے ہیں، بھلتے پھولتے ہیں اور دل پذیر بدل الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

ہمارے طویل تعلق میں میں نے جاوید کو حد درجہ حساس، صاف گو اور منکسر الخواج انسان پایا ہے۔ اسے میں نے حقیقی طور پر لوگوں کی پریشانیوں پر ڈکھی ہوتے دیکھا ہے اور ملکی حالات پر رنجیدہ۔ وہ ترقی یافتہ ممالک سے واپسی پر پورے غلوں سے وہاں کی غریبوں کو یہاں پر عملی شکل میں دیکھنے کی تڑپ رکھتا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے ماں کا دل رکھتا ہے اور بھائیوں کے لیے باپ کا۔ اپنی بیوی کا ہم درد اور بے لوث ساتھی ہے۔ البتہ کسی کی زیادتی ایک حد تک برداشت کرتا ہے، اگر حد سے بڑھ جائے تو ناراضی صورت میں اظہار کر کے دل صاف کر لیتا ہے۔ یہ اسی زرخیز نرم دل کی خوبی ہے کہ اس میں خیال کے قح خوب صورت کوئلوں کی شکل میں سر نکالتے ہیں، بھلتے پھولتے ہیں اور دل پذیر بدل الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

جاوید چودھری کی تین جگہ ترقی اور پیشہ ورانہ جہتیں ہیں۔ پہلا وہ جو صرف کالم لکھتا تھا، قاری کے اور مصنف کے درمیان پردہ اسرار کی وجہ سے خاص احترام کا حامل تھا۔ دوسرا وہ جو ٹیلی ویژن پر آیا۔ اسرار کی دھند چھٹنے کی وجہ سے گو اس کی پہنچ پہلے سے بڑی فاصلہ گھٹا سوتھیدا اور نکتہ چینی کا ریچھ لمبی نیند سے بیدار ہوا۔ تیسرا درجہ سوشل میڈیا کا روپ ہے۔ اس میں کالم نگار آئیڈیل سٹ جاوید چودھری 'کل تک' کے قہر کو نقادوں اینکر جاوید چودھری کی جگہ دوراندیش کاروباری صحافی کا ظہور ہوتا ہے جس کی نظر میں ایسے سیکڑوں معروف صحافی اور دانش ور ہیں جو کسمپرسی میں فوت ہوئے اور غربت کی اجتماعی قبر میں دفن ہیں۔

اس کی شخصیت کا ایک رخ اور ہے جسے اس کے قریبی ترین چند دوست جانتے ہیں یا اہل خانہ۔ یہی اصل جاوید چودھری ہے۔ جاوید فطرتاً الگ تھلگ آدمی ہے۔ صحافت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے اسے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے مگر نہ سماجی سطح پر اس کے زیادہ دوست نہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ احباب کے گھروں پر آنا جانا نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس کا اصل روپ وہ ہے جس میں وہ حب آتا ہے جب وہ کالم لکھتا ہے، سوچتا ہے یا قریبی احباب کے ساتھ ہوتا ہے۔ گویا وہ ماہرٹ لوئی اسٹیونس کے معروف کردار ڈاکٹر جیکال کی طرح ذاتی زندگی میں مختلف انسان ہوتا ہے اور لوگوں سے ملتے ہوئے کچھوے کی طرح اپنے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ لوگ اس خول ہی کو جاوید چودھری سمجھ لیتے ہیں۔

جب اس نے ماسٹرز میں گولڈ میڈل لیا تو کلاس فیوز اور اساتذہ کو اس کے گولڈ میڈل لینے پر یقین نہ تھا۔ اس نے کالم نگاری شروع کی تو بہت سے احباب کا خیال تھا یہ کالم جاوید چودھری جیسا پینڈ نہیں لکھ سکتا۔ یہ وہ عام لوگ تھے جو جاوید سے ملتے تھے اور اسے ہی جاوید چودھری سمجھ بیٹھتے تھے۔ وہ یہ نہ جانتے تھے کہ جب جاوید قلم اٹھاتا ہے اور اپنے اندر اتر جاتا ہے تو یہ کوئی اور آدمی ہوتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی!

وہ کئی برسوں سے پاکستان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار ہے، فیس بک پر اس کے قارئین کی تعداد تیس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ وہ پاکستان کا سب سے بڑا نیوز پورٹل بھی چلا رہا ہے اس کی ویب سائٹ [javedch.com](http://javedch.com) کے روزانہ وزیٹرز 25 لاکھ ہیں اس کی کتاب "تزمیر و پوائنٹ" کا پہلا حصہ تین سوائڈیشن سے زیادہ شائع ہو چکا ہے یہ ایک ریکارڈ ہے۔ "تزمیر و پوائنٹ" کے بقیہ حصے بھی فروخت



میں ہلکی سیل پر پہلے نمبر پر موجود ہیں، اُس کا پروگرام ”کل تک“ اپنے ناٹم سلاٹ کے تمام پروگراموں میں پہلے تین نمبروں پر چلا آ رہا ہے۔ گویا وہ پرنٹ میڈیا میں پہلے نمبر پر کتابوں کی اشاعت میں بیسٹ سِلر، سوشل میڈیا پر تمام جنوبی ایشیا کے صحافیوں میں پہلے نمبر پر، الیکٹرانک میڈیا میں ہینڈرڈ میں مقبول ترین لوگوں کی صفِ اول میں کھڑا ہے۔ گویا ابلاغ کے سبھی ذرائع میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر رکھی ہے۔ قصباتی تہذیب کا ایسا شخص جس کے خاندان میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا، جو آج بھی پنجابی لب و لہجہ میں شین قاف کی غلطیاں کر جاتا ہے اور انگریزی بولنے ایک لکھ جاتا ہے، اس میں ایسی کیا بات ہے جس نے اُسے کروڑوں لوگوں میں مقبول کر رکھا ہے۔ اُس نے ایک گاؤں سے نکل کر، قلم کے دور پر، اردو زبان میں ایسی کامیابی حاصل کی ہے جو ہر عام پاکستانی لڑکے کے لیے اُمید کی عملی شکل ہے۔ میں کہتا ہوں حدیثِ دل بیان کرتا ہوں، کچھ اپنی کہتا ہوں، کچھ اُس کی سناتا ہوں، دنیا کے لیے جاوید چودھری اور میرے لیے جاوید۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ سرسبز و گل و گلزار اسلام آباد میں بہار کی چمکیلی نیم سر صبح تھی۔ میں اور جاوید مارگلہ روڈ سے میر سوہاؤہ کے لیے پیدل مارگلہ پہاڑ کی پتھریلی، خشک جھاڑیوں والی پر مشقت چڑھائی چڑھ کر ہانپ گئے تھے۔ نصف رستے میں سانس لینے کے لیے ہم ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے ہزرے کے غلاف میں لپٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا، جنگلی پھولوں پر بھونرے تھے یا سکون بخش خاموشی میں ہوا سرسرا رہی تھی۔ جب ہمارے پسینے سے تر بدلوں پر تازہ ہوا اپنی نرم انگلیاں پھیرنے لگی تو ہلکی ٹھنڈک کا ویسا ہی احساس ہوا جیسا نیم سرد ہوا میں پسینہ خشک ہونے پر ہوتا ہے۔ جاوید خاموشی سے سامنے دیکھنے لگا اور میں ہزرے کی کچی مہک کو شام جاں میں اتارنے لگا۔

مارچ کی اس دھمکی صبح پہاڑیوں کے سائے میں ہزرے کے غلاف پر بیٹھ کر میں نے اُس سے پوچھا تھا، نیم خواندہ وہی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود تمہارے اندر ایک توازن، سوچ میں جدت اور زندگی کے معاملات میں ایسی شائستگی جو برسوں کی تربیت سے آتی ہے کیوں کر موجود ہے؟ وہ مسکرایا اور مجھے دیکھ کر کہا ”یہ اللہ کا کرم ہے۔“ یہ اُس کا نکیہ کلام بھی ہے اور یقین بھی۔ سو میں نے مزید ٹٹولا تو اُس نے قصوں کی پٹاری کا منہ کھولتے ہوئے کہا ”میں نے پہلے دن سے یقین کر لیا تھا مجھے کچھ نہیں آتا اور میں نے ابھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ سو جب مجھے کسی کی کوئی چیز اچھی لگتی ہے تو میں اُسے اپنانے کی کوشش کرتا ہوں، کوئی نئی بات پڑھنے دیکھنے کو ملتی ہے تو اُسے سمجھنے کی کوشش دل و جان سے کرتا ہوں۔ جہاں تک مزاج میں سادگی کا تعلق ہے تو یہ مجھے میری دادی سے وارثت میں ملی ہے۔“

”دادی؟!“ میں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا تو اُس نے مجھے اپنے بچپن کی بہت سی باتیں سنائیں۔ میں کچھ پہلے جانتا تھا، کچھ اُس صبح معلوم ہوئیں۔ مارچ کی وہ صبح جب سفید کپاس کے پھولوں کے ایسے باد مارگلہ کی پہاڑیوں پر اپنا سایہ ڈالتے خیلے بے اتھاہ آسمان پر تیرتے پھستے چلے جا رہے تھے، اس وقت دو بندے دھبوں کی مانند ہزرے میں محدود ہو رہے تھے۔

اُس صبح جاوید نے میرے سامنے چند لوگوں کا بہت پیار سے تذکرہ کیا۔ وہ جنھوں نے اُسے تب عزت اور توجہ بخشی جب وہ ایک گم نام صحافی تھا، اُن میں سر فہرست الطاف گوہر ہیں۔

”الطاف گوہر کی شخصیت میں ایک سکون اور گھر کے ماحول میں ٹھیراؤ تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک پڑھے لکھے دانش ور تھے۔ اُن کی لائبریری میں عمدہ کتابیں اُن کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتی تھیں۔ جب میں نیا نیا صحافت میں آیا تو مجھے نہ لباس پہننے کا صحیح ڈھنگ تھا اور نہ ہی طبقہ اشرافیہ میں نشست و برخاست کا سلیقہ۔ الطاف گوہر ایوب خان کے دور کے طاقت ور ترین بیورو کریٹ رہے تھے۔ بڑے آدمی کا اہم جوہر اس کی عاجزی اور سادگی ہوتی ہے۔ چنانچہ الطاف صاحب مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے۔ یوں نستعلیق انداز میں مدلل گفت گو کرتے کہ باتیں سیدھی دل میں اتر جاتیں۔ وہ پرانے خاندانی لوگوں کے انداز میں زندگی گزارتے۔ اپنی بیگم کے ساتھ صبح ناشتا کرتے اور میاں بیوی آپس میں باتیں کرتے ہنسوں کا جوڑا دیکھتے۔ میں اُن کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا، اُن سے سیکھنا چاہتا تھا سو میں نے اُن کو پیش کش کر دی کہ میں اُن کی زیر تالیف کتاب کے ریکارڈ کی تلاش اور اسے تحریر کرنے میں اُن کی معاونت کروں گا۔ چنانچہ مجھے ان کے ساتھ

وقت گزارنے کا خاصا موقع مل گیا۔ ان کے متعلقہ حوالہ جاتی ریکارڈ پر مجھے اس حد تک عبور ہو گیا کہ کئی مواقع پر جب وہ بھول جاتے تو میں ان کو لقمہ دے کر یاد دلادیتا۔ یوں میرے دل پر ان کی متانت اور شہینگی کا دائمی نقش موجود ہے۔ اسی طرح ابتدائی دور میں جاوید اقبال (کارٹونسٹ) نے بھی بہت محبت اور عزت دی۔ جب انسان کسی مقام پر پہنچ جائے تو بیش تر لوگ لحاظ کرتے اور عزت دیتے ہیں۔ انسان کا اصل غرض بھی سامنے آتا ہے جب وہ کسی عام بندے کو عزت دے۔ "جاوید نے سوچتے ہوئے کہا۔

ممتاز مفتی ایک منفرد آدمی تھے۔ وہ اتنی توجہ اور شفقت سے پیش آتے کہ جاوید کو اپنے اہم ہونے کا احساس ہونے لگتا۔ ان دنوں وہ اپنی آخری کتاب "تلاش" پر کام کر رہے تھے۔ سوانحوں نے جاوید کے ذمہ کام تفویض کیا کہ یہ ان کے لیے متعلقہ مواد تلاش کر کے لائے۔ اس نے دل و جان سے ان کی معاونت کی۔

یہ بیمار کی وہی صبح تھی جب جاوید نے چند ایسے دوستوں کا نام لیا جو اس کے اوائل صحافت میں اپنی تمام تر مشرمانوں، کام یابوں اور توانائیوں کے ہم راہ اس کے ساتھ ناروا سلوک رکھے تھے۔ کوئی اس کے لباس کا مذاق اڑاتا تھا، کوئی انداز و اطوار کا۔ بعض تو ایسے بھی تھے جو احباب کے ساتھ مل کر اس پر جگت بازی کرتے اور خوب محفوظ ہوتے۔ یہ بے چارگی میں چپ چاپ سہتا رہتا۔

ابھی اس کے عملی زندگی میں ابتدائی دن تھے، عمر جو بیس پچیس برس کی تھی جب اسے طویل اندر دیو لینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اسے ایم اے کے دوران محنت کی عادت پڑ چکی تھی۔ اس نے ایک ریٹائرڈ پولیس افسر جو کالم نگار بھی تھے سے انٹرویو کی درخواست کی۔ وہ صاحب آمادہ ہو گئے اور انھوں نے روزانہ صبح سویرے کا وقت طے کر دیا۔ اب جاوید فجر سے پہلے صبح صادق کے وقت اپنے گھر راول ٹاؤن سے پیدل چلتا ہوا اسلام آباد پہنچتا۔ اس دور میں وہاں سے کوئی ویگن اتنی صبح نہیں چلتی تھی سو وہ کئی میل پیدل چل کے آب پارہ اور وہاں سے ویگن پر اُن صاحب کے ہاں پہنچتا۔ سردیوں کے دن تھے۔ دھند آلودہ ٹھہرتے ماحول میں سر پر ٹوپی پہنے، گردن پر مفلر اور جسم پر جیکٹ ڈالے جب وہ اُن صاحب کے ہاں پہنچتا تو وہ اپنے لیے گرم گرم چائے منگوا لیتے اور اسے لکھوانا شروع کر دیتے۔ اگر دل میں ہم دردی آ جاتی تو اسے بھی چائے پوچھ لیتے۔ جاوید، جلدی میں کئی مرتبہ ناشتے کے بغیر خالی پیٹ آ جاتا۔ ایک مرتبہ یہ بیٹھنا اپنے ساتھ لے گیا۔ جب چائے آئی تو یہ اس کے ساتھ بن کھانے لگا۔ اُن صاحب نے اچھا خاصا امنایا۔ اُن کے مزاج میں درشتی اور تلون کا یہ عالم تھا کہ اگر جاوید دس بارہ منٹ بھی لیٹ ہو جاتا تو وہ ملنے سے انکار کر دیتے اور یہ گیٹ سے ٹوٹے قدموں واپس لوٹ جاتا۔ کئی دنوں کی تپسیا کے بعد اس صاحب نے انٹرویو جاری رکھنے سے معذرت کر لی۔ یوں ساری محنت اکارت گئی۔

ہماری پہلی ملاقات ایک نجومی کی وساطت سے ہوئی تھی۔ لاہور کے نجومی کا بھی دل چپ واقعہ ہے۔ مطیع الرحمان ایک انوکھا نجومی تھا۔ وہ ہر وقت چوکنا رہنے والی باتوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اپنا اچھا خاصا جاجا یا روزگار کا سلسلہ چھوڑ کر نجوم کا کاروبار سجا بیٹھا تھا۔ اس نے لاہور چھاؤنی میں ریلوے اسٹیشن کی بغل میں اپنی چھوٹی سی نجوم گاہ قائم کر رکھی تھی۔ ایک روز ایک لڑکا اس کے پاس آیا۔ مطیع ابھی فارغ تھا چنانچہ نجوم کے معاملات کے دوران دیگر موضوعات پر بھی بات چل نکلی۔ باتوں باتوں میں لڑکے نے ایک ایسے موضوع پر بات چھیڑ دی جس نے مطیع کو چونکا دیا۔ وہ موضوع آواگون، جنموں کے سلسلہ کا تھا۔ لڑکا اس معاملے میں خاصی دل چسپی رکھتا تھا اور اس نے آواگون پر خاصا پڑھ لکھا تھا۔ لڑکے نے حساب لگاتے مطیع الرحمان سے جھجکتے ہوئے متذبذب لہجے میں پوچھا "میرا کون سا جنم ہے؟" مطیع الرحمان نے کن اکھیوں سے باہر کی جانب دیکھا اور لڑکے کے کان میں سرگوشی کی۔ "چھنا ابراہم مہربانی اس بات کا باہر نہ کرہ نہ بھیجے گا ورنہ لوگ میرے دفتر کو آگ لگا دیں گے۔" لڑکے نے معصومانہ حیرت سے پوچھا "ادھر سے کوئی پچاس کلویٹر پر امرت سر واقع ہے جہاں لوگ جنموں پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا سرحدیں حقائق بھی بدل دیتی ہیں؟ ادھر ہمارے ہم سائے چمن میں لوگ زندگی بعد از موت پر یقین نہیں رکھتے، وہ ہمیں اتنا ہی سادہ دل سمجھتے ہیں جتنا ہم مشرقی سرحد کے پار والوں کو۔ یہ تو سمجھ اور تلاش کے معاملے ہیں۔" مطیع الرحمان نے توجہ سے بات سن کر اسے ایسے چند ذاتی

واقعات سنائے جن میں لوگ آواگون کے بارے میں دریافت اور انکشاف کرتے اس تک آپہنچے اور ہر نکل کر خوف اور بے یقینی کی وجہ سے خاموش رہے۔ اس کے بعد دونوں میں ایک دوستانہ تعلق قائم ہو جاتا ہے جس میں کئی نشستیں ہوتی ہیں۔ ان نشستوں میں ایسے تجربات بھی رپہ بحث آتے ہیں جن سے بہت لوگ عام زندگی میں گزرتے ہیں۔ انہی میں Dejavu (التباس) کا تجربہ ہے جس میں ایک فرد کسی وقت، تجربے یا مقام سے گزرتے وقت سمجھتا ہے کہ وہ واقعہ اس کے ساتھ پہلے ہو چکا ہے یا اس مقام پر وہ پہلے بھی آچکا ہے۔ یہ اپنائیت یا دہراپا غیر مشتبہ ہوتا ہے۔

آواگون پر یقین رکھنے والوں میں مسیحی، یہودی، اور دیگر مذاہب کے عالم گیر شہرت کے حامل دانش ور شامل رہے ہیں جن میں جیمز فرینکلن، مارکن ٹوئن، لیوناسٹائی، نیولین یونا پارٹ، نطشے، گوئے، سقراط، کارل یونگ، والٹر، شوپنہار اور گوگین جیسے شان دار فن کار، فلسفی اور لیڈر شامل تھے۔

بعد ازاں مطبع الرحمان دست شناسی کے حوالے سے ایک کتاب تحریر کرتا ہے جس میں آخری باب میں اپنی زندگی کے دل چسپ باتوں اور لوگوں کا ذکر کہانیوں کی صورت میں کرتا ہے۔ انہی میں فسانہ طرازی اور مبالغے کے ساتھ وہ اس لڑکے کی کہانی بھی شامل کر دیتا ہے جو آواگون کے بارے میں تجسس ہوتا ہے اور اس واقعے کا شکار رہا ہوتا ہے کہ وہ موجودہ زندگی سے پہلے ایک بحر پور زندگی گزار چکا ہے۔ وہ کتاب اسلام آباد کا ایک نوجوان صحافی پڑھتا ہے۔ وہ صحافی مطبع الرحمان کا واقف ہے، سو کتاب پڑھ کر لاہور کے لڑکے کے بارے میں پوچھتا ہے۔ وہ لڑکا میں تھا اور اسلام آباد کا نوجوان صحافی جاوید چودھری۔

جاوید کی وجہ سے میرے کئی صوفی منش روحانی شخصیات سے روابط قائم ہوئے ہیں۔ ان میں سرفراز شاہ صاحب سرفہرست ہیں۔ ایک روز میں شاہ صاحب کی لاہور چھاؤنی سے پوسٹ برج کالونی کے قریب کی رہائش گاہ پر بیٹھا تھا۔ وہاں جاوید کا ذکر چل نکلا تو مجھ سے کہنے لگے۔

”ایک روز مجھے جاوید چودھری کا فون آیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ ہم نے وقت طے کر کے ملاقات رکھ لی۔ ملاقات میں خوب گپ شپ ہوئی۔ گفت گو کے دوران جاوید چودھری نے مجھے ایک لڑکے کا قصہ سنایا۔ وہ لڑکا چندرہ برس پہلے مجھ سے ملا تھا۔ تب وہ زندگی میں تنگ و دو کر رہا تھا۔ میں نے نہ صرف اُسے ایک مشورہ دیا بلکہ اسے ایک تاب ناک مستقبل کی یقین دہانی بھی کرائی۔ میری خوش کلامی اور حوصلہ افزائی سے وہ بے یقینی کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔ اُس نے میرے مشورے پر سوچا اور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔“

”وہ لڑکا کون تھا اور آپ نے اسے کیا مشورہ دیا تھا؟“ میں نے تجسس لہجے میں پوچھا۔

”وہ لڑکا ابھی صحافت کی عملی زندگی میں قدم رکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے مشورہ دیا تھا آپ رپورٹنگ اور ایڈیٹنگ کے بجائے کالم نگاری کا شعبہ اختیار کریں۔ مجھے واضح طور پر اُس کی کامیابی نظر آرہی تھی۔“ شاہ صاحب نے وضاحت کی اور بات جاری رکھی۔

”وہ لڑکا جاوید چودھری خود تھا۔ سچ تو یہ ہے میں اُس لڑکے کو بھول چکا تھا۔ اُس دور میں جب وہ بے یقینی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا، کم ہی لوگوں نے اُس کی اس طرح حوصلہ افزائی کی تھی۔ وہ میری جانب سے اُس پر اعتماد کرنے اور پیش بینی کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔“

سرفراز شاہ صاحب نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا ”چودھری ایک بہت اچھا کالم نگار اور صحافی تو ہے ہی مگر مجھے وہ ایک اور وجہ سے پسند ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ہر وقت مسکراتا، مذاق کرتا، تکلفتہ موڈ میں رہتا ہے۔ لوگ میرے پاس دکھ درد لے کر آتے ہیں اور رنجیدہ رہتے ہیں۔ چودھری کی زندگی میں بھی بہت مسائل ہوں گے مگر وہ اپنے دکھ اپنی پریشانی کا کبھی اظہار نہیں کرتا خوش رہتا ہے اور خوش رکھتا ہے اور مجھے اُس کا



جاوید نے پروفیسر رفیق احمد اختر کی دی ہوئی تسبیح کو حزن و غم سے بھر دیا تھا۔ اس نے اسے شراب سے پیسے کھانے دیے تھے۔ وہ ہر وقت زہر برب یہ تسبیح پڑھتا رہتا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے، گاڑی چلتے ہوئے، سفر کے دوران وہ یہ تسبیح پڑھتا رہتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ تسبیح سے اس کا اضطراب قابو میں رہتا ہے، ایک سکون اور ٹھیرا قائم رہتا ہے اور ذکر کی برکت کے باعث اس کی مشکلات کے حل نکل آتے ہیں۔

پروفیسر صاحب سے میری اپنی ملاقات نوے کی دہائی میں ان کے گورنمنٹ کے گھر میں ہوا کرتی تھی وہ اس وقت بھی خواہ میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے مگر ابھی عوامی سطح پر اتنے معروف نہ تھے۔ میں پہلی مرتبہ ایک پریشانی میں ان کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر میری پریشانی کی جڑ کو اپنی انگلیوں کی چنگی میں یوں پکڑ لیا تھا کہ میں دم بخود رہ گیا تھا۔ یقیناً اس میں ولایت اور روحانی کشف کا واضح عمل نظر آتا تھا۔

ایک مرتبہ میں جاوید کو کراچی کی معروف روحانی شخصیت اور آصف علی زرداری کے مقرب صوفی جلیل صاحب کے شان دار بیٹے پر لے گیا۔ وہاں کا ماحول بھی عجیب ہے۔ مجھ سا ہر وقت تشکیک کا شکار و سیاہ بھی چونک اٹھا تھا۔

صوفی صاحب سے جاوید نے اپنی ذاتی زندگی کا ایک مسئلہ بیان کیا۔ صوفی صاحب نے کچھ دیر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا اور دعا کی۔ پھر کہنے لگے آپ پر بندش ہے جو اللہ تعالیٰ کے کرم سے دور ہو جائے گی۔ اس کے بعد جاوید کی قمیص کی آستین تھامی اور اسے جھٹک دیا۔ اس میں نے آلاشیں، سپپاں اور ایک رنگ آلود آہنی تالہ باہر جھولی میں آن کرے۔

صوفی صاحب اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ میرے سامنے ایک دوست پر نحوست کا سایہ یوں ختم کر چکے تھے کہ اسے قمیص ابھر کر سامنے دیوار میں گڑے کیل پر ٹانگنے کا کہا تھا اور بنیان اور شلوار میں لمبوی دوست کے لیے دم درد کیا تھا۔ اس کے بعد اسے اپنی دور لنگی قمیص کو دیوار سے اتار کر جھاڑنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے یہ عمل کیا تو قمیص کی آستین اور دامن سے خفک بخت اور جسامت کے کیل، کانٹے، مردہ مچھلیاں وغیرہ پھڑکی تھیں۔

صوفی صاحب کے ہاں بارہا ایسے معاملات دیکھے جا چکے ہیں۔ یہ شعبہ بازی ہے، نظر کا فریب یا ولایت۔ واللہ اعلم بالصواب۔ میں صوفی صاحب سے متاثر ہوں لیکن جاوید نے مثبت رد عمل کا اظہار نہیں کیا وہ انہیں نارل لے رہا تھا۔

ایک شام ہم کراچی میں ایک شان دار بیٹے میں مقیم رئیس بزرگ کے ہاں بھی گئے تھے جن کا گھر ساتھ کی دہائی کا ایک شان دار اور ایسا وسیع بنگلہ تھا جو اس دور کی فلموں میں بھی نظر نہ آتا تھا۔ بڑے لان میں چھوٹی سی ندی پر پانی پلوں کی راہ گزر، ڈرائنگ روم کے ایک جانب شیشے کی دیوار کے پیچھے ایسا ساتھ کی دہائی سے بنا ہوا باغ جو مصنوعی درجہ حرارت اور بارش وحدت میں قائم تھا۔ گھر کے اندر وسیع زینے اور لاتعداد کھڑکیاں۔ کمر اور کمر۔ وہ صاحب ایوب دور میں پاکستان کے رئیس ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اب سب کا رو پار چھوڑ کر گوشہ نشینی میں عبادت و ریاضت اور مجاہدے کے سلسلے پر قائم ہو چکے تھے۔ انہوں نے بھی متاثر کن روحانی فیض کا دروازہ وا کر کے اس گورکھ دھندے کا نظارہ کر دیا تھا۔

ایک رات جاوید مجھے کراچی میں گلشن اقبال میں ایک ولی اللہ عظیم اختر صاحب کے آستانے پر لے گیا۔ وہ برگزیدہ ہستی نیم بے ہوشی کے عالم میں صاحب فراش تھے۔ اس پاس ایک ایسا ہجوم عاشقان تھا جو ان کی خدمت پر کمر بستہ تھا۔ ان کے چاہنے والوں میں مثالی امریکا اور برطانیہ سمیت دنیا کے کونوں سے خاصے پڑھے لکھے اکثر اور اسکالرز ان کے دیدار، عبادت اور خدمت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ بیماری کے باوجود وہ اسے ان کے پر نور چہرے پر سکون اور ٹھیرا نظر آتا تھا۔ دانائے راز کہتے ہیں کہ اللہ کے مقرب کو اپنی تسبیح کی نہ تو ذاتی وجوہ کی بنیاد پر



خواہش ہوتی ہے اور نہ ہی ضرورت۔ البتہ اجتماعی مفاد کے لیے سامنے آنا ایک ناگزیر ضرورت بن سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کی نشاندہی ممکن ہے ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو ان کی محفل اور قربت میں سکون محسوس ہوتا ہے۔ مزاج میں ٹھیکراؤ اور دل کو قرار سا آ جاتا ہے۔ ایک روز لاٹنگ ڈرائیو کے دوران میری اور جاوید کی مادرائی معاملات پر بات ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کے تجربات کے حوالے سے ایک دل چسپ واقعہ سنایا۔

بی بی کی ایک ٹیم پاکستان میں درگاہوں، ولیوں، پیروں، جوگیوں اور روحانی شخصیات پر ڈاکو میٹری بناری تھی۔ جاوید کا دفتر اور ادارہ ان لوگوں کی معاونت کر رہا تھا۔ وہ لوگ پاکستان کے طول و عرض پر چہرہ پھر کر عکاسی اور فلم بندی کرنے کے علاوہ لوگوں کے اثر و بر کر رہے تھے۔

اسی دوران انھیں خبر ہوئی کہ جنوبی پنجاب میں ایک صاحب روحانی کرامات کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ جب پوری ٹیم بہاول نگر کے قریب ایک نیم قصبائی علاقے میں جا کر ان صاحب سے ملی تو اس کے اراکین حیران رہ گئے۔ وہ سادہ سے آدمی تھے جو صاف تہ بند اور قمیص میں لمبوس تھے اور اوسط درجے کے دیہی پیشوں سے منسلک دھوبی، موچی یا حجام لگتے تھے۔ چوں کہ یہ لوگ تعارف کے ساتھ ملے تھے اس لیے اُن صاحب نے ٹیم کو ختمہ پیشانی سے بٹھایا، چائے پوچھی اور سادہ لہجے میں عمومی نوعیت کی گفت گو شروع کر دی۔ جب بات اُن کی روحانی رسائی تک پہنچی تو انھوں نے مسکرا کر خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر توقف کے بعد ان صاحب نے سب لوگوں سے کہا کہ وہ اپنی زندگی سے متعلق سوال لکھ کر پرچیوں کو فرش پر اُتار رکھ دیں۔ سب نے اپنے خاندان، ازدواجی زندگی اور دیگر ایسے معاملات جن کی صرف انہی کو خبر قی کاغذ کی پرچیوں پر لکھ کر انھیں اُتار رکھ دیا۔ اس کے بعد اُن صاحب نے ہولے ہولے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے سب کو اپنی اپنی پرچی اُٹھانے کا کہا۔ جب سب نے اپنی پرچیاں اُٹھائیں تو اُن کے لکھے سوالات مثلاً بچوں کی تعداد وغیرہ کے میچے شکستہ لکھائی میں درست جواب لکھے تھے۔ سبھی ششدر رہ گئے۔

ان معاملات کے حوالے سے میں ہنوز تذبذب اور حیرت کا شکار ہوں۔ کراچی میں ایک ٹیرو کارڈ (Tarrot Card) والے صاحب ہیں۔

وہ صاحب خوب پڑھے لکھے ہیں اور دنیا کی سیاحت کر چکے ہیں۔ ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ قابل رشک ہے، درجہ بھی مغربی ہے۔ میں اُن کی تعریف سن کر طے گیا تو پہلی ملاقات میں حساب لگا کر بولے۔ ”آپ کا تیس روز میں ایک معقول رقم کا انعامی بانڈ نکل آئے گا۔“

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دو بانڈ خریدے تھے۔ البتہ ایسے کئی قیافہ شناسوں کے بارے میں ناگفتنی سن رکھی تھی سو اسے بھی ایک توتے کی فال نکالنے والے صاحب سے زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے پوچھا ”اور اگر انعام نہ نکلا تو؟“

”تو میں اسی شہر میں رہتا ہوں، آپ مجھے جواب دہ کر سکتے ہیں۔“ انھوں نے یہ بات اس یقین سے کہی کہ میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ خلاف توقع میرا زندگی میں پہلا بانڈ اُن تیس دنوں میں نکل آیا۔ میں نے اپنی حیرت جاوید سے بیان کی تو اس نے یہ کہہ کر مجھے چٹکا دیا۔ ”وہ صاحب پہلی ملاقات میں سو فی صد درست پیش گوئی کرتے ہیں۔ البتہ بعد کی نشستیں حسب توقع نہیں ہوتیں۔ ان میں غامض جھول ہوتے ہیں۔“

بعد ازاں بہت سے لوگ ملے جو ان صاحب سے متعلق ایسے ہی تجربے سے گزر چکے تھے لیکن میں حیران ہوں جاوید نے اس شخص کے بارے میں ایسا درست انکشاف کیسے کیا جبکہ یہ اس سے ملا بھی نہیں تھا۔

میرا منطقی ذہن ان تجربات سے حیران تو ہوتا ہے پر تاحال ان میں روحانیت کے عنصر کا اس لیے قائل نہیں ہوتا کہ سویڈن، جرمنی

اور دیگر بہت سے مغربی ممالک میں غیر مذہبی خواتین حضرات پوری آب و تاب سے ماورائی معاملات پر دست در رکھتے ہیں۔ جاوید دوست نہیں بناتا لیکن جس کا دوست ہوتا ہے پھر اس کا دوست ہوتا ہے۔

جاوید کے ایک دوست یورپ میں کاروبار کرتے ہیں۔ اُن کے فرانس میں ریستوران ہیں اور مواصلاتی ذرائع میں سرمایہ کاری ہے۔ وہاں کے ٹیکس قوانین سے عدم واقفیت کی وجہ سے باقاعدہ ریکارڈ نہ رکھنے کی پاداش میں ایک مرتبہ دھریے گئے اور انھیں جیل جانا پڑ گیا۔ اچھے خاصے خوش حال اور سلجھے ہوئے آدمی کا یوں پابند سلاسل ہو جانا ایک کڑی آزمائش تھی۔ جب جاوید کو خبر ملی تو وہ بے چین ہو گیا۔ دوست کی بھرپور معاونت کی پہلی فرصت میں بیرون ملک اُس قید خانے جا کر دوست سے بھی ملا اور باقاعدگی سے اس کی مدد بھی کرتا رہا۔ یہ پرانی بات نہیں بس دو چار برس ادھر کا قصہ ہے۔

بعد ازاں جب وہ دوست رہا ہو کر آیا تو جاوید نے اُس کی معاونت کے لیے اپنا کمرش پلاٹ بیچ دیا تاکہ حسب ضرورت رقم حاصل ہو سکے اور اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ اپنے بچپن کے کئی دوستوں کو بیرونی پرکھڑا کرنے کے لیے وہ بے چین رہا ہے تاوقتیکہ ان کے مسائل کا عمل حل ہو گیا۔ میں نہ صرف اس کا شاہد ہوں بلکہ ایسا کئی مرتبہ ہوا کہ میں نے اسے پریشانی میں فون کیا تو وہ میری دل جوئی کے لیے بہ طور خاص اگلی فلائٹ سے اسلام آباد سے کراچی یا لاہور چلا آیا، در کسی قسم کا احسان نہ دیا۔

وہ دینی اور جذباتی طور پر کھلاؤ لاخ لہو پنجابی آدمی ہے۔ دوستوں کا دوست اور کسی سے ناراض ہو جائے تو اظہار کر دیتا ہے۔ اس کے ڈلے ہمتن "میڈان پاکستان" اور "میڈ فار پاکستان" صاحبِ داراک دانش و دراد معاملہ فہم، ذریک، خبرگر، خبرگوار، باخبر قلم کار کی زندگی ایک واقعہ دار تکمیل ناول اور تندرست قلم کا سامان رکھتی ہے۔ اُس نے اپنی زندگی کی کہانی چھوٹی چھوٹی مٹی ایچر گلوں میں مجھے سنائی۔ کبھی کافی پیئے ہوئے، کبھی حویل میر کرتے ہوئے، کبھی کھانے پر، کبھی اپنی اسٹڈی میں، کبھی میری قیام گاہ پر، کبھی فون پر تو کبھی رو بہ رو، سواں کی کہانی کے رنگ کو بہ کچیلے ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے سوچا کہ اگر کامیاب تخلیقی لوگوں سے اُن کی زندگی، بچپن کی پہلی یاد کا پوچھ جائے اور اسے کتابی شکل دے جائے تو ایک دل چسپ اور حوالہ جاتی کام ہو جائے گا۔ بچپن کے ابتدائی نقش انسانی فطرت اور رجحان کے عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ تحت اشعور کی بنیاد بنتے ہیں۔

اسلام آباد کی کوہ سار مارکیٹ میں واقع کیفے کی بالائی منزل کے دیوار گیر شیشے سے سردیوں کی دوپہر کی گھنے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آتی دھوپ کو دیکھتے جاوید نے مجھے اپنی زندگی کی کہانی کی کئی بکھری ٹکڑیاں سنائیں۔ اُس کی زندگی کی سب سے پہلی یاد اُس وقت کی ہے جب وہ سات آٹھ ماہ کا تھا "مجھے والد نے اٹھایا ہوا ہے، والدہ نے بڑے سے کڑا ہے میں پانی اور سوڈا ڈال کر اُسے آگ پر گرم ہونے رکھا ہوا ہے، کڑا ہے میں کھیس ڈالا ہوا ہے۔ ہم گاؤں کے ڈیرے پر ہیں۔ والد صاحب نے تہ بند باندھا ہوا ہے، در جسم کا بالائی حصہ ننگا ہے۔"

پس یہ حصہ فلیش بیک کی جھلک میں اُسے یاد ہے، اس کے بعد نو دس مہینے کی عمر کی ایک یاد ہے۔ "پانی کا کنواں ہے، رہٹ میں بکھر کی لگی ہوئی ہے، اس کی جانب ایک کتے کا بچہ جا رہا ہے، والدہ شور مچا دیتی ہیں تاکہ کنویں کے گرد گھومتے بیلوں کو روک دیا جائے اور مجھے بچالیا جائے۔ میں تب رہتا تھا۔"

اپنے والد کے گھرانے کی تفصیلات سناتے ہوئے جاوید نے بتایا کہ اُس کے دادا، شاہ محمد عرف شاہ، ساڑھے چھ فٹ کے گراٹھ لیمر تھے جن سے لالہ موسیٰ کے بازو میں واقع شاہ سرمست گاؤں کے ہاسی مرعوب رہتے تھے۔ اُس دور میں شاہ زورنی عزت کی علامت تھی۔ ان کے سے دیگ آدمی نے اپنا ڈیرہ خوب آباد کر رکھا تھا۔

اُن کے پانچ بچے تھے، جاوید کے والد درمیان میں تھے۔ دادا کی وفات کے بعد خاندان پر زوال آ گیا۔ اُن کے جاں نشینوں میں

کوئی بھی ان کی جگہ نہ سنبھال پایا۔ جب کھاریاں چھاؤنی بن رہی تھی، جاوید کے والد نے اُسے کو نلہ پلائی کر کے اپنے ہر مضبوط کیے۔ بھی انھوں نے لالہ موسیٰ میں آڑھت کے کام کو جانا شروع کیا۔ والد صاحب بہن بھائیوں میں خاصے پڑھے لکھے شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے دو بھائیوں پڑھ رکھی تھیں۔ دیگر چچا بہ مشکل سوئک گنتی جانتے تھے۔

خاندان میں تعلیم کو وقت کا ضیاع سمجھا جاتا تھا۔ جس کا وہی بیٹی (کھیتی باڑی) میں کوئی کردار نہ تھا۔

والد صاحب ترقی پسند ذہن رکھتے تھے سو کاروبار میں آگئے۔ انھوں نے بھائیوں کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی مگر یہ معاملہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بالآخر باقی بھائی شہر سے واپس گاؤں لوٹ آئے۔ لوگ دیہات سے شہر کا رخ کرتے ہیں۔  
 ”وہاں الٹی لنگا بہر رہی تھی۔“ جاوید نے گرم کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے سنایا۔ وہ بے توجہی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔  
 بارش تھوڑی دیر کے لیے تھی مگر ہوا میں نمی موجود تھی۔ میرے والد کو بھی اس لیے اسکول سے اٹھایا گیا تھا کہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے وقت ضائع ہوتا ہے۔“

جاوید کے گاؤں میں لڑائی، مار کٹائی، کوشیو، مردانگی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے والد خالص دیہی ماحول میں پلے تھے جہاں اُن کی ماں (جاوید کی دادی) سرگی ویلے (صبح سویرے) سب سے پہلے اُٹھ کر کچے اُپلوں اور بکھری خشک ٹہنیوں کو آگ دکھا کر پھونکیں مار کر چولہا جلاتیں اور دہکی بکھن میں پرائیٹے اور ساتھ میں لسی کا ناشتا تیار کرنا شروع کرتیں تو اُن کے سبھی بچے فردا فردا اُٹھ کر آنکھیں ملے چولہے کے گرد بیٹھنا شروع کر دیتے۔ بعد ازاں سبھی زندگی کی مصروفیات میں گم ہو جاتے جن میں گائے بھینسوں کے دودھ دہنے سے لے کر لگن مٹی کھینے جیسے کام ہوتے تھے۔ جاوید کے والد کا بچپن موٹیاں شلجم توڑ کر کھاتے گزرا تھا۔ وہ کھیتوں کو سانچھی ملکیت سمجھتے ہوئے ان میں سے من پسند بنریاں اور بھل کھا لینا معمول کی بات سمجھتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ بہت سے کھیتوں کے مالک اُن کے نظریات سے متفق نہ تھے سو وہ جب کبھی انھیں اپنے ہاں سے گاجریں توڑتے دیکھتے تو دبے پاؤں والد کی جانب بڑھتے۔ والد کی کاروباری حس کی طرح چمچی جس بھی خامی تیز رہی ہے، چٹاں چہ وہ بچائے باہمی کے اصولوں کے عین مطابق گاجر مولیاں ہاتھوں میں تھامے بروقت تیزی سے وہاں سے یوں رخصت ہوتے کہ مالکان اُن کی دھول کو دیکھتے رہ جاتے۔

رات کو بھڑی ترکاری کے ساتھ روٹیوں کا کھانا ہوتا تھا۔ اُس دور میں ابھی قدرتی کھاد استعمال ہوتی تھی چٹاں چہ بنریاں طاقت ور، بھرپور اور خوش ذائقہ ہوتی تھیں۔ طاقت کے لیے دودھ میں کچے انڈے ڈال کر بھی لیے جاتے تھے۔ بعض صورتوں میں انڈے توڑ کر موقع پر پی لیا جاتا۔

دیہی پیشے بھی چند ایک ہی تھے۔ عمومی طور پر کم تر ذات کے غریب لوگ ان سے وابستہ ہوتے تھے۔ ان پیشوں میں ناکی، موچی، جولاہا، چوہڑا، لوہار، ترکھان، مولوی اور رنگ ساز بھی شامل ہوتے تھے۔

البتہ مولوی خاصا باعزت پیشہ تھا جو اہل دیہہ کے بچوں کو قرآن پاک پڑھاتا، جنازے پڑھاتا، نکاح پڑھاتا اور قرآن پاک کا ختم کرواتا۔ اُسے گاؤں کے لوگ چندہ کر کے کھانے پینے کو مناسب انتظام کر دیتے۔ رہائش کے لیے مسجد کے ساتھ حجرہ ہوتا۔

ایک مرتبہ میں نے افسانہ نگار منشا یاد سے پوچھا تھا کہ ازمنہ رفتہ رفتہ کی سادہ زندگی کی کون سی بات انھیں بہت پسند تھی تو انھوں نے کئی چیزوں کے علاوہ کہا تھا ”اُس زمانے میں لوگ بور نہیں ہوتے تھے۔ نہ تو ہمارے ہاں یہ لفظ ایجاد ہوا تھا اور نہ ہی لوگوں کو اس کا مفہوم معلوم تھا۔ چٹاں چہ لوگوں کے بور ہونے کا تصور ہی نہیں تھا۔“

جب میں نے جاوید سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ بولا ”ہمارے گاؤں میں ہر مصیبت کو من جانب اللہ سمجھا جاتا تھا اور اسے زندگی کا ”صدقہ“ سمجھ کر قبول کیا جاتا تھا۔ زراعت، کھیتی باڑی، آپ پاشی کے لیے بیلوں کی جوڑی استعمال میں آتی تھی، گاؤں میں بجلی نہ ہونے کی

وجہ سے لوگ سرشام سو جاتے، اکثر لوگ دھوتی میں لمبوس ہوتے، نئی جوتیاں میروں کے بجائے بغل میں ہونٹس تاکاں پر ملی نہ لگ جاتے، بیماریوں کا علاج مولوی صاحب کے دم درود پر منحصر ہوتا، شہر میں اسپتال جانے والے کی واپسی کی توقع نہ ہوتی اور پورا گاؤں مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود لوگوں میں واقعی "تقاعد" تھی۔ یہ کوئی ماضی کی رومانوی تخیلاتی بات نہیں۔ لوگ صابر بھی تھے اور شاکر بھی۔ اب وہاں اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت موجود ہے پر لوگوں کے ہونٹوں پر ناٹھکری بھی ہے۔ اب میرا گاؤں ایک فریب گاؤں ہے۔ لوگوں کے دل فریب ہو چکے ہیں۔

جب گاؤں کے دیگر لڑکے بالے کاموں کے لیے بڑوں کے ساتھ نکل جاتے تو وہ بچے گھر کی خواتین کے ساتھ اکیلا رہ جاتے۔ گاؤں میں خواتین ہونٹس، ڈھور ڈنگر ہوتے یا پھر آوارہ پھرتے گئے۔ شام تک یہی کیفیت رہتی، ناؤتیکہ مرد اور لڑکے بالے زمینوں اور کاموں سے واپس آ جاتے۔ جاوید اپنی والدہ، چاچوں، تائیوں، ممانیوں، پھوپھیوں کا پلو پکڑے چلا ہوا اتنا بڑا ہو گیا کہ اسکول جاسکے البتہ اس دوران گاؤں کی گلیوں میں اترنے والا سفید سٹانا اُس کے اندر طول کر گیا۔ اس تہہ کی وجہ سے وہ آج بھی تنہائی میں زیادہ آسودگی محسوس کرتا ہے۔

جاوید کو اسکول داخل کروادیا گیا۔ یہی معاشرت کو سمجھنے والے خوب جانتے ہیں کہ وہاں چودھری ایک باعزت سابق دواحقہ ہے۔ یہ جس کے نام کے ساتھ ہو وہ حامیوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ ایک روز مستنصر حسین تارڑ صاحب مجھ سے کہنے لگے "آج کل انگریزی میں لکشن لکھنے والے ہماری علاقائی ثقافت سے اسٹنٹ ناواقف ہیں کہ ایک مصنف نے اپنی کہانی میں مرکزی کردار مصلیٰ کے نام کے ساتھ چودھری کا سا بھلا لگایا ہوا تھا۔"

بہر حال اسکول میں جاوید کو چودھریوں کا بیٹا ہونے کی وجہ سے دیگر طلبہ پر ایک برتری حاصل تھی۔ اسکول ایک برگد کے نیچے ہونے والی تدریس تھی۔ اُس دور کے بیش تر اسکول اور مدرسے کے طالب علم تعلیم کے بوجھ کی بہ نسبت ماسٹر کی مار کے ڈر سے بھاگ جاتے تھے۔ وہ ترکھان، راج مزدور، موچی بن جانا گوارہ کر لیتے تھے مگر "پڑھا لکھا" نہیں۔

ایک وقت ایسا آیا کہ جاوید کے اسکول میں وہ، اُس کا استاد، اُستاد کی چٹری اور برگد کا درخت ہی رہ گئے۔

جاوید اسکول کھوئی پر بیٹھ کر جاتا تھا۔ کھوئی کو اُن کا ملازم نور مصلیٰ "اسٹارٹ" کرتا تھا اور اس کا کان پکڑ کے چلاتا ہوا اسکول لے جاتا تھا۔ جاوید، تالیوں پر سے ٹاپتی، کچھڑے سے پچتی لہرائی کھوئی پر بیٹھا اسکول پہنچ جاتا تھا۔ گاؤں میں جاوید کے دادا کے گاؤں میں "ڈیرے" کی ایک روایت تھی۔ جو اُس کے سامنے سے گزرتا اُسے بہ وجہ احترام سواری سے اتر کر پیدل گزرتا پڑتا۔ چٹاں چوہاں کے راہ گیر سانکھوں، کھوئیں، شجروں سے اتر کر ڈیرے کے سامنے سے گزرتے۔ در نہ انھیں موقع ہی پر کان پکڑ دایئے جاتے۔

"ہمارے خاندان میں مذہب کو عورتوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ مذہب کو فقط دم درود کے لیے محدود کر دیا گیا تھا۔" ہمارے پورے خاندان میں صرف تین خواتین نے ناظرہ قرآن مجید پڑھا تھا، مرد اس نعمت سے محروم تھے جاوید نے کافی کے جھاگ کو پھونک مارتے ہوئے کہا۔

جاوید کے والد کا روہری ذہن رکھتے تھے سوان کے بھائی انھیں آڑھتی کہتے تھے۔ آڑھتی خاصے خوش حال لوگ ہوتے تھے جو زمین داروں سے اناج خرید کر آگے بیچ دیتے تھے۔ البتہ ایسے لوگ صلح ہونے کی وجہ سے کم تر اور بزدل سمجھے جاتے تھے۔

والد صاحب روز روز کے طعنوں سے تنگ آ کر اور کاروباری سمجھ بوجھ کو استعمال کرنے کے لیے قریبی شہر لالہ موئی آگئے۔ گاؤں میں تو چودھریوں کا بچہ ہونے کی وجہ سے جاوید کا لحاظ کیا جاتا تھا مگر یہاں اُس کی جسمانی کم زوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر کے اسکول کے شرارتی اور خراٹ لڑکے اُسے خوب ہنستے۔ وہ بڑی طرح روتا اور جھد کرتا کہ اسے اسکول نہیں جانا۔ اُسے والدہ سمجھا کر پیار سے ترے بہت کر کے اسکول بھیج دیتیں۔



جاوید نے کتابوں سے اپنی صحبت کی کہانی سنائی۔

”اُنہی دوران میرے ہاتھ میں الدین کا چراغ لگ گیا“ جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں بچے کر کے لفظ جوڑ کر جملہ پڑھ لیتا تھا، تیسری جماعت میں کہانیوں کی ایک کتاب میرے ہاتھ لگ گئی۔ وہ کتاب میرے لیے الدین کا چراغ تھی۔ میرے ہم جماعت تب تک پڑھ نہ سکتے تھے سوانحوں نے مجھے حکم دیا کہ میں انہیں کہانی سناؤں۔ میں نے کہانی سنائی تو پہلی مرتبہ وہ مجھ سے مرعوب ہوئے۔ میرے ہم جماعتوں کو روز ایک نئی کہانی چاہیے تھی۔ اب میرے لیے روز کہانی کی ایک نئی کتاب خریدنا مسئلہ بن گیا۔ کبھی ماں جی تو کبھی ابا سے پیسے مانگتا، کبھی گھر کے ٹین ڈبے بیچتا تو کبھی کچھ۔ یوں میں روز ایک چھوٹی سی کتاب خرید لیتا۔ ایک روز میں کتاب گھر بھول آیا۔ لڑکے میری پھینٹی لگانے کی تیاری کرنے لگے۔ ان کی مار سے بچنے کے لیے میں نے پھیلی کہانیوں کے کرداروں کو ملا کر ایک نئی کہانی اپنے دماغ میں تخلیق کی اور انہیں سنا دی۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ اس سے میری ہمت بندھی اور میں نے انہیں روزانہ ایک نئی کہانی سن کر سنائی شروع کر دی۔ اب میرے بستے میں درسی کتابوں کے ساتھ کہانیوں کی کتابیں ہوتیں۔“

اُس کی تاریخ پیدائش کا معاملہ بھی دل چسپ ہے۔ جب اُس کے اسکول کے پرائمری کے داخلے جانے تھے تو اُس کی جماعت کے استاد نے ہر بچے کی عمر کے حساب کرنے کے ترڈ سے بچنے کے لیے کلاس کے تمام بچوں کی تاریخ پیدائش یکم جنوری 1968 لکھ دی۔ چنانچہ اُس کے تمام ہم جماعتوں کی تاریخ پیدائش یکم جنوری 1968 ہے۔ یہی تاریخ پیدائش آج تک اُس کے کار میں لگی ہوئی ہے۔

جاوید کی تنہائی نے اُسے تین دوست دیئے۔ پہلا مشاہدہ دوسرا مطالعہ اور تیسری یادداشت۔ وہ ہر بات کو یوں پڑھتا اور دیکھتا جیسے پہلی مرتبہ پڑھا دیکھ رہا ہو، چنانچہ یادداشت تیز کرنے کی مشق اتنی بڑھ گئی کہ غیر معمولی حافظہ اُس کے دماغ کا لازمی جز بن گیا۔

بابائے جدید نفسیات کارل یونگ نے کہا تھا ”تمھاری نظر بھی صاف دیکھ سکتی ہے جب تم اپنے اندر دل میں جھانکو۔ جو باہر دیکھتے ہیں، خواب دیکھتے ہیں جو اندر دیکھتے ہیں جاگتے ہیں۔“ جاوید نے کافی کاغذ ختم کیا۔ شفاف شیشے کی دیوار گیر کھڑکی سے باہر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ بوندوں کی دیواریں گھنے درختوں، فٹ پاتھ اور سڑک پر آکڑوٹ رہی تھیں۔

اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”میرے والد کو اخبار کا بہت شوق تھا۔ میں انہیں خبریں سناتا تھا۔ وہ حقہ گڑ گڑاتے مزے سے خبریں سنتے رہتے تھے۔ ان کے پاس حقہ پینے کے شوقین لوگوں کی آمد جاری رہتی جو تم کو بھرا چلم گڑ گڑاتے خبریں سنتے اُن پر تبصرے کرتے رہتے۔ یوں میری اخبار کے مطالعے اور اسے سنانے کی خوب مشق ہوتی رہی۔“

ایک مرتبہ میں اسلام آباد میں منشا یاد کی رہائش گاہ پر گیا تو باتوں باتوں میں جاوید کا ذکر آ گیا۔ منشا صاحب کہنے لگے ”جاوید چودھری ہمارے قبیلے کے آدمی ہے، گلشن نگار، افسانہ نگار ہے۔“

جب میں نے یہ بات جاوید کو بتائی تو کہنے لگا ”بہت سے لوگوں نے مجھے افسانہ نویس کا مشورہ دیا ہے۔ میں نے دو جوہات کی بنا پر اب تک اس سے اجتناب کیا ہوا ہے۔ ایک تو میں نے افسانہ نویسوں کو قافے کرتے دیکھا ہے۔ دوسرے جب میں طالب علم تھا تو میرے مطالعے اور مزاج کو دیکھتے ہوئے ساتھی طالب علم طنزاً مجھے ”شاعر ناپ“، ”ڈاکٹر صاحب“ اور ”بخلول“ کہتے تھے۔ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مطالعہ کرنے یا شاعری اور افسانہ نگاری کرنے والے لوگ مذاق کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم بنیادی سطح پر علم دشمن لوگ ہیں، ہم علم کے شوقین لوگوں کا اُن کے سامنے اور پیچھے پیچھے مذاق اڑاتے ہیں۔ یوں ہم اپنے احساس کمتری اور نالائقی پر پردہ ڈالتے ہیں۔“

اس میں جستجو اور نامعلوم کی حقیقت جاننے کی بے پناہ خواہش ہے جو اس کی تحریروں میں بھی موضوعاتی تنوع لے کر آتی ہے۔ میرے ساتھ دوستی کے تعلق کے دوران جب بھی کسی ایسی معلومات کا تذکرہ ہوا جس سے وہ ناواقف تھا تو اُس نے نہ صرف اپنی لاعلمی کا

اعتراف کیا بلکہ اس موضوع کے بارے میں اشتیاق کا اظہار بھی کیا۔ ہمارے عمومی معاشرتی رویے میں کسی نئی بات کے بارے میں شک و شبہ اپنی معلومات اور رائے کو حتیٰ کچھ سمجھنے پر اصرار اور اس کے حوالے سے لاعلمی یا کم علمی کو باعثِ خفت سمجھنے کا رجحان عام ہے جبکہ اس کے برعکس اعلیٰ علمی و تہذیبی معاشرت میں اپنی رائے کے اظہار کے ساتھ عاجزی اور یہ اعتراف ”میری رائے غلط بھی ہو سکتی ہے یہ حتیٰ نہیں“ عام ملن ہے۔ زبان کے حوالے سے بھی وہ تکلیلِ عادل زادہ اور دوسرے دیول سے رجوع کرتا رہتا ہے۔

زبان کے حوالے سے یہاں دو واقعات کا تذکرہ پر محل ہے۔ ایک مرتبہ میں ایک محفل میں بیٹھا تھا، وہاں ایک اردو دان اور ایک انگریزی دان دوست تشریف لے رہے تھے۔ اردو دان کہنے لگے ”ہمارے لوگ بھی کتنی غلط اردو بولتے اور لکھتے ہیں۔ درست ترکیب“ عاقبت نااندیش ہے جب کہ لکھتے ہیں ”نا عاقبت اندیش“ اس پر انگریزی دان بھٹا اٹھے اور بولے ”نا عاقبت اندیش“ ہی درست ہے۔ اپنی رائے پر وہ اس ضد سے جیسے کہ ان کے چہرے کا رنگ خنجر ہو گیا اور وہ وہاں سے اٹھ گئے۔

ایسے میں اگر وہ لغت سے رجوع کریتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ درست اصطلاح عاقبت نااندیش ہی ہے۔ تکلیل صاحب تو دو قدم اگے بڑھ جاتے ہیں اور کسی کو آزمائش میں ڈالنے کی بجائے سادگی سے دونوں اصطلاحیں سامنے رکھ دیتے ہیں اور اصلاح لیتے ہیں کہ کیا درست ہے۔ یوں مخاطب کی عزت و شرف بچ رہتی اور اکثر و بیش تر وہ خود لغت سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ تکلیل صاحب کے ایک شاگرد نے ”جنگ“ اخبار راول پنڈی کے ایک صاحب کو فون کر کے مودبانہ گزارش کی کہ ”بدامنی“ غلط العام اصطلاح ہے۔ یعنی برا امن کوئی ترکیب نہیں۔ برا امن ہونا چاہیے یا پھر بے امن۔ اس پر وہ صاحب جھلا اٹھے اور کہنے لگے ”آپ کی بات دبستانِ دیلی یا دبستانِ لکھنؤ میں تو درست ہوگی، دبستانِ راول پنڈی میں بدامنی ہی درست ہے۔“ لیکن جاوید اس معاملے میں چلک دار ہے آپ اس کی کسی غلطی کی نشان دہی کریں یہ نہ صرف آپ سے معذرت کرے گا بلکہ شکریہ بھی ادا کرے گا۔

ابھی میرا اور جاوید کا تعلق ابتدائی مراحل میں تھا۔ ایک روز رات کے کھانے پر ہم بلیو ایریا کے ایک معروف ریسٹوران میں گئے۔ جاوید کا کم نگار تو تھم کر معروف عوامی چہرہ نہیں۔ سو ہم بغیر کسی مداخلت کے شاہ راہ کے رخ پر واقع کھڑکی کے ساتھ والی میز پر بیٹھ گئے۔ کھانے کا آرڈر کر کے ہم گپ شپ کرنے لگے۔ اسنے میں اُس نے اپنی جیب سے ایک موٹا سا بین ٹکالا اُس کی ٹوپی کھولی تو اندر سے ایک سرخ برآمد ہوئی۔ میں ابھی اُسے حیرت اور تشویش سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اُس نے وہ سرخ اپنی قمیص اونچی کر کے پیٹ میں پیوست کر دی۔ میرے لیے یہ منظر پریشان کن تھا۔ اُس نے میری پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔

”اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیں۔ مجھے شوگر ہے اور ہر کھانے سے پہلے انسولین کا انجکشن لگانا پڑتا ہے۔“

بعد ازاں کھانا کھاتے ہوئے اُس نے بتایا کہ وہ بچپن سے کم زور تھا۔ اُس کا جسم منحنی اور لاغر تھا اور ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ ایک مرتبہ اُس نے سنا کہ ایک حکیم کے پاس ایسے نسخے ہیں جن کے کھانے سے کم زور سے کم زور بڑھ کے بھی اچھے خاصے کسرتی جسم کے مالک بن جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ حکیم کے پاس گیا۔ اُس نے اسے چند خوراکیں دے دیں۔ وہ خوراکیں کھانے کے بعد اس کے جسم میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہونا شروع ہو گئیں۔ اُس کا جسم بھر گیا، چھاتی خوب توانا ہو گئی اور جسم میں گویاں مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ وہ بے اندازہ خوش ہو گیا۔ چند روز بعد اس کا جسم ڈھلکنے لگا۔ تھکاوٹ کا احساس رہنے لگا۔ جب اُس نے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے پریشان کن انکشاف کیا۔ جاوید کو مین ٹوجوانی میں بلڈ شوگر ہو چکی تھی۔ حکیم کے نسخوں میں steroids تھے جنہوں نے جسمانی تخریب کا آغاز کر دیا تھا۔ اُس کے بعد سے انسولین کا انجکشن اس کی زندگی کا مسلسل حصہ بن گیا۔

ہمارے تعلق میں ایسا کئی مرتبہ ہوا ہے کہ بروقت کھانا نہ ملنے پر اُس پر نفاہت طاری ہونے لگتی ہے اور وہ بے دم ہو جاتا ہے۔ اُسے مخصوص وقفے کے بعد مناسب خوراک کی ضرورت رہتی ہے۔

عمومی طور پر فطرناک حد تک بڑھی شوگر کے مریضوں کے مزاج میں مدوجز عام بات ہے۔ وہ پچھلے بیس برس سے شوگر کے مرض کو اپنے خون میں لیے پھر رہا ہے۔ اس کے باوجود عمومی طور پر خوش گوارد موڈ میں کھلکھلاتا رہتا ہے۔ وہ شوگر کا بھی ایک آئیڈیل مریض ہے ایک ایسا مریض جس نے شوگر کو کنٹرول میں رکھا ہوا ہے۔

بعد ازاں میں اور جاوید بے شمار مرتبہ کھانے کو ریستورانوں میں گئے ہیں۔ وہ کھانے کا زیادہ شوقین نہیں۔ جب کہ میرا ان دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا رہا ہے جو عمدہ پکوانوں کے اہم مقامات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ پچھلے وہ لاہور میں نسبت روڈ کا ہریس، نیلا گنبد کے چنے، چند بڑی جی پر خان بابا کا خستہ، ویسی گھی میں بھنا گوشت، ماڈل ٹاؤن میں تھپے کے کباب، بزنس روڈ کراچی کی نہاری، دل بہار ہوٹل ہاتھی دروازہ راول پنڈی کی شب دیگ اور دیگر کشمیری کھانا، حیدرآباد میں مچھلی کا حلوا، ڈیرہ اسماعیل خان میں ”محبت“ کا پکوان، گوجرانوالہ میں جی ٹی روڈ کے مٹن بوٹی کباب سیال کوٹ میں امام صاحب کے نزدیک ویسی کھن میں تو پر بنی چائیں، ٹھٹھہ کا ”بخنی گوشت“، کوئٹہ کا دم پخت اور بے شمار لنڈے پکوان۔ ایک روز کھانا کھاتے ہوئے اُس نے خود ہی اعتراف کیا۔

”ابا جی تازہ خوراک کے حق میں اور فرج کے خلاف تھے۔ وہ بڑی مقدار میں خوراک لے آتے تھے۔ اب گھر میں اُسے محفوظ کرنے کا کوئی طریقہ موجود نہ تھا۔ اس لیے ہمیں وہ ساری خوراک ایک دن میں ختم کرنا ہوتی تھی۔ جب مقدار میں خوراک گھرا آتی تو اسے دیکھتے ہی ہمارے رنگ اڑ جاتے۔ اگر کھانا مرضی سے کھایا جائے تو لنڈے لگتا ہے، زبردستی کا عمدہ کھانا بھی عذاب ہوتا ہے۔ اسی لیے میں کھانا ضرورت کے تحت کھاتا ہوں۔ مجھے بھوک کم ہی لگتی ہے۔“

جاوید نے توقف کیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”ابا جی ہماری بہتری کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ لالہ موہی میں کم گھروں میں ٹی وی موجود تھا۔ ہمارا گھر اب بھی ان خوش نصیب گھروں میں شامل تھا جہاں ٹی وی تھا۔ گھر میں ٹیلی فون بھی تھا۔ اُس کا نمبر 18 تھا۔ ابا جی نے گھر میں لوہے کے چھ گلاس رکھے ہوئے تھے۔ کالج کے گلاس تو تھے نہیں جو ٹوٹتے اور نئے گلاس آتے۔ سو ہم دی چھ گلاس استعمال کرتے رہے۔ ہماری صحت کے لیے ہمیں ٹھنڈے پانی سے نہلایا جاتا، ہر ڈیس کھلائی جاتیں، مالش کروائی جاتی، سارا لڑکپن آٹے کا سالن کھاتے گزر گیا۔ دودھ میں ویسی گھی ڈال کر پلایا جاتا جو جیسے جیسے ہم اوپر سے پیتے جاتے نیچے سے لگتا جاتا۔ تازہ خالص کھن روکھا کھلا دیا جاتا۔ بیماری میں حکیم سے رجوع کیا جاتا۔“

”کس طرح کی بیماری عام تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جسمانی کم زوری تو تھی ہی، ایک مرتبہ کالی کھانسی ہو گئی۔ والد صاحب حکیم کے پاس لے گئے۔ اُس نے گدھی کا دودھ پلایا۔ اس کا ذائقہ اب بھی منہ میں موجود ہے۔“ جاوید نے بڑا منہ بناتے ہوئے کہا۔

”اُس دور کا کوئی اور واقعہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں ایک واقعہ ہے۔ اس سے پہلے اپنی دادی کا ذکر۔ میری دادی دیگر خاندان سے مختلف تھیں۔ وہ نیک، خوب صورت، حلیم الطبع، دریا دل اور مخلص بزرگ تھیں۔ ہر وقت نماز تسبیح میں مشغول رہتیں۔ اُن کی کبھی تہجد قضاء نہ ہوتی تھی۔ آخر میں بیٹائی چلی گئی۔ تسبیح اتنی پڑھتی تھیں کہ نظر چلی جانے کے بعد جہاں سے اُسے چھوڑا ہوتا، عین اُسی دانے سے شروع کرتی تھیں۔ مجھ سے بے اندازہ محبت کرتی تھیں۔ میں بھی ان کی دل و جان سے خدمت کرتا تھا۔ وہ مجھے ہاتھ اٹھا کر دل سے دعائیں دیتی تھیں۔ عبادت کے دوران بھی میں اُن کی دعاؤں کا مرکز رہتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ انہی کی دعا تھی جس نے آج بھی میرے ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور مجھے ناساعد حالات سے نکال کر کامیابی پر گامزن کر دیتی ہیں۔ جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے تو میں نے اس کا ذکر کالموں میں بھی کیا ہے۔“

جاوید نے دل چسپی سے واقعہ سنانا شروع کیا۔

”شہر میں ہمارے گھر کے سامنے سڑک پر ایک بابا جی بیٹھے تھے۔ وہ فقیر تھے، مذہب کے عالم میں رہتے تھے۔ میری والدہ انہیں کھانا بھیج دیا کرتی تھیں۔ یوں ہمارے گھر آنے کا اُن سے ایک تعلق قائم ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ گناہیں خوب اُمنڈ کر آئیں اور پھا جوں میں برس۔ جب بارش کچھ تھی، درختوں کے پتوں، مکالوں کے پرنا لوں سے پانی رحاروں اور قطرہوں کی صورت بہا اور ٹپک رہا تھا کہ میں گئی میں نکلا۔ اُس روز نہ جانے اُن فقیر کے جی میں کیا سائی کہ انہوں نے مجھے پاس اٹھالیا اور سامنے ایک دائرہ کھینچا۔ دائرے میں ہماری سڑک نظر آنے لگی۔ سڑک کا ماضی زندہ ہو گیا۔ وہ دور سامنے آ گیا جب ابھی ٹیل گاڑیاں چلتی تھیں اور کنویں سے پانی کے ٹکائے کے لیے جانور استہال ہوتے تھے۔ میں ابھی عالم حیرت میں تھا کہ انہوں نے ایک اور دائرہ کھینچا۔ اس دائرے میں مستقبل نظر آنے لگا۔ ابھی میں مستقبل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انہوں نے اپنے انگوٹھے سے میری گردن کی ایک رگ یوں دبائی کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ اُس روز اُن فقیر کے اس طرح میری گردن دبانے سے یوں لگا جیسے میری روح کی ایک کھڑکی کھل گئی ہو۔“

جاوید نے کھوئے لہجے میں کہا۔

”اُس دن کے بعد وہ فقیر بزرگ وہاں نظر نہیں آئے۔ نہ جانے کہاں چلے گئے۔“

”کہیں انہوں نے سب تختیاتی نہ دکھایا ہو؟“ میرے لہجے میں تذبذب تھا۔

”نہیں۔ اُس دائرے میں جو نظر آیا وہ واقعی حقیقی تھا۔ میرا آج بھی اس پر پورا یقین ہے۔“

جاوید کا دفتر مارگلہ پہاڑی سلسلے کے قدموں میں سرسبز قطعے پر مارگلہ روڈ اور جناح پیر سے آنے والی شاہ راہ کے سنگم پر واقع ہے۔

وہاں کیا کیا رنگین کرداروں اور حیران کن واقعات سے شناسائی ہوئی ہے۔

ایک روز میں اُسے ملے پیچھا تو وہاں ایک کٹی سمٹائی خوب صورت لڑکی سامنے بیٹھی تھی۔ جاوید سر اُپا ہم دردی بنا ہوا تھا۔ اُس نے لڑکی کو تسلی بخش الفاظ کہہ کر لڑکی نے مسکرا کر مجھے سلام کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

بعد میں جاوید نے مجھے اُس لڑکی کی چونکا دینے والی حیران کن اور عبرت انگیز چٹائنی۔

وہ چنڈی کے ایک انتہائی متحول اور جانے پہچانے گھرانے کی لڑکی تھی۔ گھر والے بڑے نکلے اور روشن خیال تھے۔ لڑکی کا باپ کاروباری دنیا میں جانا پہچانا نام تھا۔ وہ اُس کی اکلوتی بیٹی تھی اور ایک بہترین کالج میں انگریزی ادب کی طالبہ تھی۔ باپ کو شراب کی لت تھی۔ بات اگر یہاں تک رہتی تو بھی قابل برداشت تھی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ باپ شراب پی کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا تھا اور اسے اپنے پرانے کی تیز ختم ہو جاتی تھی۔ ایک رات وہ نشے میں ڈھت گھر آیا تو اپنی خواب گاہ کے بجائے بیٹی کے کمرے کا ڈرنگ کر لیا۔ وہاں شرفہ انسانیت کو پیروں میں رگیدار کیا۔ بیٹی باپ کی حرکت سے شدید خوف زدہ ہو گئی۔ چند روز گزرے تو باپ نے وہی مکرر حرکت بھردہرائی۔ لڑکی پہلے جذباتی سامنے کے پلید اثرات میں ٹانک ٹوئیاں مار رہی تھی کہ اس عمل دہرائے جانے پر نفسیاتی طور پر تباہ ہو گئی۔ اب تک ماں اس وحشیانہ فعل سے ناواقف تھی۔ جب اُسے اس کا علم ہوا تو وہ قریباً جتنی توازن کھو بیٹھی۔ گھر پر ہر نوع دوست کے سامنے گہرے ہو گئے۔ اس دوران کثرت شراب نوشی کی وجہ سے باپ عارضہ جگر میں مبتلا ہو کر آنا فانا جہنم رسید ہو گیا۔

”بہت دکھی داستان تھی“ میں نے گہرے دکھ سے کہا تو جاوید بولا۔

”ایک معاملہ اس کے بعد آتا ہے۔ لڑکی نفسیاتی معالج سے علاج کرواتا رہی ہے۔ اب اُس کی شادی طے ہو گئی ہے۔ لڑکا خاصا معقول اور خاندانی ہے۔ لیکن لڑکی کے دماغ پر کچھ ایسا اثر ہو گیا ہے کہ وہ کسی مرد کے قریب آنے پر خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ اب وہ معالج اس پہلو کا بھی علاج کر رہا ہے تاکہ بنی معمول کی زندگی گزار سکے۔“

”انسانی زندگی کے بعد کیا بھیا تک روپ ہیں۔“ میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ دفتر میں سو گوار خاموشی دھواں دھواں دم کھونٹنے لگی۔



”جب مجھے پہلی مرتبہ اس واقعے کا پتا چلا تو میں پوری رات سو نہیں سکا تھا۔“  
جاوید کی آواز گہرے دکھ میں ہلکی ہوئی تھی۔

ایسا کئی مرتبہ ہوا ہے کہ کسی ایسے واقعے پر جس کا اُس کی ذات سے براہ راست تعلق نہ بھی ہو۔ وہ رات بھر جاگتا رہتا ہے اور دن کو بے چین رہتا ہے۔ ان میں ملکی سطح کی خبریں بھی آجاتی ہیں بھلے وہ لاہور میں ایک درندہ صفت آدمی کا چھوٹے بچوں کو تیزاب کے ڈرموں میں گھول دینا ہو یا ایک بیوی کا اسلام آباد میں اپنے شوہر اور بچوں کو ناشتے کی میز پر قتل کر دینا ہو، وہ دنوں اُداس رہتا ہے۔

ایک شام میں اُس سے فون پر بات کر رہا تھا کہ اُس کے فون میں یک دم ایک دھماکے کی ہولناک آواز سنائی دی۔ وہ سپر مارکیٹ میں چھل قدمی کر رہا تھا کہ سڑک پار اٹالوی ریسٹورانٹ میں ہم دھماکا ہو گیا تھا۔ وہ فون ہاتھ میں تھاے مقام حادثہ کی جانب لپکا۔ میں نے اُسے جان کے خطرے سے ہوشیار کرتے ہوئے دُور رہنے کی درخواست کی تو وہ بولا۔ ”میری وہاں ضرورت ہوگی“ اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔ بعد میں وہ لاشوں اور زخمیوں کو دیکھ کر کئی دنوں شدید پریشن میں رہا۔

”میں شوگر کا مریض ہوں، حساس ہوں اور میں نے زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھا ہے اس لیے کوئی بھی سانحہ مجھ پر زیادہ اثر کرتا ہے۔“ بعد میں اُس نے بتایا۔

بتایا تو اُس نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے بارے میں اور بھی بہت کچھ تھا۔

اسلام آباد میں پنجوئرس ٹاور کے افتتاح کے کچھ دن بعد ایک روز ہم سر شام اُس کے دفتر سے پیدل ہی اُس کی جانب روانہ ہو گئے۔ گرین بیلنس میں پگھلنے والوں پر چلتے، سڑکیں عبور کرتے اور ٹپ پاتھوں پر چھل قدمی کرتے ہوئے اُس نے اپنے کالج کے زمانے کی باتیں، قصے، کہانیاں سنائے۔

بزرگوں نے جاوید کو زمیں دار کالج سمجرات میں داخل کروا دیا۔ لالہ موسیٰ کے طالب علم روزانہ صبح گجرات جاتے اور شام کو واپسی ہو جاتی۔ جاوید نے سفر سے بچنے کے لیے ہاسٹل میں رہنا شروع کر دیا۔ والد کی محبت یہاں بھی جاوید کے ہم راہ رہی۔ وہ روزانہ جاوید کو لالہ موسیٰ سے خالص تازہ دودھ بھجواتے۔ دودھ مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا جاوید تک پہنچتا تو ختم ہو چکا ہوتا، اُسے لڑکے بالے طالب علم پنی جاتے۔ اس دودھ کے حوالے سے اُس کا نام ”جاوید دودھی“ (جاوید گوللا) پڑ گیا۔ اُس پر بچپن کے دور کا رد عمل ہوا اور اُس نے لفٹے تیز طرار دوستوں میں رہنا شروع کر دیا۔ وہیں اُس نے پہلا شپ ریکارڈ خریدا، چمروں والی ہندو خریدی اور خوب میر سپاٹا کرنا شروع کیا۔ نتیجتاً ایف ایس سی کے امتحانات میں فیل ہو گیا۔

استحالی نتیجہ ملنے ہی جاوید ذکر کر لاہور بھاگ گیا۔ وہاں اس نے نہر کے پاس اسکاچ کارنر میں دکانوں کی بالائی منزل پر کمرانے کر چار پائی اور گدا ڈالا اور وہیں رہ پڑا۔ دریں اثنا ”پاکستان ہو میو پیٹھک میڈیکل کالج“، گروہی شاہو میں داخلہ لے لیا اور ایف اے بھی کرنے لگا۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ جاوید نے ہو میو پیٹھک کا کورس بھی کامیابی سے کر لیا اور ایف اے بھی۔  
ایف اے کرنے کے بعد وہ ایف سی کالج میں داخل ہو گیا۔

”میں کالج کا واحد طالب علم تھا جس نے سر پرنسپل لگایا ہوتا، شلوار قمیص پہنی ہوتی اور کندھے پر بستہ ڈالا ہوتا۔ میرے دیسی حلیمے کو دیکھ کر لڑکے خاص مذاق کرتے۔ بی۔ اے میں نہیں نے اردو کا مضمون رکھ لیا۔ اردو کے استاد شمیم صاحب تھے۔ میں اُن کا واحد طالب علم تھا۔ میرے ہونے سے اُن پر ایک بوجھ رہتا اور وہ مجھے سمجھاتے رہتے کہ میں نے اردو میں داخلہ لے کر درست فیصلہ نہیں کیا۔ چنانچہ میں نے کالج میں درخواست داخل کی اور مصافحت میں چلا گیا۔ جب شمیم صاحب کو یہ خبر ملی تو وہ اتنے خوش ہوئے کہ بے اختیار مجھے گلے لگالیا اور کہنے لگے ”تم بہت ترقی کرو گے۔“ وہاں داصف ناگی میرے استاد تھے۔ چوں کہ میرا کوئی دوست نہ تھا اس لیے داصف صاحب سے میرا پھم تعلق بن گیا۔

پیشہ تعلق آج بھی قائم ہے۔

جادید کی انگریزی شروع سے کم زور رہی ہے۔

”مجھے آج تک انگریزی کا کوئی مناسب استاد نہیں ملا۔ بی۔ اے میں انگریزی رکھنی لازمی تھی، میں نے پہلے پرچہ میں رہنا شروع کر دیا۔ 70 فی صد نمبر حاصل کر لیے اور دوسرا پرچہ چوں کہ انگریزی سمجھ بوجھ کا تھا سو اس میں صفر آیا۔ کل دوسو میں سے ستر نمبر لے کر میں پاس ہو گیا۔ بی۔ اے میں مجموعی طور پر میری فرسٹ ڈویژن آگئی۔ ایم اے میں میرا انگریزی میں ٹیٹل ہونا یقینی تھا۔ حادثاتی طور پر اس کے پرچہ کم ہو گئے سو اس مضمون میں مجموعی فی صد کے تناسب سے نمبر دیے گئے اور میں نہ صرف پاس ہو گیا بلکہ مجھے گولڈ میڈل بھی مل گیا۔“

جادید کے جنون اور سیکھنے کے حوالے سے دو بول چنبھ تھا تھے۔

ایک مرتبہ جادید کو لیکچر دینے کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی جانا پڑا جہاں مطبوعہ شرافت کے بچے زیر تعلیم تھے اور اسلام آباد کے ماحول کے زیر اثر انگریزی میں بات چیت کرتے تھے۔

آڈیٹوریم میں جادید کے لیکچر کا آغاز ہوا تو اس نے اردو میں بات کرنا شروع کی۔ یہ روایت کے خلاف معاملہ تھا، چنانچہ چند مکشوں سے احتجاجی آوازیں بلند ہوئیں جو تھوڑی ہی دیر میں دب گئیں۔ جیسے جیسے جادید کی بات بڑھتی گئی ویسے ویسے طالب علموں کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ جب اس کا لیکچر ختم ہوا تو سب نے کھڑے ہو کر تالیاں بجا کر اسے داد دی۔

”سب سے اہم ہوتا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کس طرح کہہ رہے ہیں، باقی تمام باتیں بعد میں آتی ہیں۔“ وہ اس خیال کا

اظہار کرتا ہے۔

ہر رے معاشرے کا بھی عجب مضحکہ خیز المیہ ہے کہ کبھی اردو بولنے اور سمجھنے والے آپس میں کانفرنسوں میں انگریزی میں گفت گو کرتے ہیں۔ گویا اجتماعی احساس کمتری کا اس بڑی طرح شکار ہیں کہ اعتماد سے آپس میں نظریں بھی نہیں ملا پاتے۔

ایک راز جادید کے بہت قریبی لوگ جانتے ہیں۔ اُس نے جس طرح اپنے آپ کو جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کیا ہے اسی طرح انگریزی سیکھنے کیلئے اُس نے چند سال پہلے انگریزی کی ایک ٹیوشن پڑھنی شروع کر دی۔ لگاتار مصروفیت کے بعد رات ساڑھے گیارہ بجے کا وقت بچتا تھا سو وہ رات گئے ٹیوشن پڑھنے جاتا رہا ہے۔

یہ اُس کے ابتدائی زمانے کی باتیں ہیں کہ بحریہ ناؤن کے ملک ریاض جو اُس وقت عام سے پراپرٹی ڈیلر تھے اُس کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔

اس سے پہلے، زمانی ترحیب سے واقعات!

جادید کو ایک دوست نے بتایا کہ صحافت میں آنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ریلے اور پی آئی اے میں ٹرینوں اور جہازوں کی ٹکٹوں کے نرخوں میں رعایت مل جاتی ہے۔ اس نے ایم اے صحافت کے لیے بہاول پور میں اسلامیہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہاں اُس کی زندگی کا ایک ایسا وقت شروع ہوا گویا ایک بچے کو ہوش آیا ہو اور اُس نے آنکھیں کھول کر دنیا کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ یہاں وہ ایک شرارتی طالب علم کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ایک دنیا اُس کے سامنے چمکی ہوئی ہے اور جسم میں طاقت اور زندگی ہے۔ پارہ جلتی، جھلکتی آج اور محنت کا مادہ تو اُس میں موجود تھا ہی۔ اس میں جب شرارت کا آمیزہ شامل ہوا تو شہر بے ہمارے کبھی چڑیا گھر کا رخ کیا تو کبھی سینما کا۔

بہاول پور ابھی نوابی دور کی پرال کے قریب پیشانی غنودگی میں جگالی کر رہا ہے۔ ٹھہرنے وقت میں سائیکل رکشوں کی جل ترنگ گھنٹیاں یوں خوش آہنگی سے بج اٹھتی ہیں جیسے کالی جے پرانے مقدس تالاب کے قرب میں ایسا تادہ مندر میں گھنٹیاں۔ شہر میں اب تک نوابی دور

کی مجلسیں جو اس ہائی ہے، انگریزی راج کی لادروں کے ساتھ بڑے فکروں اور عمل، اور ہارمل، گل زار گل، نشاط گل اور راج بھون صدائی گڑھ عمل کندھے سے کندھا لائے ٹھنکت سے کھڑے ہیں۔

ایک سر بہرہاں جہاں گھر میں ایک دل بہتہ واقع ہوتا ہے۔ نو جوانوں کی ایک ٹولی آتی ہے۔ وہ مختلف جانوروں کے بچوں تک جاتی ہے اور ایک نو جوان کو دیکھ کر جانور، بن مانس، شیر، بچھو وغیرہ اپنے اپنے بچروں میں ڈبک کر پھیلے بچوں پر چبھنے کے ہاتھ ہیں۔ ٹولی ان جانوروں کی حرکات کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ یہ جہاں جہاں جاتے ہیں، وہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ بالآخر ٹولی کا حلقہ نو جوانوں شرط جیت جاتا ہے کہ اس کا خوف جانوروں کو چوکنا کر دیتا ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ اس ”دورے“ سے چند روز پہلے شرط پد نے والا نو جوان ایک سرنج میں سرٹ لیے جہاں گھرا آیا تھا۔ اس نے کچھار کے پاس ٹپکتے وحشی شیروں، بچھوں اور دوسرے جانوروں کی چبھنے کے زیریں جھپے پڑم کے نیچے نشانہ لے کر سرنج سے سرٹ کی دھار اپنے ہدف تک کام یابی سے پہنچائی۔ پیٹھ پر ٹھنڈی سرٹ نے جانوروں کو بوکھلادیا۔ نو جوان نے یہ عمل چند روز دہرایا تو جانور خطرے کو بھانپتے ہوئے اپنی اپنی پیٹھ کو دیوار کے ساتھ جوڑ کر بچاؤ کرنے لگے۔ سرٹ کی ٹھنڈک تیز لیکن عارضی ہوتی جو تھوڑی ہی دیر میں اڑ جاتی۔ یہ نو جوان جہاں جہاں سے گزرتا وہاں جانوروں میں سراپسنگی بھیلتی جاتی۔ اس نو جوان کو دیکھ کر جانور ہڑبڑا کر اپنی اپنی پیٹھ چھپاتے دیواروں سے جڑ کر بیٹھ جاتے۔ بعد ازاں اس نو جوان نے اس مشق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ تجربہ انسانوں پر بھی آزمایا، گو یہ بہت بعد کی بات ہے۔ وہ نو جوان جاوید چودھری تھا۔

اور یہ بھی کی بات ہے کہ جاوید اپنے دوستوں کے ساتھ سینما میں فلم دیکھنے جاتا اور کوئی گانا پسند آنے پر شرارتی طالب علموں کی ٹولی اسے دوبارہ چلانے کا مطالبہ کر کے خوب ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔ طوعاً و کرہاً انتظامیہ کو وہ گانا دوبارہ، سہ بارہ، چوبارہ چلانا پڑتا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سینماؤں میں شرارتیں ہوتی تھیں، ہم دھماکے نہیں۔

بہر طور، جاوید ان غیر نصابی مصروفیات کے باعث تعلیم کی جانب زیادہ توجہ دینے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ یونیورسٹی میں تعلیم ملنا سے بچے دورے میں شمار کیا جانے لگا۔

نو جوان جسم میں ہارمونز کی تبدیلی کا اثر تھا یا اساتذہ کی ”گھرکیوں“ کا نتیجہ کہ فاضل امتحانات سے تین ماہ قبل خاصا سنجیدہ ہو گیا۔ یہ تیاری کی چھٹی کے دوران لاہور آیا تو اس کی ملاقات شفیق جالندھری صاحب سے ہوئی۔ شفیق جالندھری صاحب حقیقی معنوں میں اس کے پہلے راہنما اور محسن ثابت ہوئے۔ انھوں نے اسے کورس کی تیاری کا طریقہ بتایا اور یہ تیاری میں بخت گیا۔

اب یہ عالم تھا کہ جاوید دنوں تک پنجاب یونیورسٹی کی ہاسٹل کے اس کمرے جہاں یہ عارضی قیام کر رہا تھا سے باہر نہ آتا۔ گھوٹا (رٹ) لگانا اس نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ یہ لاہوری سے کتابیں لیتا اور ان کے ہیرا گراف، صفحات کے صفحات یاد کر لیتا۔ بعد میں کمرے میں ٹپکتے ہوئے انھیں دہراتا رہتا یہاں تک کہ وہ حافظے پر نقش ہو جاتے۔ یہ حفظ بغیر کبھی نہ ہوتا، اس میں نصاب کی مکمل تفہیم ہوتی۔ اس گوشہ نشینی کا اثر یہ تھا کہ اس کے ساتھ کے مسائے کروں میں ٹھیرے لڑکے بھی اُسے پہچانتے نہ تھے۔ یہ میلی شلوار تیس پہنے مطالعے میں مصروف رہتا، کئی وقت کا کھانا چھوڑ دیتا یا چند تھپے زہر مار کر لیتا۔

تین ماہ بعد اسلام آباد یونیورسٹی میں جب ایم اے کے فاضل امتحانات ہوئے تو جاوید خاصا پر اعتماد اور پرامید تھا۔ جب کہ اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ یہ لاہور سے تازہ دم ہو کر آیا ہے۔

امتحانات کا نتیجہ نکلا تو اس نے امتحانات میں اول آکر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ کلاس فیلوز نے رزلٹ ماننے سے انکار کر دیا، احتجاج بڑھا تو انتظامیہ نے پچھلے دوبارہ چیک کرنے کا اعلان کر دیا۔ چند دن بعد نتیجے کا اعلان کیا گیا تو جاوید کے نمبر پچھلے نمبروں سے بھی بڑھے

ہوئے تھے۔

غیر معمولی حافظہ، تصویر زیادہ داشت اور اس کا ہر عمل حوالہ قدرت کا تختہ ہے۔

جاوید کا حافظہ واقعات، حوالہ جات، ناموں اور جزئیات کے حوالے سے قابل رشک حد تک مضبوط ہے۔ اسے ایک مرتبہ ملے والے میرے دوستوں کے لباس کی تفصیل، جوتوں کا رنگ اور مونچھوں کی لمبائی تک یاد رہتی ہے، تاریخ کی کتابوں کے باب کے باب اور سباحت کے مقامات کے علاوہ بے شمار تفصیلات یوں یاد ہوتی ہیں جیسے ماں کو گونہال کے چہرے کے خدو خال۔

داس کوہ کے ایک بچہ پر بیٹھے ہوئے سمبر کی ایک سہ پہر میں نے اُس سے یادداشت کا راز پوچھا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ ایک تو یہ قدرت کا تختہ ہے دوسرے وہ ہر چیز کو یوں بغور دیکھتا ہے جیسے بچہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔ بچپن کی یادیں عموماً ساری زندگی ساتھ چلتی ہیں کہ وہ ذہن کی صاف سلیٹ پر ابتدائی نقوش ہوتے ہیں۔

جدید تحقیق کے مطابق بچپن میں وقت آہستہ اور بعد میں تیزی سے سرگت محسوس ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں انسان ہر شے کو بغور دل چسپی سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ حال میں زندہ ہوتا ہے اس لیے زندگی کے ہر رنگ اور ہر لمحے کو محسوس کرتا ہے۔ بعد کی عمر میں چون کہ انسان بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کر چکا ہوتا ہے اس لیے سرسری نگاہ کو کافی سمجھتا ہے۔ وہ اپنا وقت ماضی اور مستقبل کی سوچ میں گزارتا ہے۔ یہ وقت حقیقی نہیں ہوتا بلکہ انسانی ذہن میں گزرتا ہے ان لیے بہت تیزی سے گزرتا ہے اور خواب کی طرح لگتا ہے۔

آج بھی کالم لکھتے ہوئے بہت سے معاملات وہ یادداشت کے زور پر حل کر لیتا ہے۔ اسے ریفرنس میٹیریل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

گلے میں گولڈ میڈل ڈالے وہ لاہور کے ایک اہم اخبار کے دفتر پہنچ گیا۔ اُس دور تک اخبارات کے دفاتر کو انیک نقد میں آمیز قدر سے دیکھا جاتا تھا کہ وہ علمی، تہذیبی، سیاسی اور لسانی دانش گاہیں تھیں جن سے عام عوام کی تربیت بھی کی جاتی تھی اور وہ رائے عامہ پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ اخبار میں پڑھی خبر ایک مستند حوالہ بن جاتی تھی اور اس کی زبان لسانی راہ نمائی کا ذریعہ۔

لاہور کے اخبار کے دفتر میں ابتدائی دنوں میں وہ ریسپشن سے آگے نہ بڑھ پایا۔ وہ اخبار کے چیف ایڈیٹر سے ملنے گیا تھا لیکن اُسے باہر ہی روک لیا گیا۔ وہ استقبالی میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ اُس کے پاس چند کیلے اور دو چار کتابیں تھیں۔ اُس نے کیلے کھائے اور کتابیں پڑھنے میں مگن ہو گیا۔ اگلے روز بھی اُس نے یہی کچھ دہرایا۔ وہ پورے ڈیڑھ ماہ اسی طرح روزانہ بیٹھ پڑا کر بیٹھ جاتا اور اخبار سے مطالعہ کرنا شروع کر دیتا۔ بالآخر ریسپشن پر بیٹھے بندے کا دل موم ہو گیا اور وہ اسے چیف ایڈیٹر کے چہرے کے پاس لے گیا۔ چیف ایڈیٹر نے اسے نیوز ایڈیٹر عباس اطہر صاحب کے حوالے کیا۔ عباس صاحب نے اس کا امتحان لیا۔ وہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ پھر روزانہ امتحان دینے کے لیے آنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک ماہ اسی طرح گزر گیا۔ آخر کار عباس صاحب نے اس کی مستقل مزاجی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اُسے منظوری کی دھمکی کے ساتھ سینئر صحافی، ایڈیٹر ارتباط (کوآرڈینیشن) محمد اقبال زبیری صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اُس کی مستقل مزاجی کے امتحان کا پچھتر واں دن تھا جب زبیری صاحب نے اُس کا ٹیلی فون نمبر لیتے ہوئے کہا ”بیٹائی الحال ہمارے پاس منجائش نہیں۔ جب نوکری کی جگہ لکے گی، آپ کو ہم خود ہی اطلاع کر دیں گے۔“

اگلے روز یہ پھر اُن کے دفتر میں موجود تھا۔ انھوں نے اسے خوشگین نظروں سے دیکھا اور بولے ”تم پھر آگئے؟“۔ اس نے لجاجت سے کہا کہ وہ فون نمبر اس کے ہوشل کا ہے۔ اسے خدشہ ہے، چون کہ فون مصروف رہتا ہے اس لیے اگر کال کی گئی تو اس تک پیغام نہیں پہنچے گا۔ وہ سارا دن فارغ رہتا ہے۔ اگر زبیری صاحب اجازت دیں تو یہ روزانہ آکر باہر بیٹھنے سے اشارتا پوچھ لیا کرے۔ زبیری صاحب نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ اب یہ روزانہ آتا، دروازے میں لگے بیٹھنے سے اندر جھانکتا، زبیری صاحب نفی میں سر ہلا دیتے۔ یہ وہیں لوٹ جاتا۔



نوسے دن یعنی تین ماہ وہ روزانہ یہ عمل دہراتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز زبیری صاحب نے دروازہ کھولا، اسے اندر بلا کر اپنے سامنے ٹھایا اور نیوز ایڈیٹر کو بلا لیا۔ وہ آیا تو زبیری صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ”میں نے آج تک اس جیسا مستقل مزاج نوجوان نہیں دیکھا۔ میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ یہ بہت کام یاب ہوگا۔ میں نے اس کے لیے نظامی صاحب سے منظوری لے لی ہے۔ آپ اسے ڈسک پر بٹھالیں۔“

برسات کی ایک رات جب گیارہ بجے تھے اور بارش ہو رہی تھی کہ اُس نے مجھ سے ایک کپے میں کافی پیتے ہوئے کہا کہ آؤ باہر واک کرتے ہیں۔ میں نے پہلے اُسے اور پھر باہر گرتے پانی کی چٹکتی بوندوں کو دیکھا تو وہ بولا ”بارش میں بھیگنا اور چلنا بھی زندگی کا خوب صورت تجربہ ہے۔“

ہم کوہ سار مارکیٹ سے نکلے اور بھیکتے ہوئے پچھلی گرین ہیلٹ سے ہوتے ہوئے چھوٹے سے جنگل میں نکل آئے۔ اگر کوئی لمحہ یادگار ہو تو اس میں کئی گنی سادہ، عام سی باتیں بھی یاد رہ جاتی ہیں۔ مارگرہ روڈ کو میریٹ ہوٹل سے ملاتی ٹھوٹی سڑک پر رات کے بارہ بجے بارش کی بوندوں کو اپنے بدن پر محسوس کرتے ہم باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ ہم صبح تین بجے تک یونہی چلتے رہے۔ جاوید سے میں نے اُس کے کالم کی مشق کا پوچھا تھا۔

”چوں کہ مجھے مطالعے کا شوق تھا، مشاہدہ بھی تھا اور لکھنے سے خوشی ملتی تھی اس لیے میں نے کالم نگار بننے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کالم لکھنے کی مشق کرنی شروع کر دی۔ میں کسی موضوع کا خیال کرتا، اس پر مطالعہ کرتا، اپنی قطعی سوچی سمجھی عام ڈگری سے ہٹ کر خالص رائے قائم کرتا، کالم کی طوالت کی حد مقرر کرتا اور لکھنا شروع کر دیتا۔ ایک وقت ایسا آ گیا کہ الفاظ کی حد کے آخری لفظ پر آ کر کالم خود ہی ختم ہو جاتا۔ میں نے مشق کے لیے بے شمار کالم لکھے اور ضائع کر دیے۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے اوپر اعتماد ہو گیا۔ اب میں کسی بھی موضوع پر، یہاں تک کہ سامنے والے درخت کی ٹہنی اور آسمان سے نازل ہوتی بوندوں پر بھی لکھ سکتا تھا۔“ جاوید نے برساتی نالے پر سے چھلانگ لگا کر اسے عبور کرتے ہوئے کہا۔

یہ اُسی رات کی بات ہے جب ہم سبزے کی گیلی مہک کو اپنی یادداشت کا حصہ بنا رہے تھے کہ میں نے اُس سے پوچھا کہ اتنے مطالعے کے بعد اگر اُسے کسی ویران جزیرے پر اپنے ساتھ مذہب اور دین کے علاوہ پانچ کتابیں لے جانے کا موقع ملے تو وہ کن کتابوں کا انتخاب کرے گا۔ اُس نے کچھ دیر سوچا اور پانچ کتابوں کا نام لے دیا۔ ان کتابوں کے بارے میں ہم دونوں کا اتفاق تھا۔

”امیر تیمور کی خودنوشت“ ”میں ہوں تیمور“، دیوان سنگھ مفتوں کی ”نا قابل فراموش“ قدرت اللہ شہاب کی ”شہاب نامہ“ احمد بشیر کا ناول ”دل بھٹکے گا“ اور صغیر ملال کے ترجمے اور تعارف کے ساتھ ”میسوس صدی کے شاہکار افسانے۔“

وہ روز نامہ ”نوائے وقت“ سے صحافت میں داخل ہوا تھا اور روز نامہ پاکستان سے ہوتا ہوا روز نامہ خبریں میں جا بیٹھا۔ وہیں اُس کا ایک کالم میر ٹکیل الرحمان صاحب کی نظر سے گزرا اور انھوں نے اسے روز نامہ ”جنگ“ میں یہ طور کالم نگار آنے کی دعوت دے ڈالی۔

”جنگ“ سے جاوید چودھری کی زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جلد ہی وہ پاکستان کے سب سے بڑے روز نامے کے ادارتی صفحے کے مقبول ترین کالم نگاروں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اس میں چند وجوہات قابل ذکر ہیں، ان کالموں میں جذبات کی تاریخی پیش و دل چسپی کا عنصر، حکیمانہ اظہار، حکایت یا قصے کا سانداز، سیاسی کے علاوہ معاشرتی اور مذہبی موضوعات کو احاطہ تحریر میں لانا شامل تھیں۔ اُس کے ہر کالم کا ایک مکمل موضوع ہوتا تھا اور سبھی الفاظ اُس موضوع کی جانب رخ کرتے تھے۔ بعد میں اس کا یہ انداز اتنا مقبول ہوا کہ بے شمار کالم نگاروں نے اسے اختیار کیا۔

تین معاملات میں اُسے اردو کالم نگاری میں رجحان ساز کہا جاسکتا ہے۔

پہلا اُس کا حکایت کا سانداز۔ دوسرا وہ کالم کو ایک ایسی قابل قدر شے کے طور پر سامنے لایا جس سے کالم نگاروں کے مناسب

معاوضوں کا آغاز ہوا۔ تیسرا وہ کالموں کی کتاب کو ایک ریفرنس بک کی صفحہ سے نکال کر بیٹھ بیٹھ کے دوسرے بک سے لیا۔ اس کی ایک لحاظ سے ڈیل کارینگی سے بھی تحریری مشابہت ہے۔ ڈیل کارینگی میسوری، امریکا کے ایک فارم کے غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ اپنی لیاقت اور قابلیت سے اس نے اصلاح ذات اور شخصی بڑھوتری میں رجحان ساز کام کیا۔ اس کی تحریریں سلاوا، پرائمر، دل چسپ اور اچھوتی ہوتی تھیں۔ 1955 میں وفات پانے والے ڈیل کارینگی کی کئی کتابیں آج بھی قابل رشک تعداد میں فروخت ہو کر لوگوں کی زندگیوں بدلتی ہیں۔

جاوید کی تحریر میں بھی سادگی، اثر، دل چسپی اور معلومات ہوتی ہے۔ وہ روایتی کالم نگاروں کے برعکس اپنے کالم کے لیے باقاعدہ تحقیق کرتا ہے، اس کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے اور اسے دل جمعی سے تحریر کرتا ہے۔ گو اس حد تک ذہن و دلوں میں غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ اس دور میں جب کئی کالم نگار صبح جماعتی لے کر اٹھتے تھے اور بستر پر لیٹے اپنے کالم گھسیٹ کر غسل خانے کا رخ کرتے تھے اور اندر جا کر سگریٹ سلاگ کردن کا آغاز کرتے تھے، جاوید ایک کالم پر سنجیدگی سے دن میں آٹھ سے بارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ یہی وجوہات تھیں کہ جب وہ ”جنگ“ کو چھوڑ کر ”ایکسپریس“ میں گیا تو قارئین کی بڑی تعداد اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس کے ”ایکسپریس“ جانے کی رُوداد بھی خاصی دل چسپ ہے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ”جنگ“ اخبار میں وہ بہت اچھی طرح سے اپنا مقام پیدا کر چکا تھا۔ بلکہ وہ ”جنگ“ کے لیے ایک جذباتی وابستگی بھی قائم کر چکا تھا۔ اسی دوران ٹیلی وژن کے شعبے میں ایک انقلابی تبدیلی آئی اور پی ٹی وی کے علاوہ نئے چینل بھی میدان میں ایک ایک کر کے آنے لگے۔ ”جیو“ ٹی وی ان کا سرخیل تھا۔ جاوید یہ سب خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

وہ اپنی پیشہ ورانہ ترقی کا خواہاں تھا۔ جب اس نے دیکھا الیکٹرانک میڈیا میں پہنچنے آگئی ہے اور وہ بھی ذہنی طور پر اس میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ اسی دوران پی ٹی وی نے اس سے رابطہ کیا اور اسے ایک پروگرام کی پیش کش کر دی۔ اس کی قلمی وابستگی جنگ کے ساتھ تھی سو اس نے شرط رکھی کہ وہ اپنے ادارے جنگ کے لیے لکھتا رہے گا۔ پی ٹی وی نے اس کی شرط قبول کر لی اور اخبارات میں اس کے پروگرام کا اشتہار دے دیا۔

جب یہ خبر جنگ انتظامیہ تک پہنچی تو اس نے جاوید کے کالم روک دیئے۔ جاوید کے یہ یہ معاملہ خاصا پریشان کن بن گیا۔ میرا ان دنوں اس سے لمحوں کے حساب سے مسلسل رابطہ تھا۔ میں نے اس سے پہلے اسے اتنا بے چین کبھی نہ دیکھا تھا۔ بالآخر اس کی میرٹھیل الرحمان صاحب سے کراچی میں ملاقات طے ہو گئی۔ وہ کراچی آیا تو میں نے اسے ایئر پورٹ سے لیا اور ہم آرام کے ایک وقفے کے بعد پی ٹی وی ہوٹل روانہ ہو گئے۔

پی ٹی وی ہوٹل میں ہماری میرٹھیل الرحمان اور ان کے بیٹے میرابراہیم سے ملاقات ہوئی۔ میں لابی میں بیٹھ گیا اور جاوید ان کے ہم راہ چلا گیا۔ وہ قریباً گھنٹا بھر جاری ملاقات کے بعد واپس لوٹا تو اس نے قہقہہ لگایا اور مجھے بتایا ”میں نے جنگ چھوڑ دیا“ میں پریشان ہو گیا وہ کالم نگار کی حیثیت سے اپنی پروفیشنل زندگی کی آخری سیزم پر کھڑا تھا وہاں سے جلد ننگ ننگا عقل مند نہیں تھی میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے اسی طرح قہقہہ لگا کر جواب دیا ”یہ سمجھ رہے ہیں میں جنگ کے بغیر کچھ نہیں ہوں میں انہیں بتا آیا ہوں میں اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی انسان کو خدا ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں“ میں اس کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھا لیکن اس کا کہنا تھا ”میں اپنے آپ کو آزمانا چاہتا ہوں میں اگر اللہ کے کرم اور اپنی محنت کے بل پر میں ہوں تو میں نئی جگہ پر بھی کامیاب ہو جاؤں گا اور میں اگر جنگ کی وجہ سے میں ہوں تو پھر مجھے ختم ہی ہو جانا چاہیے“۔ جنگ چھوڑنے کے چند دن بعد اس نے روزنامہ ایکسپریس جوائن کر لیا یہ خبر اس وقت کی ایک بڑی خبر تھی پھر میرے سامنے میرٹھیل الرحمان کا اسے فون آیا وہ اسے واپس بلا رہے تھے لیکن اس کا جواب تھا ”شکیل صاحب میں آ گیا ہوں میں اب واپس نہیں آؤں گا انسان

کا کوئی کردار بھی ہونا چاہیے۔ میرا خیال تھا ایکسپریس ایک چھوٹا اخبار ہے یہ شاید یہاں کامیاب نہ ہو سکے لیکن اس نے کمال کر دیا اس نے ایکسپریس میں جگہ سے بہتر کالم لکھے ایکسپریس نے 2008ء میں ٹیلی ویژن چینل لانچ کیا تو یہ ان کا شمار ہنر مند بن گیا یہ آٹھ سال سے کالم کے ساتھ ساتھ ملک کا پاپر سیاسی پروگرام بھی کر رہا ہے اس دوران اسے نصف درجن چینلوں سے منہ مانگے معاوضے کی پیشکش ہوئی لیکن یہ پاکستان کے ان تین ہنر مندوں میں شامل ہے جنہوں نے پیسے کیلئے ادارہ نہیں بدلا یہ ہمیشہ کہتا ہے ”مجھے میری ضرورت کے مطابق معاوضہ مل رہا ہے لہذا مجھے صرف بینک یا رپارٹی ڈیلروں کیلئے پیسے کمانے کی کیا ضرورت ہے؟“۔

جاوید نے کچھ عرصے سے پروگرام کے آغاز میں درود شریف بھی پڑھنا شروع کر دیا ہے ”کیوں؟“ میں نے اس سے پوچھا اس نے جواب دیا ”راولپنڈی کے کسی صاحب نے ایک دن مجھے فون کیا اس کی بیگم کو نبی اکرمؐ کی زیارت ہوتی تھی اس نے بیگم سے میری بات کرائی خاتون پر ہیز گار تھیں انہوں نے بتایا نبی اکرمؐ نے آپ کو پیغام بھجوایا ہے آپ نماز بھی نہیں پڑھتے اور مجھ پر درود بھی نہیں بھجواتے“ میں نے خاتون کا شکریہ ادا کیا اور بات سنی ان سنی کر دی کچھ عرصے بعد ملتان سے ایک صاحب کا فون آ گیا انہوں نے بھی یہی پیغام دیا میں رازگیا میں نے اسے رسول اللہ ﷺ کا حکم سمجھا اور درود شریف کو اپنے تمام معمولات کا حصہ بنا لیا۔ میں نے کہا ”ہو سکتا ہے یہ زیارت صرف تحفہ ہو“ اس نے فوراً جواب دیا ”نہیں یہ صرف تحفہ نہیں تھی کیونکہ دونوں نے چند ایسے حوالے بھی دیئے تھے جن سے صرف میں واقف تھا اور اگر فرض کر لیں یہ صرف تحفہ بھی ہو تو بھی درود شریف پڑھنے کا مشورہ غلط نہیں یہ آپ کی روح کو قوی کر دیتا ہے اور میں روز اس توانائی کو محسوس کرتا ہوں۔“ جب میں پہلی مرتبہ جاوید کے گھر شہزادہ اذان اسلام آباد میں گیا تو ایک عام صحافی کے باذوق اور خوب صورت آرکیٹیکر والے کالج نما گھر کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس کے بعد وہاں درجنوں بار جانا ہوا اُس نے گھر میں بچوں کو تربیت دے رکھی تھی کہ وہ مہمانوں کو خود مشروبات اور دیگر لوازم پیش کریں۔

”مجھے گھر کے اندر ملازم کے ہونے سے ذاتی زندگی میں مداخلت ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ویسے بھی میری بیوی کو گھر گھر ہستی کا بہت شوق ہے۔“ اس نے بتایا تھا۔ تب اُس نے بچے بہت چھوئے تھے اور گھر انا بھی مکمل بھی نہ ہوا تھا۔ اُسے اپنی بیوی اور بچوں سے عشق ہے۔ بیوی بھی اُس سے ایسا عشق کرتی ہیں کہ ”میری خاطر بچے بھی چھوڑ سکتی ہے“ وہ فکرمحور لہجے میں کہتا ہے۔

اُس کے ابتدائی کالموں میں بچوں کا تذکرہ تو اتار سے آتا تھا۔ بھلے وہ ”آف دی ریکارڈ“ کالم میں بچوں کے ساتھ انور کا دان بھر پور طریقے سے گزرنے کا تذکرہ ہو، ”بائلیاں“ میں بیٹے کے بے پندے ہائی بھرنے کا قصا ہو، ”بندر آکھیں، نکلتا ہے“ میں بیٹے کا اندھے بندر کی تصویر اخبار سے کاٹ کر میز پر رکھ دینے کی بات ہو، ”تھینک یو ملک صاحب“ میں چھٹی کے دن بچوں کے ساتھ کھیلنے کو نہ لے گا کہ ہو یا بے شمار دیگر کالموں میں بالواسطہ اپنے بچوں کا تذکرہ ہو یا بلاواسطہ ایک باپ کی حیثیت سے دوسروں کے بچوں کی تکلیف پر پدرا نہ ہڈی سے جھلکا اٹھتا ہو۔

میں نے بیٹیوں سے محبت کرنے والے بے شمار لوگ دیکھے ہیں لیکن جاوید جیسا باپ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ وہ اپنی بیٹیوں کا کٹر اسلام آباد کے چنگے اسٹور پر لے جاتا ہے اور بچیاں جو چاہیں خرید لیتی ہیں ایک باریک بیٹی نے ناگہی میں برف میں چلنے والے رنگ شولے لیے۔ برانڈڈ لائیک شوفا سے چنگے بھی تھے اور یہاں پر ان کا استعمال بھی نہ تھا۔ وہ ماتھے پر شکن تک نہ لایا اور انھیں پیک کر داکر بیٹی کو لے رہے۔ یہ اُس کی روٹین ہے اس طرح بچوں کو ہفتے دس دن میں شاپنگ پر لے جاتا ہے اور ان کی من چاہی شاپنگ کرواتا ہے۔ بیٹیوں کے ذکر پر کہتا ہے۔

”ان کے غرے باپ ہی نے اٹھائے ہیں۔ میں نہیں چاہتا ان کے دل میں کوئی حسرت رہ جائے۔“ بچے اسے اکثر ایسے اٹھائے

کے ذریعے کھانے کی اشیاء لانے کا ”آرڈر“ کر دیتے ہیں یہ رات کوئی دی پروگرام کے بعد سالانہ کیا دے گی مگر کی جانب ہاتھ ہوتے  
رستے میں رکن اور بچوں کے لیے فاسٹ فوڈ، چٹ پٹے کھانے پیک کر داتا ہے۔ کئی مرتبہ میں ہمراہ ہوتا ہوں اور اسے لوٹتا ہوں بچے سوچے  
ہوں گے تو وہ کہتا ہے ”مجھے بھی معلوم ہے بچے سوچے ہوں گے لیکن میں چاہتا ہوں جب بچے سنا فری کھولیں اور سامنے پیک کیا ہوا رات کا  
کھانا دیکھیں تو یہ نہ سوچیں کہ اُن کا باپ رات کو اُن کی فرمائش بھول گیا تھا۔“  
ایک رات اپنے گھر پر اُس نے مجھے ایک واقعہ سنایا۔

”یہ 1996 کی بات ہے۔ میں نے ”خبریں“ اخبار میں دیا یا کالم لکھنا شروع کیا تھا۔ مجھے ہارون آباد سے ایک بندے نے  
جنھوڑنے والا خط لکھا۔ وہ دیکھی بھی تھا اور ضرورت مند بھی۔ میں نے وہ خط اپنے کالم میں شائع کر دیا۔ نتیجاً مدد کرنے والوں کا تانہ بندھ گیا۔  
ایک صبح مجھے ایڈیٹر خوشنود علی خان نے فینڈ سے جگایا اور بتایا کہ اُن کے جاننے والے ایک صاحب مجھے ملنا چاہتے ہیں۔ خوشنود صاحب نے یہ بھی  
بتایا کہ وہ صاحب فون پر مسلسل رو رہے تھے۔ اُسی روز خبریں کے دفتر میں ایک گم نام ٹھیکے دار تشریف لائے۔ اُن صاحب نے سونے کی گھڑی  
اور سونے ہی کی زنجیریں پہن رکھی تھیں۔ میری تنخواہ چھ ہزار روپے تھی۔ ان ٹھیکے دار صاحب نے ایک لاکھ روپے کی رقم ضرورت مند کے لیے  
بے حد ہم وردی سے دی۔ تب میں بھی گم نام تھا اور وہ ٹھیکے دار بھی۔ اُس کے جانے کے بعد خوشنود علی خان نے مجھے بتایا کہ وہ شخص فلاح عامہ  
کے کاموں بالخصوص پاکستانی جیلوں میں قید بنگلہ دیشی قیدیوں کی رہائی اور دایسی میں پیش پیش تھا۔ اُس ٹھیکے دار کا نام ملک ریاض تھا جو بعد میں  
بحریہ ٹاؤن کے حوالے سے مشہور ہوا۔“ جاوید نے ملک ریاض سے اپنے پہلے تعارف کی روداد سنائی۔

”ملک ریاض میں یقیناً کئی خامیاں ہوں گی اور اُس کے کاروباری طریقے سے اختلاف سہی لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا  
کہ اُس نے پاکستان میں وسیع پیمانے پر عمدہ اور پرسکون رہائش کو ملکی جامہ پہنایا ہے۔ اُس کے فلاح عامہ کے بے شمار کام بھی قابل تحریف  
ہیں۔ ہمارے ہاں سیکڑوں ارب پتی لوگ ہیں۔ ان میں سے چند ایک ہی فلاحی کام کرتے ہیں۔ کم از کم ان لوگوں کے مثبت پہلو کی تحریف اور  
حوصلہ افزائی ضرور کی جانی چاہیے۔ لوگ ملک ریاض کے ساتھ تعلق کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں مجھے گالیاں بھی دی جاتی ہیں لیکن میں اپنے  
ضمیر سے مطمئن ہوں سو کسی کے بے جا خوف سے ضمیر کی آواز نہیں دبا سکتا۔“  
اُس نے دکھ سے مجھے کہا۔

”ہم کام یاب لوگوں سے حسد کرتے ہیں اور اُن کی کام یابی میں نہ صرف سازش کا عنصر تلاش کر لیتے ہیں بلکہ تراش بھی لیتے  
ہیں۔ پوری دنیا میں سیلف میڈ لوگوں کی مثال دی جاتی ہے لیکن یہاں ”تودولتیا“ کہہ کر پیٹھ پیچھے تضحیک آمیز رویہ اور سامنے برخورداری کا سا انداز  
افتخار کر کے حسد کے لال قلعے پر منافقت کا جھنڈا لہرایا جاتا ہے۔“

جاوید دنیا کی سیاحت کرتا ہے، اعلیٰ فلمیں دیکھتا ہے، کتابیں پڑھتا ہے، ورزش کرتا ہے، تازہ ترین لطیفے سناتا ہے، خوب قہقہے  
لگاتا ہے اور زندگی کی رنگینی سے لطف اُندوز ہوتا ہے۔ وہ محبت کی رنگین گل بی پھوار سے بھی بھیگ بھیگ چکا ہے۔ یہ تعلق ابتدا میں فقط رکی تھا،  
بعد ازاں وقت گزاری کا ذریعہ بن گیا۔ وہ ایک عام نوجوان صحافی تھا۔ اُسے پتا ہی نہ چلا کہ اس تعلق کی جڑوں نے برگد کی جڑوں کی طرح پھیل  
کر چند برسوں میں کس طرح آکٹوپس کی مانند اُس کے دل کو جکڑ لیا۔ جب جدائی کا لمحہ قدرت کی جانب سے نازل ہوا تب تک یہ تعلق بہ ظاہر  
لو جھپن چکا تھا۔ جب تعلق سلگتی اگر جتنی کی طرح جل کر راکھ ہو تو اُس نے سکھ کا سانس لیا۔

اُس کے چلے جانے کے بعد اس نے بہ طہر ایک بوجھ ہٹا محسوس کیا۔ میں کہ محرم حال دل تھا سو واقف جذبات تھا۔  
اس دوران مجھے بیرون ملک جانا پڑا تھا۔ واپس لوٹا اور اسے فون کیا تو اُدھر سے ہچکچوں اور زندگی آواز کے غم آلود مسکارے سنائی  
دینے۔ میرا دوست سچ رہا تھا، ٹوٹ رہا تھا، بکھر رہا تھا۔ پس وہ چند برس اُس نے ہولناک تنہائی اور شدید رنج میں گزارے۔



یہ انھی دنوں کی بات ہے جب اُس پر جدائی کے عفریت کی حقیقت دینہ کے سپورن سنگہ جو اب تک بمبئی کا گھر زار میں چکا تھا کہ لکھے شعروں، ڈائلاگوں اور ہدایت کردہ فلموں کی صورت میں عیاں ہوئی۔ یہ بھی کی بات ہے کہ جب وہ چھوڑے گا دکھ اسے آن پڑتا ہے تو یہ گل زار کا مقتدی ہو جاتا ہے، اُس کے لکھے الفاظ اور اُن میں پھونکی روح خود جاوید کی کتابوں کی پشت پر رقم ہو جاتی ہے، ان میں جذبات کے ویسے ہی صوفیانی افشاں کے وہی ذرات اُتر آتے ہیں جو گل زار کی روح سے جھڑکتے ہیں۔ نہ جانے اور کتنی روحوں کی پاتالوں سے ہدائی سسکیاں اُٹتی ہیں اور عرش تک اُبھرتی جاتی ہیں، رب جانے۔

گل زار کی شاعری اور فلموں بالخصوص "اجازت" سے متاثر ہو کر اس نے لکھا تھا۔  
 "تم نے جاتے ہوئے کچھ چیزیں چھوڑی تھیں۔ دیو سائی کے سرے پر ایک کنواری جھیل تھی، نیلے پانیوں کی رخ جھیل، پانیوں میں سیکڑوں رنگ کے ہزاروں پھولوں کا عکس تھا، عکس کے بچوں بیچ بادلوں کی چادر سرک رہی تھی اور چادر کے ایک پلو میں ناگہرست کی چوٹی بندھی تھی، اس وقت دنیا کی ہمت پر صرف ہم دو انسان تھے، تم نے جھیل سے پاؤں نکالے، ہم نیلی چوچ اور ہنرؤم والی چڑیا کے پیچھے بھاگے، چڑیا اڑ گئی لیکن پھولوں کے مسئلے کچلے بدن پر تمہارے پاؤں کے نشان رہ گئے، میں یہ نشان واپس کرنا چاہتا ہوں۔ جو لیاں کی ہزاروں برس پرانی میڑھیاں بھی تمہیں لوٹانا چاہتا ہوں۔ ہم شکر محل کی بالکونی میں بیٹھے تھے، دریا ہمارے پیروں میں بہہ رہا تھا اور خوبانی اور سب کے درخت ہمارے سروں پر جھکے تھے، تم نے گگ کے کناروں پر ہونٹ رکھ دیئے، وہ گگ، گگ کے کناروں پر ہونٹوں کے نشان اونگ کی دیواروں پر کافی کی جھاگ، ابھی تک باقی ہے، میں یہ جھاگ، یہ نشان اور کافی کا یہ گگ بھی واپس کرنا چاہتا ہوں، میں سب اور خوبانی کے وہ درخت، وہ بہتا دریا اور شکر کا وہ گل بھی تمہیں لوٹانا چاہتا ہوں۔ ہم نے کلر کھار کے ریٹ ہاؤس میں زندگی کا پہلا اور آخری سگریٹ پیاتھا، میں نے شروع کیا تھا، تم نے ختم، اس سگریٹ کی راکھ اور آسوؤں کے داغ بھی باقی ہیں۔ لال سہارا کے ریٹ ہاؤس کے ہاتھ روم کے فرش پر وہ گیلیا تو لیہ بھی اسی طرح پڑا ہے، تمہارے کچلے، میلے، کھائے، رگڑے نشوز، تمہاری ساری کبیشیں، ساری سی ڈیز، ساری کتابیں، سارے کارڈز اور ساری جھوٹی مچی قسمیں بھی وہیں پڑی ہیں جہاں تم نے رکھی تھیں، چودھویں کے وہ سارے چاند بھی اسی طرح آسمان پر ٹنگے ہیں، جھیلوں میں پھینکے وہ سارے پتھر اور ان پتھروں کے بدن سے نکلے وہ سارے دائرے بھی اسی طرح موجود ہیں، تمہارے لمس کی وہ ہلکی ہلکی چپش اور تمہاری قیص کا وہ ٹوٹا ہوا بھی وہیں پڑا ہے جہاں تم نے چھوڑا تھا، بستروں کی اجلی چادروں اور تکیوں کے سرخ غلافوں میں تمہاری خوشبو ابھی تک جاگ رہی ہے، تمہاری میری 52 راتوں اور 56 صبحوں کی آنکھوں تک ابھی خند نہیں پہنچی اور میری پوروں کے حافظے میں ابھی تک تمہاری ہلکوں کا ارتعاش باقی ہے اور میری گردن پر تمہاری سانس کا لمس بھی ابھی زندہ ہے، میں یہ سارے لمس، یہ ساری خوشبوئیں، گزرے ہوئے تعلق کی یہ ساری تصویریں بھی تمہیں واپس کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنا سارا ماضی تمہیں لوٹانا چاہتا ہوں۔"

یہ جذبات قلمی نہیں قلبی ہیں۔

جذبات کے رنگین پانی اب بھی اُس کے اندر دوپٹے رگنے والے پانیوں کی طرح اُلتے ہیں اور اُس کی روح کو اپنی پھوار سے ہولی

رنگ کر دیتے ہیں۔

وہ تخلیقی مزاج کے باعث کچھ حسن پرست بھی ہے اور کچھ عشق پیشہ بھی۔ اس معاملے میں بڑھ بھی جاتا ہے۔

رنگین اور دل چسپ کرداروں میں خوش رہتا ہے۔ میری اُس کی وجہ سے نام و سیاست دانوں، کامیاب بزنس میمنوں، مشہور دانش

وروں، اداکاروں اور عجوبہ روزگار لوگوں سے ملاقاتیں رہتی ہیں۔

ایک صاحب کو ہم کوڈورڈز میں "خوابِ حلالہ" کہتے ہیں۔ خوابِ صاحب خد سے تعلقات رکھتے ہیں سو جہاں کہیں سوئے اتفاق یا بوجہ

غیظ و غضب نا اُنسکی میں طلاق ہو جائے تو "حلالے" کی غرض سے خاموشی سے اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں با بھی اعتبار

اور رازداری ضروری شرائط ہیں۔ شرماتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ اب تک سو کے قریب ضرورت مندوں کی خدمت کر چکے ہیں۔ اسی طرح ایک ریٹائرڈ بیوروکریٹ اکثر واک کرتے ہوئے ان کے دفتر آ جاتے ہیں اور اپنے کارنامے گناتے گنتے ہیں۔ ان سے معذرت کرنی ہو تو جاوید کو عجیب بہانے تراشنے پڑتے ہیں جن میں کسی دوست کی اچانک وفات سے لے کر بریکنگ نیوز کی کوریج تک شامل ہیں۔ اب تو اس کا عملہ اس حد تک تربیت یافتہ ہو چکا ہے کہ ادھر وہ صاحب بلا اطلاع کر بیٹھتے ہیں اور دسیوں بار دہرایا کارنامہ بھر سے بیان کرنے لگتے ہیں ادھر عملے کا گھبراہٹ ہوا فرد اندر داخل ہوتا ہے اور کسی ناگہانی وفات کی یا حادثے کی خبر سنا دیتا ہے۔ جاوید اچھ بڑھا کر ان صاحب سے مصافحہ کرتا ہے، معذرت کرتا ہے، انھیں دروازے تک چھوڑ کر آتا ہے اور اطمینان کی سانس بھر کر پروگرام کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔

جاوید نہ تو فرشتہ ہے اور نہ ہی شیطان۔ عام انسان ہے۔ اُس میں جہاں کئی خوبیاں ہیں وہاں بہت سی خامیاں بھی ہیں۔ وہ زود رنج ہے، مادہ صبر جلد ختم ہو جاتا ہے، کوئی دشنام طرازی کرے یا گالی دے تو اس کا فیوز اڑ جاتا ہے۔ تحریر میں سہانے کا تذکرہ بھی لگا دیتا ہے۔ کچھ معاملات میں بڑھ بھی جاتا ہے۔ روزانہ سوشل میڈیا پر برے بھلے الفاظ پڑھ کر دکھی ہو جاتا ہے۔ میں اُسے تسلی دیتا ہوں ”اس وقت پاکستان کے میڈیا میں کون سا ایک شخص ایسا ہے جس کی عزت پر اجماع امت ہو؟“ تو لا جواب ہو کر خاموش ہو جاتا ہے مگر کہتا ہے ”ہماری قوم کی یادداشت گولڈنش کی طرح تین سیکنڈ کی ہے۔ میں نے اپنے ضمیر اور سمجھ کے مطابق ہر حکومت اور ہر پارٹی پر جائز تنقید کی ہے۔ کبھی خود کو کسی کا آلہ کار نہیں بنے دیا۔ اسی لیے کھل کر لکھتا ہوں مگر جب کوئی مجھے ”بکاؤ“ کہتا ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“

جاوید نے اپنے سگے خون کے بعض رشتوں سے فقط اس لیے ناراضی اختیار کی ہے کہ وہ ملازمین سے درشتی کا رویہ اختیار کرتے تھے، یہ ویٹر کو اپنی آواز سے پکارنے والوں سے لڑ پڑتا ہے، نظار توڑنے والوں سے ناراض ہو جاتا ہے، ہمیشہ قانون قاعدے کی پابندی کرتا ہے۔ ہمیشہ بروقت اور صحیح ٹیکس دیا۔ جب وہ مجھ سے دکھی لہجے میں یہ کہتا ہے ”یار میں نے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا، بیوی بچوں کے حقوق پورے کرتا ہوں، اپنے ملازمین سے محبت سے پیش آتا ہوں، ادارے کا کام دیانت دارانہ خلوص اور تن دہی سے کرتا ہوں تو کبھی ایسے لوگ جو نہ تو مجھ سے کبھی ملے ہیں اور نہ ہی مجھے جانتے ہیں کیوں کر میری ذات پر کریک حملے کرتے ہیں؟“ تو حب میرے ذہن میں احمد ندیم قاسمی ایسا بے ضرر فن کار اور فکیل عادل زادہ جیسا وضع دار انسان آ جاتا ہے۔ یہ دونوں اساتذہ اسی سوال سے بندھے رہے ہیں۔ تب میں عرض کرتا ہوں ”جاوید آپ مٹھی بھر دشنام طرازیوں کو مت دیکھیں۔ ان ہزاروں لاکھوں لوگوں کو دیکھیں جو آپ سے محبت کا چراغ اپنی آنکھوں میں روشن کیے اس کے لو میں آپ کا لکھا ہر لفظ پڑھتے ہیں اور دیکھتے سنتے ہیں۔“

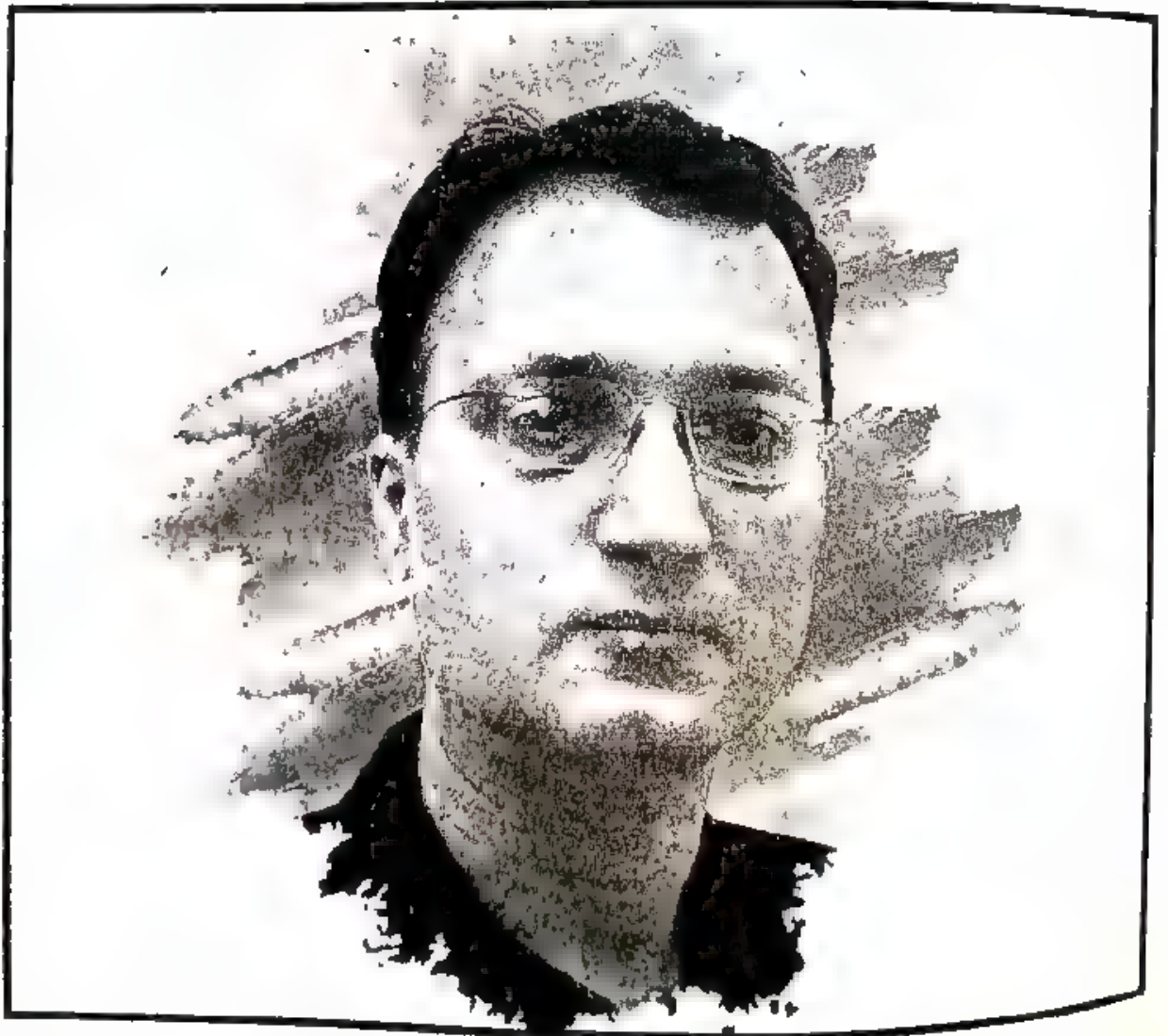
وہ لمبی سانس بھرتا ہے اور کہتا ہے۔ ”محنت میری زندگی کا واحد اثاثہ ہے اور شکر میری واحد کامیابی“ میں صبح دس بجے سے رات تین بجے تک کام کرتا ہوں، مجھے لکھنا نہیں آتا تھا، میں پانچ سال تک کالم کی پریکٹس کرتا رہا، میں روز رات کو ایک کالم لکھتا تھا اور صبح اٹھ کر پھاڑ دیتا تھا، میں پانچ سال یہ پریکٹس کرتا رہا، میں نے خوشحالی کیلئے دفتر کھولے، کہنیاں بنائیں، پرنس کیا، میں آج بھی کاروبار کرتا ہوں، مجھے ٹی وی میں کام کرنا بھی نہیں آتا لیکن میں آٹھ سال سے ڈٹا ہوا ہوں یہ کام اب سمجھ آ رہا ہے، چار کالم لکھتا ہوں، چار سیاسی پروگرام کرتا ہوں، روزانہ کمرسائز کرتا ہوں اور فلمیں دیکھتا ہوں، روزگستاہیں پڑھتا ہوں، فیملی کو وقت دیتا ہوں، میں نے کسی جگہ پڑھا سفر دنیا کی بہترین یونیورسٹی ہے میں نے سفر شروع کر دیئے، میں نے اب تک 65 ملکوں کے سفر کئے اور مزید سفر کر رہا ہوں، دوستوں کیلئے بھی حاضر رہتا ہوں، جو کام شروع کرتا ہوں وہ سیکھنا شروع کر دیتا ہوں، آج کل کنسرکشن اور آرکیٹیکچر میں دلچسپی ہے یہ بھی سیکھ رہا ہوں، شوگر کو بھی میٹین کرنے کی کوشش کرتا ہوں، نہ کسی کو بھیرنے دیتا ہوں، جو بھوکے اسے کہتا ہوں بھائی صاحب آپ اپنی گلی میں بھوکے اور مجھے اپنی گلی میں بھوکے دیں، بیوی سے محبت کرتا ہوں، بیٹوں کو دوست سمجھتا ہوں، بیٹیوں پر شمار ہوتا رہتا ہوں، پوری زندگی اچھا بیٹا اور اچھا بھائی بننے کی کوشش کی، ناکام رہا، والدین اور بہن

بھائیوں کو مطمئن نہ کر سکا جب بھی پیسے کی ضرورت پڑتی ہے تو محنت بڑھا دیتا ہوں تمام صحابیوں اور سہارا دہندگانوں سے زیادہ ٹیکس دیتا ہوں آرام وہ زندگی اچھی لگتی ہے اللہ نے آرام وہ زندگی بخشی اس پر اس کا شکر گزار ہوں عاشق رسول ہوں زندگی کا بہترین کالم نیا اکرم پر تحریر کیا روز ایک نئی چیز سیکھتا ہوں ہماری عادتوں پر روز کڑھتا ہوں 'سگریٹ نہیں پیتا' شراب نہیں پیتا' جوا نہیں کھیلتا' لوگوں کا خون بھی نہیں پیتا آرتھ بیک والٹ سے ملا' بیک والٹ نے پوچھا "تم پاکستان میں اتنے پاپولر کیوں ہو" جواب دیا "میں شاید اچھا لکھتا ہوں" اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "ابھی تم اچھا نہیں پاپولر لکھتے ہو" میں نے فرق پوچھا "وہ بولے" پاپولر لکھنے والے منافق ہوتے ہیں یہ لوگ صرف وہ چیزیں دہاتیں لکھتے ہیں جو لوگوں کو پسند آتی ہیں یہ وہ نہیں لکھتے جو صحیح ہوتا ہے آپ اس دن اچھے رائٹر بنو گے جس دن آپ صرف اپنے ضمیر کے مطابق لکھو گے اور لوگ ہمیں بچانے کی بجائے تمہیں گالیاں دیں گے مگر تم پیچھے نہیں ہٹو گے" میں نے یہ نصیحت پلے باندھ لی میں اب 2010ء سے صرف وہ لکھ رہا ہوں جو سچ ہے یا پھر جسے میں سچ سمجھتا ہوں چنانچہ اب لوگوں سے دل کھول کر گالیاں سنتا ہوں قہقہہ لگاتا ہوں اور اگلے دن دوبارہ وہی حرکت کرتا ہوں "وہ خاموش ہو گیا" میں نے پوچھا "آپ اللہ کے کرم کا بہت ذکر کرتے ہیں" کیوں؟ "وہ بولا "رد و جوابات ہیں پہلی وجہ اللہ نے مجھ پر ترس کھایا اللہ تعالیٰ ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں لوگوں پر کرم و رحم کرتا ہے لیکن مجھ پر اس نے ترس کھایا اس نے مجھے نواز دیا میں نے اللہ سے جوا کھا اس نے مجھے عنایت کر دیا میں ترس کی اس عنایت پر اللہ کا شکر گزار ہوں دوسری وجہ میرے جیسے بیک گراؤنڈ کے لوگوں کو سختیاں متنی بناوتی ہیں یہ شیطان بن جاتے ہیں یہ سیریل کلر بن جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بچپن اور خونناک جوانی کے باوجود مثبت رکھا قدرت نے مجھے متقی نہیں ہونے دیا یہ اس کا خاص کرم ہے" میں نے اس سے پوچھا "آپ میں کشف کی صلاحیت کیسے آئی روحانیت کی طرف رغبت کیسے ہوئی" وہ مسکرایا اور بولا "یہ بھی اللہ کا کرم ہے اللہ جب کسی پر خوش ہوتا ہے تو وہ اسے رزق بھی دیتا ہے نیک نامی بھی علم بھی اور اس کی روح کو بھی سیراب کر دیتا ہے"۔

یہ اسی شام کی بات ہے جب ہم دونوں بارش میں بھٹکتے، مارگلہ روڈ کے درختوں کی شاخوں اور پتوں سے ٹپکتے پانی کے قطروں کے نیچے چھ جا رہے تھے، سامنے مارگلہ کی پہاڑیوں پر دھند سی آتر رہی تھی، گھر دل کی تیریاں روشن ہو کر پانی کی پھوار کے پیچھے ٹھنڈی تھیں کہ میں نے جاوید سے پوچھا تھا "آپ کی زندگی میں کوئی افسوس، کوئی ندامت؟" وہ فوراً بولا "ہاں ایک ندامت ہے، وہ جاتے ہوئے ناراض تھی یہ بات دکھ دیتی ہے۔" پھوار پانی کی بوچھاڑ میں بدل گئی اور اس کے آنسو بارش کے قطروں میں مل کر بہنے لگے۔ ہم دونوں نے کالر لہجے کر لیے، در ایک گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔

# دُھندلا آدمی

محمد عاصم بٹ





عاصم بٹ کو دیکھ کر مجھے کبھی کبھار اس پر آنکھیں جھپکاتی، کابلی سے ساحل پر ٹھسل آتالی کرتی سندری ہیل کا ٹھکان ہوتا ہے۔ اُسے بڑی سے بڑی خبر سنائی جائے تو اُس کے بے تاثر چہرے پر بے یقینی آہستہ آہستہ کھوے کی چال چلتی چلی آتی ہے اور وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے فقط اتنا ہی پوچھتا ہے ”واقعی؟“ اگر کوئی مزاح کی بات سنے تو زیر لب خرگوش کی طرح مسکراتا ہے (گوکہ راقم نے کبھی خرگوش کو مسکراتے نہیں دیکھا، چنانچہ یہ بیان قیاس پر مبنی ہے)۔ تبقہ آور بات پر ایک ٹھٹھا ٹھٹھا سا دھماکا قہقہہ اُس کے ہونٹوں سے چھوٹ جاتا ہے اور بڑی بڑی آنکھیں مسکرا اٹھتی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے اُسے کہا کہ اُس کی کچھ شبابہت منٹو سے ملتی ہے۔ یہ سن کر وہ بڑا خوش ہوا۔ اُسے افسوس ہے کہ ”بٹ“ کا لالہ اُس کے نام کو غیر ادبی بنا دیتا ہے۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگا کہ جب کبھی کسی غیر ادبی محفل میں ذکر ہو کہ بٹ صاحب ادب کا شوق رکھتے ہیں اور موصوف اس نازنین سے محبت میں مبتلا ہیں تو حاضرین بے یقینی سے صرف اتنا ہی کہتے ہیں ”محمد وجی، بھلا بٹ بھی ادیب ہوتے ہیں۔“ میں اُس کے اس خیال سے جزدی طور پر متفق ہوں۔ اب اگر سعادت حسن منٹو جیسے بکے کشمیری کا نام سعادت بٹ ہوتا تو شاید اتنا متغیر نہ رہتا۔

ایک دور میں مختصر حرنی ناموں کا رواج تھا جیسے اے حمید، ن۔م۔ راشد وغیرہ۔ اگر محمد عاصم بٹ اُس دور میں ہوتا تو اس کا نام م۔ع۔ بٹ ہوتا بالفاظ دیگر مع بٹ یعنی بٹ کے ہم راہ۔ وہ واقعی ایک عاصم ہے جو بٹ کا لالہ چنیچہ پر لادے چل رہا ہے۔ اس کی ایک عادت مجھے بہت پریشان رکھتی ہے اور وہ اس کا بھلکھو پن ہے۔ بڑے سے بڑا وعدہ کر کے بھول جاتا ہے اور اپنی داخلی دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار مجھے اس پر دھونی رمائے برگد کے نیچے بیٹھے ایک سادھو کا گن ہوتا ہے، سوچ کی پہنائیوں میں گم لیکن کبھی مجھے لگتا ہے کہ یہ آنکھیں بند کیے جوگ سنبھالے بیٹھا سادھو اتنا بھی گم نم نہیں بلکہ جب دنیا بے خبر ہوتی ہے تو وہ اپنی ایک موٹی سی آنکھ کھول کر ارد گرد کا جائزہ لیتا ہے اور کسی کو متوجہ پا کر جلدی سے وہی آنکھ بند کر لیتا ہے۔ میری آنکھیں چند ایک بار اُس کی کھلی آنکھ سے دوچار ہوئیں تو اس میں مشاہدے اور ذہانت کی چمک یوں لشکارے مارتی تھی جیسے پہاڑی چشمے سے نہا کر نکلتی گوری کا جو بن۔

اگر اُس کا مشاہدہ اتنا حیرت نہ ہوتا تو وہ کیوں کرایے ادبی شاہ کار تخلیق کر لیتا، وہ عورت کا سا مشاہدہ رکھتا ہے جو آدمی آنکھ سے مخاطب کے عزائم کو جانچ لیتی ہے۔

عاصم کسی کو انکار نہیں کرتا، شاید وہ عورت ہوتا تو خاصے مسائل سے دوچار ہوتا۔ دیگر احباب کہتے ہیں کہ وہ مرد فولاد ہے مگر میرے سامنے تو وہ پس لبیک کی عملی تفسیر ہے۔ کسی بھی پردگراں پر لبیک صادر کرتا ہے، بھلے آخری لمحے میں خاموشی سے کھسک جائے۔

فولاد سے خوشونت سنگھ کا خیال آتا ہے۔ بزرگوار ایک مرتبہ جب پاکستان تشریف لائے تو لاہور کے ایر پورٹ پر روانگی کے دوران اُن کی چیکنگ کرنے والے اہل کار کا دستی آلہ بار بار زیر ناف ”ٹوں ٹوں“ کی آواز سے چیخ اٹھتا۔ بالآخر اہل کار نے مشکوک نظروں سے موصوف کی جانب دیکھا تو حضرت نے اپنے زیر ناف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

”فولادی ہے فولادی۔“

اس پراہل کار نے مسکرا کر انھیں جانے دیا۔ درحقیقت انھوں نے جو بیٹ ماہن رکھی تھی اُس کا بنگل خاصا وزنی اور اہنی تھا جس کی وجہ سے آلہ بول اٹھتا تھا۔

میری اُس کی دوستی کو دہائی بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے اور ہم نے زیادہ تر وقت سڑکوں پر گزرا ہے۔ سڑک چھاپ بن کر نہیں بلکہ چہل قدمی کرتے ہوئے۔ مجھے لمبی پیدل سیر کا جنون ہے اور اسلام آباد کا سب سے بڑا سڑک کا ماحول اس خواہش کو اور بھی جلا بخشتا ہے۔ ایسے میں اچھے دوست اور بہت اچھے سامع کی تلاش مجھے اس کی چوکھٹ تک لے جاتی ہے۔ ابتدا میں وہ سمجھ کہ ہم چند لمحے چہل قدمی کر کے لوٹ آئیں گے مگر

جب یہ تجربہ سمجھنے پر محیط ہونے لگا تو وہ خوب صورت خواب آلود شاموں میں سیر کا وعدہ تو کر لیتا لیکن میں موقع پر غائب ہو جاتا۔ یہ اس کی وعدہ خلافی کا اظہار نہیں بلکہ طبعی شرافت اور وضع داری کی علامت ٹھہرتا۔ چنانچہ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ جب وہ وعدہ کر لیتا تو میں اس کے چڑاؤ سے فون پر تصدیق کر لیتا کہ وہ دفتر بیٹھا ہے اور خاموشی سے وہاں پہنچ جاتا۔ دروازہ کھولتا تو اسے روٹی کے ساتھ امرود کھاتے بھانڈوں میں گھومتے یا اس پاس بکھرے کاغذوں میں گم "رنگے ہاتھوں" پکڑ لیتا اور پھر ہم دونوں لمبی سیر پر نکل جاتے۔

نتیجہ ہے کہ آج کل اس چڑاؤ کا تبادلہ کہیں اور کر دیا گیا ہے۔

ایک ٹکسری پاکیزہ روشن سہ پہر کو میں اور عاصم بٹ مارگلہ کی پہاڑیوں کے قدموں میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ صبح بارش ہوئی تھی، فضا شفاف تھی اور اب تک درختوں کے سبز پتوں پر نمی کے قطرے سورج کی کرنوں میں ہیروں کی طرح دک رہے تھے کہ عاصم کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا آپ نے کبھی اپنی موت کے بارے میں سوچا ہے؟"

مجھے گہری سوچ میں گم دیکھ کر وہ گویا ہوا۔

"میں نے اپنی موت کے بارے میں سوچا ہے، میری خواہش ہے کہ میں لکھتے لکھتے مر جاؤں۔"

جب عاصم یہ بات کہہ رہا تھا تو مجھے اس کے ہر لفظ پر انتہائی اعتبار تھا جتنا اپنے اوپر۔ اس کی جد اس کے الفاظ نہیں تھے بلکہ معمولات اور شخصیت تھے جسے میں کئی برس سے دیکھتا اور جانچتا آیا تھا۔

میکلم گلیڈ ویل ایک معروف مفکر ہے جس کی کتب کے بحر میں میں عرصے سے گرفتار ہوں۔ اس کی ایک کتاب "Blink" نے شہر آفاق مقبولیت حاصل کی۔ اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح انسان کی تربیت یافتہ پھٹی جس بعض اوقات لمبی چوڑی سوچ بچار اور منصوبہ بندی پر حاوی ہوتی ہے۔

اس نے کئی دن چپ مثالیں بھی دی جن میں ایک ایسے مجسمے کا تذکرہ ہے جسے کیلی فورنیا کے مستند ماہرین اصل قرار دے کر اس کے نایاب اور بیش قیمت ہونے کی تصدیق کر چکے تھے لیکن ایک یونانی ماہر کی پھٹی جس نے خبردار کیا کہ وہ مجسمہ جعل سازی سے تراشا گیا تھا، چنانچہ بعد ازاں تحقیق نے یہ بات درست ثابت کر دی۔

اسی طرح جارج گوٹ مین نامی خانگی معاملات کے محقق کا تذکرہ ہے جو فقط ایک گھنٹا کی شادی شدہ جوڑے کے ساتھ گزار کر فیصلہ سنا دیتا ہے کہ آیا وہ پندرہ برس بعد اکٹھے ہوں گے یا تعلق علیحدگی پر منتج ہوگا۔ اس کے نتائج کی درستی کا تناسب 95 فی صد ہے۔ اس کتاب میں Thin slicing نامی اصطلاح بھی مذکور ہے۔

اس طرح انسانی پھٹی جس اور قلبی تین کی اہمیت موجودہ دور کی معاشرت کے محققین کی جستجو میں مرکزی اہمیت حاصل کرتی جا رہی ہے اور میری پھٹی جس مجھے عاصم کے ادب سے مجنونانہ لگاؤ کا کامل یقین دلا چکی ہے۔

عاصم کی ذات کا نیل جس مدار کے گرد گھومتا ہے اس کا مرکز اور محور ادب ہے۔ یہ لگاؤ جنون کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی جنون نے عاصم سے "کافکا کہانیاں" سے لے کر بین الاقوامی شاہ کاروں کے ہزاروں صفحات ترجمہ کرا ڈالے، "دائرہ" اور "نا تمام" جیسے ادبی شہ پارے تخلیق کروائے اور درجنوں تہہ در تہہ افسانے تحریر کرنے پر مجبور کیا۔

مجھے افسوس ہے۔ افسوس تو بہت سے معاملات پر ہے اور خود ملا متی بھی مگر زیادہ افسوس جن باتوں پر ہے ان میں سے ایک "دائرہ" جیسے کار و دوں فریب شاہ کار کی کم پذیرائی پر ہے۔ یہ ناول عاصم سے میرے تعارف کا باعث بنا تھا۔

کئی برس ادھر کی بات ہے، میں عاصم بٹ کے نام سے نا آشنا تھا کہ ناول اللہ کا خرید ڈالا۔

اس ناول نے مجھ پر تعزیر کے دروازے وا کر دیے۔ کیا محل تھا جو پتھروں کے ڈھیر تلے نظروں سے اوجھل پڑا تھا۔ یہ میری آنکھوں کے رستے اندر اتر گیا اور دھماکا ڈالنے لگا۔ میں کبھی جاگتے میں کام کرتے چونک اٹھتا، اس کے مٹی ایچ کر دھارا پنی آوازوں اور چہروں کے ساتھ میرے سامنے میز پر کھیل کھیلنے لگتے، کبھی گاڑی چلاتے ہوئے بغیر ریڈیو، ٹیپ کے موسیقی سنائی دیتی تو اس کے امتیاز علی خاں سفید پا جاے اور کھدہ کے ڈھیلے ڈھالے کرتے میں ملبوس، ہونٹوں کو پان سے لال کیے، مختلف پتھروں کے گلیٹوں والی انگلیاں پہنے، بیوی کی چڑی اور میرے اپنے بھاری تن و قوش کے ساتھ ہولے ہولے پیر پھرتا کرتے اور کبھی پاؤں فرش پر زور سے مار کر لرزہ طاری کرتے مست المست رقص میں گھومتے دکھائی دیے۔ تھا تھی تھا تھی دھامی دھما۔ اُن کا بوز نامیرے سر پر ناچ رہا ہوتا۔

اُس قصبے میں اندرونِ لاہور اپنی تمام تر مٹھاس، رنگینیوں اور بولیمبیوں کے ساتھ یوں رچا ہوا تھا جیسے مٹی کے پیالے میں دھڑے جلیب پر گرم دودھ۔ کردار ایسے زندہ جیسے ابھی تھا اور کھینچ لیا، ماحول یوں حقیقی جیسے چاروں طرف کھینچے پروے پر عکس بند مناظر، اس میں قدیم حمام کے اندھیرے خانہ غسل کی دیواروں پر جمی میلہ پر ٹھہرے حروف کی سی نظری بے ساختگی بھی تھی اور گلی میں دوڑے چلے جاتے، گلے میں نقرئی گھنٹیوں کا ہار ڈالے بکری کے بچے کا بانگ بھی۔

علم الابدان کے ماہرین بتاتے ہیں کہ ہر انسان کے جسم کی مخصوص مہک مختلف اور منفرد ہوتی ہے، اسی بنا پر جانور انسان کو بنا دیکھے پہچان جاتے ہیں۔ عاصم کے جسم اور روح سے لاہور اور وہ بھی پرانے لاہور کی مہک آتی ہے۔ اس مہک نے ایک مدت سے اسے مسحور کر رکھا ہے۔ بھلے وہ اسے حید کا ساحس فن کار ہو، کلچر کے روحانی عناصر جیسی معرکہ الاثر تصنیف کا خالق الفاظ کا سامری داؤد رہے ہو یا پھر چاچا الفی ای چودھری جیسا سرنجاں مرنج تصویر کش، سبھی اس نازعین دلدار کے عاشق ٹھہرے۔ خستہ ڈھتے اور ڈھتے چکے دروازوں کے اندر چھلتا، زندگی برتنا لاہور اس کے شعور اور لا شعور میں گھس بیٹھا ہے۔ جب وہ اسلام آباد (بالکل سرکاری نام!) منتقل ہوا تو راتوں کو مکان کی چھت پر بیٹھ کر غفلتی لگائے چاند کو دیکھا کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ وہی چاند ہے جو لاہور میں بھی لگتا ہوگا۔ اس کی شاذ و نادر تحریر کا لوکیل پنڈی یا اسلام آباد ٹھہرتا ہے۔ جدھر دیکھو لاہور ہے۔ کلف لگے شلوار کرتے والے لاہوری، دودھ دہی لسی کی دکانیں، رات میں لکشی چوک کی رونق، رتن، نگار سینما، پنجابی فلمیں، ناٹی کی دکانیں، اندرون شہر کے احاطے، لارنس باغ، شالامار باغ کی روشیں، کھٹی چٹنی والے اُبلے چنے، درختوں پر کندہ محبت نامے، ریت یوں کے کوٹھے، دلالوں کی کوفیاں، مساجد کے منبر، موتیے کے ہار اور جیٹوں کے کھڑاک۔ ہر طرف لاہوریوں اُبل پڑتا ہے جیسے پتیلوں میں اُبلتا دوپٹے رنگنے والا رنگین پانی۔

جب میں نے اُس کا افسانہ ”تین گھروں“ پڑھا تو یہ مجھے لاہور کی ثقافت کی زندہ تصویر لگا جس میں تین گھر دو دھڑ دھڑی شاپ سے بیڑوں والی لسی پی کر موج مستی کرنے لگتے ہیں اور سینما میں ”شیر پنجاب“ کی نمائشی تصویروں کو دیکھتے ہوئے، تفریحاً ایک مقامی جماعت کے جلسے میں شریک ہو کر خوب نعرے بازی کرتے ہوئے ایک مقرر کو ”چیتا لگا اے“ کہتے ہوئے موری دروازے کا رخ کرتے ہیں۔

اس دوران ایک ویگن میں بیٹھی عورت سے نظر بازی کرتے ہوئے بالآخر براستہ ریلوے روڈ لکشی چوک جا نکلتے ہیں اور فالودہ کھاتے ہوئے ایک دوسرے پر چھتیاں کتے ہیں اور قلم ’جی راکھڑاک‘ دیکھنے سینما میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ ایک اور ماجرا ہے۔ بہ ظاہر یہ تین گھروں کے ایک فارغ دن کی روداد ہے مگر میرا جتنس مجھے مجبور کرتا رہا کہ میں دیکھوں کہ افسانہ نگار اسے کہاں آن کر ختم کرتا ہے اور جہاں عاصم اسے ختم کرتا ہے وہ اس کی مشاقی کی دلالت کرتا ہے اور انسانی فطرت کی فن کارانہ عکاسی کا ثبوت ہے۔

عاصم کے الفاظ میری سماعت پر گدگدیاں کرتے ہیں ”’دائرہ‘“ کا خیال مجھے ایک دم سوچا۔ ایک رات میں لاہور کے پڑ رونق رہنے والے بڑے شاہنگ سینئر میں گیا۔ دن بھر وہاں اتار ش ہوتا تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا اور بھانت بھانت کے لوگ آتے تھے۔ رات میں وہاں سناٹا اور اندھیرا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی قلم کا ایک بہت بڑا سیٹ ہو جہاں لوگ، فن کار اور ایکسٹرا ہوں، جو رات کو گھروں کو لوٹ گئے



ہیں۔ پھر ایک خیال آیا، گویا ایک منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا جیسے وہاں ایک دم روشنیاں ہو جائیں اور پس منظر کی عمارتیں پینٹنگ کی مثل اختیار کر لیں۔ اس جادو بینی نے مجھے اپنا اسیر کر لیا اور میں بے اختیار ہو گیا۔ پس کچھ حقیقت، کچھ طلسم اور کچھ ان دونوں کے بین بین حاصر میری تخلیق کے ابتدائی اجزا ٹھہرے۔“

اُس نے ”دائرہ“ ایسے جنون میں لکھا کہ عین تنہا نو جوانی میں مگر چھوڑ کر ایک علیحدہ کمرے کے اندر دن شہر میں تہا رہنے لگا۔ بعد ازاں جب وہ پنڈی آیا تو شہر کے وسط میں بسوں کے اڈے کے پاس ایک ہوٹل میں کمرے لے لیا، جہاں نیچے سارا دن گاڑیاں دیکھیں، دیکھتے شور کرتے رواں دواں ہوتے اور رنگ برنگے مسافروں، راہ گیروں، گدا گروں، پلڑوں، سینما تلاش بینوں، خریداری کرتی عورتوں اور سودا گروں کی چہل پہل کی تنجین آوازیں شہر میں اٹھڑائیاں لیتی اور کروٹیں بدلتی پھر پور زندگی کی عکاسی کرتیں۔ ایسے میں عام خستہ ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں لکھنے میں مشغول ہوتا۔ وہ لکھتا روک رہتا پھاڑتا اور پھر لکھتا۔ اُس نے چھ مکمل سوسے لکھ ڈالے تو بھاپ دینا ڈاکٹر پکوان تیار ہوا۔ خواب اور حقیقت میں گندھاغن پارہ، خمیر انسان کی طرح۔

خواب، حقیقت، عدم حقیقت، وجود، عدم وجود، وقت، زمانہ اور قدرت کے اسرار انسان کو شروع سے خیال آرائی اور خامہ فرسائی کی جانب مائل کرتے آئے ہیں۔ وجود کے عدم وجود کی جانب سفر کا روح فرسا تصور انسان کے تخیل کو اس طرح بے لگام کرتا رہا کہ وہ مختلف پناہ کاہیں تلاش کرتا رہا یا پھر گوشہ ہائے عافیت تخلیق کر کے ان میں دُک کر بیٹھتا رہا۔ ازلی طور پر بے چین و مضطرب یہ مشتِ خبار چوں کہ نوع کا طالب اور تحفظ کا متلاشی رہا اس لیے شعوری تشفی کے لیے راستے تو تخلیق کر لیے پر جب تحت الشعور میں اور اک حقیقت کا بے لگام گھوڑا باطلوں پر پہناتا بگشت دوڑا تو کہیں پکا سو کے ہاں دُنی شفا خانے میں مہم شاہ کا مصور ہوئے تو کہیں کاڈکا کی دُھند آلود تحریریں بیسویں صدی کے فنکار خانے میں اودھم مچانے لگیں۔

کچھ ایسا ہی واقعہ اردو کے ایوانوں میں بھی ہوا۔ جب نئے افسانہ نگاروں کی تشبیہ و علامت میں گندھی افسانوی تحریریں سامنے آئیں تو شاہ کار ٹھہریں، معتقل کے محقق کے لیے تحقیق و تجر کا وافر سامان لینے۔ عام قاری ان کے تحیر سے کچھ ایسا ہراساں ہوا کہ دُک دبا کر باہر کو بھاگا۔

حاصم بھی اس میدان میں دشت پیمائی کرتا ہے لیکن جلد ہی وہاپس لوٹ آتا ہے۔

حاصم اور اُس کے فن کو جدا کرنا ممکن نہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں یوں پیوست ہیں جیسے شب و زفاف کو دو بے قرار بدن، جھڑیلوں کے ٹوٹے رنگین ٹکڑوں، گلاب کی مسلی پتیوں، بگلت میں ڈھیر کی گئی شیروانی، پانکٹی سے لگتی انگلیا اور چادر پر ڈڑہ ڈڑہ چمکتی افشاں کے بیچ ایک ہونے کی کوشش کرتے دو بدن کہ یونانی اساطیر میں مرد اور عورت ایک ہی بدن تھے جو جدائی کے بعد ہنوز یکجا ہونے کی جستجو میں ہیں۔

حاصم نے کہا تھا کہ وہ خواہش رکھتا ہے کہ اُسے لکھتے لکھتے موت آجائے تو اس پر ایک ظریف کی بات یاد آئی جس نے کہا تھا ”میری خواہش ہے کہ مجھے اپنے دادا کی طرح میٹھی گہری نیند میں پرسکون موت آئے نہ کہ اُن ہم سفر کی طرح جو حادثے سے ایک لحظہ پہلے دادا جان کی گاڑی میں چیخ دپکار کر رہے تھے جسے وہ چلاتے ہوئے سو گئے تھے۔“

حاصم یقیناً ایک جنونی ہے۔ وہ ایک سفاک جنونی ہے۔ بے تاثر اور خاموش چہرے کے پیچھے گھات لگائے آشفہ سر۔ اُسے دیکھ کر اُس کے جنون کا اندازہ نہیں ہوتا۔

وہ لوگوں سے چھپاتا ہے لیکن اسی باقاعدگی سے سال ہا سال سے روزانہ سرشام لکھنے کی میز پر بیٹھتا ہے جس باقاعدگی سے جوشِ صاحبِ سرشام غرقِ مئے ناب ہونے سے پہلے وضو فرما کر پاک ہوا کرتے تھے۔

لیکن جنون ہے جس نے اُسے مختلف اشغال پر آمادہ کیا۔ جب وہ پانچویں جماعت میں تھا تو لوہاری کی پانچ گھنٹوں کے عک



مکانوں میں سے ایک قدیم گھر سے منسلک دکان سے سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ چلتے چلتے کہیں سے سن لیا کہ اگر مسلسل چلے گاٹے ہائیں تو رسول پاک کا دیدار ہوتا ہے، سو چلے گاٹے شروع کر دیے۔ ابھی یہ عمل جاری تھا کہ ایک رات ریڈیو پر دگرام سننے ہوئے خیال کی زندگی تو ریڈیو کیپکنی کا کورس کر ڈالا۔ ایک روز اندرون شہر ایک کھلے کپے احاطے میں چند نوجوان جوڈو کرائے کی مشق کر رہے تھے۔ ان کا یکساں لومی مہارت کا سا انداز کچھ ایسا بھایا کہ جوڈو کرائے کا کورس کر ڈالا۔

یہ انھی دنوں کی بات ہے جب وہ لوہاری کے محلہ مولیاں میں رہتا تھا جہاں دن بھر خوانچہ فروشوں کی صدائیں، ریڈیو پر فرمائشی پروگراموں کی، بھنبھناہٹ، جنگ ہونٹوں میں گلے شپ پر گونجتے پنجابی فلمی گانے اور گھریلو عورتوں کی باتیں کرنے اور جھگڑنے کی آوازیں گئیں کے پیچیدہ گجھلکوں میں آوارگی کرتی رہتیں۔ ایسے میں ایک آواز، ہندو آواز، سماعت میں خوش گوار سترنم سرگوشی کرتی۔ قریب میں موسیقی کا ریاض ہوا کرتا۔ شاہ عالمی میں ایک پرانی، دورگم گشتہ کی عمارت تھی۔ ”پری محل“ کیا نام ہیں شاہ عالمی اور پری محل۔ بالکل داستانوی۔ اس عمارت میں موسیقی اور کلا کاری کا دربار بچتا۔ پس اس کہن سالہ عمارت کے نیم اندھیارے میں کئی برس کلاسیکی راگ سیکھنے میں یوں بسر ہوئے کہ نو آموز و ناپختہ عاصم ایک صندوق میں بیٹھ کر کبیل اوڑھے پڑھانچ کی چپٹی پٹی منہ میں رکھ کر ریاض کرتا تا کہ اس کی آواز باہر تک نہ جائے۔ ایسے میں اس کا منہ اور گلا سوج جاتے اور بدن پسینے میں شرابور ہو جاتا لیکن اس کا جنون انگلی تھامے اُسے حصول شوق میں غلطاں رکھتا۔

اُس کی آواز غالباً جھنگی کے لیے ناموزوں تھی اس لیے وہ اس میدان میں کام یاب نہ ہو پایا۔ یہ آواز بھی کیسا دھوکا دیتی ہے۔ ریڈیو یا فون پر خوش آواز عموماً بالمشافہ ملاقات میں مختلف ہوتے ہیں۔

تقریباً کوتاہ مختلف جنون تھے جو اس کا ہاتھ تھامتے رہے اور یہ اُن سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلتا رہا۔ البتہ ایک جنون کا ایسا اسیر ہوا کہ اُس سے بیاہر چاڑا الہب حرف و حکایت کا جنون۔

ادب و کہانی کی وہ راکھ جو اُس نے سر پر بکھیری تھی آج بھی اُس کے بالوں میں پڑ اٹھاں ہے۔ یہ 1989ء کا واقعہ ہے کہ اُس نے مایہ ناز تخلیق کار شاعر اور مدیر ”ماہ نو“ کشور ناہید کو اپنا ایک افسانہ رائے اور اشاعت کے لیے بھیجا۔ ”ماہ نو“ ایک ممتاز ادبی پرچہ تھا۔ کشور نے وہ افسانہ شائع کر دیا اور مشورہ دیا کہ وہ کافکا کے اثرات سے باہر نکل کر لکھے۔ دل چپ امر یہ ہے کہ عاصم تب تک کافکا کے کام سے ناواقف تھا۔ چنانچہ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس نے کافکا کو پڑھنا شروع کیا اور مشق کے لیے اُس کی چند تحریروں ترجمہ کر ڈالیں۔

بعد ازاں اس کی ملاقات مظفر محمد علی جیسے جید صاحب علم سے ہوئی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ کافکا کا مکمل ترجمہ کر ڈالے۔ انھوں نے یہ مشورہ سرسری انداز میں دیا تھا لیکن عاصم نے اسے گروہ سے یوں باندھ لیا جیسے ایک دیہاتن گرتے کے کنارے سے رقم پونلی کی محل میں باندھ لیتی ہے۔ گورنمنٹ کالج سے فلسفے میں ایم اے کی ڈگری لے چکا تھا، مگر بے روزگاری کے دن تھے۔ چنانچہ روزانہ سویرے ہفتاب پبلک لائبریری چلا جاتا اور شام تک کافکا کو ترجمہ کرتا رہتا۔ ایک برس بعد تراجم کا ضخیم پلندہ مظفر محمد علی صاحب کے حوالے کیا تو وہ حیران رہ گئے۔ بعد ازاں یہ ترجمہ جنگ جلی شرز کے ہاں سے شائع ہو کر مقبول ہوا۔ اس دوران اسے جنگ جلی شرز کے ہاں ملازمت مل چکی تھی۔ وہاں دل بھا کر کام کیا۔ ایک صبح سوکر اٹھا تو خیال آیا کہ اگر دفتر نہ جائے تو کیسا ہے۔ سو بستر میں پڑا سوتا رہا۔ جب دو تین روز ایسے گزر گئے تو دفتر سے فون آیا کہ آکر کم از کم تن خواہ ہی لے جائے۔ طبیعت نے گوارا نہ کیا سو وہ بھی وصول کرنے نہ گیا۔ طبیعت میں سیما بیت نے کچھ ایسا بھیرا کیا کہ پھر مگر کر کوئی کام نہ کیا۔

برطانیہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں چند دہائی قبل سرمایہ دارانہ نظام کی میکا کی زندگی کے بطن سے جنم لینے والی جکڑ بند یوں کے خلاف انفرادی اور گروہی طور پر غیر منظم اور غیر مربوط تحریک چلی تھی جس نے ”پتی ازم“ کو جنم دیا۔ Pink Floyd کا معروف مینٹرا "A Brick In The Wall" انفرادیت کے اوپر اجتماعیت کے غالب آ جانے کے خلاف احتجاج تھا۔ یہ پہلو عاصم کے ہاں بھی عوام جھک دکھا

مگر لکھ بھڑک رہا ہوتا ہے۔

اس کا افسانہ ”چالیس سال پر محیط ایک لمحہ“ اسی نظام کی نشان دہی کرتا ہے جس میں ایک فرد نظام کی غلامی سے فرار ہو کر ایک دور و فتر نہیں جاتا اور ترقی پارک میں چلا جاتا ہے جہاں وہ ایک بچے سے خوب کھیلتا ہے۔ وہ بچہ اس لڑکا کا اپنا بچپن ہوتا ہے۔ آزار، بے فکر اور محروم بچپن۔ یہ کہانی عاصم کی اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ ویسے تو اس کی پیش تر تخلیقات میں سوانحی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ کہانیاں گھڑتا ہے سناتا ہے اور سناتے سناتے سو جاتا ہے۔ ایام رفتہ کی یاد میں سو جاتا ہے۔

جیسا کہ پیر ہینڈ کے نامی مفکر نے کہا تھا ”جو معاشرہ اپنے کہانی کو کھو دیتا ہے، وہ اپنے بچپن سے محروم ہو جاتا ہے۔“  
عاصم اتنا دھیمہ اور کم گو ہے کہ اپنی کہانیوں کے پیچھے دھندلا جاتا ہے۔ یہ بات بھی اسی نے مجھے بتائی کہ بہت سے فن کار اپنے حراج کی کج یا شخصیت کی سحر طرازی کے موجب زیادہ پہچانے گئے۔ بھلے وہ میراجی کا سا پر اسرار شاعر و فلسفی ہو، منٹو جیسا بانٹا، جوش جیسا منفرد شخص یا ناصر کاظمی ایسا ازلی تنہا آدمی۔ بسا اوقات ان کے تعارف پرفن سے سوانحیت کی چھاپ بھی نمایاں ہوتی۔

ایک شام میں اور عاصم، مستنصر حسین تارڑ صاحب جیسے منجھے ہوئے اور قد آور ادیب کے ہاں گئے اور انھیں اس کے ناول ”نا تمام“ کا مسودہ رائے کے لیے پیش کیا۔ تارڑ صاحب نے بہت محبت سے اُسے رکھ لیا۔ چند روز بعد میری تارڑ صاحب سے بات ہوئی تو کہنے لگے ”تمہارا دوست عاصم بٹ بہت باصلاحیت ہے۔ اس کے ناول نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے اسے میمونہ (بیگم) کو بھی پڑھنے کو دیا۔ اُسے میں بہت ہی خاص اور چلتی ہوئی چیزیں دیتا ہوں۔ واقعی اس نے متاثر کن کام کیا ہے۔“

اس کے بعد جب انھوں نے اپنی توصلی رائے لکھ کر دینی تو خاص طور پر کہا کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں بلکہ عاصم اس کا صحیح حق دار

ہے۔

یہ ناول بھی ایک قصہ نا تمام ہے۔ یہ ایک ایسا فقیری ہمارے جس میں رنگ برنگے منکے، خشک بھور گھلیاں، موتی، فیروزہ قمری بھر ہیں۔ اس میں روایتی معاشرت کی تیز و سارائی تنگی زبان، برشتوں اور تعلق کی ابھی ڈوریں اور گرہیں، معاشرت کے گلے انگوڑے بکھرے کے انبار پر پڑے بچے کے پوٹے، ماہ واری زدہ چیتھڑے، اور گندگی کے ڈھیر کے چپے ریگتے ٹکڑے ہیں۔ ہندی، سالیاری کہانی متوازی چلتی ہے جو اس میں روایت کا رنگ گھول دیتی ہے۔ اس نے عام روایتی گھر اور بستی کی کہانی اُلوکی زبانی سنائی ہے۔ آنکھیں پھاڑے خاموشی سے دیکھتا دین اُلو۔ مدت کا شیاور۔

محبت کے حوالے سے ذکر اس کی پہلی خاموش محبت کا۔

وہ اس کے ہم سائے میں رہتی تھی۔ یہ کتابوں کا عاشق، وہ چنچل و شوخ، چوڑیوں کی شیدا لڑکی۔ پس آپس میں کچھ ایسی بن آئی کہ وہ اس سے کتابیں لے کر پڑھتی اور لوٹا دیتی۔ یہ اُسے دیکھا کرتا آہستہ آہستہ محبت کا ایک کوئل، لطیف اور نازک شرقی جذبہ اس کے دل میں علامت کرنے لگا۔ یہ بیٹھا جذبہ اُس کی روح میں اس طرح گھلنے لگا جیسے شکر دودھ میں۔ عاصم ایک شرمیلا اور کم کولڑکا تھا سوا ظہار مدعا کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بالآخر ایک حل سمجھ میں آیا۔ قلم سنبالا اور ایک خط لکھ کر اسے کتاب کے بیچ رکھ دیا۔ وہ آئی، اٹھا کر کتاب مانگی اور بائگن سے ایسی گندمی چٹیا بھلاتی چل دی۔ چلتے چلتے اس کی نظر خط پر پڑی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی اور دھیرے سے مڑ کر بچے تلے قدموں سے داہیں چلی آئی۔ خط اسے تھمایا اور بولی کہ شاید وہ اپنا کوئی کاغذ کتاب میں بھول گیا ہے۔ اس نے خط داہیں لے لیا۔ وہ اسے غنظر نظروں سے دیکھتی رہی۔ یہ بھی اُسے تک دیکھا کیا۔ بادل ناخواستہ یہ کہہ کر وہ خط داہیں اپنی جیب میں ڈال لیا ہاں شاید میں اپنا کاغذ بھول گیا تھا۔ وہ داہیں لوٹ گئی۔ یہ اُسے جانتے دیکھتا رہا۔

عاصم آج بھی اُس لمحے کے لوٹ آنے کا غنظر ہے۔ پر شاید اتنا بھی غنظر نہیں کہ قدرت نے اس ایک لمحے کا ازالہ اور بہت سے

لحات سے کیا ہے۔  
عاصم کی والدہ کہتی تھیں کہ اگر کوئی لڑکی عاصم کے کمرے میں بے لباس ہو کر بھی آجائے تو یہ اس پر اچلتی نگاہ ڈال کر دوبارہ مٹا لے

میں مصروف ہو جائے گا۔ مائیں بھی کتنی معصوم اور خوش گمان ہوتی ہیں۔

اُس کی تسلیج روز و شب میں یقیناً ایسے کئی رنگین دانے ہیں۔

ایک روز میری اُس کی ملاقات طے تھی سو میں سہ پہر میں اُس کے دفتر چلا آیا۔ دفتری اوقات ختم ہونے کو تھے۔ ہمارا اہرارہ لمبی سر پر روانہ ہونے کا تھا۔ اُس نے چائے آرڈر کر دی۔ ابھی ادب عالیہ کے متعلق گفتگو ابتدائی مراحل میں تھی کہ یک دم دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک طرح دارنا زمین خوش اندام اندر داخل ہوئی تو خوشبو کے لپیٹے ساتھ میں لپے آئی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی اور عاصم بھی چونک اٹھا۔ وہ میرے بازو کی گری پر بیٹھ گئی۔ عاصم نے تعارف کر دیا۔

”میرے دوست ہیں۔“

وہ مسکرائی اور بولی۔ ”میں اُردو ادب کے ایک تھیس پر کام کر رہی ہوں۔ عاصم کی مہربانی ہے کہ اس معاملے میں میری مدد کر دیتے

ہیں۔“

میں نے موضوع کا پوچھا اُس نے بتایا ور خاموش ہو گئی۔

عاصم نے سرسری طور پر پوچھا۔

”عمرقان آپ چائے تو نہیں پیئیں گے۔“

مجھے چائے کی بہت طلب ہو رہی تھی چنانچہ کچھ بولنے کو تھا کہ ایک لڑکا بیتل کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا اور ہرے سامنے

چائے کنگ رکھ دیے۔ عاصم نے اُسے خشمگین نظروں سے گھورا۔ وہ بوکھلا کر باہر چلا گیا۔

اب ہم چائے پینے لگے۔ کمرے کی خاموشی میں چائے پینے کی چٹکی کی مدھم آواز شامل ہونے لگی۔

عاصم مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور سوچنے لگا کہ اسلام آباد شاموں میں کتنا دل فریب ہو جاتا ہے۔

اتنے میں عاصم کے کھٹکارنے کی آواز آئی۔ میں نے چہرہ موڑا تو عاصم مجھے مضطرب لگا۔ خاتون بھی کن اکھیوں سے مجھے دیکھ رہی

تھی۔

یک دم میرے کشف کی تجلی نے صورت حال مجھ پر واضح کر دی اور میں حالات کی نزاکت اور علم کے ارفع مقاصد کی تروتازگی کے

لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے دیکھ کر عاصم مسکرا کر کھڑا ہوا اور گرم جوشی سے مصافحہ کر کے دروازے کی جانب چل پڑا۔ میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔ باہر مجھے

چھوڑتے ہوئے اُس نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔

”اچھا خاصا واک کا پروگرام تھا۔ آپ یک دم چل دیے۔“

یہ سن کر میری آنکھوں میں عداوت کی نئی آگئی اور میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”یار ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔“

اُس نے گویا کچھ سمجھتے ہوئے میرا کندھا تھپتھپایا اور بولا۔

”آپ وعدہ خلاف ہوتے جا رہے ہیں۔“

جب عامم کی شخصیت کا میں نے مطالعہ کیا تو مجھ پر یہ عقہہ کھلا کہ وہ درحقیقت انسانی نفسیات کی باریکیوں پر بھرپور نظر رکھتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کے بیش تر افسانے واقعاتی نہیں بلکہ داخلی مدوجزر کے عکاس ہیں۔ ناولوں کی البتہ بات اور ہے جن میں واقعات کی کڑیاں کچھ اس طرح نمایاں ہو جاتی ہیں جیسے پختہ عمری میں ہاتھوں کی پشت پر رگیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔

اس کے نفسیاتی مطالعے کا خاص موضوع عورت ہے۔ وہ عورت کے اندر اتر جاتا ہے اور اس کا وہ کردار تراش کر تحریروں میں لے آتا ہے جو حقیقت کے اس قدر نزدیک ہوتا ہے کہ ادھنری کے معروف ڈرامے ”دالاسٹ لیف“ کی یاد دلاتا ہے۔ اس ڈرامے کی ہیروئن نمونے کی بیماری کا شکار ہو کر بستر مرگ پر پڑی اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر درخت پر باقی چند ایک چوں کو ٹکا کرتی ہے۔ جیسے جیسے درخت پر پتے کم ہوتے جاتے ہیں اس کی حالت بگڑتی جاتی ہے یہاں تک کہ اب درخت پر صرف ایک پتہ رہ جاتا ہے۔ ہیروئن کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ جب آخری پتہ گرے گا تو وہ اس کی موت کا وقت ہوگا۔ اس کی ایک سہیلی اس کی نفسیاتی کیفیت سے واقف ہوتی ہے۔ وہ پریشانی میں، اپنے ہم سائے میں رہنے والے ایک ایسے ناکام مصور ہے جو ایک شاہ کار تخلیق کرنے کا خواب دیکھا کرتا ہے، ہیروئن کا نفسیاتی مسئلہ بیان کرتی ہے۔ اگلی صبح وہ اپنی جگہ پر ہوتا ہے۔ پھر وہ قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہیروئن تن درست ہو جاتی ہے مگر ادھر مصور کی حالت بگڑ جاتی ہے اور وہ دم توڑ دیتا ہے۔ بالآخر یہ عقہہ کھلتا ہے کہ مصور نے اس فیصلہ کن رات کی برف سردی میں ایک بیڑمی لے کر درخت کی دیوار کے اندر جھکی شاخ کے ساتھ میں ایک ایسا پتا مصور کر دیا جاتا تھا جو ہو بہو اصل دکھاتا تھا۔ اس مشقت کے دوران اسے ایسی ٹھنڈ لگی کہ وہ خود تو دم توڑ گیا لیکن اپنے شاہ کار کے نمونے ایک لڑکی کو زندگی دے گیا۔ یہ بظاہر سطحی کہانی اپنے دور کا شاہ پارہ ٹھہری تھی۔

یہاں اس بیان کا مقصد کسی شہ پارے کا قرین حقیقت ہونا ہے۔

اگر اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو شاید یہ بات کچھ وزن پائے کہ کم گو اور شرمیلا ہونے کے نائنے صنف مخالف سے روابط کی تحت اشہور میں ہر وقت موجود مردانہ جہلت کو مطمئن کرنے کے لیے نفسیاتی رستہ اختیار کر کے وہ بیک وقت اپنی جہلت اور فن کارانہ جستجو کی تسکین کرتا ہے۔ البتہ اپنی عام بول چال میں وہ ایسے موضوعات پر کم ہی بات کرتا ہے۔

عورت میں اس کی فن کارانہ دل چسپی کی توجیہ یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ جب وہ بچپن میں پیر بھولے شاہ میں نیوا صفا سکول میں پڑھتا تھا تو وہیں اس کی ہم جماعت ہیرا منڈی سے تعلق رکھنے والی دو لڑکیاں تھیں۔ ہیرا منڈی کے جو بن کے اس دور میں اپنی ایسی ہم جماعتوں کی موجودگی نے اس کے فطری تجسس کو اس حد تک ہوا دی کہ عورت اس کی نفسیات اس کی توجہ کا مرکز بن کر رہ گئی۔

عورت اور مرد اس کمرے پر ہزاروں سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں اور آج بھی ایک دوسرے سے اتنے دُور ہیں جتنے ابتدا میں تھے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو جاننے کی جستجو میں رہتے ہیں اور اسی جستجو کے برگ سے تخلیق کی بے شمار کونپلیں پھوٹی ہیں۔

عامم کو میں نے خواتین کے بیچ شرماتے ہوئے اور خاموش دیکھا ہے۔ وہ بہت اچھا سامع ہے۔

ایک حکایت میں ایک شخص اپنی بیوی کے ہم راہ ایک دعوت میں شریک ہوتا ہے جہاں اُسے اپنا ایک دوست مل جاتا ہے۔ یوں تینوں ایک طرف بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اسی اثنا میں اُس شخص کو چند شناسا مل جاتے ہیں ہودہ دوست اور اپنی بیوی کو باتیں کرتا چھوڑ کر وہاں سے اٹھ آتا ہے۔

اگلے روز وہ شخص اپنے دوست کو ملتا ہے تو کہتا ہے۔ ”تم نے میری بیوی پر ایسا کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ بس کل سے تمہارے ہی مٹن گائے جا رہی ہے۔“

اس پر دوست حیرانی سے کہتا ہے۔



”میں تو کل کچھ بھی نہیں بولا۔ بس سارا وقت بہت توجہ اور دل چسپی سے تمہاری بیوی کی باتیں سن رہا تھا۔“

دو دن نئے خیالات سامنے لاتا رہتا ہے۔ ایک روز مجھے کہنے لگا کہ لوگ مہا تماہد کو بہت محترم جانتے ہیں اور مختلف انداز میں ان کی کہانیاں لکھی جاتی رہی ہیں، اگر کبھی اُن کی بیوی کے نقطہ نظر سے، جسے وہ چھوڑ گئے تھے، کہانی لکھی جائے تو کیسی رہے۔ یہ اچھوتا خیال مجھے حیران کر گیا۔

ایک دل چسپ واقعہ ہے۔ وہ اتنا گم سم آدمی ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ بازار سے گھر لوٹا تو بیوی کو اپنا منتظر پایا۔ بیگم نے عامم کو موبائل تھام رکھا تھا جس کی سکرین پر ایک نمبر دکھ رہا تھا۔

ایک دم عامم کو خطرے کا احساس ہوا کہ گویا کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ اپنا موبائل گھر بھول گیا تھا۔ اب جب اس کی نظر نمبر پر پڑی تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ نمبر ایک ایسی خاتون کا تھا جس سے راہ و رسم کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا اور راہ و رسم بھی قطعی نصابی نوعیت کا۔ خیر خاتون خانہ کو تو یہ باور کرانے کے لیے کافی مشقت درکار ہوتی ہے۔

”کس کا نمبر ہے یہ؟ میں جانتی تو ہوں کیوں کہ میری ابھی بات ہوئی ہے مگر آپ کس طرح جانتے ہیں؟“

بیگم نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا تو عامم گڑبڑا گیا اور کافی دیر تک آنکھیں پینپٹا بیوی کو دیکھتا رہا۔ پھر یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ ”ابھی مجھے کوئی وجہ نہیں سوجھ رہی۔ جب کچھ سمجھ میں آئے گا تو پھر بات کریں گے۔“

بیگم بے بسی سے اُسے جاتا دیکھتی رہیں۔

ایک قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک شب جب عامم رات کو تھکا ہارا گھر لوٹا تو آتے ہی بستر پر دراز ہو گیا۔ جب بیوی کمرے سے جانے لگیں تو اس نے جی بند کر کے جانے کا کہا تا کہ وہ آرام سے سو سکے۔ بیگم روشنی گل کر کے اپنا من پسند پردہ گرام دیکھنے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

دو گھنٹے بعد دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئیں مبادا عامم کے آرام میں خلل پڑے۔ دروازے کی جھری سے روشنی عامم کے چہرے پر پڑی تو اُن پر انکشاف ہوا کہ عامم اب تک جاگ رہا تھا۔ انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ اب تک سوئے نہیں۔ پچھلے دو گھنٹے سے جاگ رہے تھے کیا؟“

اس پر عامم نے بے بسی سے جواب دیا۔

”اُس وقت سے پیشاب آیا ہوا ہے۔ تب سے سوچ رہا ہوں کہ ابھی کروں یا صبح اُٹھ کر کروں۔“

اور کروٹ بدل لی۔

بھلکھو پن عامم کے ساتھ یوں بندھا ہوا ہے جس طرح بھڑکی دُم کے ساتھ دھاگا۔ بھلکھو پن سے ذہن آئن سٹائن کی جانب چلا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آئن سٹائن کو دو پہر میں ایک دوست ایک چوراہے پر ملا اور لُنج کی دعوت دی۔

آئن سٹائن کسی گہری سوچ میں گم چلا آ رہا تھا۔ دعوت کا سن کر وہ چونک گیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دوست سے استفسار کیا کہ وہ

کس جانب چلا آ رہا تھا۔ دوست نے ایک سڑک کی طرف اشارہ کیا تو آئن سٹائن نے یہ کہتے ہوئے لُنج سے معذرت کر لی کہ اس طرف تو اس کا اپنا گھر ہے اور چوں کہ وہ اپنے گھر کی جانب سے آ رہا ہے اس لیے وہ یقیناً لُنج کر چکا ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ میں عامم سے ملنے اُس کے دفتر گیا۔ میں نے اس سے استفسار کیا کہ کیا اس نے کھانا کھا لیا ہے۔ وہ کمرے

میں تنہا بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ یہ سن کر وہ چونک گیا۔ اسی دوران اس کا اردلی کمرے میں داخل ہوا تو عامم نے اس سے پوچھا کہ کیا اس

نے لکھ کر لیا ہے۔ اس پر اردلی واپس مڑتے ہوئے ایک ایسی مالوس سکرابٹ سے سکرایا جو ماتھوں ہی سے مخصوص ہوتی ہے اور تھوڑی دیر میں ایک پلیٹ میں چٹوں کے ساتھ روٹی لے آیا۔  
عاصم کو میں نے روزگار کے کئی سلسلوں سے منسلک دیکھا ہے۔

اُس نے کتابوں کے تراجم کیے ہیں، پرائیویٹ اداروں میں ملازمت کی ہے، غیر ملکوں کے لیے راہ نما اور مترجم کے فرائض سرانجام دیے ہیں اور اب چند برس سے اکادمی ادبیات سے وابستہ ہے۔  
جب عاصم نے اکادمی میں ملازمت اختیار کی تو مجھے اُس کی القاطیع کی پیش نظر خدشہ تھا کہ یہ تعلق بہت لمبا نہیں چلے گا مگر اب اسے اس ادارے سے منسلک ہوئے خاصا عرصہ ہو گیا ہے۔

وہ ادیب عمری کی جانب سفر کر رہا ہے، بتوں مزاجی سے تھک چکا ہے اس لیے اب ایک کونے میں بیٹھ کر سستا نا چاہتا ہے۔ وہ شعوری طور پر اپنی تھکاوٹ سے سمجھوتا کر چکا ہے، شاید اسی لیے زندگی کی رایگانی کا افسوس کرتا رہتا ہے۔ عبداللہ حسین سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا اور وہ یہ کہ اسی سالہ ناول نگار عبداللہ حسین کو میں جب بھی ملا انھوں نے آئندہ کے منصوبوں اور کاموں کا ذکر کیا۔ گویا جب تک اُن میں اتنی تخلیقی حرارت اور زندگی کا دلولہ موجود تھا کہ وہ پیچھے کے بجائے آگے دیکھتے تھے۔

عاصم تو ابھی فقط پینتالیس سینتالیس برس کا جوان آدمی ہے۔ اُسے میں نے پورٹریٹ، جس نے اپنا سنجیدہ کام پختہ عمری میں کیا، انوبل انعام یافتہ جوزلے ساراماگو جنھوں نے "بلانڈ نیس" جیسا معروف اور اہم ناول 73 برس کی عمر میں لکھا، پاکستانی ناول نگار جمیل احمد جنھوں نے 74 برس کی عمر میں مغربی ادبی حلقوں میں اپنا واحد ناول "داوانڈ رنگ فالکن" لکھ کر داسیٹی اور دیگر بڑے ادیبوں کے حوالے دیے ہیں جس نے اپنے اہم کام خاص عمری میں آکر کیے تو عاصم میرے استدلال سے متفق تو ہو جاتا ہے مگر شاید مطمئن نہیں ہوتا۔ اُس کا یہ نفسیاتی مسئلہ تازہ افسانوں میں نظر آتا ہے جن میں کہانی ابھام کا شکار ہو جاتی ہے اور افسانہ غیر ضروری علامتوں سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ عاصم نے چند بہت اچھے افسانے لکھے ہیں جن میں شاید بہترین اُس کا پہلا افسانہ "تیز بارش میں ہونے والا واقعہ" ہے لیکن اُس کا "Forte" یعنی کمال فن ناول ہی ہے جہاں مشاقی اپنے جوہر دکھاتی ہے۔

اکادمی ادبیات کا تجربہ اُس کے لیے شاید بہت خوش گوار نہیں رہا۔ میرا دوست عرفان احمد عربی کہتا ہے کہ جب تک آپ خاکے میں خامیوں یا بشری کم زوریوں کا تذکرہ نہ کریں تب تک اُس میں جان نہیں پڑتی۔ میں اُس سے اتفاق کرتے ہوئے والٹیر کی جانب ذہن چلا جاتا ہے۔ والٹیر جب ستر مرگ پر تھا تو پادری اُس کے سر حانے کھڑا ہو کر انجیل مقدس سے مختلف دعائیں پڑھنے لگا اور رب کی حمد و ثنایاں کرتے ہوئے تلقین کرنے لگا کہ وہ شیطان مردود پر لعنت بھیجے۔ جب اُس نے تو اتر سے یہ تلقین کی تو والٹیر نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔  
"اے نیک پادری یہ موقع نئے دشمن بنانے کا نہیں۔"

عاصم نے اکادمی میں چند احباب کی مخالفت مول لی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ اکادمی ایک فعال ادارے کے طور پر تازہ ادب کو سامنے نہیں لارہی اور نئے ٹیلنٹ کی آب یاری نہیں کر رہی بلکہ ایک خوابیدہ سرکاری ادارہ بن چکی ہے۔ بہ تقاضائے انصاف اس رائے سے اتفاق کیے بنا بات نہیں بنتی۔ عاصم بھی انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہوا ہے۔

چند احباب کو یہ شکوہ بھی رہا کہ ایک اہم ادبی ادارے کا رکن ہونے کے ناتے عاصم نے نئے تخلیق کاروں کی بھرپور حوصلہ افزائی نہیں کی۔ چند نکتہ چینیوں کو یہ گلہ بھی رہا کہ تخلیق کاروں کو دفتری اوقات و معاملات میں رعایت ملنی چاہیے، سخت ڈسپلن تخلیقی اُچھ کو پابند کر کے بے ثمر کر دیتا ہے۔ میں نے گروش دوراں میں عاصم کے دوستوں کو شکوہ کناں نکتہ چینیوں کی صف میں کھڑے ہوتے دیکھا۔ دوست محبت اور خلوص آئینہ رعایت کی توقع کرتے ہیں اور ہماری معاشرتی روایات میں یہ توقع بے جا نہیں۔ میں نے اُسے درویش منش بندے سے بہتر تنقید پابند



قاعدہ سرکاری اہل کار میں اپنی جون بدلے لے سنا۔ گو کہ میرا اُس کا ذاتی تعلق کہ نہ سال انگریز شروب کی طرح دو آفتاب ہی ہوا ہے۔ دوستوں کے معاملے میں وہ بہت خوش نصیب نہیں نکلا۔ دوست سے منٹو صاحب یاد آتے ہیں۔ مختصر زندگی میں غالباً منٹو کی قریبی ترین دوست اُن کی اہلیہ صفیہ تھیں۔ دوستوں کی صف میں اُن کا ایک دل چسپ دوست بھی تھا۔ جب منٹو ذہنی شفا خانے میں داخل ہوئے تو وہاں ایک سنجیدہ اور بردبار شخص منٹو کا معتقد اور دوست ہوا۔ اس شفا خانے کے تمام مریض اپنا کام خود کرتے تھے جس میں اپنے کپڑے دھونا اور دھوپ میں سکھانا بھی شامل تھا۔ ایک مرتبہ منٹو نے اپنے کپڑے دھو کر سوکھنے کے لیے دھوپ میں ڈالے۔ جب انھیں واپس اکٹھا کرنے کا وقت آیا تو ایک زیر جامہ غائب تھا۔ منٹو اپنے اس زیر جامے کو ڈھونڈنے لگے۔ اسی اثنا میں وہ دوست منٹو صاحب کے پاس آیا اور پریشانی کی وجہ پوچھی۔ منٹو صاحب نے زیر جامے کی گم شدگی کا تذکرہ کیا۔ وہ بھی منٹو کے ہم راہ۔ تئویش آمیز سنجیدگی لیے تلاش میں مصروف ہو گیا۔ کافی وقت گزر گیا اور زیر جامہ نہ ملا۔ تھک ہار کر دونوں ایک طرف خاموش بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد دوست نے اپنا گرتا اٹھایا اور پوچھا ”آپ کا زیر جامہ یہ تو نہیں؟“ اُس نے منٹو کا زیر جامہ پہن رکھا تھا۔

عاصم نے بہت پہلے ایک فیصلہ کیا تھا۔ جب اُس کے بھائی بہنوئی اور دیگر قریبی اعزاء منفعت بخش کاروبار اور قابل ذکر آمدنی والی ملازمتیں اختیار کر رہے تھے تب اُس نے اپنی زندگی اردو ادب پر وار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج وہ لوگ معاشی طور پر قابل رشک حد تک متحول ہو چکے ہیں جب کہ عاصم جنگلی مور کی طرح روزانہ دانے ڈنکے کی تلاش میں گئے جنگلوں، ویران پگڈنڈیوں اور خواب ناک وادیوں کا رخ کرتا ہے۔ البتہ وہ اکیلا نہیں بلکہ اُس کے ہم راہ اُس کے خوش نما اور پیارے انگیلیاں کرتے بہار رنگ بچے ہیں۔ بہت سے تراجم، کئی افسانے اور تین ناول کچھ جیسی چال چلتے اور دو تین ناچتے گاتے شرف و چنیل مور بچے۔ وہ اُن کے جھرمٹ میں دھیرے دھیرے احتیاط سے ناچتا جا رہا ہے۔





عرفان جاوید لاہور میں پیدا ہوئے، گورنمنٹ کالج لاہور، انجینئرنگ پڑھی اور مٹری لاہور اور سندھ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی تخلیقات اردو کے مستند رسائل و جرائد "نقون"، "سویا"، "نیا لاد"، "معاصر"، "نظام"، "سمیل" وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب میں شامل خاکوں میں سے چند "زرواڑے" کے عنوان سے روزنامہ "جنگ" میں ایک برس تک سلسلہ وار شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ "کافی پائوس" اور آصف لرنی اور محمد الیاس کے انسانوں کے انتخاب مع تنقیدی تعارف "مسند کی چوری" اور "مور میں" شائع ہو چکے ہیں۔

اگر تیرہ کروڑ لوگ کر دیا جائے تو اردو میں خاک نگاری کی ابتدا محمد حسین آزاد سے ہوتی ہے۔ "آب حیات" میں ہمارے متعدد بڑے شعرا کا تذکرہ ہے، لیکن زیادہ زور اس بات پر ہے کہ جس شاعر کے بارے میں وہ لکھ رہے ہیں اس کے عادات و خصائل، اس کی شکل و شبابت، اس کی افتاد و مزاج کو بھی اس طرح بیان کریں کہ شاعر کی شخصیت جتنی جاگتی ہو اسے سامنے آجائے۔ "آب حیات" کی یہ عبارتیں محمد حسین آزاد کا شاہکار ہیں۔ اور یہ تحریریں کیا ہیں، مریض تواریس ہیں کہ جب بے نیام ہوتی ہیں تو صاحب خاک کی شخصیت کے پردوں کو کاٹ کر اصل کو ہمارے آگے بے نقاب کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید انشا سے بے حد محبت کے باوجود محمد حسین آزاد ان کی کم زوریوں کے بیان سے نہیں جھجکتے (صرف تاریخ کے باب میں وہ ذرا سحر پانگے ہیں اور انھوں نے تاریخ کی امر پر کسی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن اس زمانے کے لوگ شاید ایسی باتوں کو چھپانا ہی بہتر سمجھتے تھے)۔

محمد حسین آزاد کے بعد دوسرا نام میرے ذہن میں رشید احمد صدیقی کا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف ان لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں جن سے وہ بہت متاثر تھے اور جن میں انھیں برائی بظاہر نظر نہ آتی تھی۔ رشید احمد صدیقی صرف انہی باتوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں وہ ذاتی طور پر جانتے ہیں۔

عرفان جاوید کی یہ تحریریں دراصل اصطلاحی معنی میں خاکے نہیں ہیں، بلکہ مصنف کی اپنی شخصیت کی بھرپور آمیزش، صاحب خاکہ کے بارے میں دوسروں کے بھی تاثرات کی عکاسی کی بنا پر یہ تحریریں افسانوی رنگ رکھتی ہیں۔ یعنی یہ افسانے ہیں، لیکن بچے افسانے۔ اس کتاب کو پڑھتے وقت میں کبھی اس کے انداز تحریر میں کھو گیا تو کبھی اس میں بیان کردہ واقعات اور جھانپناؤں کا تماشا بن گیا۔ ایسی کتابیں کم ہوتی ہیں۔

عرفان صاحب خوب لکھتے ہیں۔ کچھ لوگ یاد دہشتے ہیں اپنی تہذیب کی جد سے اور کچھ تہذیبیں اور تمدن یاد دہشتے ہیں کچھ لوگوں کی جد سے اس باب میں ایک پوری کی پوری تہذیب زندہ ہو جاتی ہے عرفان صاحب کے بیان سے۔ افسوس کہ وہ لوگ نہ رہے لیکن فقیر کو کون روکے۔ نہ لوگ نہ کہتے ہیں مذہب کا ہے نہ تہذیب، نہ تمدن۔ تعمیر لازمی ہے۔

گلزار (ممبئی، انڈیا)

حیرت ہے کہ اس کم عمری میں عرفان جاوید نے اتنا طویل تجربہ حاصل کر لیا ہے کہ اپنے سے کہیں سینئر ادیبوں پر کندھیں کھینک کر ان کے برابر جا کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے ورق و ورق کالٹ کر ان کے کام اور ان کی زندگی کو منظر عام پر لا رہے ہیں۔ جن ادیبوں پر انھوں نے کاوش کی ہے ان میں سے مجھے دو میں زیادہ دل چسپی پیدا ہوئی ہے۔ اول، محمد عاصم بٹ، جو وقتاً ایک بند کوڑے کی مانند ہیں۔ جس طرح عرفان جاوید نے ان کے ایک ایک پتہ کو پھیل کر ان کے باطن کو ظاہر کیا ہے، ایک معرکے سے کم نہیں۔ اب ہمیشہ کے لیے جب بھی میں عاصم بٹ کا خیال کروں گا وہ ایک ادھ چھلے پناؤ کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

دوم، نصیر کوئی صاحب۔ ان کی روداد نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ جنگ دہشتی میں گزارا کرتے رہے، صلہ کچھ طلب نہ کیا، عقیدہ کسی حالت میں ترک نہ کیا، اور آخر میں گم نامی کی موت مرے۔ یہ ایک عام آدمی کے heroism کی کہانی ہے۔ میرے نزدیک نصیر کوئی ایک یونانی ایسے کے کردار ہیں جو نامساعد حالات کے مقابل اپنے اصول ترک کرنے سے انکار کرتے کرتے ڈھیر ہو گئے۔ ایک معمولی آدمی کو نامور لوگوں کے برابر کھڑا کر کے عرفان جاوید نے انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ عبداللہ حسین

کراچی میں شنیڈ ہے کہ ایک مسند ہے۔ وہی مسند جس کہ ساحل پر کھڑے ہو کر منیر نازمی نے اس کی لہروں کی جانب ایک جام اجمال دیا تھا کہ "کا کا تو بھی خوار میں ہو جا"۔ اس مسند میں میرے لیے تین جزیرے عافیت اور پناہ کے ہیں۔ محمد حنیف نقوی اور عرفان جاوید۔ یہ تین تہذیبوں کے لوگوں کی اس کی اجنبیت اور اقلیتی میں ڈوب چکا ہوتا۔ عرفان ایک ہنگامی ہوئی خود سوار ہے لیکن روح ہے اور دروحوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ وہ ہلک کر کہاں نکل جائیں۔ وہ افسانے کے کپے میں تو بھٹکتا ہے ہی لیکن جب کبھی خاکہ نگاری کی گلی میں آگتا ہے تو اپنی جادوگری سے ہم سب کو متحیر کر دیتا ہے۔ وہ اس ادبی شخصیت کو صرف بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے رگ و پے میں حرکت کرتا اس کا ایک حصہ ایسے میں جاتا ہے کہ کچھ خیز نہیں ہوتی کہ ان میں میر کوں ہے اور انھوں کوں سا ہے۔

مسند حسین تارڑ

عرفان جاوید کے یہ خاکے کبھی خاک نہیں ہوں گے کہ ان کے اندر وہ خود گردش کرتا ہے۔

Rs. 1200.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 969-35-2997-9

ISBN-13: 978-969-35-2997-5



9 789693 529975